





خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ





خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۳۴۲۴/۷۷

مجلس ادارت

ساتواں - آٹھواں شمارہ ۷۹-۱۹۷۸ء

اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے، جو خدا بخش لائبریری کے نادر نوادر پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : ۳۰ رُپے

سالانہ خریداری : اندرون ملک : ۶۰ رُپے

پاکستان : ۱۲ ڈالر

یورپ : ۸ پونڈ

امریکہ اور دیگر ممالک : ۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے اُردو حصہ پٹنہ لیتھو پریس رمنا لین پٹنہ ۴ اور انگریزی حصہ تابار پریس ترپولیہ، پٹنہ میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

پہلا حصہ

انتخاب از ادیب الہ آباد

تحریریں

فہرست تصاویر

گروپ فوٹو کی تفصیل :-

—— مجمع دربار نظام مع اسٹاف : ۱۔ نظام (درمیان میں) ۲۔ سپہ سالار عساکر و ایڈیکانگ ۳۔ مولوی احمد حسین۔ ۴۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد وغیرہ۔

—— مجمع دربار آصف جاہ ثانی : ۱۔ میر نظام علی خاں ۲۔ تیغ جنگ بہادر ۳۔ سکندر جاہ ۴۔ راجہ چندو لال ۵۔ فریدوں جاہ ۶۔ غنی یار خاں ۷۔ موسیٰ رحمول ۸۔ اسد نواز جنگ ۹۔ ارسطو جاہ ۱۰۔ احتشام جنگ ۱۱۔ میر عالم ۱۲۔ گھانسی میاں ۱۳۔ میر الملک ۱۴۔ طاہر ۱۵۔ رائے داس ۱۶۔ رفعت الممالک ۱۷۔ اسد علی خاں ۱۸۔ غلام سید خاں ۱۹۔ امجد علی خاں ۲۰۔ شرف الدولہ ۲۱۔ منو میاں مسخرہ۔

—— مجمع اخبار نویسان لاہور: ۱۔ پنڈت گردھر رائے، ایڈیٹر برہمہ پرچارک

دوسرا حصہ

تحریریں

'ادیب' کے اس انتخاب میں ایسی تمام تحریریں اور تصویریں شامل کی گئی ہیں، جو متعلقہ مصنفین کے مطبوعہ مجموعوں میں نہیں آسکی ہیں ــــــــ پریم چند کا 'بیغرض محسن' البتہ غلطی سے شامل ہو گیا، یہ ان کے ایک مجموعہ میں آچکا ہے۔

حصّہ اوّل کے مقالہ نگار

علی حیدر نظم طباطبائی (م ۱۹۳۳ء)

—— معروف ادیب اور شاعر، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۷-۸ ص ۴۸-۴۹

غلام مصطفیٰ ذہین (م نیمہ اوّل ۲۰ ویں صدی)

—— مخزن اور ادیب میں ان کے مضامین برابر شائع ہوتے رہے ؛ معروف شاعر خاص کر اخلاقی نظموں میں اختصاص

ضمیر الدین احمد عرش گیاوی (پ ۱۸۸۰ء تقریباً - م ...)

—— امیر اللہ تسلیم کے شاگرد۔ آپ کی تصانیف میں حیاتِ تسلیم ؛ حیات مومن اور کلیاتِ عرش طبع ہو چکی ہیں ؛ عرش اللغات، رسالہ عروض و قوافی ؛ بارگاہ سلطانی ؛ تذکرہ شعرائے گیا غیر مطبوعہ آثار میں ہیں۔

نقّاد لکھنوی

—— غالباً نوبت رائے نظر (ایڈیٹر ادیب) - یا عبدالماجد دریا بادی کا اس وقت کے لیے قلمی نام

سیّد نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی (پ ۲۳ فروری ۱۸۸۳ء)

—— معروف شاعر اور انشا پرداز ؛ آگرہ اخبار، مفید عام اور نقاد کے ایڈیٹر رہے۔ نیاز فتحپوری، وصل بلگرامی، اور شاہ دلگیر کی تثلیث ایک زمانہ میں خاصی معروف تھی۔

حکیم حبیب الرحمٰن (پ ۱۸۸۱ء - م ۲۳ فروری ۱۹۴۷ء)

—— ڈھاکہ کے معروف حکیم اور ادیب۔ بانی طبیہ کالج ڈھاکہ ؛ حکومت سے شفاء الملک کا خطاب بھی ملا تھا قومی تحریک میں شامل ہونے کے بعد مسلم لیگ کی تحریک پر اسے واپس کر دیا۔

آپکے آثار میں بنگال کی ببلیوگرافی پر شلا دو رسالہ، کشف الظنون کے طرز پر ہے۔ مشرقی بنگال پر دوسری تصانیف : مساجد ڈھاکہ ؛ ڈھاکہ اب سے ۵۰ برس پہلے ؛ شعرائے ڈھاکہ ؛ آسودگان ڈھاکہ (بزرگان ڈھاکہ کے مزارات اور تذکرے) ؛ ہفتہ وار رسالہ المشرق کے ایڈیٹر رہے ؛ ادبی و علمی رسالہ جادو بھی آپکی ادارت میں نکلتا رہا۔

بشن نراین در تخلص ابر لکھنوی (پ ۱۸۶۴ء - م ۱۸۲۵ء)

—— بیرسٹر کشمیری پنڈت، اُردو کے معروف ادیب سخن سنج اور سخن گو؛ انگریزی مضامین کا مجموعہ آثار زمانہ SIGNS OF TIMES کے علاوہ اردو مثنوی گلزار کشمیر کا ذکر تذکروں میں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو چکبست کا مضمون، ادیب جنوری ۱۹۱۰ء، جو مضامین چکبست میں بھی شامل ہے)۔

د۔ ر = دھنپت رائے = نواب رائے = پریم چند (پ ۱۸۸۱ء - م ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

—— مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی (پ ۸ جنوری ۱۸۴۶ء - م ۷ جنوری ۱۹۲۷ء)

—— اُردو کے مشہور شاعر اور انشا پرداز (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کلیات شاد، مرتبہ کلیم الدین احمد، زبان و ادب شاد عظیم آبادی نمبر، فروری - مارچ ۱۹۷۹ء)

سید محمد فاروق

—— ادیب کے مستقل مضمون نگاروں میں سے ایک۔

جان طلکم

—— حیدر آباد میں مقیم، ادیب کے مستقل مضمون نگاروں میں سے ایک۔

شہیر فتحپوری

—— ادیب کے مستقل مضمون نگاروں میں سے ایک۔

محمد شفیع الدین خاں مراد آبادی

—— ادیب کے مستقل مضمون نگاروں میں سے ایک۔

حکیم عبد الکریم برہم فتحپوری (م ۱۹۰۰ء)

—— خوش فکر شاعر اور نثر نگار، امیر مینائی کے شاگرد۔ اخبار صلح کل کے اڈیٹر اور رسالہ فتنہ (اڈیٹر ریاض خیر آبادی) کے مالک و مہتمم رہے۔ ایک ناول گرشن کماری ان کی یادگار ہے۔

حصۂ دوم کے مزید لکھنے والے

شیخ احمد علی شوق قدوائی، قصبہ جگور ضلع بارہ بنکی (پ ۱۸۵۳ء - م ۱۹۲۵ء)

— شعرائے متاخرین اُردو میں ایک اہم مثنوی نگار۔ حضرت امیر کے شاگرد۔ لکھنؤ سے 'آزاد' نامی اخبار کے ایڈیٹر، اور ریاست رامپور میں 'حامد اللغات' کے شریک مؤلف۔ مثنوی 'ترانۂ شوق'، 'عالم خیال'، اور ڈراما 'قاسم و زہرہ' وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔

نوبت رائے نظر (پ ۱۸۶۶ - م ۱۹۲۳)

— جنوری ۱۹۱۰ء تا مئی ۱۹۱۱ء 'ادیب' الٰہ آباد کے پہلے ایڈیٹر رہے۔ 'مخزن' کے دور میں 'خدنگ نظر' شروع کیا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو یادِ رفتگاں از جگر بریلوی)

پیارے لال شاکر (پ ۱۰ مارچ ۱۸۸۰ء م ۲۰ فروری ۱۹۵۶ء)

— جون ۱۹۱۱ء تا دسمبر ۱۹۱۲ء 'ادیب' الٰہ آباد کے دوسرے ایڈیٹر رہے۔

سید محمد قاسم رضوی حسیر عظیم آبادی (پ ۱۸۸۲ء م ۱۹۲۲ء)

— اچھے انشا پرداز اور شاعر؛ امپیریل (نیشنل) لائبریری کلکتہ کے فہرست نگار؛ محقق السنۂ مشرقیہ سرکار ہند اور جنوری تا جولائی ۱۹۱۳ء 'ادیب' الٰہ آباد کے آخری ایڈیٹر رہے۔ نقاد وغیرہ رسائل میں لکھتے تھے۔

نشی کانت چٹوپادھیا (م ۱۹۱۰ء)

— کئی مشرقی و مغربی زبانوں کے ماہر؛ سرکار نظام کی طرف سے ترجمہ کے کام پر مامور؛ ابن رشد (فرانسیسی سے انگریزی میں) اور مسلمانان اسپین، مصنفہ ڈوزی (انگریزی میں) کے مترجم۔

حافظی ۔ 'ادیب' کے مضمون نگاروں میں ایک۔

منوہر لال زتشی ۔ 〃 〃 〃

سید محمد اسد علی ۔ 〃 〃 〃

سید خورشید علی ۔ 〃 〃 〃

لطیف الدین چشتی ۔ 〃 〃 〃

م - ی - چھانیا ۔ 〃 〃 〃

امجد حسین ماہ عظیم آبادی ۔ پختہ مشق نظم گو شاعر؛ 'ادیب' کے کئی شماروں میں آپ کا کلام شائع ہوا ہے۔

مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی (پ ۱۸۸۴ - م ۱۹۵۶ء)

— سید علی محمد شاد اور بیتاب عظیم آبادی کے نامور شاگرد (تفصیل کے لئے یاس یگانہ چنگیزی از معصوم رضا راہی)

تیرتھ رام فیروزپوری — اُردو زبان میں انگریزی سے جاسوسی ناولوں کے معروف مترجم۔

منتخبہ تحریروں اور تصویروں کے مآخذ

ادیب کے شماروں کی تفصیل

پہلا حصہ — تحریریں

(۱) اکتوبر ۱۹۱۱ء، (۲) اپریل و اکتوبر ۱۹۱۱ء و مئی ۱۹۱۲ء، (۳) اگست ۱۹۱۰ء، (۴) مئی ۱۹۱۱ء، (۵) فروری ۱۹۱۰ء، (۶) نومبر ۱۹۱۰ء، (۷) جولائی ۱۹۱۱ء، (۸) جنوری ۱۹۱۱ء، (۹) اپریل ۱۹۱۰ء، (۱۰) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۱۱) نومبر ۱۹۱۱ء، (۱۲) جون ۱۹۱۱ء، (۱۳) نومبر ۱۹۱۱ء، (۱۴) مارچ ۱۹۱۱ء، (۱۵) جولائی ۱۹۱۰ء، (۱۶) مئی ۱۹۱۱ء، (۱۷) مارچ ۱۹۱۲ء، (۱۸) نومبر ۱۹۱۱ء، (۱۹) اگست ۱۹۱۰ء، (۲۰) اگست ۱۹۱۱ء، (۲۱) ستمبر ۱۹۱۰ء، (۲۲) نومبر ۱۹۱۲ء، (۲۳) جولائی ۱۹۱۲ء، (۲۴) اپریل ۱۹۱۲ء، (۲۵) جولائی ۱۹۱۲ء

تصویریں

الف — (۱) فروری ۱۹۱۲ء، (۲) اکتوبر ۱۹۱۱ء، (۳) اکتوبر ۱۹۱۱ء، (۴) اگست ۱۹۱۱ء، (۵) اگست ۱۹۱۱ء

ب — (۱) اکتوبر ۱۹۱۲ء، (۲) نومبر ۱۹۱۲ء، (۳) اگست ۱۹۱۰ء، (۴) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۵) مارچ ۱۹۱۲ء و (۶) جولائی ۱۹۱۲ء

ج — (۱) مارچ ۱۹۱۲ء، (۲) اپریل ۱۹۱۲ء، (۳) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۴) اپریل ۱۹۱۱ء، (۵) مارچ ۱۹۱۲ء، (۶) مئی ۱۹۱۲ء، (۷) اپریل ۱۹۱۲ء، (۸) مارچ ۱۹۱۲ء، (۹) ستمبر ۱۹۱۰ء، (۱۰) دسمبر ۱۹۱۲ء، (۱۱) اکتوبر ۱۹۱۲ء، (۱۲) دسمبر ۱۹۱۲ء، (۱۳) نومبر ۱۹۱۲ء، (۱۴) مارچ ۱۹۱۲ء، (۱۵) اپریل ۱۹۱۰ء، (۱۶) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۱۷) اگست ۱۹۱۲ء، (۱۸) جون ۱۹۱۰ء، (۱۹) اکتوبر ۱۹۱۲ء، (۲۰) ستمبر ۱۹۱۲ء، (۲۱) ستمبر ۱۹۱۲ء، (۲۲) مئی ۱۹۱۰ء، (۲۳) جون ۱۹۱۲ء، (۲۴) فروری ۱۹۱۱ء، (۲۵) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۲۶) اپریل ۱۹۱۱ء، (۲۷) نومبر ۱۹۱۱ء، (۲۸) اپریل ۱۹۱۲ء، (۲۹) جون ۱۹۱۱ء، (۳۰) جنوری ۱۹۱۱ء، (۳۱) اپریل ۱۹۱۲ء، (۳۲) اپریل ۱۹۱۲ء، (۳۳) ستمبر ۱۹۱۰ء، (۳۴) مارچ ۱۹۱۱ء، (۳۵) جنوری ۱۹۱۰ء

دوسرا حصہ — تحریریں

(۱) اگست ۱۹۱۱ء، (۲) مارچ ۱۹۱۱ء، (۳) مارچ ۱۹۱۲ء، (۴) مئی ۱۹۱۲ء، (۵) جولائی ۱۹۱۲ء، (۶) جولائی و اگست ۱۹۱۲ء، (۷) اگست ۱۹۱۱ء، (۸) مارچ ۱۹۱۲ء، (۹) نومبر ۱۹۱۰ء، (۱۰) جنوری ۱۹۱۰ء، (۱۱) جنوری ۱۹۱۱ء، (۱۲) دسمبر ۱۹۱۰ء، (۱۳) اپریل ۱۹۱۲ء، (۱۴) مارچ ۱۹۱۱ء، (۱۵) اپریل ۱۹۱۱ء، (۱۶) مارچ ۱۹۱۲ء، (۱۷) جون ۱۹۱۲ء، (۱۸) اگست ۱۹۱۰ء، (۱۹) فروری ۱۹۱۰ء، (۲۰) مئی ۱۹۱۱ء، (۲۱) مارچ ۱۹۱۲ء، (۲۲) اپریل ۱۹۱۲ء، (۲۳) نومبر ۱۹۱۲ء، (۲۴) ستمبر ۱۹۱۲ء، (۲۵) اگست ۱۹۱۲ء، (۲۶) اگست ۱۹۱۲ء، (۲۷) جون ۱۹۱۲ء، (۲۸) مارچ ۱۹۱۰ء، (۲۹) مارچ ۱۹۱۲ء، (۳۰) اپریل ۱۹۱۲ء، (۳۱) جولائی ۱۹۱۰ء، (۳۲) مئی ۱۹۱۱ء، (۳۳) فروری ۱۹۱۲ء، (۳۴) ستمبر ۱۹۱۰ء، (۳۵) جنوری ۱۹۱۲ء، (۳۶) مئی ۱۹۱۱ء، (۳۷) جولائی ۱۹۱۲ء، (۳۸) جولائی ۱۹۱۲ء، (۳۹) مئی ۱۹۱۲ء، (۴۰) مئی ۱۹۱۲ء، (۴۱) اگست ۱۹۱۱ء، (۴۲) اگست ۱۹۱۲ء، (۴۳) مارچ و جولائی ۱۹۱۲ء، (۴۴) اپریل ۱۹۱۲ء، (۴۵) ستمبر ۱۹۱۲ء، (۴۶) مارچ ۱۹۱۱ء، (۴۷) فروری ۱۹۱۱ء، (۴۸) اپریل ۱۹۱۱ء، (۴۹) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۵۰) اپریل ۱۹۱۰ء، (۵۱) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۵۲) اپریل ۱۹۱۲ء، (۵۳) جولائی ۱۹۱۲ء، (۵۴) ستمبر ۱۹۱۰ء، (۵۵) اکتوبر ۱۹۱۲ء، (۵۶) فروری ۱۹۱۲ء، (۵۷) مارچ ۱۹۱۲ء، (۵۸) اپریل ۱۹۱۲ء، (۵۹) مئی ۱۹۱۲ء، (۶۰) مئی ۱۹۱۱ء، (۶۱) جون ۱۹۱۱ء، (۶۲) جون ۱۹۱۱ء، (۶۳) دسمبر ۱۹۱۰ء، [illegible] مارچ ۱۹۱۱ء، (۶۴) اپریل ۱۹۱۲ء، (۶۵) مئی ۱۹۱۲ء، (۶۶) دسمبر ۱۹۱۲ء، (۶۷) جون ۱۹۱۱ء، (۶۸) جون ۱۹۱۰ء، (۶۹) مارچ ۱۹۱۱ء، (۷۰) جون ۱۹۱۲ء، (۷۱) مئی ۱۹۱۰ء، (۷۲) جون ۱۹۱۰ء، (۷۳) مارچ ۱۹۱۱ء، (۷۴) اکتوبر ۱۹۱۰ء و (۷۵) فروری ۱۹۱۰ء، (۷۶) مارچ ۱۹۱۱ء، (۷۷) مارچ ۱۹۱۱ء، (۷۸) فروری ۱۹۱۱ء، (۷۹) ستمبر ۱۹۱۱ء، (۸۰) مئی ۱۹۱۱ء

کچھ ادیب کے اس انتخاب کے بارے میں

یہ ادیب (الہ آباد) کے جنوری ۱۹۱۰ء تا جولائی ۱۹۱۳ء کے ۲۰×۳۰/۸ سائز کے ڈھائی ہزار سے کچھ اوپر صفحات پر پھیلے ہوئے ۴۲ شماروں کا انتخاب ہے۔ یہ کام شروع کرتے وقت خیال تھا کہ اردو کے معروف ادبا و شعرا کے بارے میں لکھی ہوئی معاصر تحریریں جمع کردی جائیں۔ (درخشاں[1]، صولت[2]، طباطبائی[3]، تسلیم[4]، جلال[5]، ریاض[6]، شبلی[7]، ذکاءاللہ[8]، شرر[9]، سید احمد دہلوی[10]، نظام الدین حسن[11]، سید علی بلگرامی[12])۔ بشن نرائن[13] در اس عہد کی مشہور شخصیتوں میں تھے، کانگریس کے صدر رہ چکے تھے، اردو کے خوش گو شاعر تھے، (چکبست نے ان کی شاعری کے بارے میں ایک بھرپور مقالہ بھی لکھا تھا جو مضامین چکبست میں بھی شامل ہے) ابر تخلص تھا، ان کا ایک مقالہ ان کی خوش ذوقی اور نثری اسلوب (مقالہ عصریت بھی لئے ہوئے ہے) کی یادگار کے طور پر مزید جوڑا گیا۔ بنگالیوں کی اردو شاعری[14] ایک کمیاب موضوع تھا؛ اس طرح املا[15] اردو کے مسائل پر اس وقت شاد نے جیسی تجزیاتی تفصیل کے ساتھ سوچا، ان امور کے پیش نظر یہ دونوں تحریریں بھی انتخاب میں لے لی گئیں۔ علمی اداروں میں کلکتہ کے مشہور کتاب خانہ پر (جو اس وقت امپیریل[16] لائبریری کہلاتی تھی اب نیشنل لائبریری)، اور لکھنؤ کی معروف دینی عربی درسگاہ (ندوۃ العلما[17]) پر یہ دو مضامین لئے گئے۔ عالمی شہرت کے مالک فردوسی[18] پر ایک بھرپور مقالہ نظر آیا اُسے شامل کرلیا گیا۔ پریم چند صدی کا موقع تھا اور پریم چند کی یہ تحریریں[19] اب تک ان کے کسی مجموعہ میں شامل بھی نہ ہو پائی تھیں۔ اسی لئے اردو ناول پر ان کی تحریر، اور پانچ افسانے (خوف رسوائی[20]، دھوکے کی ٹٹی[21]، کیفر کردار[22]، سگ لیلی[23]، بڑی بہن[24])، اس انتخاب میں شامل کر لئے گئے۔ مزید برآں ادیب میں شائع شدہ ۴۰۰ تصاویر میں سے شعرا، ادبا اور مشاہیر کی ۱۳۵ ایسی تصویریں

بھی منتخب کرلی گئیں، جو عام طور سے متعارف و متداول نہیں (۲۶ دیں، میر اکبر علی، ایڈیٹر ادیب فیروزآباد، کی تصویر اس انتخاب کا باقاعدہ حصّہ نہ شمار کی جائے۔ یہ ادیب سے ماخوذ نہیں ہے۔)

ابتدائی اسکیم بس اتنی ہی تھی اور اتنا مواد آفسٹ سے چھاپ دیا گیا۔ یہی وہ حصّہ ہے جسے موجودہ ترتیب میں پہلا حصّہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ صرف اتنے پر اکتفا کیا گیا تو درجۂ اوّل کی بہت سی دوسری چیزوں کو ایک عرصۂ دراز کے لئے پھر دفینہ بنا دینا ہوگا۔ چنانچہ لیتھو میں دوسرا حصّہ تیار کیا جس کا کینوس وسیع تر تھا۔ اس میں لبھّی نرائن در کی دو نظمیں جو اسلوب اور مواد دونوں کے لحاظ سے قابل قدر تھیں، ادیب کے پسندیدہ شاعر ماہ عظیم آبادی، جو اچھا کہتے تھے مگر آج انہیں کوئی عظیم آباد میں بھی ٹھیک سے نہیں جانتا، ان کی ایک نظم، اور یگانہ چنگیزی کی عہد یاس کی ایک غزل ـــــ یہ منظومات علامتی طور سے لی گئیں۔ اور حصّۂ نظم کا اختتام شوق قدوائی کی غالب کے بارے میں ایک نظم پر کیا گیا جو اگلے حصّہ غالبیات کا گویا دیباچہ بن گئی۔ اس طرح غالبیات کا حصّہ ایک نظم، ایک طویل مضمون اور مزار غالب کے سلسلے میں مختصر اداریتی شذرات پر مشتمل ہوگیا۔ اس کے بعد ہم عصر اور قریب العصر شعرا، ادبا اور مشاہیر کے بارے میں اداریتی تحریروں یا سیر حاصل مضامین کا حصّہ آتا ہے جس کا دیباچہ عہد متوسط کے نظیر اکبرآبادی کو بنایا گیا۔ (رجب علی بیگ سرور، نظام علی خاں اور رام موہن رائے بھی کچھ قبل کے زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں) ہمعصر شعرا ادبا کے علاوہ نظم ونسق، سماجی کام، یا سیاست میں نام پیدا کرنے والے چند ہمعصر مشاہیر کو بھی اس میں لے لیا گیا۔ اردو کے نظیر اکبرآبادی سے شروع ہونے والے اس حصّہ کا اختتام ہندی کے عہد اکبری کے نامور شاعر تلسی داس پر ہوتا ہے۔ اگلا حصّہ پریس، اخبارات اور اخبار نویسی پر ہے جس کا خاتمہ نول کشور پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی زبانوں کی ترقی کے لئے ایک انسٹی ٹیوٹ کی اسکیم سے آغاز کر کے اردو زبان کے لئے جس میں اردو ہندی مسئلہ بھی آجاتا ہے، ایک حصّہ وقف کیا گیا۔ پھر تعلیم و سیاست ہند اور کتاب خانوں پر چند شذرات لئے گئے اور ہند اسلامی تہذیب کے چند مظاہر پر مضامین،

جس کے اختتام پر ہندی فنِ تعمیر کے شاہکار قطب پر دو تحریریں ہیں۔ اس طرح فنونِ لطیفہ کا حصہ در آیا، جس میں لکھنؤ کے مصوروں پر ایک مضمون لیا گیا اور پھر خیام کے ہندوستانی مصور مجموعہ پر ایک شذرہ۔ آخر میں ہندو اور بدھ مذاہب سے متعلق چند تحریریں ہیں اور جبری عقیدہ پر ایک عمومی تبصرہ۔

امید ہے اس انتخاب کے ذریعہ درجۂ اول کی ایک خاصے کی چیز کا بھرپور تعارف اور نمائندگی ہو سکے گی۔

مہتاب الدولہ درخشان

حضرت واجد علی شاہ طاب ثراہ کے منتخب کئے ہوئے شاعرون مین تھے۔ تدبیر الدولہ منشی مظفر علی اسیر سے انھون نے فن شعر کو حاصل کیا تھا۔ انکی سخن سنجی و خوش گوئی پر اُستاد کو بھی ناز تھا۔ یہی سبب ہوا کہ جب فتح الدولہ برق نے اپنے ایک خوش فکر شاگرد مرزا محمد رضا طوبہ کو دربار شاہی مین پیش کیا تو منشی صاحب نے مہتاب الدولہ درخشان کو پیش کر دیا۔ مہتاب الدولہ خود بیان کرتے تھے کہ میری اور آفتاب الدولہ قلق کی نذر ساتھ ہی ہوئی اور ہم دونون کو خطاب بھی ساتھ ہی ملے۔ الحاق اودھ کے بعد قلق اور اسیر لکھنؤ مین رہ گئے۔ طوبہ کربلائے معلیٰ چلے گئے۔ برق و درخشان بادشاہ کے ساتھ مٹیا برج مین رہے اور وہین مر بھی گئے۔ بادشاہ کے قلعہ سے چھوٹنے اور غدر کے فتنہ و فساد فرو ہونے کے بعد لکھنؤ سے اور بھی شعرا پہونچے اور ملازمان شاہی مین منسلک ہوے۔ سات شاعر انمین سے سبعہ سیارہ کہلاتے تھے۔ یہ امتیاز حضرت کا دیا ہوا تھا۔ درخشان بھی ان ساتون مین داخل تھے۔ یہ سب لوگ بڑے نازک خیال تھے۔ اس سبب سے کہ بادشاہ کو وہی رنگ زیادہ تر پسند تھا۔ مرزا داغ مرحوم بارہا ذکر کرتے تھے کہ مین جب رامپور سے چلا تو لکھنؤ و عظیم آباد وغیرہ مین ٹھہرتا ہوا اور مشاعرون مین سب جگہ شریک ہوتا ہوا کلکتہ پہونچا۔ جو مزہ مجھے مٹیا برج کے مشاعرون مین آیا وہ لطف لکھنؤ مین بھی نہ پایا۔ درخشان نہایت پُرگو شخص تھے۔ جمیع اصناف سخن پر انکا کلام شامل تھا۔ بنگالا ان لوگون کے لئے ایسا کور دہ تھا کہ کسی نے یہ بھی نہ جانا کہ لکھنؤ کے کچھ اہل کمال یہان پڑے ہوے مین کسی کے کلام کا بھی کچھ پتہ نہین ہے۔ مجھے ایک عرصہ کے بعد شاہزادہ مرزا محمد مقیم بہادر کے حسب طلب کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہان ایک ایک سے پوچھا کہ عیش و بہار و ہنر و درخشان وغیرہ کے دیوان کسی کے پاس ہین۔ ایک مصرع بھی نہ ملا۔ مستورات مین سے ایک صاحب کے پاس درخشان کے چند شعر نکلے۔ دیکھا تو سب الف کی ردیف کے ہین اور یہ معلوم ہوا کہ کسی نے فقط اپنی پسند کے شعر لکھ لیے ہین۔ پوری غزل کوئی نہین ہے۔ مین نے انھین اشعار کو غنیمت سمجھا اور سب لکھ لئے۔ اگر محسنات کلام کے بیان مین میرے قلم سے کہین مبالغہ تراوش کرے تو اہل فن اُسکو مقتضائے محبت و حق صحبت پر محمول فرمائین۔

اشعار

ہر مصرع ہو جو حاصل مصرع تر دوسرا ۔۔۔ مرغ معنی کے لئے پیدا ہو شہپر دوسرا
حال ابنائے زمان بے شل سنگ آسیا ۔۔۔ ایک بے آرام مین کھاتا ہے چکر دوسرا
یک سپر ہے فوق بد کو ہر عالم مین تو کیا ۔۔۔ خس نظر آتا ہے مجھکو ایک گوہر دوسرا
گلشن عالم مین کی اک دھیمی پریم نے بسر ۔۔۔ پیرہن بدلا نہ مانند صنوبر دوسرا
کیون پڑے روزی کی فکر ناکس سے کرتا ہے رجوع ۔۔۔ بند کر سکتا نہین رزق مقدر دوسرا
دست رس ایسا جو ہو تجھسے تو دون آئینہ ۔۔۔ دیکھنے پائے نہ تیرا دیدۂ انور دوسرا
کام وہ کر جس سے راحت گور کی منزل مین ہو ۔۔۔ تا قیامت تو ہے جسمین نہین گھر دوسرا
ذبح کیا کرتے ہو چھوڑو باندھکر بر بام پر ۔۔۔ ایک کو دیکھے تو آ بیٹھے کبوتر دوسرا

اے درخشان ہیکہ مضمون سے ہے روشن کہ جہان
شاہ اختر سا نہین دیکھا سخنور دوسرا

اس غزل مین حسن بندش لطف تغزل شان شوق دیکھنے کی

چیزین ہین۔ غزل مین زبان کا مزہ ردیف کے چمکنے سے پیدا ہوتا ہے اسکے ہر شعر مین ردیف ایسا مزہ دے رہی ہے جیسے ترانہ مین سم۔ ہر شعر کے حاصل معنی کو دیکھئے کیسے پُر مغز مضامین ہین۔ مطلع مین شہرت کا استعارہ شہپر ہے۔ سنگ آسیا کی تشبیہ۔ خس کا پانی کے اوپر بہنا اور گوہر کا تہ نشین ہونا۔ صنوبر اور مقدر کے قافیہ مین قناعت کا لاؤ آئینہ والے شعر مین حیرت کا مضمون داد طلب ہے۔ گھر کا قافیہ بھی ردیف سے خوب لپٹا ہے اور مضمون بھی عبرت خیز ہے۔ ایک کبوتر کو دیکھکر دوسرے کا آبیٹھنا کیا اچھی تمثیل ہے۔ اور تخئیل ہی شعر کی جان ہے ورنہ شاعر کوئی واعظ نہین ہے کہ سارا کلام اُسکا پند نامہ ہو۔ مقطع مین بادشاہ کی مدح ہے۔ ذوالفقار الدولہ بادشاہ کے مقرب و رفیق خاص تھے۔ اُنکے یہان مشاعرہ تھا اور سب کو معلوم تھا کہ جہان پناہ بھی رونق افروز ہونگے۔ غزلین بھی شعرا نے فکر سے کہین اور ایک آدھ شعر مین اُنکی مدح بھی کی ہے۔ بادشاہ کہتے تو بہت تھے مگر مشاعرہ مین آنے کا ذوق نہ تھا اسی سبب سے یہ مشاعرہ ٹوٹ گیا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ہوادار پر سوار چلے جا رہے ہین شعرا کو باریابی کا حق مل گیا یا تون باتون مین کوئی مصرع حضرت کی زبان سے نکل گیا۔ سب نے ملکر اُسے طرح قرار دے لیا۔ پھر جو سواری ہوئی تو اپنی اپنی غزلین سناتے ہوئے ہوادار یا بوچے کے ساتھ ساتھ چلے۔ بوچے کے کہار مزاج شناس تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھانے لگے۔ سیدھی راہ کو چھوڑ کر باغون کے اندر ہوتے ہوئے گزرے۔ شعرا جب پڑھ چکے اور داد دے چکے تو رئیس الدولہ جو خوشنویسون کے افسر اور مطبع سلطانی کے مہتمم تھے بوچے کے قریب آئے اور بادشاہ کی غزل صاف کی ہوئی گزران دی۔ اُنسے غزل لیکر حضرت نے پڑھنا شروع کی۔ کلام الملوک ملوک الکلام کا شور بلند ہوا۔ بیچ مشاعرہ ہو گیا۔ جہان پناہ رہس منزل مین داخل ہو گئے۔ رئیس الدولہ بھی شعر کہتے تھے اور مہتاب الدولہ سے مشورہ تھا۔

ولہ

کیا نام خدا قبلہ نما دل نظر آیا   محراب سے ابرو کے مقابل نظر آیا

دریائے محبت کا نہ پوچھو مد و پایان   جی ڈوب گیا جب مجھے ساحل نظر آیا

مرجانے سے بدتر ہے غم دوری احباب   دیدار فقط زیست کا حاصل نظر آیا

نالان ہے جراحت سے نہین طالب مرہم   دل صورت منقار عنادل نظر آیا

نازک ہے فن شعر نہایت ہی درخشان

کہنے سے سمجھنا مجھے مشکل نظر آیا

محراب ابرو کی گنجائش وزن مین نہ تھی۔ محراب سا ابرو باندھ دیا۔ نام خدا کا لفظ محض قبلہ و محراب کی رعایت سے رکھا ہے اور بھرتی کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے شعر مین جی ڈوب جانا بھی دریا کی رعایت سے لائے ہین مگر وہ بُرا نہین معلوم ہوتا۔ رعایت لفظ کرنے مین اتنا سلیقہ شاعر کو ضرور ہونا چاہئے کہ رعایت مبتذل و منکر مین تمیز کرے۔ یورپ کے شاعرون کی تقلید مین جو لوگ رعایت سے مطلقاً نفرت ظاہر کرتے ہین اُنکی رائے یہ ہے کہ کسی محل پر رعایت اچھی نہین معلوم ہوتی۔ مگر تجربہ اسکے خلاف ہے۔ مین اسکو ویسی ہی بات سمجھتا ہون کہ کسی کو ابلا ہوا گوشت پسند ہے کسی کو بھنا ہوا۔ مد و پایان مین ایک لفظ مونث ایک مذکر ہے۔ مگر دو نون ملکر مذکر ہی بولے جائینگے۔ دل و چشم کی تشبیہ منقار عنادل سے اور مقطع مین بندش کی صفائی و طرز بیان نہایت پُر لطف ہے۔

ولہ

کبھی تم نے بھی گل کھایا تو ہوتا   جلانے کا مزہ پایا تو ہوتا

کوئی میرے لئے ہے بے خور و خواب   تمہین اتنا خیال آیا تو ہوتا

کہین سکتہ نہ عاشق کو ہوا ہو — اُسے آئینہ دکھلایا تو ہوتا
پلائی گر نہ ساقی نے مجھے مے — دکھا کر جام ڈہکایا تو ہوتا

جلانے کا مزہ دیکھ لیا ہوتا یا چکھا ہوتا زیادہ تر اس محل پر بولتے ہین۔ پایا تو ہوتا ضرور قافیہ کے سبب سے کہہ گئے ہین۔ خواب وخیال مین مراعات النظیر بھی موجود ہے اور بیشک بُری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُسکے بُرا معلوم ہونے کی لم یہ نہین ہے کہ رعایت لفظی اصل مین بُری چیز ہے بلکہ مبتذل ہونے کی وجہ سے بُری معلوم ہو رہی ہے۔ یعنی خواب کے ساتھ خیال کا لفظ دو لاکھ دفعہ کہا گیا ہے اب سُنتے سُنتے جی اُکتا گیا۔ تیسرے شعر مین عاشق کا لفظ مبتذل ہے۔ انکا ایک شعر مجھے یاد آیا اسی مضمون کو کیا اچھی طرح کہا ہے۔ ؎

سکتہ مین وہ آئینہ دکھا کر مجھے بولے — پتھر پڑین اے شخص تری بے خبری پر

ڈہکانے کا شعر بہت صاف ہے مگر ایک پرہیز گار کہہ رہا ہے کہ مجھے مے نہ پلائی تھی تو ڈہکایا ہی ہوتا اسکے معنی کیا۔ معنی انکے یہ ہین کہ شراب کا مضمون فارسی و اُردو کی شاعری مین معرکہ شعرا ہے خواہ کوئی شراب پیے یا نہ پیے ان مضامین کا کہنا ضرور ہے۔ ایسے ہی اور بھی اسرار ہین جو ہر زبان کی شاعری مین پائے جاتے ہین۔ یورپ کی شاعری بھی اس رنگ مین ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ ایسے مضامین کہنا ضروری کیا ہے۔ آغا حجو شرف مرحوم نے شراب ساقی پیرمغان مے خانہ واعظ زاہد سبحہ زُنار مسجد بُت خانہ وغیرہ کا ذکر غزل مین ترک کر دیا تھا۔ کہتے تھے آخر اسکے معنی کیا کہ شراب سے نفرت واعظ سے عقیدت اور پھر اُسکی تعریف کرین اور اسکی مذمت اس قسم کے شعر سراسر غیر واقعی ہوا کرتے ہین مجھے اُس سے کچھ لطف نہین ملتا۔ اُسی زمانہ مین مرزا غالب کا دیوان پہلی دفعہ لکھنؤ سے چھپکر نکلا۔ ایک دن کیا دیکھتا ہون کہ شرف ترپ رہے ہین اور بے چین ہوئے جاتے ہین۔ مجھے دیکھکر کہنے لگے بھئی مرزا نوشہ نے ایک شعر کہا ہے کہ مین نے کلیجہ پکڑ لیا ہے۔ ؎

نظر لگے نہ کہین اُسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیون مرے زخم جگر کو دیکھتے ہین

مین نے کہا کہ اس مضمون غیر واقعی سے آپ کو لطف کیون آ رہا ہے۔ کہنے لگے اسکا تو جواب ہی نہین ایسا غیر واقعی ہو تو کیا پوچھنا یہ غزل بھی اسیطرح کے مشاعرہ کی ہے جو سواری کے ساتھ ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بادشاہ کی غزل بھی اسیطرح مین ہے۔ مجھے رئیس الدولہ نے ذکر کیا کہ اپنی غزل پڑھکر حضرت نے خواجہ حیدر علی آتش کا مطلع پڑھا۔ ؎

کبھی وہ سروقد آیا تو ہوتا — کوئی دم گور پر سایہ تو ہوتا

اور مہتاب الدولہ سے فرمایا کہ دیکھو بظاہر یہ مطلع دو لخت معلوم ہوتا ہے۔ اُنھون نے عرض کیا بجا ارشاد ہوتا ہے۔ کہنے لگے نہین۔ سرو کو گور سے اک مناسبت ہے۔ یہ درخت قبرستان مین اکثر لگاتے ہین۔ یہ ایران کی رسم ہے۔ مہتاب الدولہ نے کہا کہ کوئی دم کا لفظ بھی سرو کے مناسب حال ہے کہ اُسکا سایہ دیر تک نہین رہتا۔ پھر فرمانے لگے کہ فارسی کے اساتذہ سایہ اور آیا کبھی قافیہ نہ کرینگے۔ اُردو مین کوئی اسکا خیال نہین کرتا۔ مین نے بھی یہی اختیار کر لیا۔ مہتاب الدولہ نے ناسخ کا مطلع پڑھا کہ۔ ؎

گھر مرا غربت مین سونا ہو گیا — گنج مرقد کا نمونہ ہو گیا

اور عرض کیا کہ دیکھیے شیخ نے بھی ہائے مختفی کو ردی قرار دیا ہے۔ جناب مفتی میر عباس صاحب کے پاس یہ ذکر پہونچا۔ اُنھون نے اس مسئلہ مین یہ اجتہاد فرمایا کہ دیکھا اور سایہ اور نمونہ اور اچھا قافیہ نہ کرنا چاہیے لیکن سایہ اور آیا اور نمونہ اور سونا مین کچھ قباحت نہین۔ ایک بادشاہ کے دم سے مٹیابرج مین عجب دلچسپ مجمع رہا۔ کیسے کیسے دقائق چھن گئے اور کتنے لوگ شاعر طبیب و علامہ بنگئے۔ رئیس الدولہ نے مجھ سے پوچھا کہ جناب مفتی صاحب نے

تفصیل جو کی میری سمجھ مین اسکی وجہ نہ آئی - دیکھا اور سایہ قافیہ غلط اور آیا اور سایہ صحیح - مین نے کہا کہ دیکھا اور سایہ مین ہاے مختفی کو سوا روی قرار دینے کے اور کوئی صورت نہین اور فارسی والے کبھی ہاے مختفی کو روی نہین قرار دیتے - کہنے لگے ہمین فارسی والون سے کیا غرض - میر انیس اور مرزا دبیر ہمارے زمانہ کے بڑے شاعر ہین یہ لوگ تو ہاے مختفی اور الف کو ایک چیز سمجھتے ہین اور بے تکلف دریا کے ساتھ چشمہ باندھا کرتے ہین اور صحرا کا قافیہ سبزہ کر دیا کرتے ہین اور کچھ برا بھی نہین معلوم ہوتا - مین نے کہا اگر چشمہ کا قافیہ جمع یا کون و مکان کا قافیہ ارض و سما کر دیجیے تو برا تو جب بھی نہ معلوم ہوگا - کہنے لگے تو پھر سونا اور نمونہ بھی غلط ہے - الف ہو تو سب جگہ الف ہی ہو ہ ہو تو سب جگہ بس ہ ہو - مین نے انھین سمجھایا کہ سب قاعدہ کہین ہ ہونا ہی نہ چاہیے - خصوصاً ترکیب فارسی مین ہو تو نہایت مہمل پن معلوم ہوتا ہے اور جناب مفتی صاحب قبلہ کا مقصود یہی ہے کہ فقط اردو کیواسطے اجازت ہے کہ سونا اور نمونہ قافیہ کرلین ورنہ فارسی مین ایسا نہین ہو سکتا جیسا کہ بادشاہ نے ارشاد فرمایا -

وله

کیا شرف ذات کا گر فیض کا جوہر نہوا — آب گوہر سے لب خشک کبھی تر نہوا

جامۂ سلطنت و فقر برابر نہ ہوا — مخمل آئینہ نمد پوش سکندر نہوا

بحر ہستی مین ہے دن رات روان کشتی عمر — خواب سنگین کبھی اسکے لیے لنگر نہوا

بخیہ در کار نہین چشم مروت کے لیے — آشنا بازکی وحشت سے کبوتر نہوا

بیشتر حال جہان ہم نے پریشان دیکھا — گھر ہوا در نہوا زور ہوا زر نہوا

دیکھیے کب نظر آتے ہین قامت یار — وقت فردائے قیامت کا مقرر نہوا

طالب بوسہ ابرو کو دیا اسنے جواب — کیا کہون ہاتھ مین اسدم مرے خنجر نہوا

سادہ رویون سے نہین چشم وفا دنیا مین — آئینہ رگ سنگ سے مکدر نہوا

آب گوہر والا مطلع انصاف یہ ہے کہ خوب کہا ہے لیکن اڈیسن کی راے کے موافق یہ صنعت بھی قابل ترک ہے - اس سبب سے کہ محض فارسی مین یہ ایک لفظ دو معنون مین مشترک پایا جاتا ہے کہ آب چمک کو بھی کہتے ہین اور پانی کو بھی کہتے ہین - اشتراک معنی کے سبب سے یہ صنعت پیدا ہو گئی ہے - اسکی خوبی محض دھوکا ہی دھوکا ہے - اصل مین کچھ بھی نہین - اس آب مین نمائش سراب ہے - اڈیسن کی اس نکتہ سنجی کے آگے صائب کا بھی یہ مشہور شعر

دست طمع چو پیش کسان کردہ دراز — پل بستہ کہ بگذری از آب روے خویش

خاک مین مل گیا یہان بھی لفظ آب کے مشترک ہونے سے یہ حیرت انگیز صنعت پیدا ہوئی ہے - مگر اسکی کیا وجہ کہ ہم اڈیسن کا تتبع کرین اور شکسپیر کی تقلید نہ کرین وہ تو انکی زبان کا فردوسی ہے اور اس صنعت کا دلدادہ ہے اور اڈیسن کا مرتبہ شعر مین اس سے بہت ہی پست ہے - اسکی فلسفیانہ نثرین البتہ مقبول ہین -

آئینہ نمد پوش کو درویش صاف باطن خیال کرنا اور سکندر پر اسکا تفوق ثابت کرنا نہایت بلند مضمون ہے کہ تعریف نہین ہو سکتی - خواب سنگین یعنی غفلت کا بے سود ہونا بھی اچھی طرح نظم کیا - کبوتر کی آنکھ سے مروت کے معنی نکالنا کیا اچھی تخییل ہے - ایسی تخییلین پیدا ہو سکین تو زبان اردو مین جان پڑ جاے - حال جہان کی پریشانی کس تفصیل سے دوسرے مصرع مین بیان کی ہے یہ صنعت معنوی اور بندش کی برجستگی داد خوش بیانی کی طالب و سزاوار ہے - فرداے قیامت والا شعر بھی مشاقانہ ہے لیکن قامت کے ساتھ قیامت کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ اب سننے کو جی نہین چاہتا بوسہ ابرو مین نہایت تصنع کو دخل دیا ہے - بوسہ لینے کے مقامات جو ہین انمین ابرو نہین داخل شمشیر و خنجر کے ساتھ دم کا لفظ مبتذل ہو چکا ہے اس سبب سے برا معلوم ہوتا ہے - سادہ رویون کا ذکر ایک

ثقہ شاعر کے قلم سے نکلنا اور اُنکی بیوفائی کا گلہ کرنا البتہ گرفت کے قابل ہے لیکن لکھنؤ میں زیادہ تر اور دہلی میں بھی مہذب شاعرون کا رنگ سخن صاف دلالت کرتا ہے کہ قصد شاعر کا کیا ہے۔ بقول غالب ایک سخن گسترانہ بات ہے۔ یہ غزل ان مرحوم کو کئی مرتبہ پڑھتے ہوئے مین نے سُنا ہے ہمیشہ مشاعرہ مین رنگ دیتی تھی۔

ولہ

قلم نہ شعلۂ مہر کا ہو دست مانی مین ۔۔۔ بھرے تصویر جانان مین سپیدہ روزِ روشن کا
یہ طاقت جوشِ وحشت سے دکھائی ناتوانی پر ۔۔۔ گریبان سے مرے کرتا ہے باتین چاک دامن کا
طریق عشق مین ہرگز نہین چلتی ہے طراری ۔۔۔ یہ وہ منزل ہے لُٹ جائے جہان اسباب رہزن کا
دل بیدرحم سے اعجاز ہو تو دم بھی عاجز ہو ۔۔۔ بہت مشکل ہے کرنا موم ایسے سخت آہن کا
برنگ بوئے گل پہونچے یکایک وہی سے اُس بام ۔۔۔ دکھائے برچھیان سبزہ جہان دیوار گلشن کا
ہمیشہ رنج مین رکھتی ہے اپنی جنت عالی ۔۔۔ ہمین ہے دوست کا احسان گویا ظلم دشمن کا
فرومایہ کو بہر گز فیض صحبت ۔ عمدہ ۔۔۔ عفونت جشیر لاتا ہے پانی چاہ گلشن کا
نہین چھپتا ترا چوری سے جانا غیر کے گھر مین ۔۔۔ بڑھایا جب قدم دروازہ سے ماتھا ٹھنکا
بسر کرتا ہے تنگی سے کوئی، کوئی فراغت سے ۔۔۔ ہوا ہے ساتھ یاران جہان مین چولی دامن کا
مسی آلودہ لب سے اُس پری کے شرم پڑائی ۔۔۔ ہوا تحت سلیمان کیطرح ہر تختہ سوسن کا

خط شعاعی کا قلم روز روشن کا سپیدہ اُسکی تصویر کے لئے چاہئے۔ صد ہا رنگ سے یہ مضمون کہا جا چکا ہے اسکے مبتذل ہونے مین شک نہین۔ چاک دامن کا گریبان سے باتین کرنا ایک بات ہے مگر مصرع بالکل پیش پا افتادہ اُٹھا کر چپکا دیا ہے۔ رہزن والا شعر بے عیب ہے۔ بے رحم کی مذمت لطف سے کی ہے۔ سبزہ کا برچھیان دکھانا اچھی تخئیل ہے خصوصاً وہ سبزہ جو دیوار پہ اُگا ہو۔ دیوار و در پر حفاظت کے لئے سنانون کی شکل کی آہنین سلاخین لگا دیا کرتے ہین مطلب یہ ہے کہ سبک روحی حاصل ہو تو گلشن عرفان تک رسائی ممکن ہے۔ مجھے یہ شعر پسند ہے خصوصاً اسکی تشبیہ۔ دشمن کا قافیہ بھی خوب کہا۔ اخلاقی مضمون ہے۔ چاہ گلشن کا بیشتر متعفن ہو جانا مسلم امر ہے۔ ایسا معشوق جو غیر کے گھر چوری سے جائے قابل لغزت ہے۔ اس قسم کے مضامین کچھ بازاری لوگون کو اچھے معلوم ہوتے ہونگے مگر اس شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو محض یہ محاورہ صرف کرنا تھا کہ ماتھا ٹھنکا اور اُسکا محل استعمال دکھانا تھا ورنہ لکھنؤ کے شعراء رشک کے مضامین جسمین معشوق کا شاہد بازاری ہونا نکلے بہت کم کہتے ہین۔ مرزا داغ نے قیامت کی کہتے ہین۔ ؎

تم کو ہے وصل غیر کا انکار ۔۔۔ اور اگر ہم نے آ کے دیکھ لیا

آتش نے بھی ایک جگہ رشک کا مضمون غضب کا کہا ہے مگر اسکے برعکس ہے۔ ؎

مرتے مین رشک کے مارے پس دیوار رقیب ۔۔۔ شور کرتا ہے جو پازیب کا وہ شب وصل

چولی کی تنگی اور دامن کی فراخی اچھی تخئیل ہے۔ چولی دامن کا ساتھ محاورہ کو اگر کا خوب کہا۔ کئی شعر اس غزل مین شالی مین اور اخلاقی ہین۔ آخری شعر مین مطلب مبہم رہ گیا اور اغلاق بھی ہے۔ شرم سے رنگ اُڑنا کہنا چاہئے تھا اور یہ کا لفظ اسقدر کے محل پر عجز طبیعہ پر دلالت کرتا ہے۔ جہان سامعین کو یہ معلوم ہوا کہ فلان لفظ مین شاعر عاجز ہو گیا پھر شعر و شاعر دونون نظر سے گر جاتے ہین اور اُس شعر کے ساتھ اچھے شعرون کا بھی خون ہو جاتا ہے۔

ولہ

عاشق کے دل کو دام ہوس مین پھنسا دیا ۔۔۔ کیا باغ سبز سبزۂ خط نے دکھا دیا
آئی قریب گوشۂ ابرو جو زلف یار ۔۔۔ آخری ہوئی کمان پہ چلّہ چڑھا دیا
سیماب وار پاک مین آلودگی سے ہم ۔۔۔ گردون نے گرچہ خاک مین ہمکو ملا دیا
جام تہی مین صورت دست سوال تھی ۔۔۔ گردن کو اپنی شیشے نے جھکا دیا
پیدا ہے ہیرے نالۂ جان سوز سے صدا ۔۔۔ بس اے تپ فراق کہ تو نے جلا دیا

سرمہ بہر عیسے ہوتا خاک راہ یار / آنکھوں سے میں نے نقش قدم کو مٹا دیا
ہم اُس سے نقد بوسہ کے اُمیدوار تھے / قیمت مین دل کی یار نے خنجر لگا دیا
مرنا بھی اہل ہوش کا ہے غافلون کو پند / ہم سو رہے تو یارون کو اپنے جگا دیا
غالب ہوئی جو نکہت گل پر شمیم زلف / غنچون نے چٹکیون مین صبا کو اُڑا دیا
ہنگام صبح حشر مین شاید کرے اجل / تیرا چراغ عمر جو تونے بجھا دیا

کس طرح سوز دل کا درخشان گلہ کرون
جب آہ سرد نے بھی کلیجہ پکا دیا

اس غزل کے سب قافیون مین روی الف تعدیہ ہے اہل فن کے نظر مین ساری غزل ایک ہی قافیہ مین ہے مگر دکھا دیا اور جگا دیا مین الف جزو غیر منفک ہو گیا ہے۔ اس سبب سے ان دونون قافیون مین سے ایک کا مطلع مین آجانا تکرار قافیہ کے عیب کو چھپا دیتا ہے۔ سبزہ و سبزہ مین تجنیس مبتذل ہے اور جو صنعت مبتذل ہو گئی ہو اُس سے احتراز چاہیے۔ اس سے کلام مین امتیاز پیدا ہوتا ہے مشکل یہ ہوتی ہے کہ لوگ یہ دیکھتے رہتے ہین کہ کوئی لفظ مناسب اس سے چھوٹ تو نہین گیا۔ جہان دیکھا کہ لفظ بدلنے سے تجنیس یا مراعات یا ایہام تناسب پیدا ہوتا ہے فوراً اعتراض کرنے کو موجود ہو گئے۔ صنعت کو کیا چھوڑا گویا بڑی غلطی کی مین نے ایک جگہ "بسان نکہت گل" باندھا تھا۔ ایک صاحب نے مجھے کہا بیان برنگ نکہت گل کہنا بہتر تھا۔ مین نے یہ جواب دیا کہ مین نے عمداً ترک کیا ہے۔ جس بات کو ہزار دفعہ لوگ کہہ چکے اُسکے باندھنے مین اب لطف کیا رہا۔ بلکہ سراسر بے لطفی و ابتذال ہے۔ تجنیس بھی انھین صنعتون مین ہے جنکو یورپ کے شعرا نے ترک کر دیا ہے۔ نواب عماد الملک بہادر ایک دفعہ فرماتے تھے کہ مجھے بھی یہ صنعت بہت مکروہ معلوم ہوتی ہے۔ مین نے یہ مصرع پڑھا ع نقش ہم بشکست سجدہ گہ سنگین۔ اسکو انھون نے بہت پسند کیا۔ اصل بات یہی ہے کہ مبتذل ہونا صنعت کو خراب کر دیتا ہے۔ اُتری ہوئی کمان کی تشبیہ اور زلف کے ابرو پر آجانے سے کمان پر چلّہ چڑھ جانا یعنی تیر افگنی کا سامان ہو جانا سزاوار ستائش ہے۔ سیماب کا خاک مین مل کر بھی آلودگی سے پاک رہنا مضمون نفیس ہے۔ جام کا ہاتھ پھیلانا اور شیشہ کا گردن جھکانا بھی بہت اچھی تخییل ہے۔ آگ مین صدا پیدا ہونا شدت اشتعال کی علامت ہے اور بہت اچھی بات ہے۔ نقش قدم والا شعر بھی خوب کہا۔ قیمت لگانے اور خنجر لگانے مین اشتراک فعل سے صنعت پیدا ہوئی ہے۔ دہلی و لکھنؤ کے شاعر اس صنعت پر مٹے ہوئے ہین۔ یہ بات ضرور ہے کہ سامعین سُنکر پھڑک جاتے ہین۔ پند والا شعر بھی بُرا نہین ہے۔ صبا جو نکہت گل لئے ہوئے تھی شمیم زلف کے سامنے غنچون نے اُسے چٹکیون مین اُڑا دیا یہ شعر محض یہ تخییل ظاہر کرنے کے لئے کہا گیا ہے کہ غنچہ کا چٹکنا چٹکی بجانا ہے اور بہت اچھی تخییل ہے۔ جس وقت اپنا چراغ عمر بجھ جائے بس اسی کو صبح حشر سمجھنا چاہیے لطف سے خالی نہین۔ ٹھنڈی سانسین بھی کلیجہ پکا دینے کے لئے سوز دل سے کم نہین ہین سچا مضمون ہے اور مضمون کا سچا ہونا بڑی خوبی ہے۔

وله

زر بے اندازہ حق ملایا خاک مین اُسنے / مگر شداد کے ہاتھ آگیا تھا مال قارون کا
نہین رہتے ہین دانشمند رہ جاتا ہے افسانہ / خم گردون ہے جبتک نام باقی ہے فلاطون کا
خلل جرأت کا ہے آرائش تعمیر نو منعم / کہ ہر خشت کہن ہے آئینہ قصر فریدون کا
کہا یہ ساربان سے نجد کے وادی مین لیلی نے / کہ پہچانا نہین جاتا ہے اب کیا حال مجنون کا
نگاہ ناز سے مارے جلائے جنبش لب سے / جواب آسان ہے اسکو مسیحائی و افسون کا
نہ ہوگی فکر معنی آشنا محتاج غواصی / گہر افشان ہے خود دامن ہر دریائے مضمون کا
مرے سارق کا مین کبھی شکوہ نہین کرتا / مرے مضمون کا سرقہ ہے تصدق طبع موزون کا

قارون والے شعر مین ایک مضمون یہ نکلتا ہے کہ بخیل کی جمع کی ہوئی دولت بہت بُری طرح لٹا دیجاتی ہے۔ غلامون و فریدون کے قافیے بھی مشاقانہ کہے ہین۔ لیکن خشت کہن اور آئینہ یہ دونون قصر فریدون کی طرف مضاف ہین اور حرف اضافت مین تنازعہ واقع ہوا ہے۔ شاعر نے آئینہ کو قرب کے سبب سے عمل دیا۔ مجھے متنبی کا ایک شعر یاد آیا۔ ؎

طلبتهم على الامواه حتى | تخوّف ان تفتشه السحاب

اسنے اپنی زبان مین پہلے عامل کو عمل دیا ہے اگرچہ وہ بعید ہے۔ غرض تنازع کا واقع ہونا بھی شعر مین گنجلک پیدا کرتا ہے۔ مجنون والا شعر بہت سیدھا سادہ ہے۔ ایسے شعر کے لئے ضرور ہے کہ بندش برجستہ ہو نہین تو کہنے سے کیا فائدہ۔ نگاہ سے مارنا اور لب سے جلانا مضمون مبتذل اور پامال ہے مگر دوسرے مصرع نے کچھ بنالیا۔ شعر سے تبادر معنی کی یہ تشبیہ کہ "گہر افشان ہے خود دامن مرے دریا سے مضمون کا" نہایت پُرلطف ہے۔ مضمون کا سرقہ طبع موزون کا صدقہ ہے۔ شوخی سے خالی نہین۔

ولہ

پیرہن سے ہے تن عریان میرا | زخم گردن ہے گریبان میرا
ظلم کرتا ہے کتابی چہرہ | خط کوفی مین ہے قرآن میرا
خود پرستی ہے پرستش بُت کی | کم نہین کفر سے ایمان میرا
کیون نہین برق کرم آتی ہے | وقت غارت ہے گلستان میرا
کیون ہون انگشت نما اے وحشت | کیا یہ تو نے گریبان میرا
دے کے دل مجھے نہ چین نہین | فائدہ تیرا ہے نقصان میرا

زخم گردن کی وجہ ظاہر نہ ہوئی شعر سست ہو گیا۔ اسکو یون سمجھنا چاہئے کہ گریبان سے مجھے ایسی نفرت ہے کہ زخم گردن سے تصور کرتا ہون۔ کوفی کے لفظ سے معنی ظلم کا تبادر ہوتا ہے جیسے اصطلاح مین لزوم ذہنی کہتے ہین۔ اپنے اوپر خود پرستی کا الزام رکھکر دوسرون کو نصیحت کرنا مقصود ہے۔ برق والا شعر نہایت پُر درد ہے۔ وحشت کو مخاطب بناکر انگشت نما ہونے کی وجہ ظاہر کر دی اسطرح سے مطلب کو ادا کر دینا شاعر ہی کو آتا ہے۔ چین نہین ہونے سے یہ مطلب نکالا ہے کہ وہ دل کو عوض نا روا سمجھا نا پسند کیا۔

ولہ

حال کم فرصتی عمر گریزان جانا | عیسیٰ و خضر کو دو روز کا مہمان جانا
آدمیت کو نہ جو جوہر انسان جانا | جسمین اخلاق نہ پائے اسے حیوان جانا
نہ فراغت کی خوشی ہے نہ مصیبت کا قلق | راحت و رنج کو جب دست و گریبان جانا
ہمکو فیض ہوا عشق رخ و گیسو سے | گبر نے گبر، مسلمان نے مسلمان جانا
ترے نفرت ہے ہمین غیر سے رغبت ہے مدام | کفر سمجھا ہے جسے ہمنے اسے ایمان جانا
حُسن معنی سے جو واقف نہوا صورت دوست | پڑھ کے قرآن کو نہ کچھ ترجمہ قرآن جانا
خشک ٹکڑون پہ گرسنہ نگر جو اہل زبان | ہمنے یہ مطلب آواز لب نان جانا
جب تلک ضعف نہ تھا یاد بیابانی کی | اب تو دشوار ہے تا کوچہ جانان جانا

دونون مطلع اس غزل کے خوب کہے ہین۔ کم فرصتی کے لفظ مین یاے مصدری دیکھکر مجھے خیال آیا کہ اسی قیاس پر لوگ فطرتی اور قدرتی بھی لکھنے لگے ہین۔ اسمین مصدری ت موجود ہے پھر مصدری ی کیونکر آسکتی ہے۔ لامحالہ اس ی کو یاے نسبت کہے گا اور یاے نسبت جب لگاتے ہین تو ت کو گرا دیتے ہین۔ پس فطرتی کہنا یقینا غلط ہے۔ صحیح لفظ فطری ہے۔ ہان بلند ہمتی و پست فطرتی کہنے مین قباحت نہین ہے کہ اب ہمت اور فطرت ترکیب فارسی کا جز ہو گئی ہے۔ اسمین فارسی کی یاے مصدری لگا سکتے ہین اور خود اہل فارس اسطرح استعمال کیا کرتے ہین۔ لیکن فطرتی و قدرتی وہ بھی نہین کہتے۔ غرض کہ یہ لفظ نہ عربی مین صحیح ہین نہ فارسی مین۔ یہان مجھے خود خلجان ہوتا ہے کہ اُردو زبان کیا اسقدر مشکل

ہے کہ جب تک عربی و فارسی کے قواعد پر عبور نہ ہو کوئی شخص صحیح عبارت لکھ نہیں سکتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ اکثر عربی خوان و فارسی دان بھی ناواقفوں کیطرح غلط الفاظ گڑھ لیا کرتے ہیں۔ مثلاً وقعت کا لفظ عربی ہے۔ جنگ و جدال و فتنہ و فساد کے معنی پر آتا ہے اُردو زبان کے مضمون نگار اور اہل قلم اس لفظ کو توقیر و اعتبار کے معنی پر لکھنے لگے۔ ایک کے قلم سے نکلا اور دوسرے نے فوراً اُڑا لیا۔ اُس پر طرہ یہ کہ اسم صفت بھی اُس سے بنا لیا یعنی وقیع بھی ایک مہمل لفظ اب اُردو میں داخل ہوا چاہتا ہے۔ اندازاً اور نمونۃً خوب جانتے ہیں کہ دونوں لفظ فارسی ہیں انھیں عربی کی تنوین لگا کر اندازاً کہا اور انھیں تنوین کے ساتھ تائے مصدری بھی لے آئے نمونتۃً کہنے لگے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ اسطرح کے خرف الفاظ پہلے وہی لوگ بناتے ہیں جنھیں کچھ شدبد عربی فارسی آتی ہے اور مقصود انکا یہ ہوتا ہے کہ تحریر میں اظہار علم کریں اور الفاظ کے تراشنے پر اپنی قدرت دکھائیں۔ اگر یہ کہئے کہ یہ الفاظ بوضع ثانوی اُردو ہو گئے ہیں تو اُردو ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ عام و خاص کی زبان پر چڑھ گئے ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے اور اس سے اُردو کی زبان پوچ ہوتی جاتی ہے۔ جو عربی فارسی نہ جانے اُسے اظہار علم کرنا کیا ضرور ہے۔ اُردو کے زبان زد الفاظ محاورہ کے بچے ہوئے کلمات استعمال کئے جائیں تو اُردو لکھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس سے تحریر میں زبان کا لطف بھی آئیگا۔ اسیطرح ترکیب الفاظ میں بھی احتیاط چاہئے۔ اُردو میں جسطرح سب بولتے ہوں اسیطرح قلم سے بھی ادا کریں تو کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ آفت تو یہ ہے کہ مثلاً خطوں کا صندوق کہنا اور لکھنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بس ذرا سی فارسی دانی قیامت ہو گئی۔ صندوق خطوط اندازی ایک مہمل ترکیب بنائی اور اُسے جزو زبان بنا دیا۔ اسیطرح تخت نشینی کیلئے تاج پوشی کا لفظ حال میں وضع کیا گیا ہے۔ دیکھئے تعلیم کا ہونا تعلیم ناقص اور بقول ابوالفضل علمک ناقص سے ہزار درجے بہتر ہے۔ انگریزی کے الفاظ مانوس اگر اُردو میں شریک کرلئے جائیں تو کہیں بہتر ہے اس سے کہ ایسے فارسی و عربی کے الفاظ بڑھائے جائیں۔ کم فرصتی و بے عزتی و خوش قسمتی وغیرہ صحیح ترکیبیں ہیں۔ زیادتی کا لفظ غلط العام کے درجہ میں ہے اور اُسی کے مقابلہ میں کمتی بھی صحیح و فصیح اُردو کے الفاظ ہیں۔ فوراً دفعۃً شکایۃً، عایۃً وغیرہ صحیح الفاظ ہیں۔ اندازاً نمونۃً غلط و تمسخر آمیز۔ جیسے نعمت خان عالی نے دل لگی کی ہے۔ ع

شد الحمد کہ ما مجیدیم   مرشد ختم رسل طوخیدیم

اُردو کی شاعری فارسی سے ماخوذ ہے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں اسیوجہ سے اُردو کے اشعار میں مزہ دیتی ہیں۔ مگر صحیح ترکیب پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ فارسی جاننے کی ضرورت ہے۔ اگر اچھی طرح فارسی نہ آتی ہو تو فارسی ترکیبیں تراشنے سے کنارہ کرنا چاہئے۔ سیدھی سادی اُردو لکھنے میں کبھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غلطی تو اس سبب سے ہوتی ہے کہ اُردو لکھنے میں عربی یا فارسی بولنے کا قصد کیا جاتا ہے۔

اس غزل میں راحت و رنج والا شعر خلاصہ تہذیب اخلاق ہے۔ گبر و مسلمان کا مضمون مبتذل ہے۔ خیر و شر کی خوبی و بدی کس لطف سے بیان کی ہے اور کس طرز سے ادا کی ہے۔ کہ وجد کرنے کے قابل ہے۔ صورت دوست کی ترکیب صحیح ہے مگر اوس نہیں صورت پرست اس سے بہتر ہے لیکن وزن مساعد نہ تھا۔ سوکھے ٹکڑوں کے توڑنے میں جو آواز پیدا ہوتی ہے کیا اچھا مطلب اُس سے نکالا ہے۔ اس صنعت کو حسن توجیہ کہتے ہیں۔ یہ بھی تخئیل کی ایک صورت ہے۔ لکھنؤ میں چند لوگوں نے اتفاق

کہ کے فلک کے لفظ کو غیر فصیح قرار دیا ہے۔ درخشان مرحوم اس سے ناواقف رہے ورنہ ضرور اتباع کرتے لیکن اس قسم کے متروکات کو کوئی غلط نہیں کہ سکتا۔ بڑی چیز تو کلام کو غلطی سے پاک کرنا ہے۔ یوسف حسین کوئی شخص شیخ علی حزین کی ملاقات کو گئے شیخ اُسوقت پاؤن پھیلائے ہوئے بے تکلف بیٹھا ہوا تھا۔ انکو دیکھکر پاؤن سمیٹ لے سیدھا ہو بیٹھا۔ پوچھا کہ اسم شریف۔ اُنھون نے کہا یوسف حسین۔ یہ سُنکر نازک دماغی سے اُسنے مُنہ پھیر لیا اور پھر پاؤن پھیلا دیے۔ اسکے قریب قریب ایک نقل جمی بیان کرتا ہے کہ زمانۂ حج مین ایک شخص کو زرق علماء مین مین نے دیکھا کہ لوگ اسے گھیرے ہوئے ہین۔ مین سمجھا کہ کسی ملک کا عالم متبحر ہے۔ ملاقات کا مشتاق ہو کر اُسکے خیمہ مین گیا پہلے مین نے نام دریافت کیا تو اُسنے کہا ابوعبدالرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین۔ اس جواب سے علم و تبحر کی ساری حقیقت کھل گئی۔

زبان کا پاک ہونا بڑے امتیاز کی بات ہے۔ لفظ تو لفظ ہے کسی حرف کا مخرج اگر صحیح نہ ادا ہو تو زبان کا بڑا سقم سمجھا جاتا ہے شریف و رذیل فقرے مین پہچان لیا جاتا ہے۔ آب حیات مین آزاد اس نکتہ کو سمجھکر بہت تہذیب سے لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرتے ہین۔ پہلے ناسخ کے کچھ اشعار نقل کرتے ہین۔ ؎

شہسواری کا جو اُس چاند کے تُو شیدا ہوگا ۔۔۔ چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا
نام سُنتا ہون جو مین گور کی اندھیاری کا ۔۔۔ دل دہڑکتا ہے مجھے شب تار نہ ہو
آتش۔ مد نظر اسکو ترے گالون پہ تل رہتا ہے ۔۔۔ چاندنی آئین بجلیک ہو گئین اندھیاریان

پھر لکھتے ہین کس کا مُنہ ہے کہ لکھنؤ کی زبان پر حرف رکھ سکے۔ دلی کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ اندھیاری گھوڑے کی ہوتی ہے اور رات اندھیری کہی جاتی ہے۔ مطلب اسکا یہ ہے کہ لکھنؤ کے اساتذہ بھی لفظ کے محل استعمال سے ناواقف ہین۔ مگر تعجب ہے کہ ایک تذکرہ نگار زبان اُردو کی تاریخ کا مصنف اس بات سے ناواقف رہا کہ یہ خاص دلی کا محاورہ ہے جو ناسخ و آتش کے قلم سے نکلا ہے۔ سودا۔ ؎

ہو گئی کب تک بچا خبرداری ۔۔۔ پڑ رہا تیرے رہے کہ اندھیاری

درخشان کے کلام کے جو لوگ مشتاق ہین اُنھین میرا دوسرے وادی مین نکل جانا اور اسقدر سامعہ خراشی کرنا ضرور شاق ہوا ہوگا مگر مین دیکھتا ہون کہ کچھ اُردو کے دن بھلے آئے ہین۔ ساری قوم اُسکی طرف دفعۃً متوجہ ہو گئی ہے جب گوش شنوا ہو تو کیونکر دردِ دل نہ کہون۔

ولہ

کیا کہون کیا طعن پر کیا طعن کیا ترے غافل ۔۔۔ ہیہ وہم مین حال نظر آیا ترازو کا
دل ناداں کی جگہ مرثیہ خوانی اپنے آئی ۔۔۔ جوانی کا نہ یہ محتاج جتانے دریا نہ کا

دونون شعر شاقانہ ہین۔ بندش مین ذرا جھول نہین آنے پایا یہ شاعرہ کی غزل ہے۔ مین نے سُنا کہ بادشاہ نے ماتل[ملہ] کے مطلع کو بہت پسند کیا کئی دفعہ پڑھوایا وہ مطلع یہ ہے۔ ؎

لعقور تھا جو دستے مین کلوے یار سدا کا ۔۔۔ حرامی دار موتی بن گیا ہر قطرہ آنسو کا

ولہ

کل وہ جو مجھکو دیکھکے بیگانہ بن گیا ۔۔۔ مین بھی تو ہوشیار ہوا دیوانہ بن گیا
شکست پہ اپنی کیون نہ ہو ممنون خون دل مدام ۔۔۔ جام شراب عمر کا پیمانہ بن گیا
دیکھی درخشان بستہ مری شکل انقلاب ۔۔۔ گرآشنا تھا بگڑ کے بیگانہ بن گیا
رونق ذرا ہوا جو درخشان وہ بُت کبھی
آئینہ خانہ رشک صنم خانہ بن گیا

اس عاشقانہ مطلع مین بیان کا طرز دیکھنے کے قابل ہے یہ باتین وہ ہین جنسے شعر مین جان پڑ جاتی ہے۔ اسکے آگے صنائع و بدائع کی کچھ حقیقت نہین جو لوگ عاشقانہ اشعار سُنکر ذوق شوق سے

ملہ مولوی صادق علیخان ماتل مرحوم جو بادشاہ کی حیات تک کلکتہ مین رہے اور انکی وفات پر لکھنؤ مین آکر داد سخن گستری دیتے رہے۔

بقیہ

کام لیتے ہین اس شعر کی اداانکو پہچاننے ممکن نہین۔ شعر کی ماہیت کو نظر دقیق سے دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ عشقبازی بت پرستی بادہ خواری کے مضامین ہون یا معارف و مکارم کا بیان ہو یا عبرت وحسرت کا مضمون ہو جب تک کہ شاعر کے طرز بیان نے اسمین جان نہ ڈالدی ہو وہ کلام موزون ہے۔ شعر نہین ہے اور جہان شعر مین اسطرح کا سحر پیدا ہوا پھر معانی اسکے کیسے ہی رکیک وسقیم ہون وہ شعر عزیز و دلنشین ہوتا ہے۔ فن شعر و فن خطابت مین یہی بڑا فرق ہے کہ شاعر کے بیان مین شوخی اور خطیب کے بیان مین سستی ہوتی ہے۔ شاعر کو معانی سے چندان غرض نہین وہ طرز بیان کے کوچون مین دوڑتا پھرتا ہے اور اسی دُھن مین اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُسکا کلام بے معنی ہوجاتا ہے۔ خطیب کا موضوع بحث فقط معانی ہوتے ہین اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اُسکے بیان مین طرز دلکش نہین پیدا ہوتا۔ شاعر اس بات کی مشق کرتا ہے کہ تادیہ معانی بطرق متعددہ ہونا چاہیے اسکی تشریح کتب بلاغت مین موجود ہے پھر اُسکے ضمن مین پند وحکمت آجائے تو آجائے اور خطیب کا مقصود اصلی یہی ہوتا ہے کہ پند وحکمت کا افادہ و استفادہ ہو۔ بیان مین لذت ہو یا نہو جیسے کوئی شخص فن موسیقی کا ماہر ہو وہ ایک ہی مصرع کو بار بار نئی نئی ترکیبون سے پڑھ رہا ہے اور اپنا کمال دکھا رہا ہے۔ اہل مجلس مین جنکو ذوق نہین وہ یہ اعتراض کرتے ہین کہ مرثیہ کا لطف جاتا ہے۔ رقت سلب ہوئی جاتی ہے۔ بول سجھائی نہین دیتے۔ انکی خاطر سے چند بند سیدھے سُرون مین وہ پڑھ دیتا ہے اور لوگ خوش ہوجاتے ہین۔ اسوقت اُردو کی مجلس ادب مین ایسے ہی لوگون کا مجمع نظر آرہا ہے۔ جو چاہتے ہین کہ شعر کو خطابت اور شاعر کو خطیب بنا دین۔ شاعر کی ترانہ سنجی اُنکے کانون کو ناگوار ہوتی ہے۔ اپنے مطلب سے کام ہے۔ اب ضرور ہے کہ اُردو کی شاعری کا رنگ بدل جائے۔ سامعین شاعر کو اپنے رنگ پر کھینچ لیتے ہین مگر پھر شعر بھی حیرت انگیز وطرب خیز نہین رہتا۔ کہتا کیا تھا اور کہنے لگا کیا۔

حافظ

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

مصحفی

تھمے تھمے تھمین گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہین ہے

طرز بیان ہی مین جدت مقصود ہوتی ہے کہ شاعر تصنع سے کام لیتا ہے۔ اس مضمون کو کہ ممدوح کی درگاہ کو وہ شرف حاصل ہے کہ جب کوئی قسم کھاتا ہے اسی کے در کی قسم کھاتا ہے۔ عرفی اسطرح ادا کرتا ہے۔ ع

چرخ از شرف خاک درش ساخت طلسمے کز درگہش آن سو نبود راہ قسم را

طرز بیان مین شکوہ پیدا کرنے کے لیے شاعر تشبیہ وغیرہ سے کام لیتا ہے۔ یہ مضمون کہ جب فضل خدا ہوتا ہے تو سب کام بن پڑتے ہین۔ حافظ اسطرح ادا کرتا ہے۔ ع

کار وا نیکہ بود بدرقش لطف خداے بتجمل بنشیند بجلالت برود

غرض مختلف کوچے ہین جنمین شاعر اسی چیز کو ڈھونڈھتا ہے۔ مجھے اس دُر مکنون کی جھلک کبھی برجستگی ردیف مین دکھائی دیتی ہے کبھی باب الانشا مین۔ شراب کے ذکر مین مدام کا لفظ ایہام تناسب کے لئے لانا ایسا ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے جیسے زبان کے ساتھ گویا کا لفظ صرف کرنا۔ ایہام تناسب مزے کی چیز ہے لیکن جب تازگی پائی جائے جہان اسقدر رکنگی وابتذال پیدا ہوگیا ہو وہان احتراز واجب ہے۔ مگر مضمون بہت اچھا ہے جب حاصل عمر غفلت و بے خبری ہو تو پیمانۂ عمر و جام شراب مین فرق کیا رہا۔ شکایت بخت کی بندش مین شان مشق پیدا ہے۔ مقطع بھی خوب کہا ہے۔

یہ زمین بھی بادشاہ کی نکالی ہوئی ہے اُنکی عادت تھی جہان دیکھا کر شعراے سبعہ سیارہ مین سے کچھ لوگ سلام کو حاضر ہوئے ہین باتون باتون مین کوئی مصرع نظم کر دیا۔ یہ لوگ اکثر کوئی قطعہ یا رباعی جسمین اعادۂ سلطنت کی دعا ہوتی تھی پڑھ دیا کرتے تھے جس سے اُنکا زخم کہن تازہ ہو جاتا تھا اور اپنا درد دل کسی مصرع مین ظاہر کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ مصرع زبان سے نکلا ع

رہیگا تم آخر تا کجا اے چرخ گردش مین

بادشاہ ابھی ہوادار سے اُتر کر سلطان خانہ مین داخل ہوئے تھے کہ مہتاب الدولہ نے یہ مصرعے پڑھے۔ ے

دیے ہے سیلی سنگ آسیا سے چرخ گردش مین | دیے ہے یون ساغر بادہ سدا اے چرخ گردش مین
ندیان تسبیح دست پارسا اے چرخ گردش مین | رہیگا تم آخر تا کجا اے چرخ گردش مین

ان مصرعون کو بہت پسند کیا فرمایا کہ قافیے بدل بدلکر اور مصرعے لگاؤ اور میرے مصرع کو مصرع ترجیع قرار دو۔ پھر جو ملاقات و حضوری حاصل ہوئی تو مہتاب الدولہ نے ایک مخمس پڑھا جسمین بہت سے بند تھے ہر بند مین چوتھا مصرع مخمس کا گرہ کا مصرع تھا صلہ بھی ملا اور مخمس مطبع سلطانی مین چھاپا گیا۔ مین نے بھی دیکھا تھا۔ مطلع کے یہ تین مصرعے مجھے یاد رہ گئے

ایک صحبت مین مین بھی موجود تھا اور تمام شعرا و ندماے شاہی کا مجمع تھا۔ اعادۂ ملک کی دعائین لوگ دے رہے تھے کہ حضرت نے دست دعا بلند کئے اور یہ مصرع پڑھا۔ ع

بارہ تقصیر سے بس گوشمالی ہو چکی

شگفتہ ایک شاعر حامد علی مرزا کوکب ولی عہد بہادر کے مصاحبون مین تھے اُنھون نے عرض کیا کہ خانہ زاد نے مصرع لگایا ہے حکم ہو تو پڑھون۔ ے

شان قدرتی اتنک دکھلا دیکھی شان تحمل | بارہ تقصیر سے بس گوشمالی ہو چکی

اس صحبت مین بادشاہ نے کچھ اپنا کلام بھی سُنایا تھا۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔ ایک مطلع

ایک حسرت حور پر بھی ہر مرے سینہ رہ گئی | دیکھا پھر دیکھا کہ آنکھون کو تمنا رہ گئی

اور ایک غزل کا یہ شعر

جوانی مین یہ مو تھے سفیدی ہے یہ دندان کی | ضعیفی ہنس رہی ہے مجھے کیون اندوگین ہونا

یہ شعر پڑھکر مہتاب الدولہ سے مخاطب ہوئے کہ معنی بیان کرو اُنھون نے عرض کیا کہ بالون کی سفیدی نہین ہے بلکہ ضعیفی کا خندہ دندان نما ہے۔ فرمایا وہ تو خندہ دندان نما کر رہی ہے مگر پوچھ رہا ہون کہ مجھے ہنس رہی ہے۔ اب اندوگین ہونے کی کوئی وجہ نہین۔ اس نکتہ کے ارشاد فرمانے پر مہتاب الدولہ فوراً اُٹھے اور آداب بجالائے گویا حضرت نے اُنکی شرح پر اصلاح دی اور اُنھون نے اصلاح کا سلام کیا۔

ولہ

کشتی شبرنگ کی چوٹی ہے گیسو حور کا | پالکی گر در سواری مین ہے عالم نور کا
حلق مین جھکا دیا بیٹھا ہوا مشہور نام | آگیا گل ہاتھ موسیٰ کو چراغ طور کا
دیکھئے گر چشم عبرت سے بڑی تنبیہ ہے | نیند کی شدت جھکا دیتی ہے سر مغرور کا
جب نگاہ دست اُسکی چہرہ پر پڑنے لگی | ہو گیا ثابت بکنا نرگس مخمور کا
خوان نعمت دیکھ کر فاقہ کشون کی یاد کی | کاسہ چینی سے دھیان آیا سر فغفور کا
چارہ سازی عشق کی کرتا ہون گر درمان نہ ہو | مرمت جیشتر رہتا ہے گھر مزدور کا

مطلع مین "چوٹی" کا لفظ چوٹی کا لفظ ہے لیکن گرد جولان کو تحقیق نور کتنا مضمون مبتذل ہے۔ معجزہ ید بیضا حور پر عنایت ہوا ہے اس سبب سے اُسے شمع طور کا گل کہنا لطف سے خالی نہین۔ یہان ہاتھ آجانے کی اصطلاح مین ایہام تناسب ہے اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ تنبیہ کے معنی جگا دینے کے ہین یہان یہ رعایت کوئی کم سکتا ہے کہ لطف نہین دیتی۔ بکنے کے ثبوت مین تازگی نمایان ہے۔

محض اسواسطے غیر پر آنکھ پڑنے کا مضمون ناپسندیدہ گوارا کر لیا ورنہ مقصود بالذات یہ مضمون نہین ہے۔ مزدور و منصور کے دونون شعرون مین اخلاقی مضمون ہے اور شاعرانہ لہجے مین ہے۔ غزل مین اخلاقی مضامین اگر واعظانہ طرز کے ہون تو وہ غزل غزل نہین ہے موعظہ ہے۔

ولہ

مطلب کے آشنا ہین فقط یا تماشنا — معدوم ہین جہان مین وفادار آشنا
کہنے کیواسطے ہین بہت یار آشنا — آنکھون مین یان نکلتے ہین دہچار آشنا
ناحق نہین سمجھتے ہین اغیار آشنا — ہوتے نہین کسی کے طرحدار آشنا
رکھین نہ بعد مرگ سرو کا آشنا — کب ہو سر بریدہ سے دستار آشنا
قاتل سے ہے اشارہ ابروے ماہ نو — دو دن تو ہو نیام سے تلوار آشنا
کب ہے برادران حقیقی کا اعتماد — بے فائدہ بدلتے ہین دستار آشنا
تکیہ نہ اتفاق عناصر پہ آپ کر — کل چار سمت جائینگے یہ چار آشنا
ہے دشمن وصال فلک۔ پھینکدیگا دور — کیا چلّہ کمان سے ہو سوفار آشنا
پوچھون مین لعنت بوسۂ گوش یار سے — کانون سے ہو اگر لب گفتار آشنا

مجھے لفظ فقط اردو مین بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے لیکن محاورہ مین داخل ہے مین خود بھی اکثر ترک نہ کر سکا طرحدار اور صورتدار اور سمجھدار اور تابعدار یہ سب ترکیبین غلط ہین مگر زبان اردو کا جزو ہو گئی ہین پھر بھی اہل قلم ان لفظون کے استعمال سے احتراز کرتے ہین خصوصاً فارسی کی اضافت و عطف کے ساتھ تو ہرگز نہ استعمال کرنا چاہیے۔

دستار والا مطلع مثالی شعر ہے اور خوب کہا ہے۔ تلوار کے قافیہ مین چاند کے دو دن چھپنے کا اشارہ لطف دیتا ہے۔ دستار والا شعر بھی اخلاقی مضمون سے خالی نہین۔ عناصر کے جدا ہونے کی صورت دکھا دی ہے یہ بندش بھی داد طلب ہے۔ سوفار کا قافیہ بھی خوب کہا حاصل زمین ہے۔ شعر آخر مین در گوش سے باتین کرنے کی تمنا کیا اچھی تخییل ہے۔

ولہ

ہے جائے گریہ حال جہان خراب کا — جو چشم مہر و ماہ پہ دامن سحاب کا
تکیہ پہ لطف عارض رنگین کو دیکھنا — گویا روش پہ پھول پڑا ہے گلاب کا
کب تک پیون مین خلوت شب سے لہو کے گھونٹ — چھلکائے شیر صبح قدح آفتاب کا
سجدے میکدہ کو بیک کر چلا ہون رات — گویا چراغ طول ہے ساغر شراب کا
کیا آئینہ مین عارض رنگین کی ہے بہار — پانی مین پھول تیر رہا ہے گلاب کا
ہم جلد بہشت پہنکر چلے گئے — ڈھونڈھا کیا کفن مین فرشتہ عذاب کا
تزئین حسن مین ہے سر دست نقص عیب — انگلی پہ رنگ آتا ہے پہلے خضاب کا
روز سیہ دکھائے نہ لیل و نہار دہر — اک صفحہ تو سفید ہے اس کتاب کا
رخسار آتشین نے ترے شب کو اسے پری — دکھلا دیا چراغ سے اڑنا شراب کا
تجنیس خط ہے لفظ شباب و شتاب مین — کسقدر جلد جائے نہ موسم شباب کا

مجھے اس غزل کا مطلع عبرت انگیز معلوم ہوتا ہے نہایت خوب کہا ہے۔ جو کا لفظ ہونا چاہیے کے محل پر رکھ گئے ہین اسپر بھی مطلع کی خوبی مین فرق نہین آیا۔ دوسرے شعر مین عارض کو گلاب کا پھول کہنا تشبیہ مبتذل ہے مگر شبہ مین یہ قید لگانا کہ جب تکیہ پہ رکھا ہو تخییل تازہ ہے۔ قدح آفتاب سے شیر صبح کا چھلکنا نہایت دلکش تخییل ہے۔ ساغر شراب کو چراغ طول بھی خوب کہا رات کا لفظ بغیر کو کے استعمال کرنا اگلے زمانہ کی روش تقریر ہے۔ ناسخ نے تنگی صحن کے باعث مرزنگ بیٹھا مجھے — رات اہل بزم کی کثرت کا احسان ہوگا

عتاب الدولہ حسن شخص تھے ناسخ و آتش کے مشاعرون کا ذکر کیا کرتے تھے۔ شاید یہ غزل انکی انھین مشاعرون کی ہے اس زمانہ مین رات کو کی اسطرح نہ باندھے گا۔ آئینہ والے شعر مین عارض کو پھر گلاب کے پھول سے تشبیہ دی لیکن یہان بھی تشبیہ آب یہ

اور وجہ شبہ مین حرکت بھی داخل ہے اگر آئینہ ہاتھ مین ہو تو۔ کفن کے اندر بھی
ملا بہشت پہن بھی لیا اور اندر ہی اندر بہشت مین چلے جانے کی راہ
بھی پیدا کر لی گہری تخییل ہے۔ سر دست کی رعایت مبتذل ہے اور
قابل ترک۔ آرزو کی ہے کہ فلک روز سیہ نہ دکھائے تو اس کتاب
لیل و نہار کا ایک صفحہ سفید رہے اور ایک سیاہ۔ چراغ سے شراب
کا اڑنا انکے حصہ کا مضمون تھا۔ اے پری اے صنم اے جان
اے مہرو اے گلرو اے گلبدن بھرتی کے الفاظ سمجھے جاتے ہین
اور بھرتی کا لفظ شعر مین ہونا شاعر کے عجز طبع پر دلالت کرتا ہے
تجنیس لفظی البتہ اگر تازہ ہو تو چھوڑنے کی چیز نہین ہے گو یورپ
کی تقلید مطلقاً مانع ہے مگر تجنیس خطی کے مہمل ہونے مین کوئی
شک نہین۔

ولہ

داغ سودائے محبت سے تر و تازہ ہوگیا — عشق کی دولت سے مفلس بھی تونگر ہوگیا
شکوہ پست و بلند دہر تھا وردِ زبان — اشک کے طوفان مین کل عالم برابر ہوگیا
رتبۂ اعلیٰ نہ پائے اکڑ کر اور بڑے — تیرا آدم آئینہ کس درجہ سکندر ہوگیا
خانۂ تحریر سے نکلا شکایت کا جو پر — لے کے خط میرا دمِ پرواز نیلا کبوتر ہوگیا
شل دشمن دوستوں کو ستانے کا ملا — کیا مزا جو ہر بھی آئینے کا جوہر ہوگیا
زخمی تیغ ادا شب بھر تڑپ کر مر گئے — چاندنی کا کھیت وہ پھولوں کا بستر ہوگیا

برابر اور سکندر اور زیور کے قافیون مین اچھے شعر نکالے ہین۔

علی حیدر طباطبائی

مالک الدولہ حسین جعفر خان بہادر صولت

خاندانی شاعر بادشاہ؎ کے اُستاد فتح الدولہ برق کے بھتیجے تھے۔ انکے خاندان کے سب لوگ فصحاے لکھنؤ و میرزایان شہر مین سے تھے۔ اس گھر کے سب لوگون پر بادشاہ کی نہایت نظر عنایت تھی۔ یہ میرے سامنے کا ذکر ہے کہ انکے والد مرحوم کیدان مستقیم الدولہ بہادر مرزا جعفر صاحب ایک دفعہ مبتلاے سنگ مثانہ ہو کر صاحب فراش ہو گئے تھے کہ بادشاہ عیادت کے لئے خود چلے آتے اور جب تک علیل رہے دونون وقت خیر و عافیت پوچھنے کو میر دہ بادشاہ کے پاس سے آیا کیا۔ باریابانِ بزم شاہی مین ایسا امتیاز کسی کو کم حاصل تھا۔ ڈاکٹرون نے بیہوش کر کے عمل بالید کے ذریعہ سے آخر اس پتھری کو نکالا اور بیمار کو افاقہ ہو گیا۔ مالک الدولہ نے تاریخ کہی۔ سنگ آمد و سخت آمد اسپر جو مصرعے لگائے ہین اُنمین بادشاہ کے عیادت فرمانے کا اور دعا پڑھنے کا ذکر بھی نظم کر دیا ہے۔

یہ لوگ بڑے بہادر، صاحب جوہر، نبکیت اور پھکیت اور مشہور قدر اندازون مین تھے۔ شرفاے لکھنؤ مین ان فنون کا بھی حد سے زیادہ چرچا تھا۔ اس فن کی مشاقی کے جیسے جیسے تذکرے متواتر سُننے مین آئے ہین حیرت انگیز ہین۔ ایک بزرگ سفر حجاز مین تھے۔ قافلہ کسی منزل پر ٹھہرا یہ بھی استنجا کرنے کو کسی جھاڑی مین چلے گئے۔ وہان کوئی عرب لٹیرو گھات مین لگا ہوا تھا۔ سر پر آ کے اس زور سے ڈانڈ لگائی کہ تیورا گئے۔ وہ ظالم لوٹا لے کر ہوا ہو گیا۔ انھین ہوش آیا تو اس جھاڑی کو اچھی طرح سے پہچان لیا اور منزل کا نام بھی لکھ رکھا۔ زیارت سے مشرف ہو کر جب اسی منزل پر پہونچے ہین تو انتقام لینے کا خیال آیا۔ ایک ڈنڈا بغل مین دبا لیا اور ایک لوٹا ہاتھ مین

؎ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ ۔

اُٹھالیا اور اُسی جھاڑی مین جاکر استنجا کرنے کے طرز پر بیٹھے۔ مگر ہوشیار بیٹھے۔ بیٹھنا تھا کہ وہ آ ہی پہونچا۔ ابھی اُسنے نیزہ کو سرے اونچا ہی کیا تھا کہ اودھر غلیل کا ہاتھ پورا پڑ گیا۔ ڈنڈا کنپٹی پر جاکر بیٹھا۔ وہ اودھر دھم سے گرا اور یہ اودھر اپنا اُٹھا اور ڈنڈا لئے ہوئے قافلے سے آملے۔ ہمراہیون سے کہتے تھے کہ اُس دن مجھے اس ظالم نے مار ہی ڈالا تھا اور اسیطرح نہین معلوم کتنے خون کر چکا ہوگا۔ آج مین نے ایک ہاتھ مار دیا اگر بچ گیا تو عمر بھر یاد کرے گا اور اگر مر گیا تو مین بری الذمہ ہون۔ ایک اور صاحب غلیل کے نشانہ مین قدر انداز تھے۔ قافلہ پر بدوی آگرے۔ گٹھریان بغل مین دبالین۔ بڑے بڑے گٹھر پیٹھ پر لادے۔ بچے پیسون کی تھیلیان کاندھے پر اُٹھالین اور اب سارے قافلہ کو لوٹ کر جایا چاہتے تھے کہ ان بزرگ نے ایک غلیل اُٹھاکر سردار پر چند گولیان مار دین۔ اسکے گٹے پر پڑی کہ نیزہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ اُسکی کہنی پر پڑی کہ بقچہ بغل سے نکل پڑا۔ سب کے سب ڈھیلے ہوگئے۔ جو گولی پڑی جوڑ پر پڑی۔ ہاتھ چھوٹے ہوگئے پاؤن نکمے ہوگئے۔ جسنے برچھا اُٹھایا اُسکے گٹے اور کہنی اور مونڈھے کے جوڑون کو توڑ کے رکھدیا اور پھر لطف یہ کہ کسی کو جان سے نہین مارا۔ کسی کی آنکھ کو نہین پھوڑا۔ ورنہ قلب پر اور کنپٹی پر گولی کا پڑنا موت کا پیغام تھا۔ انسان کا مارنا تو کجا کبھی چڑیا کو بھی ان بزرگ نے نہین مارا۔ فاختہ درخت پر بیٹھی بول رہی ہے اور احباب نے مجبور کیا کہ مرزا صاحب نشانہ لگایئے۔ بہت اصرار کرنے سے نشانہ لگایا مگر ایسا اوچھا کہ فاختہ درخت سے تو گر پڑی لیکن زمین پر لوٹ کر پھر اُڑ گئی۔ پچیس چھبیس برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ میرے دوستون مین حکیم مرزا باقر صاحب مرحوم گردش زمانہ و بے وفائی روزگار سے تنگ آکر لکھنؤ سے حیدرآباد تک پیدل چلے آئے اور غلیل کے سوا کچھ زادراہ ساتھ نہ تھی۔ یہان کچھ سہارا ہوگیا تھا مگر وقت رحلت بھی قریب ہی آچکا تھا۔ اُردو مین فن محاضرہ کسی نے نہین لکھا ورنہ ان بزرگون کے حالات سے دفتر بھر جاتے۔

ملک الدولہ مرحوم کی طبیعت مین بھی وہی خاندانی آن بان موجود تھی۔ وضع کے بڑے پابند، انتہا کے کم سخن، فکر شعر نے انھین چپ کردیا تھا۔ بات بہت کم کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ سوچ رہے ہین۔ مین نے عموماً اس بات کو خیال کیا ہے کہ شعرا کے چہرہ سے بشاشت و شگفتہ روئی جاتی رہتی ہے۔ کچھ یہ ضرور نہین کہ ہر وقت وہ سوچ ہی مین رہتے ہون اور فکر شعر سے کسی وقت خالی نہ ہوتے ہون۔ نہین بلکہ فکر کرتے کرتے بشرہ پر آثار فکر مرتسم ہوکر رہ جاتے ہین۔ اس مسئلہ مین یورپ کے فلاسفہ کا یہ قول کسقدر مطابق واقع کے ہے کہ خیال موثر ہے اور مادہ منفعل ہے یعنی اسباب جسمانی وجود اخلاق کی علت نہین ہین بلکہ اخلاق علت ہین اور وضع و احوال جو اجسام پر طاری ہوتے ہین وہ معلول ہین۔ شعرا جیسی فکر شعر مین کرتے ہین اگر اور فنون مین اسطرح مستغرق ہوجائین تو بہت کچھ انکشافات ہون۔ زہیر بن ابی سلمیٰ چار مہینے مین قصیدہ کہتا تھا۔ پھر چار مہینے تک اُسمین اصلاح کیا کرتا تھا۔ پھر چار مہینے اہل ذوق کے سامنے پڑھا کرتا تھا۔ برس دن مین وہ قصیدہ اس ہوتا تھا کہ سوق عکاظ کے مشاعرہ مین پڑھا جائے۔ انگلینڈ کے شعرائے متاخرین مین ٹینیسن کا یہ حال تھا کہ کہتے ہین اُسکی تخیل کی قوت بانکشاف سیو بچ گئی تھی۔

بادشاہ اپنا غم بہلانے کے لئے جانورون بھر تو کبوترون مین مشغول رہتے تھے۔ تین تین سو اور چار چار سو کبوترون کا ساتھ ایک رنگ کا اور ہر ایک کوٹھی مین کئی کئی کبوترخانے۔ ایک لاکھ

کبوتر تھا اور آٹھ نو سو کبوتر باز جنمین اکثر شرفا و سادات لکھنؤ کے خانمان ویران و آوارہ وطن ملازم تھے۔ جنے کسی ساتھ کو دو چار بھڑیان دیکر اڑا دیا دوشالہ اور رومال اور انعام سے مالا مال ہوگیا اور کبوترون کو روغنی روٹیان کھلانے کے لئے ہزارون روپیے اسکے علاوہ ملجاتے تھے۔ گرمیان آئین اور جہان پناہ نے کبوترون کا شغل موقوف کیا۔ اب خس خانہ مین سارا سارا دن گزر جاتا ہے۔ مراقبت و خفقان کا زور رہتا ہے۔ دھوپ کی طرف دیکھنا ناگوار ہوتا ہے۔ اس زاویۂ عزلت مین غم غلط کرنے کی راہ کچھ دنون یہ رہی کہ بلبلون کے پنجرے خس خانہ کے قریب آویزان ہین اُنکے زمزمون سے وحشت دل کا علاج کر لیتے تھے۔ مگر یہ چڑیا ہر فصل مین نہین بولتی۔ کچھ دنون بے زبانون سے دل بہلاتے رہے۔ خس خانون کے اندر سنگ مرمر کے حوض بنے ہوئے ہین انمین لال مچھلیان چھوٹی ہوئی ہین۔ فوارے چل رہے ہین۔ حوضون مین سوار ڈالی جاتی ہے۔ جب مچھلیان اُسمین انڈے دے لیتی ہین تو سوار مٹی کے ناندون مین ڈالدیجاتی ہے اور کچھ دنون مین بچے نکل آتے ہین۔ ماہی گیرون کو انعام ملتا ہے۔ برسات کی فصل بادشاہ کے مزاج سے بہت موافق تھی۔ اکثر سوار ہوتے تھے اور باغون کی آرائش مین مشغول رہتے تھے۔ اس زمانے مین تعمیر کا شغل بہت رہتا تھا۔ قصر مرصع منزل سہ منزلہ ایوان تھا۔ حکم ہوا کہ اُسکے دونون پہلودان مین دو منارے اتنے ہی بلند تعمیر کئے جائین۔ اُس بلندی پر دو پنجرے آہنین کٹہرون کے تیار ہون۔ اُنمین ریچھ چھوڑے جائین۔ خیال یہ ہوا کہ ریچھ کو گرمی زیادہ لگتی ہے۔ رمنہ مین زرافہ کے لئے مچان بنوا دئے کہ اسکو دانہ مچان پر کھلایا جائے۔ سانپون کا شیشون مین بند رہنا گوارا نہوا اور اُنکا کھلا رہنا بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ ایک عجب تدبیر کی جو بادشاہ کی جودت طبع و جدت فکر کی عمدہ دلیل ہے۔ شہنشاہ منزل ایک کوٹھی ملکہ باغ مین تعمیر ہو رہی تھی۔ اسی کوٹھی کے مُطرّہ ایوان کے سامنے ایک پہاڑ بنوا کر سیکڑون سانپ اُسمین چھڑوا دئے کہ پہاڑ پر پھرنے کے سوا اور کہین جا ہی نہ سکتے تھے۔ شاہزادہ مرزا کام بخش بہادر ملکہ باغ مین رہتے تھے اُنکی تعلیم کی خدمت میرے حوالہ تھی۔ مالک الدولہ صولت مرحوم کو مجھسے بہت اُنس تھا۔ جب بادشاہ کے سلام کو ادھر آتے تھے مجھسے ضرور ملتے تھے۔ جب کوٹھی تیار ہوگئی اور سج جاچکی تو بادشاہ دیکھنے کے لئے رونق افروز ہوئے۔ سبعہ سیارہ شعرائے دربار شاہی تاریخین پڑھ پڑھکر سُنانے لگے اور مورد تحسین و آفرین ہوئے۔ مالک الدولہ اپنی تاریخ مُذہب کر کے ایک فریم مین لگا کر لائے تھے۔ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ شہنشاہ منزل کے ایک فراش نے آکر خبر دی کہ جہان پناہ نے یاد کیا ہے۔ گئے تاریخ ملاحظہ مین گزری اور کوٹھی کے خاص کمرہ مین لگا دی گئی ؎

کیا خوب ہے یہ بنائے عالی — ہر نقش و نگار مین ہے صنعت
اس اوج کو جو کہ دیکھتا ہے — کہتا ہے کہ ہے خدا کی قدرت
جس شخص نے آنکھ اُٹھا کے دیکھا — آئینہ ہوا۔ ہوئی یہ حیرت
صولت نے لکھا یہ مصرع سال
یہ قصر ہے یا ہے قصر جنت
۱۲۰۹ھ

کوٹھی کے سامنے پہاڑ ہونے سے یہ بات نہ تھی کہ ملکہ باغ کا منظر بالکل چھپ گیا ہو۔ پہاڑ کے شکم مین ایک مستطیل درۂ کوہ تھا۔ اُسمین اتنی بڑی ایک چیت تھی جسے بکرا نگلتے ہوئے مین دیکھا ہے۔ اس درۂ مصنوعی کے دونون طرف آہنین سیخچے لگے ہوئے تھے کہ چیت کبھی نکل نہ سکتی تھی اور

باغ کا سامنا بھی صاف تھا۔ اُسپر سیکڑون خالی مٹکے تلے اوپر رکھے ہوے تھے جنپر سیاہ روغن کیا ہوا تھا۔ مٹکون کے موگھڑون کے درمیان جو جگہ چھوٹی ہوئی تھی اُسمین سفالی نل کہ وہ اگے سانپ کی بانبیون کی طرح طولاً و عرضاً لگائے گئے تھے۔ اس مصنوعی کی پہاڑ کی چوٹی شہنشاہ منزل کے لب بام سے باتین کرتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی سے آبشار چھوٹتے تھے جسکا خزانہ کوٹھی کی چھت پر تھا اور پانی کے جھرنے بھی جابجا بنائے گئے تھے جنکے سبب سے پہاڑ پر کی ہری ہری دوب ہمیشہ لہلہایا کرتی تھی۔ کوٹھی کے سامنے پہاڑ ایک گلدستہ معلوم ہوتا۔ پہاڑ کے چارون طرف دو دو گز گہری اور چوڑی ایک خندق کھدی ہوئی تھی کہ اگر سانپ جست کرکے نکلنا چاہتا تھا تو خندق مین گر پڑتا تھا۔ گرکے لہراتا ہوا دیوار تک پہونچا اور چڑھنا شروع کیا۔ خندق کی دیوار مین لداؤ کا کام ہے ساری دیوار ہلالی ہے اسپر چونے کی گھٹائی مین ایسا اہتمام کیا گیا ہے کہ آئینہ کیطرح عکس پڑتا ہے سانپ جون جون چڑھتا ہے اُلٹتا جاتا ہے۔ جب تک دُم زمین پر لگی ہوئی ہے لپٹا ہوا ہے۔ ذرا اور اونچا ہوا اور اپنا بوجھ سنبھالنا اوسے مشکل ہوگیا۔ اب ذرا بھی جنبش کی تو زمین پر آرہا عاجز آکر پھر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ یہان سیکڑون دھامن اور کالے ناگ اور کوڑیالے سبزہ پر لہرارہے ہین۔ اُنکے کھانے کے لئے مینڈک اور چوہے بہت سے کیڑے مکوڑے اُسی خندق مین چھوڑ دیے جاتے تھے اور سانپ کے شکار کا لطف دیکھنے مین آتا تھا۔ مجھے اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ چڑی مارنے تھیلے مین سے چڑیا نکالی اور سانپ کو دُور سے دکھائی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ چڑیا مجھے دیتا ہے اور جلدی سے اُسنے سر اُٹھایا۔ ادھر اُسنے چڑیا پھینکی اُدھر اُسکے منہ ہی مین تھی۔ پھر نہر سے خندق مین جو پانی گرتا تھا وہ پائین کوہ ایک پتلی سی نہر مین جمع رہتا تھا۔ مینڈک اسمین ڈبکیان لگاتے تھے اور سانپ سے بچتے پھرتے تھے۔ یہ مضمون طبعزاد بادشاہ کا تھا۔ یورپ کے بھی کسی چڑیاخانہ مین زہریلے سانپ اس آزادی سے نہین رکھے گئے تھے اب سُنتا ہون کہ اور لوگ بھی لے اوڑے۔

بادشاہ نے ایک رسالہ جوہر عروض تصنیف کیا اور ایک نسخہ اُسکا مالک الدولہ کو بھیجا۔ اُنھون نے اسکے شکریہ مین کچھ اشعار حضرت کے سامنے پڑھے۔ آخر مین دعائیہ اشعار کا ایک قطعہ تھا جسے سُنکر جہان پناہ آبدیدہ ہوگئے ؎

سُنتے تو مین زمانہ نے بدلا ہے اپنا رنگ — پھر انقلاب کرنے کو ہے دور آسمان
سامان اور کچھ نظر آتے ہین آج کل — یعنی جلوس شاہ کے آثار ہین عیان
ہر اک طرف یہ دھوم ہے چلتے ہین لکھنؤ — پھر بیٹھتے ہین تخت پہ سلطان عز و شان
اس سے یقین ہے کہ ہو پھر سلطنت بحال — نقارۂ خدا ہے خلائق کی بھی زبان

یہ لوگ تو بادشاہ کے خوش کرنے کے لئے اعادۂ ملک و سلطنت کی دعا دیتے تھے مگر مین نے خیال کیا کہ اُنکا دل دکھ جاتا تھا اور غم تازہ ہو جاتا تھا۔ ہائے افسوس۔

فصیح الملک مرزا داغ مرحوم کلکتہ مین جب آئے مین تو مالک الدولہ اُنسے ملنے کو گئے۔ جب وہان سے آئے تو مین نے پوچھا کہ کوئی مزے کا شعر بھی یاد کرکے آئے۔ کہنے لگے ایک مزے کا فقرہ سُنیئے۔ مین اُنکا مشتاق ہوکے گیا تھا۔ اپنے ساتھ کوئی غزل نہین لے گیا تھا۔ مگر اُنھون نے اصرار کیا تو ایک غزل کے چند شعر مجھے یاد آگئے وہ مین نے پڑھ دیے ؎

نہ دیکھا جلوۂ رخسار تیرا — قیامت پر رہا دیدار تیرا
کمان ابرو کشش کمان یہ جوش رحمت — کرم اے ابر دریا بار تیرا
ترے کوچے پہ پڑھ آؤن پہنچ کر — جا پڑے سایۂ دیوار تیرا

اِدھر تو آنکھ دکھلاتا ہے ظالم ۔ اُدھر جہرہ روزنِ دیوار تیرا
دہانِ زخم بوسے لے رہا ہے ۔ لبِ معشوق ہے سوفار تیرا
غضب ہے اُڑ گئیں راتوں کی نیندیں ۔ بُرا ہو خواہشِ دیدار تیرا
اُترتے فلک سے ماہ و خورشید ۔ جو پاتے سایۂ دیوار تیرا
محبت میں نہ اے صورت کی جو
بڑے اغماض اُٹھا یار تیرا

کہتے تھے مقطع پڑھکر میں خاموش ہو رہا تو مرزا داغ نے کہا کچھ تو اور پڑھئے میں نے پانچ چار شعر اور پڑھے ؎

جو تم نے بیداد کی ہے ہم پر یہان تو چپ ہین ستم اُٹھا کر
ضرور لیکن بروزِ محشر کرینگے شکوہ خدا سے جا کر
یہان تو لیٹے دو چین مجھکو لحد مین آئے ہو کیون فرشتو
نہ تم مجھے نیند مین ستاؤ عبث نہ چھیڑو جگا جگا کر
عجب یہ قدرت کے ہین تماشے ہین دستِ صنعت پہ سکتے دیتے
کہ نقشِ پا کی طرح سے نقشے بگاڑتا ہے بنا بنا کر
ہم اب نہ چونکین گے تا قیامت ملی ہے خوابِ اجل سے راحت
عبث جگاتے ہو بعدِ رحلت ہمارا شانہ ہلا ہلا کر
ہوئی یہ ہجرِ بتان سے حالت ہے ایک عالم کو جس سے حیرت
بیان مشکل ہے اسکا صورت اُٹھائے صدمے جو دل لگا کر

کہنے لگے مرزا داغ سے میری جو وضعداری کا کسی نے تذکرہ کر دیا تھا یہ فقرہ اُنھون نے کہا کہ بحرِ خفیف مین بھی آپ نے خوب غزل پڑھی اور شکستہ بحر بھی خوب کہی۔ مرزا داغ سے اور مُجھ سے کچھ ایسا ارتباط بڑھ گیا تھا کہ ہمیشہ خط و کتابت باہمدگر ہوا کی۔

مرض الموت مین مالک سالہ والکا غزل پڑھنا مجھے نہین بھولتا۔ عجب انداز کا پڑھنا تھا اور عجب مزے کے شعر تھے۔ یہ ذوقِ فن دیکھئے کہ مرتے دم تک اُسے نباہا۔ ایک عرصے سے مدقوق تھے مشاعرون مین جانا اور ملاقات احباب کو آنا یک قلم موقوف تھا۔ میرے پاس رقعہ آیا کہ آج شب کو مشاعرہ ہے ضرور آئیگا۔ مین خوش ہوا کہ شاید کچھ افاقہ مرض سے ہوا۔ مگر جا کے یہ حال دیکھا کہ اُنہین بیٹھنے کی بھی طاقت نہین ہے۔ پلنگ پر گاؤ تکیہ لگا کر بیٹھے ہین اور اُسی کے متصل تختون کا چوکا ہے۔ چند کنول روشن ہین۔ پانچ چار حقے بھرے ہوئے دم کھا رہے ہین دس پندرہ آدمی جنسے زیادہ تر ارتباط تھا۔ وہی پڑھنے والے وہی واہ واہ دینے والے ہین۔ کہنے لگے طولِ مرض سے دم اُکتا گیا اور صحبتِ احباب کے لئے دل ترس گیا۔ تو مین نے ایک طرح کر دی کہ مین سب کو تکلیف دونگا یہ کہکر خاصدان میری طرف بڑھا دیا۔ طرح کی غزلین لوگ پڑھنے لگے آخر مین اُنھون نے غزل پڑھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص بیمار نہین ہے۔ نجانے شعر پڑھنے کی طاقت کہان سے آ گئی تھی اور چہرہ پر بشاشت کیونکر پیدا ہو گئی تھی ؎

پھونکے ہوئے بلند جو بادِ بہار کے ۔ دامن گلون نے پھونک دئے کوہسار کے
کہتا ہے یار واسطے دل کے قرار کے ۔ ہاتھ اُسکے چوم لون کہ قدم راہوار کے
آتش بھی گل ہے فیض سے ابرِ بہار کے ۔ نکلے ہین لالہ بن کے شرر کوہسار کے
جادو نگاہِ ناز کا نرگس پہ ہے ستم ۔ بیمار کو نہ قتل کرو آنکھ مار کے
آنکھین حضور آپ کے دیدار سے ہوئین ۔ روشن ہوئے چراغ شبِ انتظار کے
خلعت بٹے گلون کو جو فصلِ بہار مین ۔ بخشے جنون کو دیدے کپڑے اُتار کے
آ کے میکدہ پہ جو آئی برس پڑین ۔ بادل نہ جائین اور طرف کوہسار کے
جلدی قیامت آئے حساب اپنا پاک ہو ۔ دوڑے کے تو حشر ڈھاتے ہین روزِ شمار کے
پیری بگڑی کا دیا ہے نہ ہو ساغر ۔ دم بھی نہین ہے دم مین مریضِ بہار کے
نکلی ہے دل کے گرتے ہی کہنے لگا وہ شوخ ۔ ہم شرط جیت بیٹھے ہین بازی ہار کے

واقف ہے کون شہر خموشاں کے راز سے — کتنے طلسم توڑے ہین لوح مزار کے

دل کی خرابیون کا جو آتا ہے اب خیال — پچھتاتے ہین حضرت ہم قول ہار کے

تم جیو د بعد میرے نہ آنسو بہائیو — تم شیشہ سے بھگانہ لیل و نہار کے

صورت سے رنج فرقت قاتل نہ اٹھ سکا

کیا مفت جان دی ہے چھری دل پہ مار کے

واسطے شکار کے اور طرف آسمان کے اس قسم کے تصرفات ہین جو عربی و فارسی پڑھنے والون کی زبان مین پائے جاتے ہین اور لطف یہ ہے کہ انکو مانوس معلوم ہوتے ہین۔

مشاعرہ کے آٹھ دن بعد مین عیادت کو گیا تو خیر حال تھا۔ خدا مغفرت کرے۔ مجھے سال وفات یاد نہین رہا۔ غالباً سنہ ۱۳۰۲ ہجری مین انتقال کیا۔

(باقی آئندہ)

سید علی حیدر طبا طبائی

مالک الدولہ صولت

(۲)

مالک الدولہ کی تین غزلوں کے کچھ شعر میں لکھ چکا ہوں جن میں سے ایک کو اہل عروض بحر ہزج میں شمار کرتے ہیں اور دوسری کو متقارب شانزدہ رکنی کہتے ہیں۔ اور تیسری مضارع میں ہے کچھ شعر اور اُن کے دیوان میں سے انتخاب کر کے لکھتا ہوں۔ گو بمقتضائے محبت مجھے انکا سارا کلام اچھا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بہ نظر اختصار بہت سی غزلوں کو چھوڑ دیا۔ دیوان کی یہ حیثیت ہے کہ حاشیہ پر بھی اکثر غزلیں ہیں۔ اور بوسیدہ ہونے کے سبب سے ہر مصرع کا ایک آدھ لفظ شروع کا یا آخر کا تلف ہو گیا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔ وہ غزلیں سب بیکار ہو گئیں۔ میرے اس انتخاب پر نکتہ چینی کی نظر نہ کرنا چاہیے۔ کہ صولت مرحوم میرے احباب اخلاص منشین سے ہیں۔ ان کی ہر ادا مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اس پر بھی میں نے آداب تذکرہ نگاری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ تحسین کے ساتھ تنقید سے بھی کام لیا ہے۔ اس کے ضمن میں اکثر نکات فن کی بحثیں اور شعرائے معاصرین کے مشاعرہ و معارضہ کا حال جو کچھ مجھے یاد آ جائے گا لکھوں گا۔ ان مرحوم کا طرز سخن کوئی جدت کا پہلو لئے ہوئے نہیں ہے۔ لیکن سارا کلام مطبوع و مانوس ہے لکھنؤ کا خاص رنگ اور لکھنؤ کی خاص زبان ہے۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ صائب و حافظ کا تتبع کرتے رہے اور فارسی کے خلط کو بارشاد شیخ ناسخ اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اسی زمانہ میں دہلی میں مرزا بیدل و مرزا جلال اسیر کا رنگ پھیلا اور اُردو میں فارسی ترکیبوں کے خلط نے ایسا حد و دیگر طرز سخن کچھ سے کچھ ہو گیا۔ گو بیدل کی ترکیبیں اہل زبان کی نظر میں اعتبار سے ساقط ہیں۔ لیکن مرزا داغ مرحوم کے سوا اکثر شعرائے دہلی نے اس سے احتیاط نہیں کی مرزا غالب مرحوم کی نازک خیالی شعر و سخن کی جان ہے۔ اردوئے معلےٰ کی تحریریں اُن کے افصح الفصحا ہونے کی سندیں ہیں لیکن طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کا انجام یہ ہوا کہ ایک ضخیم دیوان میں سے چند جزو انتخاب کئے گئے اور اس میں بھی زبان کے لحاظ سے اکثر شعر آدھا تیتر آدھا بٹیر ہیں۔ نہ انھیں فارسی کہہ سکتے ہیں نہ اُردو۔ عنایت فرما شمس العلما مولوی حالی صاحب کے اس قول کی میں بھی تائید کرتا ہوں کہ "بیدل کا شعر سمجھ میں نہ آنے پر بھی اچھا معلوم ہوتا ہے" اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ لفظ و ترکیب میں فقط ایک سحر ہے۔ معنی کو اُس کی دلاویزی میں چنداں دخل نہیں اور یہ ایک ایسا عقدہ دشوار ہے جس کے حل کرنے کی طرف شعرا کو ضرور توجہ کرنا چاہیے۔ اور شعر کے راز سربستہ کو کھولنا چاہیے۔ چند اشعار صولت کے جو میں لکھنا چاہتا ہوں یہ ہیں ؎

رسائی تری خلوت تک بشر ہو نہیں سکتا | میں کیا ہوں فرشتہ کا گزر ہو نہیں سکتا
موسیٰ کو تصور ہی فقط دل میں ہے کافی | وہ پردہ نشیں پیش نظر ہو نہیں سکتا
اے دست جنوں شاق ہے دل پر یہ تکلف | کیا چاک گریبان سحر ہو نہیں سکتا
فرماتے ہیں آسان نہیں ہے گزرنا | مر جانے کو سب کہتے ہیں پر ہو نہیں سکتا
میں کہتا ہوں ملنے کے لئے آئیں گے تمکو | وہ کہتے ہیں ایسا تو اثر ہو نہیں سکتا
اٹھیں گی نہ غیر ایسے مری طرح جفائیں | یہ حوصلہ یہ دل یہ جگر ہو نہیں سکتا
صولت رہ الفت میں رکھا قدم ایک | کرنے کو بہت دور سفر ہو نہیں سکتا

گریبان سحر کا ہاتھ سے چاک ہونا یا چاک ہونے کی تمنا کرنا

کچھ معنی نہیں رکھتا۔ مگر لفظ جنوں نے معنی پیدا کر دیے کہ جو مبتلائے جنون ہوتا ہے اُس کو ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔

گھر کا استعمال گھر کے معنی پر اب چھوٹ گیا۔ آخر میں مرزا داغؔ مرحوم نے بھی اسے ترک کیا اور کہا کہ واقع میں اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جگر والے شعر کے اگر یہ معنی لئے جائیں کہ ایک معشوق بازاری سے خطاب ہے جس کے بہت سے عاشق ہیں تو نہایت رکیک و قبیح ہے۔ اگر یہ سمجھئے کہ ایک عزیز کسی دوسرے عزیز سے شکایت کر رہا ہے جسے بیگانوں پر زیادہ بھروسا ہے یا ایک رفیق قدیم کسی امیر کی نا قدر شناسی کا شکوہ کر رہا ہے جسے نئے ملازموں کی طرف زیادہ توجہ ہے تو یہی شعر نہایت حسین ہے۔

ان آنکھوں سے بچشم غور ہم نے اس جہاں دیکھا   ترا جلوہ نظر آیا جدھر گذرے جہاں دیکھا
بنایا طور سینا دل کو ہم نے تیرے جلوے سے   جو ان آنکھوں نے دیکھا چشم معنی نے نہاں دیکھا
دم جاں کندنی حسرت ہی ایسی شہیدوں کی   نہ پھر کر اک نظر قاتل نے سوئے کشتگاں دیکھا
بنا ہو خواب راحت کا محل جب تک غفلت سے   نہ پھر مٹتے نشان نقش پائے کارواں دیکھا
مرا شانہ ہلا کر لوگ تربت میں یہ کہتے ہیں   تبارے سونے والے آخری اپنا مکاں دیکھا

آنکھوں سے بچشم غور دیکھنا جھگڑے سے خالی نہیں ہے مگر بنگاہ غور دیکھنا مقصود ہے اور اس قسم کی مجازات شعرا کے کلام میں ہوتے ہیں۔ مجازاً نگاہ کے معنی میں چشم کو لے سکتے ہیں۔

نقش پا نشان پا و نشان نقش پا سب طرح سے درست ہے۔ شعر کی کرامات کو دیکھئے کہ جو شخص مر گیا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ میرا شانہ ہلا کر اٹھا۔ لیکن بے ہوشی مرگ میں یہ امتیاز نہیں باقی رہا کہ ایک شخص شانہ ہلا رہا ہے یا بہت سے لوگ ہیں۔

مکان فارسی میں گھر کے معنی پر نہیں آیا۔ ان معنی پر مکان لفظ ہندی ہے اور ہندی ہونے کی وجہ سے اس میں اعلان نون کا ترک کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جیسے پرستان میں نون غنہ کا استعمال غلط سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی اُس میں بھی بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن ان باتوں کو کوئی سمجھتا نہیں۔ اور شاعر کے لئے بہت کچھ توسع بھی ہے ؎

مجھکو سودے نے دکھایا ہے بیاباں کیسا   کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا
ہو گئی عمر بسر اپنی غم ہجراں میں   چین کہتے ہیں کسے عیش کا ساماں کیسا
چاہ بابل کا فسانہ تو ہے مشہور جہاں   دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا
عشق بازی سے تجھے منع کیا تھا صوفیؔ   پہلے مطلق نہ سنا اب یہ پشیماں کیسا

ان اشعار میں "کیسا" کا محل استعمال دیکھئے "کوئی وحشی نظر آتا نہیں انساں کیسا" یعنی انسان تو بڑی چیز ہے۔ اور "دل فرشتوں کا پھنسا عشق میں انساں کیسا" یعنی انسان تو ادنیٰ چیز ہے۔

حافظؔ کہتا ہے من آن نیم کہ ازیں عشقبازی آیم باز۔ غزل گو کا کلام مبہم اور کثیر المعنی ہوتا ہے خصوصیات اور تخصیصات سے اُسے بحث نہیں۔ شعر بقول کلی اگر ہے تو غزل ہی ہے اور اسی سبب سے غزل کا مطلب سمجھنے کے لئے نظر دقیق چاہئے۔ جو لوگ سلیم متوسط رکھتے ہیں وہ غزل کے ظاہری معنی سمجھ لیتے ہیں۔ باطنی اشارے اُنکے گو سمجھ میں نہ آئیں مگر اپنا کام کر جاتے ہیں۔ اور یہ کلیہ ہے کہ غزل کا جو شعر اچھا معلوم ہوتا ہے اُس کے معنی بہت دور ہوتے ہیں یہاں عشق بازی کا لفظ اختیار کر لیا ہے اور مراد اُس سے ہر قسم کے جذبات ہیں جنکے اتباع سے پشیمانی حاصل ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ عشق بازی جیسی ذلیل چیز ہے تمام جذبات ایسے ہی رکیک و ذلیل ہیں۔

جب کہ میں بزم سیہ مستاں سے ساغر لیکے چلا   شور تھا ظلمات٭ سے پانی سکندر لے چلا
آنکھ دکھلاتے ہیں وہ مست خرام ناز کر   رہ گیا تھا ہوش کچھ باقی سو وہ ساغر لے چلا
سبحہ میں زنار کو زاہد نے پوشیدہ کیا   آستیں میں دل کے بت کعبہ کا اندر لے چلا
کاندھا دینے والے جکو ہیں تھک تھک گئے   بار عصیاں کا نہ جانے وہ کیونکر لے چلا

٭ ظلمات کو بیکون لام باندھنا فارسی گویوں کی تقلید سے جائز ہو گیا ہے۔

میں سایہ سمجھا جانبِ میخانہ آتا ہے یہ ابر   وائے قسمت آسماں پر ہی اُدھر سے چلا

یہ غزل جس مشاعرہ کی ہے مرزا داغ بھی اس میں شریک تھے اور بڑا مجمع تھا۔ حافظ علی نجت رام پوری بانی مشاعرہ تھے۔ اور شیخ عبدالرزاق شاد دہلوی شاگرد حکیم محمد سجاد موہانی کے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد ہوئی تھی۔ دونوں صاحبوں نے اہتمام میں بہت سرگرمی کی تھی شہر میں جا بجا اشتہار لگا دئے تھے۔ شعرا کے مکان پر جا جا کے وعدے لئے تھے۔ اس سبب سے کہنے والوں کے علاوہ تماشائیوں کا زیادہ تر ہجوم تھا۔ آخر شب میں کہیں مٹیا برج کے شعرا کی نوبت آئی۔ مالک الدولہ نے غزل پڑھی۔ پھر شیخ امداد علی یاور جو برق کے شاگردوں میں خوش فکر شاعر تھے انہوں نے غیر طرح کچھ شعر پڑھنا شروع کئے تھے۔ کہ مرزا داغ نے کہا "حضرت طرح میں کچھ کہا ہو تو پڑھئے" انھوں نے کہا طرح میں تو میں نے کچھ نہیں کہا اور یہ کہکر غزل جیب میں رکھ لی۔ ان کے بعد میرے پڑھنے کی باری تھی۔ اور میرے بعد مرزا داغ پڑھنے والے تھے۔ میں نے عذر کیا کہ نماز کا وقت قریب ہے غزل کیا پڑھوں لوگوں نے کہا کہ ابھی تو صبح ہے آپ پڑھئے تو سہی۔ خیر میں نے غزل پڑھ دی پھر سوے اتفاق دیکھئے کہ اُس کے بعد مشاعرہ میں کوئی نہ ٹھہرا اصل حقیقت یہ تھی کہ تمام رات کی خستگی اور بے خوابی پھر نماز جماعت کے فوت ہو جانے کا اندیشہ۔ اکثر تماشائیوں میں دہلی کے اہل حرفہ و کارخانہ دار تھے جو کوھوٹولہ میں بسے ہوئے تھے یہ وجہ تھی برہمی مشاعرہ کی مگر مرزا داغ مرحوم کو بدگمانی اہل مٹیا برج کی طرف سے پیدا ہوئی کہ انھوں نے صحبت کو درہم و برہم کر دیا۔ اور میرے اشتیاق میں جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ مجھے نہ سن سکے۔ اس مشاعرہ کے دس برس بعد کا ذکر ہے کہ حیدرآباد میں مرزا داغ کے شاگردوں میں سے ایک صاحب نے مشاعرہ کیا جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ مگر طرح تھی صیاد کا اور جلاد کا۔ اور ایک بجے دن سے مشاعرہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مرزا داغ توزیچ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور غزل خوانی کبھی دہنی طرف ہونے لگتی ہے اور کبھی بائیں جانب اُس صف میں ایک نے غزل ختم کی اور اس صف میں دوسرے نے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس بے ترتیبی میں شام ہو گئی کہ مرزا داغ نے کہا آخر میرے پڑھنے کی بھی باری آئے گی یا نہیں۔ یہ سن کر جن جن لوگوں نے اپنی اپنی غزلیں نکالی تھیں جیبوں میں رکھ لیں مرزا داغ صاحب نے غزل پڑھی اور مقطع پڑھتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اب نماز کا وقت ہے بس ہو چکا مشاعرہ۔ حیدرآباد کا ایک اور مشاعرہ کا برہم ہو جانا مجھے یاد آیا۔ مرحوم میر باقر حسن ضیا لکھنوی بانی مشاعرہ تھے۔ طرح کچھ نہ تھی سر آسماں جاہ بہادر مرحوم کی وزارت کا زمانہ تھا شمس العلما مولوی حالی صاحب کے سننے کے لئے یہ صحبت منعقد ہوئی تھی مگر یہاں کے سب چیدہ شاعروں کو میر باقر حسن نے بہت اہتمام سے بلایا تھا۔ سامعین میں ایسے ایسے لوگ تھے جو بہت کم شعر و سخن کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ نواب عماد الملک بہادر نواب وقار الملک۔ مولوی مشتاق حسین صاحب۔ مولوی عزیز مرزا صاحب میر باقر حسن نے حیدرآباد کے لنگر کا حال نظم کیا تھا وہ پڑھا۔ مولوی حالی صاحب نے ہندوستان کی پھوٹ پر اور کالے گورے کے مقابلہ پر دو ایک نظمیں پڑھیں۔ اُن کے بعد مرزا داغ مرحوم نے دو غزلیں پڑھیں پھر میری باری آئی دو غزلیں میں نے بھی پڑھیں اسکے بعد مشاعرہ برہم ہو گیا مولوی مشتاق حسین صاحب کے اٹھتے ہی سب اُٹھ کھڑے ہوئے اکثر لوگوں نے صاحب مشاعرہ سے شکوہ کیا۔ انھوں نے کہا میں تو سننے کو موجود ہوں مگر سامعین پر میرا کیا بس ہے۔ سب لوگ کہ جو غلط

اٹھے جن میں گرامی و عرشی دربار شاہی کے فارسی گو خوش فکر شاعروں میں تھے۔

گرم اسلوج شب بھر میں پہلو ہوتا داغ ہوتا مرے دل پر نہ اگر تو ہوتا
آہ کرنے پہ تو محفل سے نکالا اُس نے قہر ہوتا جو مری آنکھ میں آنسو ہوتا
جھوٹی مہندی مجھے یوسف کی جو ہاتھ آجاتی کیا زلیخا کے لئے وسمۂ ابرو ہوتا
ہوتا زاہد نہ کبھی ضد سے مرا ہم مشرب میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا

یہ مصرع کس قدر شوخ ہے "میں مسلمان جو ہوتا تو وہ ہندو ہوتا" گویا اب یہ ہندو ہیں اور اس ضد سے وہ مسلمان ہے۔ اگر یہ مسلمان ہو جاتے تو وہ ہندو ہو جاتا۔ ہندو ہو جانا بھی لطف سے خالی نہیں۔ نیا مضمون ہے جسے شاعر نے تراشا اور آریہ سماج نے پھیلایا۔

قدیم شاعری پر ایک یہ اعتراض ہے کہ زاہد و واعظ و شیخ سے مقدس فرقہ پر یہ لوگ زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ اصل امر یہ ہے کہ رندی ہمہ و پارسائی می کن۔ ان لوگوں کو جو ریاکار و طالب دنیا نہ سمجھے وہ شاعر نہیں۔ ولا کفر حکمۃ الکل مرزا صاحب جن کا شمار مقدس شعرا میں ہے کہتے ہیں ؎

ذکر ہو شمار ان خدا انگمد ارو کر صد رست بیک حلقہ گند این ہا
کس را بے تر و حکایت آرد مدام خود ید طولی ست در تحصیل روزی خوش گدائی

حافظ کہتے ہیں اور یہ تو شاعر رند مشرب ہیں ؎

رہ یہ برمنا نم ز من مرنج اے شیخ چرا کہ وعدہ تو کردی و او بجا آورد
گرچہ بر واعظ شہر این سخن آساں نشود تا ریا ورزد و سالوس مسلماں نشود
ببوس جز لب معشوق و جام مے حافظ کہ دست زہد فروشاں خطاست بوسیدن
رنگ تزویر پیش ما نبود شیر سرخیم و افعی سیہ ایم

جراٗت کا مجھے ایک شعر یاد ہے ؎

شیخ جو ، کیوں نہ بنے ہو تم فانوس جلا دامن کا یہ بھی گمبر ہے کچھ

ہر زبان کی شاعری میں تقلید قدما فرض ہے۔

ذکر ہیں ہم خفتہ بختوں کی دعا میں ہم اثر اُٹھ شاہ ہو خواب کا ہوتا ہو مضمون بخت ہر اُٹھ
ازل سے مرتبہ پایا ہو اعلیٰ دا ستبعاد ہو نہ نہیں ممکن شرف حجاب سے بیٹھا تھا پر اُٹھ
بھلا اظاہر و باطن ہو یکساں جیلمیں و کیھو نہیں آئینہ کی صورت ادھر سیدھا اُدھر اُلٹا

اس مصرع پر "شاہد خواب کا ہوتا ہو مضمون بخت ہر اُٹھ" مرحوم نے جو مصرع لگایا ہے وہ نکتہ شناسان فن سے داد طلب ہے۔ یہ مصرع ان کے مبلغ شعر کی معیار ہے۔ اور ان کے کامل عیار ہونے کی دلیل ہے۔ اچھا شعر تو اتفاق سے کبھی نکل آتا ہے جس کے لئے کوئی قاعدہ ہی نہیں بن سکتا۔ لیکن مصرع لگانے میں جسے اتنی مہارت ہو ضرور وہ کچھ پیدا کر ہی لیتا ہے۔ تذکرہ خزانۂ عامرہ میں ذکر ہے کہ نورالعین واقف نے ایک مصرع کہا ع
اے چراغت بکف از رنگ حنا زدہ بیا۔ کئی مہینے تک اسیر مصرع نہ لگا یعنی جلا چراغ لے کر دوڑا اس مضمون کا ربط دوسرے مضمون سے اُنکی سمجھ میں نہ آیا مدت کے بعد یہ بات خیال میں آئی کہ شبستان غم میں دل گم ہو گیا ہے اس کے ڈھونڈھنے کے لئے چراغ کی ضرورت ہے۔ دیکھئے غزل کہنے میں کیا کد و کوشش یہ لوگ کرتے تھے۔

ہجر میں آنسو بہاتا ہی رہا زخم دل پانی چُراتا ہی رہا
دے گیا پیک اجل پیغام موت نامہ بر خط لے کے آتا ہی رہا
جان دے دی ہم نے اُسکے بے کہے وہ ستمگر آزماتا ہی رہا

بہانے اور چُرانے میں ایطا نہیں ہے۔ اس سبب سے کہ چُرانے کا الف جزو کلمہ ہو گیا ہے اور بہانے کا الف زائد ہے۔ اگر دونوں جگہ الف زائد تعدیہ کا ہوتا تو ایطا تھا جیسے ستانا، بجانا، ہنسانا، منانا، بجانا، اُٹھانا، ہنسانا، گرانا، بجانا، اڑانا، بچانا، گھلانا، بسانا، چکھانا، گھٹانا، بڑھانا، پڑھانا، تڑانا، پھرانا، کھپانا، تپانا، چرانا، پھنسانا، گلانا

ستانا۔ لگانا۔ جمانا۔ جھکانا۔ پکانا۔ سڑانا۔ جلانا۔ بچانا۔ چڑھانا۔ ڈرانا۔ بنانا۔ اگانا۔ ملانا۔ ہلانا۔ چلانا۔ جلانا۔ دبانا وغیرہ کہ ان سب لفظوں میں الف تعدیہ ہے اور جزو کلمہ نہیں ہوا ہے۔ یعنی الف نکال ڈالو تو کلمہ بامعنی باقی رہتا ہے۔ برخلاف چرانا۔ بتانا۔ ملانا۔ کھلانا۔ پلانا۔ نبھانا۔ اٹھانا۔ دکھانا۔ سکھانا۔ لکھانا۔ رجھانا۔ بوجھانا۔ چڑانا۔ سلانا۔ جگانا۔ گھمانا۔ بھلانا۔ ڈھلانا وغیرہ کے کہ ان لفظوں میں بھی وہی الف ہے مگر جزو کلمہ ہو گیا ہے۔ میں نے یہاں بہت سے الفاظ جتنے اس وقت یاد آئے اس لئے لکھ دیئے کہ ان قافیوں میں کوئی ایطا سے بچنا چاہے تو اسے آسانی ہو۔ ورنہ اصل امر یہ ہے کہ ان قافیوں میں تو بہت کم لوگ ایطا سے پرہیز کرتے ہیں گویا کہ جائز سمجھ لیا ہے۔ مندرجہ بالا تینوں شعروں میں ردیف کیا مزہ دے رہی ہے۔ غزل کے سوا اور کسی صنف شعر میں یہ مزہ نہیں آتا۔

بزم پر نور رکھے آٹھ پہر جام شراب دن کو خورشید ہے شب کو قمر جام شراب
ساقیا سیر ہوں میں اب تو نہ لا جام شراب کیوں چھلکتا ہوا آتا ہے بھلا جام شراب
سمجھ ہم گردش پیمانہ غنیمت سمجھو آخری دور ہی کرتا ہے سفر جام شراب
صبح دم جھومتے ہوئے دو بہار آئی مجھے پھول کھلتا ہے تو آتا ہے نظر جام شراب
غور کر دیتے ہیں ساغر وہ مری کشت فقط آج ہے تشنہ لب خون جگر جام شراب

قدیم شاعری کا ایک مضمون معرکہ آرائے شعرا جام شراب ہے۔ ابتدا اس کی عربی سے ہوئی۔ فارسی گویوں میں پھر اسکا دور شروع ہوا۔ سکندر نامہ کی کوئی داستان ذکر شراب سے اور حافظ کی کوئی غزل خالی نہیں۔ اردو گویوں میں یہاں تک ذکر شراب نے ترقی کی کہ اب مرثیوں میں بیس بیس بند فقط ساقی نامہ کے ہوتے ہیں۔ کسی نے شراب سے شراب معرفت مراد لی ہے۔ اور کسی نے شراب محبت۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ رندانہ مضامین شعر کا وہ میدان ہے جو چھوٹ نہیں سکتا۔ ؎

سبو نہادہ بدوش و قدح گرفتہ بدست فدائے چشم تو ساقی بہوش باش کہ مست

آتش کہتے ہیں ؎

کیا بادہ گلگوں سے سرور کیا دل کو آباد رکھے داتا ساقی تری محفل کو

غرض یہ مضمون بھی مورد اعتراض ہے۔ کہ جو لوگ شراب کو ام الخبائث اور نجس العین سمجھتے ہوں وہ کیا سمجھ کے اسی شراب کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ اور عرفان و تولا کا استعارہ شراب سے کرتے ہیں۔ وہ نور۔ یہ نار۔ وہ خیر، یہ شر، وہ مقدس، یہ نجس۔ یہ اعتراض آجکل کا نہیں ہے بلکہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض اسی بنا پر ہے کہ حقیقت شعر کو سمجھتے نہیں۔ ہر زبان میں شعر کے جو میدان بندھے ہوئے ہیں شاعر انھیں چھوڑ نہیں سکتا۔ یورپ کے لوگ دو ہزار برس سے تقریباً بت پرستی کو ترک کر چکے ہیں۔ مگر آج تک جو شاعر ہوتا ہے وہ ضرور پہلے بتوں کو پکارتا ہے کہ ان کے یہاں معرکہ شعر کا میدان یہی ہے زہیر بن ابی سلمی نے ہرم بن سنان و حارث بن عوف کی مدح میں جو قصیدہ کہا ہے اسکی تشبیب میں ام اوفی کے کھنڈر اور اسکی محمل و ناقہ و سفر کا رونا دس پندرہ شعر تک چلا گیا ہے۔ اہل مدرسہ سے کوئی پوچھے کہ مدح کو اس تشبیب سے کیا علاقہ ہے کیا یہ شخص دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہے ابھی ایک کھنڈر سے باتیں کر رہا تھا ابھی سادات حرب کی مدح اور عبس و ذبیان کی صلح کا تذکرہ کرنے لگا۔

نہیں معلوم کہ وہ کون گھڑی تھی ہائے نکلے جس روز سے دیکھی نہ وطن کی صورت
رونا آیا مجھے غنچوں کی ہنسی پر صورت پھر گئی سامنے اس غنچہ دہنی کی صورت

وطن کا رونا حسب حال اور واقعہ کے مطابق ہے۔ یہ لوگ لکھنؤ سے نکلکر پھر کبھی نہ گئے۔ اسی امید میں رہے کہ بادشاہ کے ساتھ ہی لکھنؤ جائیں گے۔ لیکن بہت ایسے ہیں کہ کبھی وطن سے نہیں نکلے۔ اور شعر میں اپنی آوارہ وطنی کا ذکر اور وادی غربت کی

معصیبتیں باندھا کرتے ہیں جو لوگ شعر کو سمجھتے ہی نہیں وہ ان باتوں پر ہنستے ہوں گے۔ لیکن جو لوگ وطن کے معنی اور وادیٔ غربت کے استعارہ سے ناواقف نہیں ہیں اور اُن مصیبتوں سے آگاہ ہیں جن کی طرف شاعر نے اشارہ کیا ہے ان کو اسی شعر پر وجد ہوتا ہے اسیطرح غنچہ دہن کے لفظ کو بھی اگر آپ بنظر تعمیم دیکھیں تو شعر کے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ غنچہ دہن ہونا معشوق ہی کے لئے خاص نہیں ہے۔ کیا فرزند دختر عزیز و دوست میں نہیں یہ وصف ہوا کرتا۔

گھٹے خونِ تمنا آرزوے دل بہت　　توڑتے دستِ طلب بھی گر نہ سائل بہت
ہو گا فریادی خدا سے سرِ تنِ بسمل بہت　　حشر میں تلوار بھی کچھ آئے گی تا قاتل بہت
یاس و حسرت کشتی ہے بحرِ بیاباں مرگ پر　　یہ مسافر کارواں گم کردہ ہے منزل بہت
کون اب دلسوز باقی ہے بجز داغِ جگر　　شمع بھی ٹھنڈی ہوئی پروانۂ محفل بہت

دونوں مطلعوں کی برجستگی اور دونوں شعروں کا درد قدر شناسانِ سخن کے دل سے پوچھئے۔ مجھے یہ چاروں شعر ان کی بندش و ترکیب ان کی برجستگی و جدت ان کا طرز بیان ان کا رنگ دل سے پسند ہے۔ بس غزل میں یہ شان ہونا چاہئے۔ اگر ایسے ہی مضامین دل آویز ہر زمین میں نکل آیا کریں تو کیا پوچھنا۔

یہ غصہ یہ جفا یہ ستم مہرباں عبث　　بجز کاٹنے سے رقیب کے گریباں عبث

اس مطلع میں ہے یا ہیں کا حذف کر دینا ایک لطف رکھتا ہے

نرگسی چشم میں سرمہ کی ہے تحریر عبث　　تم نے بیمار کو پہنائی ہے زنجیر عبث
کیا کروں گا میں یہ اترا ہوا نقشہ لے کر　　آپ جب پاس رہیں گے تو ہے تصویر عبث
حق کے آگے بھی وہ بت حق پہ تمہیں تھا ہے　　اسکی تقریر بجا ہے مری تقریر عبث

اس مطلع پر مجھے ایک شعر یاد آیا جو عرصہ ہوا لکھنؤ میں سنا تھا جب سے مجھے یاد ہے ؎

کہنہ نگہیں سے آنکھیں بند کی ہیں شرم آئی ہے　　عصائے نرگسِ بیمار اب آنکھ لگائی ہے۔

مطلع بھی خوب کہا اور دونوں شعر بھی خوبی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اُترے ہوئے نقشہ میں ایہام ہے۔ آزاد مرحوم کی تقریر سے متوہم ہوتا ہے کہ ایہام گوئی ختم ہو گئی یہ رنگ متقدمین کے لئے مخصوص تھا لیکن اصل امر یہ ہے کہ اس صنعت کو اُردو کے کسی شاعر نے آج تک تو نہیں ترک کیا سب کے کلام میں یہ بھری ہوئی ہے

قفس میں گھٹ گئے تنا ہے دم نکلنے کی　　چمن سے چھٹ گئے یہ باقی ہے آرزو صیاد
جفا و صبر کا باقی رہے گا افسانہ　　ہمیشہ زندہ رہیں گے نہ ہم نہ تو صیاد

دیکھئے مصرعوں کے درمیان جو سجع پیدا ہو جاتا ہے کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ قافیہ مزہ کی چیز ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ عیب بھی ہے کہ قافیہ کی پابندی جن جن زبانوں میں ہے اس کے سبب سے صدہا مضامین عالی کا اور محاورات برجستہ کا خون کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ شعر کہتے ہیں اُنکے دل سے پوچھئے کہ زمین و قافیہ کے لحاظ سے کیسے کیسے مضامین سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں قافئے بکثرت دستیاب ہیں۔ انگریزی کی طرح یہاں قافیہ کی تنگی نہیں۔ اس پر بھی جو بے تکلفی نظم بے قافیہ میں ہوتی ہے وہ پابندی قافیہ میں ناممکن ہے انگریزی میں نظم بے قافیہ کے لئے ایک ہی وزن مخصوص ہے۔ ہر وزن میں ایسی نظم نہیں کہی جاتی اُردو میں کوئی وزن ابھی تک ایسا نہیں مشخص ہوا جس میں اس نظم کا نمونہ پیش کیا جائے۔ ہماری زبان میں تو جتنے اوزان ہیں ان کی بنا قافیہ پر رکھی گئی ہے۔ اسی غزل کے دوسرے شعر میں یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ جس مصرع میں یا فقرہ میں کوئی ایسا لفظ ہو کہ اس کے نکال ڈالنے سے بھی معنی وہی باقی رہیں ایسے لفظ کے نکال ڈالنے سے کس قدر برجستگی اس کلام میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی شعر کے دوسرے مصرع میں سے پہلے

لفظ زائدہ کو حذف کر کے اسکی برجستگی پر غور کیجئے اور پھر لفظ ہمیشہ کو بھی حذف کر کے دیکھیے کہ اور زیادہ خوبی پیدا ہو جاتی ہے فقط مصرع پورا کرنے کے لئے ایسے الفاظ کے بڑھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میری صلاح یہ ہے کہ ایسے الفاظ کے بڑھانے سے بہتر یہ ہے کہ مضمون اور بڑھا دیں اور اس ترکیب سے مصرع کو پورا کریں شلاً

۶- یہ یاد رکھو کہ رہیں گے نہ ہم نہ تو صیاد۔ مضمون کے بڑھانے سے کلام کثیر المعنی ہو جاتا ہے۔ اور الفاظ زائدہ سے گویا معنی میں اور کمی پیدا ہوتی ہے

تم ہنسی میں رو دیئے کیسا ہو کھیا تمہارا مزاج   مدتوں صحبت رہی اب تک نہ پہچانا مزاج

بول چال اور روزمرّہ کا بعینہ نظم ہو جانا عجب لطف رکھتا ہے۔

شمع آئے جو ترے سامنے روشن ہو کر   جھلملا جائے چراغ تہِ دامن ہو کر
ہم محبت کی نگاہوں کے تو قابل نہ رہے   دیکھو قمری کی آنکھ سے دشمن ہو کر
گل ہوے سیکڑوں پروانوں کی ہستی کے چراغ   شمع اندھیر مچا کر گئی روشن ہو کر
تیغِ ابرو کی جو کھی ہے صفت خامہ نے   کبھی سر ہو کے جھکا ہو کبھی گردن ہو کر

مطلع کا مضمون زبان سے ماخوذ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے حسن کے سامنے شمع شرماتی ہے۔ قمری کی آنکھ میں تی کی تی گر گئی اگر قمری کی ہی آنکھ باندھتے تو یہ ثقل دفع ہو جاتا۔ کی میں سے تی کا گر جانا ایسا ثقیل نہیں ہے۔ مگر لکھنؤ کی خاص زبان یہ ہے کہ تی کو کی پر مقدم رکھیں گے۔ مالک الدولہ کے قلم سے قمری کی ہی آنکھ نکلنا محال تھا۔ سیکڑوں پروانوں میں دو جمعوں کا جمع ہو جانا تنافر سے خالی نہیں۔ اس پر دونوں لفظوں میں سے واو بھی گر گیا ہے کسی شاعر کا کلام ان باتوں سے خالی نہیں دیکھا لیکن اسما و افعال میں سے حروف علت بہ تخصیص وہ حروف جو معروف ہیں نہ گریں تو بندش میں صفائی پیدا ہو جاتی ہے

آیا ہے دل اپنا جو کسی رشک پری پر   شک ہو پر طاؤس کا داغِ جگری پر
جلوہ نظر آئے دمِ آخر جو تمہارا   پھر طور کا عالم ہو چراغِ سحری پر
جس دل میں نہ ہو درد وہ کیا درد کو سمجھے   بے جا نہیں ہنستے ہو مری نوحہ گری پر

داغ جگر میں پری کے نقش و نگارِ حسن کا جلوہ نظر آ رہا ہے اس سبب سے وہ پر طاؤس بن گیا ہے۔ یہ مطلع تو بہت اچھا ہے لیکن اس قسم کے مضمون اکثر بے معنی ہو جاتے ہیں۔ شلاً آنکھوں کے عشق میں بیمار ہوا تو طبیب نے روغن بادام نسخہ میں لکھا اور اگر مر گیا تو قبر سے نرگس بجائے سبزہ پیدا ہوئی اور اگر سبزہ اُگ آیا تو ہرن آ کر کے چر گئے اور اگر ان سب آفتوں سے بچے تو خواب میں بہار نرگستان و حلقۂ غزالاں ضرور دکھائی دے گا۔ ایسے تخیلوں سے احتراز چاہیئے دوسرے شعر میں جلوہ سے تجلی الٰہی اور چراغ سحری سے اپنا نفس واپسیں مراد ہے۔ یعنی تمہارے جلوہ سے اس چراغ سحری میں تجلی طور کی روشنی پیدا ہو جائے گی۔

سودا بڑھا ہے قید کی تدبیر دیکھ کر   پھر زلف یاد آ گئی زنجیر دیکھ کر
غارت یہ نوجوان کے باندھے ہے تو کمر   انکا شباب اے فلکِ پیر دیکھ کر
محشر میں بچ سکے گا نہ قاتل شہید سے   پہچان لیں گے کشتۂ شمشیر دیکھ کر
زاہد ہوا کرامتِ ساقی کا معتقد   شیشہ میں آفتاب کو تنہو دیکھ کر

باندھے ہے تو کمر یعنی باندھے ہوے ہے۔ محاورہ میں ہوتے کو اکثر ترک کر دیتے ہیں۔ جناب نفیس مرحوم نے حضرت امیرؑ کی مدح میں کہا تھا کہ ع غزوۂ ذات سلاسل کی بھی کڑیاں جھیلے۔ اس کا چرچا حیدرآباد میں بہت ہوا کہ میر صاحب نے یہ کیا پڑھا۔ کڑیاں جھیلیں کہنا چاہئے تھا۔ یہ ذکر اس ہیچمدان تک بھی پہنچا۔ اور لوگ مستفسر ہوے۔ میں نے سمجھا دیا کہ ہوتے یہاں سے محذوف ہے اور یہ حذف فصحا کے محاورہ میں ہے۔ اس شعر میں اُن کی ضمیر نوجوانوں کی طرف پھرتی ہے۔

کم کیجئے نہ ظلم و ستم اور چند روز / سہتے ہیں ہم بھی رنج و الم اور چند روز

اکثر خلافِ عہد کیا ہے حضور نے / پھر دیکھتے ہیں قول و قسم اور چند روز

تھا دل میں قصد ہم بھی چلے جائیں ساتھ ساتھ / نکلے جو رہروانِ عدم اور چند روز

ہم جان دیں گے پھوڑ کے سر مثل کوہکن / مجنوں کے ہیں قدم بہ قدم اور چند روز

مطلع میں اپنی زیست سے مایوس ہونے کو بکنایہ ظاہر کیا ہے۔ اور کنایہ صنائع شعریہ میں بہت لطیف صنعت ہے۔ یہ مطلع اور اس کے بعد والا شعر جفاکاری و بدعہدی کی شکایت میں ہے۔ کچھ یہ ضرور نہیں کہ یہ خطاب معشوق ہی سے ہو۔

(باقی آئندہ)

علی حیدر طباطبائی

مالک الدولہ صولت

پڑ گئے ہیں یوں دلِ صد چاک میں داغ   جس طرح ہوں لالۂ احمر میں داغ
خوف ہے مجھکو دلِ پُر درد سے   پڑ نجائیں دامنِ محشر میں داغ

مطلع کی بندش اچھی ہے زوائد سے پاک ہے مگر تشبیہ مبتذل ہے اور کسی قسم کی تازگی بھی نہیں ہے۔ دامنِ محشر میں داغ پڑجانے کی تخیل اچھی معلوم ہوتی ہے۔

ہے خدائی اس بتِ بے دین و ایماں کی طرف
کون بندہ حق کے گا اب مسلماں کی طرف
رفتہ رفتہ دستِ وحشت کی رسائی دیکھئے
آستیں کا چاک جا پہنچا گریباں کی طرف
لوگ کہتے ہیں حشر اک دن قیامت آئے گی
کاش آنکھ تمہیں گورِ غریباں کی طرف
ہم تو کہتے ہیں کسی سے واسطہ ہم کو نہیں
آپ تو کہئے اٹھا کر ہاتھ قرآں کی طرف
دن ہمارے قتل کا قاتل بتانا ہی نہیں
ابروؤں کا ہے اشارہ عید قرباں کی طرف
سنتے ہیں صولت گرفتارِ بلائے زلف ہے
کیا وہی جکڑا ہوا جاتا تھا زنداں کی طرف

اس زمین میں بھی حسن تغزل بھلا معلوم ہوتا ہے قرآن کے قافیہ میں یہ غنیمت ہے کہ محض بدگمانی ظاہر ہوتی ہے ورنہ معشوق کے مبتذل ہوجانے میں کوئی بات باقی نہ رہی تھی ؎

نہیں داغِ دل ہیں مٹانے کے قابل   یہ گلشن ہیں اُن کے دکھانے کے قابل
جدائی میں ہم منہ لپیٹے پڑے ہیں   نہ آنے کے قابل نہ جانے کے قابل
جو رمز و کنایہ لکھا خط میں اُسنے   وہ باتیں نہیں ہیں جتانے کے قابل
کہا بے وفا دل لگی میں تو بولے   کوئی ڈھونڈھ لو دل لگانے کے قابل
محبت کا گیسو کی پابند ہوں میں   نہیں بیڑیاں یہ بڑھانے کے قابل

بحر متقارب فعولن چار بار۔ اس وزن میں اکثر موزون طبع ناواقف عروض یہ غلطی کرجاتے ہیں کہ مصرعہ کو فعول یا فعل پر تمام کردیتے ہیں حال آنکہ فارسی و اردو کے شعرا میں کسی نے ایسا نہیں کیا مثلاً محبت کا گیسو کی پابند ہوں۔ اسی پر مصرعہ تمام کردیا جاتا تو رکن آخر سالم نہیں رہتا اور وزن میں خلل پڑتا ؎

ہوا از لفوں پر اُسکی مبتلا دل   کئے کی اپنے پائیگا سزا دل
وہ بیٹھے ہیں مرے پہلو بہ پہلو   جگر کی جا جگر ہے دل کی جا دل

اس مصرعہ میں حالت اطمینان کی صورت کھینچی ہے حال آنکہ اطمینان ایک معنوی و باطنی شے ہے اُس کے لئے صورت کیا بالتزام یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ فراق میں جگر و دل ٹھکانے نہیں رہتے۔ شاعر کا کام مصوّری ہے اور یہ سچ ہے کہ کوئی تصویر غیر مہذب بھی ہوتی ہے مگر وہ بھی تصویر ہی ہوتی ہے بلکہ تصویر سے بڑھکر۔ اس لئے کہ معانی کی تصویر کھینچنا شاعر ہی کا کام ہے مصوّر میں یہ ہنر کہاں ؎

جن کے ستم اُٹھا کر برباد ہو گئے ہم   نازاں ہیں اب وہ اِس پر جلاد ہو گئے ہم
مطلب نہیں کسی سے اپنی کام عاشقی ہے   افکار دنیوی سے آزاد ہو گئے ہم
شیریں سے منہ نہ موڑا کہسار کو نہ چھوڑا   سر پتھروں سے پھوڑا فرہاد ہو گئے ہم

کیا مطلع کہا ہے۔ اور شعروں میں بھی کیا اچھا تغزل ہے لیکن اُردو کی شاعری اور زبان کی اصلاح کرنے والے یہ کہا کرتے ہیں کہ آخر فرہاد و مجنوں کا ذکر کب تک کئے جاؤ گے یہ مضمون کیا کبھی پُرانا نہو گا۔ اسی طرح اگر بہزاد و شداد کے قافئے کئے تو وہ بھی پُرانے ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کو مرے ہوے نہیں معلوم کے ہزار برس گزر گئے۔ پھر اسی قیاس پر صیاد و جلاد کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے مگر ان کی شکایت کرتے کرتے بھی زمانہ ہو گیا۔ کہاں تک کوئی سن سکتا ہے یہ اعتراض بظاہر بہت قوی معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواب اس کا یہ ہے کہ ان قافیوں کے ساتھ "ہو گئے ہم" بھی تو لگا ہوا ہے دوسرے جو قافئے معرکہ الفار شعرا رہا کئے ہیں اس سے تجاوز کرنا غزل میں نامناسب بلکہ غریب و رکیک معلوم ہوتا ہے۔ ناسخ مرحوم گیسو آہو کے قافیوں میں راسو ضرور کہا کرتے تھے اور اس پر انھیں ناز تھا کہ میں نے نیا قافیہ نکالا۔ مگر غرابت سے خالی نہیں۔ غزل میں یہ عیب بے شک ہے کہ اسکا مزہ لیسا پڑجاتا ہے کہ شاعر دوسرے اصنافِ سخن سے اکثر بیگانہ رہتا ہے فارسی و اُردو کی شاعری میں غزل و قصیدہ اکثر ہے بعض شعرا مثنوی و مرثیہ بھی کہتے ہیں۔ غیر زبانوں کی شاعری میں زیادہ تر کسی موضوع پر شعر کہتے ہیں یا کسی منظر کا سماں دکھاتے ہیں یا مثنوی کہتے ہیں اور فسانہ گوئی کرتے ہیں۔ غزل ان کے کلام میں نہیں ہے۔ ہمارے قصیدوں کی تشبیب و تمہید اکثر کسی منظر لطیف یا کسی موضوع اخلاقی پر شامل ہوتی ہے مگر مقصود قصیدہ کا کسی امیر کی مدح ہوتی ہے۔ اس سبب سے تشبیب کا مضمون بھی مبتذل ہو جاتا ہے۔ فسانہ گوئی شریعۃ اسلام میں ناجائز قرار پائی ہے۔ اس سبب سے شعرائے اہل اسلام نے اس سے اجتناب کی ہے۔

جانتے زیست کو جو نقش بر آب ۔ بیٹھتے خیمۂ حباب میں ہم
اس کے مرنے کی سنتے ہیں جو خبر ۔ فرق پاتے ہیں اضطراب میں ہم

اس زمین میں بھی دونوں شعر خوب ہیں اور خیمۂ حباب والا شعر تو تعریف سے مستغنی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ انسان خیمۂ حباب میں کیونکر سما سکتا ہے تو میں یہی کہونگا کہ وہ شعر کو نہیں سمجھ سکتے۔ ہستی جس دریا کا نقش بر آب ہے اس کا حباب کچھ اور ہے۔

نظر آتا ہے مجھکو جان کا خطرہ آفات میں ۔ شال بغل میں اگر گرم ہوں تیغ ستم میں
جدائی میں تری ہیں سو طرح کا شاخسانہ گل ۔ عجب کیا ہوں جو دامن گیر صحرائے قیامت میں
گرا ہیں عالم خوف و رجا میں کیونکر تر دامن ۔ یقیں ہے تیغِ غضب کا بھی ہو دلکو ابر رحمت میں

مطلع میں وہ مضمون عالی ہے جسے فکرِ شاعر کا کارنامہ کہنا چاہئے۔ ایسے شعر بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔ کانٹے کا دامنگیر ہونا بھی لطف سے خالی نہیں۔

غم ہجراں سے آرام نہیں، مجھے اصلا تاب کلام نہیں
اس قصہ کا انجام نہیں، یہ فسانہ وہ ہے کہ تمام نہیں
تری یاد میں جب سے فقیر ہوا، ترے عشق میں جب سے کہ جوگ لیا
رہا دشت میں منہ پہ بھبوت ملا، مجھے دیر و حرم سے کام نہیں
ہیں نزع کے طور نکلتا ہے دم، او الٹی سانسیں لیتے ہیں ہم
ہٹ جاؤ ہمارے سر کی قسم، اب وقت شمار کلام نہیں
سر قبر وہ آئے جو بال کھلے، پڑھا فاتحہ رو کے یہ کہنے لگے
او ظفر، بیٹھے ہیں کب سے ہم آئے ہوئے [illegible] کلام نہیں

یہ فسانہ وہ ہے کہ تمام نہیں، اس میں چاروں فعلن متحرک العین اور الٹی سانسیں لیتے ہیں ہم، اس میں چاروں فعلن ساکن ہیں اس سبب سے کہ فعلن میں تین متحرک پیاپے جمع ہو گئے ہیں

اور یہ کلیہ عروض فارسی کا ہے کہ جس بحر میں تین متحرک جس جگہ پے در پے آجائیں وہاں دوسرے کو ساکن کر سکتے ہیں لیکن اُردو کے شعرا اس وزن کے سوا اور کسی بحر میں ایسا تصرف کم کرتے ہیں۔

پریوں کو اس نے بند کیا ہے حباب میں ہر دم نہیں ہیں چشم بت بے حجاب میں
کیوں آسماں چھپا ہے گلیم سحاب میں اک برق آہ سے میں جلا دوں گا، دیکھنا
کیفیتیں زیادہ ہیں کہنہ شراب میں ہوتا ہی پختہ کار سن امیں شک نہیں
وہ تی جلا ہوا آئینۂ آفتاب میں پہنچے وہاں غبار جو اس خاکسار کا
وہ صورتیں نظر نہیں آتی ہیں خواب میں پیش نگاہ رہتے تھے صورت جو رات دن

زجاجی سرپوش کو بھی حباب کہتے ہیں جس کے نیچے گلدستے وغیرہ رکھتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مقصود ہیں مطلب یہ کہ پریوں کو شیشہ میں اُتارا ہے۔ آسمان کا گلیم سحاب میں چھپنا کیا اچھی تخیل ہے۔ اپنی خاک سے آئینۂ آفتاب کی جلا ہونا بہت ہی تعلّی کا مضمون ہے۔ لیکن شاعر کے منہ سے تعلّی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور خاکسار کا لفظ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مرتبہ خاکساری سے حاصل ہوا ہے۔

غنودگی ہو مگر بے حساب آنکھوں میں نہیں اگرچہ خمارِ شراب آنکھوں میں
یہاں کی طرح سے ہو انقلاب آنکھوں میں کبھی وہ دیکھتا ہو لطف سے غضب سے کبھی
کیا ہے، اس نے اب پا تراب آنکھوں میں تمہارے ہجر میں مہمان ہوں کوئی دم کا

مطلع میں یہ بات نہ بتائی کہ یہ کس کی آنکھ کا ذکر ہے اور اس سے کلام کا حسن زیادہ ہو گیا۔

یہ رنگ پر ہو بہار گلچیں، کہ گل سے نازک ہیں خار گلچیں
غضب ہو گل کا نکھار گلچیں، یہ لطف ہو یادگار گلچیں
کسی کا ہوتا نہ خوف حاشا، چمن بھی اپنا تھا گل بھی اپنا
زمانہ آرام سے گزرتا ہمارا ہوتا جو یار گلچیں
نہ کیوں ہو سیر چمن سے نفرت، یہ رنگ دکھا رہی ہے قدرت
کھلے جو وہ پھول بعد مدت، تو آ کے ٹوٹے ہزار گلچیں

لکھنؤ کی شاعری میں گل و بلبل و صبا و گلچیں کا ذکر بہت ہے۔ ایسے اشعار کو استعارہ پر محمول کرنا چاہئے۔ غرض کہنے والے نے اس نکتہ کو سمجھ کر نہیں کہا ہے۔ اس کے نہ سمجھنے سے شعر کو ضرر نہیں۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ہم نے تقلید قدما میں اسی قسم کے مضامین باندھے جیسے ان کے کلام میں دیکھے اور اہل مذاق نے جب داد دی تو تنبہ ہوا کہ اس شعر کی یہ خوبیاں ہمارے خیال میں نہ تھیں۔

اور دیوانہ کو انگشت نما کرتے ہیں آج پھلا وہ تنہائی کا عطا کرتے ہیں
ہم ابھی ٹھٹھا مگر جان فدا کرتے ہیں آپ عاشق ہیں سمجھیں کہ نہ سمجھیں اپنا
اب تو قرآن پہ قرآن اُٹھا کرتے ہیں جھوٹی قسمیں نہیں کھاتے ہیں نہیں کچھ وسواس
آپ اُلٹا ہنستے ہیں اور ٹھوکر کرتے ہیں دل لگی اُلٹی ہو اغیار سے اُڑا دینا
گوشت ناخن سے وہی لوگ جدا کرتے ہیں اعتماد آپ کو جن جن کی رقابت پر ہو
شکر ہو شکر ہی بیٹھے ہیں دعا کرتے ہیں پوچھتا کیا ہو مزاج اپنے مریضوں کا مسیح
جلنے والے تو اسی طرح جلا کرتے ہیں تم سے مطلب ہی نہیں اور کسی سے کیا کام

اس غزل کے مطلع میں تو ایک عاشقانہ معاملہ ہے۔ باقی جتنے شعر ہیں وہ دیکھنے ہی میں عاشقانہ معلوم ہوتے ہیں ورنہ یہ معاملات اہل دنیا میں ہوا ہی کرتے ہیں۔ عاشق و معشوق کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ شاعر کے کلام کو عام کر کے دیکھو تو معلوم ہو کہ وہ دنیا کے کن کن معاملات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

ہم جان دیتے ہیں اس مرد خدا آیا کہیں بت پرستوں کو کہا کرتا ہو واعظ نشست
آپ تو بیکار رُٹتے ہیں ہوا سے کیا کہیں آدر کئے پر ہوئے ہم تو ہم خاموش ہیں
دم سماتا ہی نہیں زرہ بکا سے کیا کہیں پوچھنا رونے کا بات ہچکیاں تھمتے تو دو

مصلحت جو قتل عاشق میں تھی خود ظاہر کریں   مجھ سے کیوں پوچھا میں کیا جانوں خدا سے کیا کہیں

بت پرستوں کو برا کہنا اس سبب سے برا معلوم ہوتا ہے کہ خود بھی بت پرست ہیں بت پرستی سے مراد محویت ہے جو عالم اجسام کو دیکھکر طاری ہوتی ہے۔ شاعر اُسے مظاہر قدرت سمجھتا ہے اور صوفی سدِ راہِ معرفت خیال کرتا ہے۔ بُکا کا قافیہ قباحت سے خالی نہیں۔ میرے خیال میں یہ لفظ زبان شاعر کا نہیں ہے خصوصاً شاعر غزل گو۔

چال سے آفت بپا کر آئے ہو   فتنۂ محشر جگا کر آئے ہو
شکل تم جس کو دکھا کر آئے ہو   اُس کو دیوانہ بنا کر آئے ہو
جذبِ دل پھر کھینچ لایا ہے اِدھر   کیسے اُلٹے پاؤں جا کر آئے ہو
وہ ہوا امید اسیری میں ہلاک   جس کو صدقے میں رہا کر آئے ہو
سنکے مجھسے دردِ دل کہتے ہیں وہ   ہائے کیا فقرہ بنا کر آئے ہو
میں نے جا کر جب کہا مرتا ہوں میں   بولے سچ سچ زہر کھا کر آئے ہو
آہ نے صولت کی دکھلایا اثر   یار کچھ تلملا کر آئے ہو

صولت نے یہ غزل جس رنگ میں کہی ہے یہ رنگ لکھنو میں اُچھلا اور موجد اس کے جرأت ہوئے۔ پھر ناسخ و آتش کا رنگ اس پر غالب آگیا۔ آخر میں فصیح الملک مرزا داغ مرحوم نے اس رنگ کو اپنے حصہ کا کر لیا۔ حال آنکہ وہ کہتے تھے کہ میں نے ابتدا میں شیخ ناسخ کا تتبع کیا پھر حکیم مومن خاں صاحب کا طرز اختیار کیا۔ پھر میں اپنے رنگ پر آگیا۔ مگر اصل امر یہ ہے کہ یہ رنگ جرأت کا ہے اور خاصہ اس رنگ کا یہ ہے کہ اکثر کلام سست اور بے مزہ رہتا ہے۔ جرأت کا ضخیم دیوان چھپ چکا ہے اور لوگوں کی نظر سے گذر چکا ہے چند اشعار جو بیشک بہت شوخ ہیں ان میں بھی معاملات عاشقانہ اکثر تعلق ناجائز کا پہلو لئے ہوئے ہیں ؎

وہ ننگ سب بچھونا یا گھر سے نکلکر آنا   یا وہ راتوں کو سدا بھیس بدلکر آنا
جرأت اُسکی کہوں کیا تجھسے ادا ری میں   جانا جب اُٹھ کے تب اک روپ بدلکر آنا
گالیاں دینے لگے نام مرا لے لے تم   کچھ مری چاہ کے کھل جاتے ہی کھل کھیلے تم
پڑے ہے بزم میں جس شخص پر نگاہ تری   تو منہ کو پھیر کے کہتا ہے ان پناہ تری
کہا جو میں نے کہ ہو دل جلوں کی واک حق   تو بولا دُھار تجھی پر پڑیگی آہ تری
میر سے جو اشارہ سے رکھا گھیر کسی نے   سو باتیں سنائیں مجھے منہ پھیر کسی نے
دیکھوں تو یوں وہ لگے منہ کو ڈھانپنے   کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں جانچنے

غزل میں کسی حسین کی تصویر دکھانا یا اسکی کسی ادا کا ذکر کرنا اس ہیچ مداں کی رائے میں خلاف تہذیب نہیں ہے اور مہذب قوموں کے شعرا کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بھی اسی وادی کے سالک ہیں البتہ معاملات عاشقانہ جن سے تعلق ناجائز سمجھا جائے شعر میں ہوں تو اخلاق پر بُرا اثر ڈالتے ہیں۔ اسی وجہ سے محقق طوسی امراؤ القیس و ابو نواس کا دیوان دیکھنے کو منع کرتے ہیں اور اوویس نے سیفو شاعرہ یونان کا کلام تلف ہو جانے کو غنیمت سمجھا ہے۔

ناسخ و آتش نے کھلے کھلے جذبات کے نظم کرنے سے کراہیت کی لیکن پھر بھی استعارہ کے پردہ میں اس طرح کے مضامین اُنکے کلام میں موجود ہیں۔ کوئی اس بات کو سمجھا نہیں کہ ایسے مضامین مطلقاً ترک کرنا چاہئے۔ شیخ ناسخ نے اس مصرعہ میں۔ ع
رکھوں ہیں ساق ساقیِ گلفام دوش پر۔ کنایہ و تجنیس کی آڑ پکڑی ہے مگر بات تو وہی ہے جو کہنے کی نہ تھی۔ داغ نے یہ مضامین اس برجستگی سے نظم کئے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ تعجب یہ ہے کہ جلال مغفور و امیر مرحوم کے کلام پر بھی اس کا اثر پڑ گیا۔ تقریباً پچیس برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ تیسرا دیوان جلال کا چھپا ایک نسخہ اسکا حیدرآباد میں مجھے بھیجا اور یہ لکھا کہ یہ دیوان میں نے اہل دہلی

کے رنگ میں کہا ہے۔ میں نے اس عطیہ کے شکریہ میں یہ کلا بھی لکھا کہ ہمیں تو آپ کا پہلا ہی رنگ زیادہ تر پسند ہے۔ مختصر یہ کہ وہ مجھ سے خفا ہو گئے۔ مگر مالک الدولہ اور بادشاہی دربار کے شعرائے سبعہ سیارہ ایسے کورہ دہ میں رہے جہاں سے نہ کسی شاعر کا کلام باہر نکلا نہ کسی کا شہرہ وہاں تک پہنچا۔ داغ مرحوم کا پہلا دیوان بے شک چھپ چکا تھا اور وہ خود بھی مٹیابرج وکلکتہ کے مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ لیکن انکی شہرت کا زمانہ مالک الدولہ نے کہاں دیکھا مٹیابرج کا خاتمہ ہو جانے کے بعد حیدرآباد میں جب میں پہنچا ہوں تو مرزا داغ صاحب یہاں آچکے تھے اور سیف الحق ادیب مرحوم کے مہمان تھے اور ایڈیٹرول میں تھے۔ ایک غزل انہوں نے اپنی سنائی کہ یہ تازہ فکر ہے

پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے اجل رہ گئی تو کہاں آتے آتے

ساری غزل مرصع اور نہایت برجستہ تھی مگر اس شہرت عام کو دیکھئے کہ وہاں سے میں اُٹھا تو راہ میں وہی غزل گائی جا رہی تھی۔ ہمارے زمانہ میں یہ شاعر بڑا مقبول واقبال مند گزرا غزلیں ان کی گانے کے مناسب ہوتی تھیں اور اسی سبب سے شہرت بھی ان کی سی کسی غزل گو کو نصیب نہ ہوئی۔ مگر حیدرآباد بلکہ تمام ہندوستان میں تہذیب جدید نے اتنی جلد ترقی کی کہ ان مرحوم کی زندگی ہی میں انکا رنگ پھیکا پڑ گیا اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ چوما چاٹی کے مضمون کہنا جانتے ہیں۔ اتنے بڑے دربار میں کوئی شاندار قصیدہ نہ پیش کر سکے اسی اثنا میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ اب کے دفعہ وہاں کئی خوش فکر شاعروں کو دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی۔ یعنی جناب منشی نوبت رائے صاحب نظر اور حضرت محشر اور حضرت فصاحت۔ محرم کے دن تھے برادر معظم نواب سید فدا حسین خانصاحب طباطبائی سے ملنے کو میں حسین آباد گیا وہ مجلس میں جانے کو گھر سے نکل چکے تھے۔ بی حیدر کے یہاں سالانہ مجلس تھی مجھے اپنے ساتھ لئے ہوئے مجلس میں چلے گئے۔ وہاں بھی اکثر ایسے احباب سے ملاقات ہوئی جو شعر وسخن کا مذاق رکھتے تھے۔ مجلس شروع ہونے میں عرصہ تھا۔ مرزا داغ کا ذکر ہونے لگا ایک صاحب نے کہا داغ اپنے طرز میں منفرد ہیں فصاحت نے کہا اب تو کل کے چھوکرے اُسی طرز میں غزل کہہ لیتے ہیں۔ میں نے کہا اُس شخص کے کمال کی بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں کے مشاہیر شعرا پر اُس کے کلام کا ایسا اثر پڑا کہ رنگ سخن بدل گیا۔ ایک اور بزرگ بیٹھے تھے انہوں نے کہا غرض اُس سے یہ تھی کہ دیکھو ہم ایسا بھی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کہا الفضل للمتقدم۔

حیدرآباد میں جب میں آیا تو مرزا داغ مرحوم پوچھنے لگے کہ لکھنؤ میں ہمارا بھی ذکر کسی سے آیا تھا۔ میں نے حیدر کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی تھی یہ سمجھ کر بیان کی کہ وہ خوش ہوں گے مگر اُنھیں ملال ہوا۔ کہنے لگے جی ہاں ہمارا طرز سخن چھوکروں ہی کے کہنے کا ہے۔ میں یہ ذکر کر کے پشیمان ہوا۔ گویا وہ اُسے میری رائے سمجھے۔ حال آنکہ میری رائے اُنکی نسبت میں وہی تھی جو میں نے بیان کی اور اُن کے کلام کا بڑا قدرداں میں تھا۔ اور وہ بھی میری ہرزہ سرائی کو جس غور سے سنتے تھے کسی اور کے کلام پر ایسی گہری نظر نہیں ڈالتے تھے۔ یہ کل کی بات ہے جیسے آج میں کہانی کی طرح بیان کر رہا ہوں۔ ایک دفعہ کہنے لگے یہ جو طرح ہوئی ہے رفتار کسی کی اور تکرار کسی کی اس میں کچھ شعر کہے ہوں تو پڑھئے۔ میں تو مشاعرے میں نہیں جاؤنگا۔ مجھے جو شعر یاد آتے گئے میں پڑھنے لگا ایک شعر یہ تھا۔

واعظ ہو کر زاہد ہو یہ بے فصلِ بہار ہم رندانِ خرابات میں گے نہ زنہار کسی کی

قافیہ اس کا میری زبان سے پورا نہ نکلا تھا کہ انہوں نے ایسا مزا لے کے ردیف کو پڑھا جیسے کوئی سم پر بے چین ہو جاتا ہے۔ اور مجھ سے کہا سچ کہئے گا یہ داغؔ کا رنگ ہے کہ نہیں۔ میں نے کہا آپ کا فیضِ صحبت کہاں تک نہ پہنچے گا۔ مگر اس شعر کے رنگ کو بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

جرأت مجھے ہوتی ہو پہنچنے پہ صدا کے اک بات اٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

کہنے لگے یہ اور ہی چیز ہے۔ پھر ایک شعر میں نے اور پڑھا ؎

یوں مر کے نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مردہ یوں ہی، کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

کہا اس کا کیا پوچھنا۔ مرزا داغؔ کے چھوٹے بھائی شاغلؔ مرحوم ذوقؔ کے شاگرد اور بڑے خوش فکر شاعر تھے وہ بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے ان سے میں نے کہا کچھ اپنا کلام سنائیے۔ مرزا داغؔ نے کہا ان کو شوق ہی نہیں آپ کی طرح سے برسوں میں ایک آدھ غزل کہہ لیتے ہیں غرض شاغلؔ نے بہت اچھی ایک غزل پڑھی زمین یہ تھی کہ ہو جائے گا اور رو جائے گا ان کا ایک شعر مجھے یاد رہ گیا ؎

تم شبِ وصل میں افسانہ کہو میں سمجھا کہ یہ پہروں کا ہو جاگا ہوا سو جائے گا

وہ زمانہ جب کہ حجاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
یہی چہرہ زیرِ نقاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہمیں جاں نثار تمہارے تھے، کہ ہمیشہ جس سے اشارے تھے
کبھی عاشق اپنا خطاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جو اٹھائے لطفِ وصال میں، انہیں آتے وہم و خیال میں
وہ گزشتہ عیش بھی خواب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ ملال آج ہو بوسہ پر، بھلا پیٹے کی بھی ہو کچھ خبر
نہ حساب تھا، نہ کتاب تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

حکیم مومن خاں صاحب کی نکالی ہوئی زمین ہے۔ ع

وہ جو ہم سے تم سے قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ یہ غزل لکھنؤ میں بہت مشہور رہے اور مٹیا برج میں بھی اربابِ نشاط کے زباں زد تھی۔ مومنؔ نے "تھا" کو قافیہ قرار دیا اور ملک الدولہ نے تھا کو بھی ردیف کر دیا اور حجاب و نقاب قافیہ قرار دیا اب یہ زمین زیادہ خوبصورت ہو گئی۔ اس غزل کے آخر شعر میں دیکھئے کہ محاورہ قیاس پر کس قدر غالب ہے۔ ایسی مثال اس مسئلہ کے سمجھنے کے لئے بہت کم ملے گی۔ کتاب مونث ہے مگر محاورہ نے اپنی زبردستی سے اُسے مذکر بنا لیا۔ بھلا کے الف کا گرنا بُرا معلوم ہوتا ہے ؎

وحشیں تحیرت لیلی نظر آتا ہے مجھے تھا جو مجنوں کو وہ سودا نظر آتا ہے مجھے
انکے ابرو کے تصور میں رواں ہیں آنسو تیغ کی باڑھ پہ دریا نظر آتا ہے مجھے
ہمسری کی تھی جو کل تجھ سے مہ کامل نے آج چہرہ بھی کچھ اترا نظر آتا ہے مجھے
کس طرح شکر کا سجدہ نہ بجا لاؤں میں یار کا نقشِ کفِ پا نظر آتا ہے مجھے
تیری باتیں ہیں قیامت کی غضب کے فقرے آج بھی وعدہ کو فردا نظر آتا ہے مجھے
اسے کچھ کم نہ ہوئی تھی جگر کی دھڑکن قیس لیلی کا تماشا نظر آتا ہے مجھے
تم نے کیا پھیر لیں آنکھیں کہ جہاں مجھ سے پھرا کوئی اپنا نہ پرایا نظر آتا ہے مجھے

چاند کا ایک رات میں چہرہ اتر جانا کیا اچھی تخیل ہے۔ شاعر کے سوا کسی کو ایسی باتیں نہیں سوجھتیں۔ میں نے درخشاں کا جو تذکرہ رسالہ ادیب میں شائع کیا تھا اس میں یہ نکتہ جاننے کے قابل لکھا تھا کہ بوسہ ابرو میں نہایت تصنع معلوم ہوتا ہے۔ بوسہ لینے کے جو مقامات ہیں ان میں ابرو نہیں لیکن تصورِ ابرو میں بھی ویسا ہی تصنع ہے۔ لیکن تیغ کی باڑھ پر دریا کا ہونا کیونکر بنتا۔ اس قسم کا توسع اساتذۂ فارس کے کلام سے ماخوذ ہے۔ حافظؔ کہتے ہیں ؎

ورنہ از مرغم ابروے تو در یاد آمد   حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

مگر تشنج کسی کے کلام میں ہوا اچھا نہیں۔

اے دل تجھکو خیال کیا ہے   کھلا گیا کیوں ملال کیا ہے
دانستہ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں   مطلب کیا ہے سوال کیا ہے
ماشاء اللہ ابھی سے ہو شوخ   کیا عمر ہے سن و سال کیا ہے
بنتے نہیں ہم سوائے تعلق   اے شیخ یہ قیل و قال کیا ہے
آنکھوں میں حیا و سادگی ہیں   آرائش خد و خال کیا ہے
دیکھو دیکھو نہ حشر ہو جائے   سنبھلو سنبھلو یہ چال کیا ہے
محفل میں کسے وہ ڈھونڈتے ہیں   اٹھ اٹھ کے یہ دیکھ بھال کیا ہے
مسلا ہے کسی کا غنچۂ دل   مٹھی میں یہ لال لال کیا ہے
بوسہ ہونٹوں کا لوں جو بے حکم   کیا منہ ہو مرا مجال کیا ہے

یہ وزن رباعی کا مجزو ہے۔ رکن آخر کے کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ مجھو "اے دل تجھکو خیال کیا ہے" تبلاؤ یہ رباعی کے اوزان میں سے ایک وزن ہے۔ اس میں سے جتنا نکال ڈالا مجزو رباعی حاصل ہوا۔ اس وزن میں تین متحرک ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ یعنی مفعول مفاعلن مفاعیل میں مفعول کا لام اور مفاعلن کا میم اور ف متحرک ہیں۔ اردو کہنے والے بھی یہاں تسکین متحرک ثانی کا قاعدہ جاری کرتے ہیں اور مفعولن فاعلن مفاعیل کے وزن پر جس مصرع کو چاہتے ہیں کہتے ہیں۔ مگر رباعی کی طرح بعض لوگ اس میں بھی دھوکا کھاتے ہیں۔ دو حرف زیادہ کہہ جایا کرتے ہیں جس سے مفعولن مستفعلن مفاعیل ایک غلط وزن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وزن میں شعر کہنے والوں کو میں اس عام الورود دھوکے سے متنبہ کر دینا مناسب سمجھا۔ داغ کی ایک رباعی میں میں نے یہی غلطی پائی۔ وہ مصرع مجھے اس وقت یاد نہیں مگر وزن اس کا یہ تھا مفعولن مستفعلن مفاعیل فعل۔

یہ بگڑ رہی آپ کا آنا غنیمت ہو گیا   تھم گئے نالے قیامت ہو کے برپا رہ گئی
پھینک کر تیر نظر دو چار دو راہی ہوا   زخم دل میں رہ گئے زخمیں دل میں رہ گئی
کھا کے ٹوٹا بھنور ابھرا میں غریق بحر عشق   ہاتھ ساحل سے بڑھا کر موج دریا رہ گئی
اپنے بیگانوں نے اس شوکت سے پہنچا ہم بعد گور   سب ہوئے رخصت لحد میں لاش تنہا رہ گئی

موج کا غریق کے نکالنے کو ہاتھ بڑھانا تازہ خیال ہے لفظ لحد بسکون ح ہے۔ لیکن فارسی والے بتحریک باندھا کرتے ہیں اور اردو کہنے والے اُن کے متتبع ہیں۔ غرض دونوں طرح نظم میں لانا صحیح ہے۔ رہ گئی اور رہ گیا کی ردیف مجھے اکثر مزہ دیتی ہے حافظ کی اس غزل میں حسن ردیف قابل لحاظ ہے۔

ہر کہ شد محرم دل در حرم یار بماند   آنکہ ایں کار ندانست در انکار بماند
داشتم دلقے و صد عیب مرا می پوشید   خرقہ رہن مے و مطرب شد و زنار بماند
گشت بیمار کہ چوں چشم تو گردد نرگس   شیوۂ آں نشدش حاصل و بیمار بماند
از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر   یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند
صوفیاں واستدند از گرو مے ہمہ رخت   دلق ما بود کہ در خانۂ خمار بماند
بر جمال تو چناں صورت چیں حیراں شد   کہ حدیثش ہمہ جا بر در و دیوار بماند
بتماشاگہ زلفش دل حافظ روزے   شد کہ باز آید و جاوید گرفتار بماند

ذرا سا قطرہ مجنوں ہے خیال روئے روشن بھی
اگر زنہ ہے مقام ہو جو ہو وادی ایمن بھی ہو
یہ بے دردی کے معنے ہیں ستمگر ہو تو ہو تم سا
نہ پوچھا زندگی میں بھی نہ آئے بعد مردن بھی
خدا کو بھول جائیں سب جو شکل اپنی دکھا دو تم
کریں سجدہ مسلماں بھی پڑھیں کلمہ برہمن بھی
تم اپنی تیغ کی خوں ریزیاں عشاق سے پوچھو
عجب طوفاں بپا کرتی ہے موج آب آہن بھی
دل پر داغ کافی ہے قفس میں دل بہلنے کو

یہیں سیرِ گلستاں ہے یہیں لطفِ نشیمن بھی
کوئی دیکھے بوقتِ گریہ از خود رفتگی میری
عجب کیا ہے بہالے جائے موجِ چینِ دامن بھی

مطلع کی بندش اداے مطلب سے قاصر ہے۔ یعنی مجنوں کا فراغِ قلب خیال روے روشن سے بھی ہے۔ ورنہ قلب اس کا وادی ایمن بھی ہوتا تو مقام ہُو تھا۔ مردن اور کردن اور گفتن وغیرہ سیکڑوں مصدر ہیں جنمیں نون مصدری ہے اسکو دامن اور آہن کے قافیوں میں لے آنا شائگاں کہلاتا ہے۔ ایطا و شائگاں میں اکثر اہل فن فرق نہیں کرتے ہیں بعض اہل کی راے یہ ہے کہ اگر یہی قافئے مطلع میں آجائیں تو ایطا ہے اور اشعار میں ہوں تو شائگاں ہیں۔ اُردو میں دریا اور صحرا کے ساتھ دیکھا اور سمجھا اور بولا وغیرہ جس میں الف ماضی لگا ہوا ہے نظم کیا جائے تو قافیہ شائگاں اُن لفظوں کو کہیں گے اور اگر مطلع میں دیکھا اور بولا مثلاً کہا جائے گا تو ایطا ہوگا۔ کلمہ بسکون لام مستعمل ہوگیا ہے اور اردو میں تو بتحریک لام کہنا معلوم ہوتا ہے

طبیعت میں نہ شوخی تھی نہ گرمی تھی ذرا پہلے
تمہارے ہاتھ پر چڑھتا نہ تھا رنگِ حنا پہلے
کروں کیا دل کی بے تابی کو نالے کس طرح روکوں
برستے ہو جبث مجھپر سنو تو ماجرا پہلے
ابھی کچھ دن اُدھر اٹھکر پٹنے سے چال چلتے تھے
اُتر پڑتا تھا شانہ سے دوپٹہ بارہا پہلے
ابھی کیونکر جگر کے داغ کی حالت دکھاؤں میں
تمہارے سامنے سے ہو تو آئینہ جدا پہلے

مجھے یاد ہے مشاعرہ میں اس مطلع نے بڑا رنگ دیا تھا۔ دوپٹہ اور آنچل مسّی اور کاجل گھونگٹ اور افشاں چوٹی اور جوڑا لکھنؤ کے خصوصیات میں سے ہے اس واسطے کہ امرد پرستی کے عیب سے غزل کو پاک کریں۔

(باقی آیندہ)

علی حیدر طباطبائی

مالک الدولہ صولت (۴۴)

اس کے دانتوں کے مقابل جو گہر جاتا ہے
دل سے گر جاتا ہے آنکھوں سے اتر جاتا ہے

یوں ہے صحرا میں ہوا پر ترے وحشی کا غبار
جیسے دیوانہ کوئی خاک بسر جاتا ہے

آتشِ حسن کو پانی سے بھڑکتے دیکھا
جب نہاتا ہے تو وہ اور نکھر جاتا ہے

جسم سے جان جدا ہو کے بھلا خاک گئی
کہ نکلکر نہیں پتھر میں شرر جاتا ہے

آمدِ فصلِ خزاں بھی ہے قیامت سے بلا
چہرۂ بلبلِ تصویر اُتر جاتا ہے

دستِ صیاد سے بلبل کی رہائی کیسے
غنچۂ مٹھی میں دبائے ہوئے زر جاتا ہے

ہر حبابِ لبِ جو کہتا ہے باچشمِ پُرآب
یہ زمانہ مثلِ آنکھوں میں گزر جاتا ہے

اس زمین میں غبار رکے جانے کا انداز اور بلبلِ تصویر کا چہرہ اُتر جانے میں ایہام تناسب مجھے لطف دیتا ہے اور حبابِ لبِ جُو والا شعر تو بے مثل ہے۔ شرر و زر کے قافیہ میں ردیف اچھی نہ رہی اور یہ دیکھنے کی بات ہے کہ ردیف کے نہ چمکنے سے شعر کس قدر سست ہو جاتا ہے۔

بہ نسبت اسم و حرف کے فعل میں ایہام زیادہ لطف دیتا ہے۔ صائب

شکار اگرچہ درین دشت بسیار است
مرا گرفتن عبرت ز روزگار بس است

عرفی۔ عدلِ تو لبِ زندگی برداشت ستم را۔ یہاں گرفتن اور برداشت

نے جو لطف دیا ہے اگر ایڈیسن سنتا تو اُسے بھی اپنی راے سے رجوع کرنا پڑتا۔

حرم میں حق دیر میں صنم ہے' اِدھر کو اب یا اُدھر کو چلئے
کماں یہ کم ہوگی دل کی وحشت' یہ ہے تردد کدھر کو چلئے
کہیں وہ دیکھیں نہ اس طرف کو' بچا کے اُن کی نظر کو چلئے
پڑے نہ آکر خدنگ مژگاں' چھپا کے ان سے جگر کو چلئے
گزر گئی اب شب جوانی' ہے آمد مرگ ناگہانی
یہ صبح پیری کی ہے زبانی' کمر کو کسئے سفر کو چلئے
میں بھیج کر خط ہوا ہوں مضطر' نہ قاصد آیا نہ وہ ستمگر
تلاش کیجے نشان دلبر' کہ ڈھونڈھنے نامہ بر کو چلئے
یہ دل میں ٹھانی ہے ہم نے مدت' وطن میں کسکو دکھائیں صورت
بغیر شاہ اودھ کے صورت' کبھی نہ اختر نگر کو چلئے

بادشاہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لکھنو کا نام اختر نگر بھی ہے اور اسی مناسبت سے میں نے چاہا کہ اپنا تخلص اختر رکھوں مگر معلوم ہوا کہ اختر کسی کا تخلص ہے تو میں نے اُن سے تخلص مول لے لیا۔ جن سے بادشاہ نے تخلص مول لیا وہ قاضی محمد صادق خاں اختر ہیں یہ بنگالہ سے آکر لکھنو میں ایسا رہے کہ پورے لکھنوی ہوگئے یہیں تحصیل علم کی یہیں فن شعر میں کمال پیدا کیا اور یہیں سے جاگیر و زر و مال حاصل کیا۔ ان کا اہل زبان میں شمار ہے لکھنو کی زبان ان کی اکتسابی نہ تھی بلکہ اُن کے گھر کی زبان ہوگئی تھی تعلق ازدواج بھی انھوں نے اہل شہر میں کیا میرے ایک عزیز مرحوم نواب یوسف حسین خاں انزا کے نواسے ہیں اور اُن کی جاگیر کے مالک تھے اور یہ تخلص کا بیچنا کچھ بادشاہ کی خاطر سے تھا ورنہ انھوں نے کبھی اپنا تخلص نہیں بدلا۔

وہ پردہ میں ہیں نور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی کیا وحشی طور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
میں کوہ پہ فرہاد ہوا دشت میں مجنوں قصہ مرا مشہور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
وہ کہتے ہیں بدنام کیا خلق میں تم نے سن تو وہی مذکور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
کس سمت سے قاصد کو ملے جلد گھر انکا دو راستے ہیں۔ دور اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اتنی بڑی ردیفوں میں میں نے بھی دیکھا ہے کہ کوئی شعر ایسا جو نشتر مل ہو نہیں نکلتا ایسی زمینوں میں فقط ردیف کا چمک جانا اور محاورہ میں پورا اُترنا انتہائی خوبی ہے۔

وہ ملے تدبیر ایسی چاہئے بس مجھے تقدیر ایسی چاہئے
تیرے ابرو دیکھکر بسمل ہو دل برق دم شمشیر ایسی چاہئے
تا قیامت جس میں رہنا ہو ہمیں خانۂ تعمیر ایسی چاہئے

غزل کے مضامین میں بے ثباتی دنیا کا مضمون بہت ہی پیش پا افتادہ ہے اہل تہذیب ہمیشہ سے اس کوشش میں رہے کہ غزل میں اس کے علاوہ بھی اخلاقی مضامین کی گنجایش ہو سکے صائب نے اس کی راہیں بہت اچھی نکالیں کہ اخلاقی مضمون ہو اور پھر بھی غزل کا شعر معلوم ہوتا ہے ؎

تا ترا چوں دگراں دیدن ظاہر کارست چشم بر روے تو چوں آئینہ بر دیوار است
زیر شمشیر حوادث پاے بر جا ئیم ما ہمچو کوہ ثابتیم از سیلاب بیا نیم ما
دل بستگی خلق بہ عمر گزراں چیست استادگی عکس درین آب رواں چیست
گل بے خار اگر بود درین باغستاں دامنے بود کہ از صحبت مردم چیدند
نریخت تا گہر عاریت ز دامن خویش غبار تیرگی از چہرہ سحاب نرفت
چو ماہ نو قدم گشتہ در سپہر وجود نشان زیست کہ آمادہ کشتن ما
بزرگ دست کہ بر خاک ہمچو سایۂ ابر چناں رود کہ دل مور را نیازارد
چاہا بہت کہ راز محبت نہاں رہے کیا کیجیے کہ آنکھ سے آنسو رواں رہے
صیاد اب تو ہم کو رہا کر پئے خدا دل میں نہ مرتے دم ہوس بوستاں رہے
یوسف کی جستجو نے ہمیں خاک کر دیا مثل غبار راہ پس کارواں رہے
دنیا پہ فتح پائی کسی نے نہ آج تک اہل ہوس اسیر طلسم جہاں رہے

گو ہم چمن سے دور ہیں لیکن یہ ہو دعا　　گلشن رہے بہار رہے باغباں رہے
آفت سے دور رہنا قضا کی دلیل ہو　　اڑ جاؤں میں خدنگ سے زاغ کماں رہے

مطلع میں ایک درد ہے۔ صبا والے شعر میں اب تو یہ معنی نکلتے ہیں کہ طائر اسیر کو اپنے مرنے کا یقین ہو گیا ہے۔ کارواں کی رعایت سے یوسف کی جست و جو کو باندھا ہے ورنہ یوسف کی جگہ منزل کا لفظ بھی کہہ سکتے تھے۔ جہاں کو شعرا ہمیشہ سے طلسم سمجھا کئے اور آج کل کے علوم جدیدہ نے اس کا طلسم ہونا ثابت کر دیا اس سے بڑھ کر طلسم میں کیا ہوگا کہ عالم میں خاموشی محض ہے اور ہمیں آوازیں سنائی دیتی ہیں نیوٹن ثابت کر چکا ہے کہ عالم میں اندھیرا ہے آفتاب و کواکب سیاہ ہیں اور ہمیں دنیا روشن دکھائی دیتی ہے۔ اب ہمیں اس کا انتظار ہے کہ یہ مسئلہ بھی کوئی ثابت کر دے کہ عالم معدوم ہے اور ہم اُسے موجود سمجھ رہے ہیں۔ باغباں والا شعر مجھے بہت پسند ہے۔ آفت سے دور رہنا بھاگنے کے معنی پر ہے ورنہ مضمون میں سستی پیدا ہو گئی

خلاف قاعدہ کیوں ہو خفا کہو تو سہی　　قصور کوئی کیا کچھ خطا کہو تو سہی
ہمیں یہ سخت کلامی کی تاب و تاں نہیں　　کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی
بیان کاوش تیر نگہ پہ او وہ ہوئے　　کہاں کہاں ہے نشان زخم کا کہو تو سہی

یہ زمین مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل صاحبہ عالم کی نکالی ہوئی ہے ؎

تمہارا دل تو دل عالم اسیر گیسو تھا　　یہ کس طرح سے ہوا مبتلا کہو تو سہی
نہ وہ مزاج نہ وہ پیچ نہ وہ خیال　　اُداس رہنے کا باعث ہے کیا کہو تو سہی

بیگم صاحبہ نے یہ غزل کہی اور خود ہی اس کی دھن رکھی گانوں کو حکم ہوا کہ یاد کریں مجھے یاد ہے کہ اس غزل کا ایسا رنگ بندھا کہ اکثر لوگوں نے اس زمین میں طبع آزمائی کی کسی نے ردیف میں قطع کر کے سنو تو سہی کر دیا ع سنبھالو تیغ ادا کو ذرا سنو تو سہی۔ صورت کے اس شعر میں

ع کسی کو اور ہمارے سوا کہو تو سہی ردیف کا لطف اور زبان کی خوبی داد چاہتی ہے نواب مخدرۂ عظمیٰ کی اس غزل پر نواب محبوب عالم صاحبہ نے مصرعے لگائے ہیں ان دونوں بیگموں کو منشی تہنر صاحب سے مشورہ تھا دونوں صاحب دیوان ہیں مگر محبوب محل کا دیوان شاید تلف ہو گیا۔

یکایک آئی کہاں سے بلا کہو تو سہی　　یہ کیوں اتر گیا منہ چاند سا کہو تو سہی
ہوئی ہے کاہشوں کی وجہ کیا کہو تو سہی　　یہ حال عشق میں کس کے ہوا کہو تو سہی
ہلال کیوں ہوئے اے مہ لقا کہو تو سہی

ہیں یاد تجھ کو دغا بازیاں زمانے کی　　ہمیشہ سے یونہیں عادت ہے جی جلانے کی
خدا یہ گھات ہے پہلو سے اٹھ کے جانے کی　　عبث عبث نہ قسم کھاؤ دل لگانے کی
کیا ہے کون سا وعدہ وفا کہو تو سہی

ہمیں کو رنج و غم قیل و قال دیتے ہو　　رقیب کو نہیں ایسا ملال دیتے ہو
جواب غیر کو قبل از سوال دیتے ہو　　ہماری بات جو سن سن کے ٹال دیتے ہو
مزا ہے دل کے جلانے میں کیا کہو تو سہی

کہیں کچلیں نہ یہ ادا مجھے دل آ کر پاؤں کے نیچے
کہ ہیں گیسو تمہارے سر کے اوپر پاؤں کے نیچے
سوم کو بھی نہ آئے فاتحہ کو قبر عاشق پر
نہ روندی تم نے یہ پھولوں کی چادر پاؤں کے نیچے
تپے گا چرخ سے بالائے سر مہر مبیں آ کر
زمیں تانبے کی ہوگی روز محشر پاؤں کے نیچے

یہ زمین بادشاہ کی طرح کی ہوئی ہے شعرائے سبد بیارہ اور تمام سخن سنجان دربار نے ٹوٹ ٹوٹ کر فکر کی تھی۔ بین شرکت صحبت نہ تھا مگر غزلیں اکثر لوگوں کی سنیں اگر وہ مشاعرہ چھپتا تو انتخاب میں اچھے اچھے شعر ہاتھ آتے۔

گر زباں ہو ہر دہان زخم بسمل کے لئے　　مانگے خالق سے دعا ئے تیر قاتل کے لئے

جان لے جاتا کوئی کیونکر زلف ساقی کا خیال   بال آ جانے کا ڈر ہے شیشۂ دل کے لئے
دو قدم چلنے پہ غش آتا ہے اب یہ حال ہے   پہلے میں عاجز نہ تھا دو چار منزل کے لئے

زلف کی رعایت سے بال آ جانے کا لفظ شعر میں لائے ہیں رعایتیں جہاں بھرتی معلوم ہوں وہاں بے نمک بڑی معلوم ہوتی ہے جیسے حافظ کے اس شعر میں ؎

یار گندم گون اگر میل کرد نیم جو   ہر دو عالم پیش چشم ما نمود یک عدس

اگر رعایتیں بے تکلف آ جائے اور مبتذل بھی نہ ہو تو اب بھی لطف دے جاتی ہے۔

اک ہم نیند کا بہانہ کریں   دخل کیا ہے جو چشم تر سوئے
گزری اوقات عین غفلت میں   آ کے دنیا میں عمر بھر سوئے
کبھی چونکے نہ ہوشیار ہوئے   اجل آ پہنچی اس قدر سوئے
جا کے سوئے عدم نہ کی کروٹ   واہ شوکت یہ بے خبر سوئے

پہلے شعر میں اگر چشم تر کی جگہ دیدۂ تر کر دیں تو مصرع جب بھی موزوں رہتا ہے قافیہ جو پہلے تھا وہی اب بھی رہا لیکن ردیف بدل جائے گی یعنی سوئے پہلے فعلن کے وزن پر تھا اب فاع کے وزن پر ہو گیا اس سبب سے یہ مصرع دخل کیا ہے جو دیدۂ تر سوئے۔ باوجود اس کے کہ بحر وہی ہے قافیہ وہی ہے ردیف بھی دیکھنے میں وہی ہے مگر دوسری زمین میں ہے اور زمین کے بدل جانے سے اس زمین میں یہ مصرع ہو تو غلط سمجھا جائے گا طالب فن کو اس کا خیال ضرور چاہئے مثنوی میں ایسی غلطی اکثر میں نے دیکھی ہے مثلاً ؎

جانب پشت تو گدھے کا تھا منہ   اس کی دُم کی طرف تھا ان کا منہ

دیکھنے میں تھا کا قافیہ کا صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن تھا کا الف گر گیا اور کا میں الف باقی ہے اس سبب سے اس شعر میں قافیہ نہیں رہا یا مثلاً یہ شعر ؎

ابر آیا ہے بادہ خوار آئے   اب بے پئے کس طرح قرار آئے

اس میں بھی پہلے مصرع میں آئے فعلن کے وزن پر ہے اور دوسرے مصرع میں فاع کے وزن پر ہے۔ غرض کہ اس شعر کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ زمین بدل گئی پہلے مصرع کا وزن مفعول مفاعلن فعلن ہے اور دوسرے مصرع میں فعولن کی جگہ مفاعیل ہو گیا۔ آزاد مرحوم اس نکتہ کو نہ سمجھے آب حیات میں جرأت کی اس غزل پر ؎

اجل گر اپنی خیال جمال یار میں آئے   تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے
خراب کیوں کر نہ ہو شہر دل کی آبادی   ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے

اعتراض کرتے ہیں کہ کس دھوم کی غزل تھی مگر آئے کہیں واحد ہے کہیں جمع ہو گیا ہے۔ اگر جرأت نے یوں کہا ہوتا کہ پری بجائے فرشتہ مزار میں آئے۔ تو البتہ زمین بدل جاتی واحد و جمع کو کیا دخل ہے جو یہاں تکلیف دی گئی۔

خفا ہو چکے آؤ مل جاؤ اب   چلو بس جبیں پر شکن پڑ چکی
نزاکت اگر ایسی ہی ہے تو پھر   یہ تلوار اے تیغ زن پڑ چکی
جو قسمت بری ہی ہے فرقت لکھی   تو پھر کوئی تدبیر بن پڑ چکی
سب شور کا گل نے پوچھا تو کب   جب آواز مرغ چمن پڑ چکی
کہی حکم آخر سے شوکت غزل   کرشمہ سے بنائے سخن پڑ چکی

ایسی کڈھب زمینیں بادشاہ ہی نکالا کرتے تھے کہ بن پڑ چکی اور شکن پڑ چکی کے سوا کوئی قافیہ ردیف سے نہیں لپٹتا مگر مالک الدولہ نے اچھے شعر نکال لئے۔

شکل پیش نظر کسی کی ہے   ایک صورت یہ دل لگی کی ہے
میرا ان تو نہ تھا کسی لائق   نظر لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تیرے واسطے بھی   جان پہچان تو کبھی کی ہے
دیں ہمیں دل ہمیں ہوش تمام   واہ کیا خوب منصفی کی ہے

شورشِ قلب زار سن سن کر — اس نے کیسی جلی کٹی کی ہے

ان اشعار میں تغزل کا لطف بھرا ہوا ہے اور یہی رنگ اُن کے دیوان میں زیادہ تر ہے مگر بادشاہ کی طبیعت تصنع کو بہت پسند کرتی تھی یعنی برق و بحر و خواجہ وزیر جس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے وہی رنگ بادشاہ پسند تھا ان لوگوں کا شمار زبان اُردو کے اساتذہ میں تھا میر انیس سے شاعر معجز بیاں نے بحر کے ایک شعر پر مصرعے لگائے اور سر منبر پڑھے۔ غرض کہ مالک الدولہ میں کچھ خاندانی اثر کچھ بادشاہ کی پسند کا خیال ضرور تھا اس رنگ کے شعر بھی ان کے دیوان میں موجود ہیں مثلاً کہتے ہیں ؎

چاہے قیدی جو تر از رزق بلا منتِ غیر — بے تقیص دامنِ زنجیر سے خرمن ہوجائے
کمر یار کی ہے چاہ میں رشتہ کا مرض — کافی اب ڈوبنے کو چشمۂ سوزن ہوجائے

مگر یہ رنگ غیر طبعی ہونے کے سبب سے کبھی عام پسند نہیں ہوا لکھنؤ میں ہمیشہ آتش و انیس و نسیم دہلوی کے جوگہ والے اسکا مضحکہ کیا کرتے تھے۔ رشک کے اکثر اشعار نقل محفل تھے لیکن یہ خیال لوگوں کا کہ یہ رنگ لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ہے نفس الامر سے مطابقت نہیں رکھتا شاہ نصیر کا دیوان اُٹھا کر دیکھیں کہ اوّل سے آخر تک اسی تصنع سے بھرا ہوا ہے ذوق کا کلام بھی اس سے خالی نہیں ہے مومن کا اور غالب کا اُردو دیوان بھی جادۂ مستقیم سے الگ ہے انہوں نے اس قسم کے تصنع کو چھوڑا دوسری قسم کا تصنع اختیار کیا اس سبب سے کہ جو غزل میں جدت نہ کرے وہ شاعر ہی نہیں۔ لکھنؤ کے امرا میں نواب غضنفر الدولہ بہادر مرحوم شعر تو نہیں کہتے تھے مگر بڑے سخن فہم تھے اور شوق کا یہ حال تھا کہ شہر کا کوئی مشاعرہ ان سے نہ چھوٹتا تھا مجھ سے کہنے لگے کہ بھئی شعر کا شوق کیا ہے تو ایک بات ہماری یاد رکھنا خدا کے لئے جدت پیدا کرنے کا زیادہ خیال نہ کرنا۔ رباعی

ہے ماہ صیام دل سے کر یادِ الٰہ — لا دھیان میں ایامِ جوانی کے گناہ
آئینہ میں دیکھو صبح پیری کا طلوع — خیطِ ابیض ہے تیرا ہر موئے سیاہ

پیری کے حال کی یہ رباعی بیاض انتخاب میں لکھنے کے قابل ہے۔ موئے سیاہ کا خیط ابیض ہو جانا لطف سے خالی نہیں۔ رباعی کے اوزان میں ایک مغالطہ عامۃ الورود ہوا کرتا ہے کہ مفعولن مستفعلن مفاعیل فع کے وزن پر بعض مصرع کہہ جایا کرتے ہیں اور یہ کوئی وزن رباعی کا نہیں اس سے احتراز واجب ہے۔ اور طالب فن کو یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ رباعی کا وزن حقیقی مفعول مفاعلن مفاعیل فعل ہے اور وزن الحاقی مفعول مفاعیل مفاعیل فعل ہے۔ یہ دونوں وزن مطبوع ہیں۔ الحاق کا سبب یہ ہے کہ دونوں وزنوں میں نہایت مشابہت ہے ایک میں مفاعلن ہے اور ایک میں مفاعیل ہے مفاعلن میں پانچواں حرف متحرک اور چھٹا ساکن ہے اور مفاعیل میں پانچواں ساکن اور چھٹا متحرک ہے اس کے سوا اور کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ وزن حقیقی میں بعمل تخنیق تین صورتیں پیدا ہوتی ہیں مفعولن فاعلن مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعلن مفاعیلن فع۔ مفعولن فاعلن مفاعیلن فع۔ وزن الحاقی میں بعمل تخنیق سات صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ مفعولن مفعول مفاعیل فعل۔ مفعول مفاعیل مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعول فعل۔ مفعولن مفعول مفاعیلن فع۔ مفعول مفاعیلن مفعولن فع۔ مفعولن مفعولن مفعول فعل۔ مفعولن مفعولن مفعولن فع۔ دو وزن وہ اور دس تخنیق سے پیدا ہوئے۔ یہ سب بارہ وزن ہوئے۔ اب بموجب اس قاعدہ کلیہ کے کہ چاہیں مصرع کو ایک ہی ساکن پر ختم کریں چاہیں آخر میں ایک ساکن اور

بڑھا دیں ان بارہ وزنوں کے آخر میں جہاں جہاں فعل ہے اُسے فعول کر سکتے ہیں جہاں جہاں فع ہے اُسے فاع کر سکتے ہیں۔ یہ چوبیس وزن رباعی کے کہلاتے ہیں۔ ان سب اوزان کے پرکھنے کی ایک سہل سی صورت یہ ہے کہ مفاعلن اور فاعلن کے سوا جہاں جہاں نون ہو اُسے متحرک کر کے پڑھو وزن مطبوع پیدا ہو جائیگا برخلاف مفعولن مستفعلن مفاعیلن فع کے کہ اس کے نون متحرک کر کے پڑھو تو اور بھی ناموزوں ہو جائے۔ بہت عرصہ ہوا کہ اوزان رباعی پر میں ایک مفصل مضمون شائع کر چکا ہوں اُسے دیکھنا چاہئے۔ اس وزن میں ہزار برس سے گتھی پڑی ہوئی تھی جسے اس ہیچمدان نے سلجھایا ہے۔

تاریخ وفات نواب مصلح السلطان بہادر

انجم الدولہ مصلح السلطان   پیش بگرفت راہ از ہستی
گفت صولت پئے سنہ رحلت   بہ عدم رفت آہ از ہستی
۱۲۹۰

نواب انجم الدولہ بہادر مصلح السلطان پشتہا پشت کے امیر تھے دربار اودھ میں ان کا مرتبہ وزارت کے قریب قریب تھا صورت پرامارۃ برستی تھی شاعر تو نہ تھے مگر فارسی و اُردو کے صدہا شعر جوانی کے یاد تھے کہ جس صحبت میں شعر پڑھنا شروع کرتے تھے لوگ محو ہو جاتے تھے پوشاک کی نفاست اور عطر کا شوق ان کے مزاج سے مخصوص تھا۔ بادشاہ نے بنارس سے دخانی کشتیوں پر سفر کیا تو یہ بھی ساتھ تھے۔ خلیج بنگال کے طوفان میں کئی کشتیاں ڈوب گئیں ان میں نواب صاحب کا پوشاک خانہ تلف ہو گیا مگر اس پر بھی پشمینہ اور جامدانی کی قبائیں ایسی ایسی باقی رہ گئی تھیں کہ نمائش میں رکھی جاتی تھیں اور اُن کا مثل اب کشمیر یا ڈھاکہ میں دستیاب نہ تھا۔ رفعت الدولہ مرحوم ایک دفعہ کہنے لگے کہ میں جب عطر لگاتا تھا بیسن سے ہاتھ دھوتا تھا آج نواب انجم الدولہ کو میں نے دیکھا کہ عطر لگا کر انہوں نے ہاتھ نہیں دھوئے ذرا سا کیوڑا یا گلاب ہاتھ پر چھڑکا اور دستی رومال سے رگڑ کر دونوں ہاتھ پونچھ ڈالے عطر کی چکنائی بھی چھوٹ گئی اور خوشبو بھی ہاتھوں میں باقی رہ گئی مجھے یہ بات نہایت پسند آئی۔

تاریخ خطاب وزیر السلطان

اے برادر تو شکوہ و حشمت نازد   بر اختر بند شان و شوکت نازد
صولت نازد بمصرع سال خطاب   حق اینکہ بجاہ تو وزارت نازد
۱۲۹۲

نواب سید امیر علی خاں باڑھ کے رہنے والے ہائیکورٹ کے وکیل تھے مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے بتدریج ایسی ترقی کی اور اس قدر تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظر سے گرائیں۔ غدر کے زمانہ میں انہوں نے میجر کونیا قلعہ دار ولیم فورٹ کو ایک جھوٹی خبر پہنچائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے ملے اور ایک فرمان مزین بمہر شاہی لکھوا کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ غدر کر کے انگریزی تسلط کو اٹھا دیں میجر کونیا جلنے فوراً یہ قصہ نواب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا وہاں سے بادشاہ کو قید کر لینے کا حکم صادر ہوا۔

۲۳ شوال ۱۲۷۳ھ صبح کا وقت تھا بادشاہ وظیفہ میں مشغول تھے کہ داہنی طرف مڑ کر دیکھا کہ دریاے بھاگیرتی میں تین جنگی جہاز چلے ایوان شاہی کے محاذی لنگر ڈال دیا گورے وردیاں پہنے مسلح منتظر حکم کھڑے ہیں توپوں کا منہ سلطان خانہ کی طرف ہے۔ بائیں جانب مڑ کر دیکھا تو کئی پلٹنیں گوروں کی کرچی کو [illegible] کئے ہوئے ہیں اور سب پھاٹکوں پر کئی کئی جڑی توپیں لگی ہوتی

ہیں۔ اسی اثنا میں مصلح السلطان انجم الدولہ بہادر زیں پر تمد ولایتی نکلا
حضور میں حاضر ہوئے عرض کی کہ میجر کونیا کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں
حکم ہوا کہ بلاؤ میجر کونیا نے نواب گورنر جنرل بہادر کا پیغام پہنچایا
کہ جب تک ہندوستان میں غدر ہے آپ کا ولیم فورٹ میں
رہنا مناسب ہے جہاز اسی واسطے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ
سوار ہو کر قلعہ میں رونق افروز ہوں۔ بادشاہ نے جہاز میں سوار
ہونے سے انکار کیا اس پر نواب گورنر جنرل کی سواری کی گاڑی
فوراً منگائی گئی بادشاہ ایک تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے سوار
ہوئے ایک فوجی افسر نے چاہا کہ پہلو میں بادشاہ کے بیٹھ جائے
نواب مجاہد الدولہ مسلح کھڑے ہوئے تھے اُسے روک دیا اور
خود حسب قاعدہ پہلو میں بیٹھ گئے میجر کونیا سامنے بیٹھے شاگرد
پیشہ والوں میں سے ایک شخص گاڑی کے پیچھے کھڑا ہونے لگا
کہ نواب دیانت الدولہ بہادر نے اسے ہٹا کر کہا کہ آج یہ مقام ہم
غلاموں کا ہے ان کے ساتھ عشرۃ الدولہ رفیق مجاہد الدولہ بھی
گاڑی کے پیچھے کھڑے ہو گئے یہ گاڑی مٹیا برج سے چلی اور ولیم
فورٹ میں داخل ہو گئی۔ میجر کونیا نے اپنے روزنامچے میں ایلچی
یہ سارا واقعہ لکھا ہے کہ میرے گوئیندہ امیر علی نے مجھے خبر دی
کہ کل راجہ مان سنگھ چھپ کر آئے اور بادشاہ سے غدر کے لئے
فرمان لے گئے لیکن بعد کو معلوم ہو گیا کہ وہ خبر جھوٹی تھی اس روز
تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے۔ حریفوں نے میجر کونیا کا روز
نامچہ منگایا اور شاہزادہ مرزا جہاں قدر بہادر کی وساطت سے
بادشاہ تک پہنچا دیا مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے فرمایا کہ
اس زمانہ میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے۔

رد ناسخ و جواب انتخاب لنقص کی تاریخ

ع۔ کامل کو جو ناقص کہے خود ہو گا وہ ناقص۔ ۱۲۹۶ ہجری۔

ناسخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراضات شائع کئے
تھے منشی منظور علی ہنر شعرائے لکھنؤ میں سے تھے اور مرثیہ بھی کہتے تھے مرزا دبیر
کے پرانے شاگردوں میں تھے انہوں نے رد ناسخ میں ایک کتاب لکھی
صواعق اسکی تاریخ میں یہ مادہ بہت بے تکلف نکالا ہے منشی ہنر صاحب نے
وہ ساری کتاب اوّل سے آخر تک مجھے بھی سنائی تھی بہت ہی مدلل
شکن جواب تھے افسوس ہے کہ چھپی نہیں اس کے تھوڑے دنوں
بعد ان کے مکان میں آگ لگی اور وہ ساری محنت ان کی تلف
ہو گئی وہ ایک باتیں مجھے یاد رہ گئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ نشتر کی جگہ
پیر گئی ہر رگ و پے میں۔ اس پر یہ اعتراض تھا کہ تلوار کو نشتر کہا
پھر نشتر ہر رگ و پے میں پیر تا کب ہے۔ یوں کہنا چاہیے تھا کہ
ع۔ سوزن کی طرح پیر گئی ہر رگ و پے میں۔ ہنر نے جواب دیا کہ نشتر
کے لفظ میں کاتب اور معترض دونوں نے دھوکا کھایا میرے
پاس وہی مرثیہ قلمی موجود ہے اس میں نشتر کی جگہ نشتر کا لفظ ہے
ایک اور بات پر مجھے بہت ہنسی آئی تھی وہ یہ ہے کہ ع۔ گل تھا
چراغ چشم ثریا مثال کا۔ اعتراض یہ تھا کہ ثریا میں بہت کم روشنی
ہوتی ہے اور اُسے چشم سے تشبیہ دی تو کیا دی۔ ہنر نے جواب دیا
کہ معترض کو یہ نہ سوجھا کہ چشم نابینا کی طرح میں یہ مصرع ہے اور
نابینا ہونا اس لفظ سے بخوبی ظاہر ہے کہ مرزا صاحب فرماتے ہیں
کہ گل تھا چراغ۔ غرض ہنر کا جواب بہت پر لطف و پر مغز تھا وہ تو
آتش زدگی میں رائگاں ہوا مگر راجہ امیر حسن خاں مرحوم نے ان
مہملات کا ایک جواب لکھوا کر چھپوا دیا اس کے نسخے مٹیا برج میں
بھی بھیجے تھے وہ بھی جواب بہت خوب لکھا گیا تھا ناسخ کی اس
حرکت سے مجھے بھی ملال ہوا تھا مٹیا برج میں وہ آئے اور ان
ان کے شاگرد بھی ساتھ تھے میں نے کہا آپ نے ناسخ سے ناسخ
و نساخ وہ لفظ جو بنائے اسکی کہیں سند بھی ہے کہتے لگے ناسخ

افعل التفضیل ہے مین نے کہا افعل بمعنی مفعول بھی تو ہوا کرتا ہے جیسے اشہر بمعنی مشہور ہے تو اس قیاس پر انسخ بمعنی منسوخ ہو سکتا ہے اور نساخ کا لفظ آپ نے کہیں دیکھا ہو تو اس کی سند چاہیئے کہنے لگے مبالغہ ہے مین نے کہا ذلیل پیشوں کے لئے بھی یہی وزن آتا ہے جیسے حجام قصاب بقال بزاز صراف نجار خیاط اس کی سند کا بھی وعدہ کیا پھر مرزا جہان قدر نے کچھ پڑھنے کی فرمایش کی غزل انہوں نے شروع کی اس میں بھی کئی غلطیاں تھیں ایک کا جواب نہ دے سکے ہر شعر پر یہی کہتے تھے کہ اسکی سند لکھکر بھیج دوں گا۔ تحریر سرمہ کا لفظ بھی تھا۔

سید صالح خادم کربلا حضرت کے لئے عبائے کر آئے تھے مالک الدولہ نے تاریخ کہی مادہ کا مصرع یہ ہے۔ ع

پاک حلہ پئے اختر آیا۔ سنہ ۱۲۹۱ ہجری

ان سید صاحب نے خوب ہی دام فریب پھیلایا تھا بادشاہ سے کہا کہ امام حسینؑ نے حکم دیا کہ عبائے جا کر واجد علی شاہ کو ہماری طرف سے دو بادشاہ نے وہ عبائے سیاہ سر پہ رکھ لی سب شاہزادوں کے پاس بھیجی کہ سر و چشم پر اُسے رکھیں سید صاحب کو بہت کچھ اس کا صلہ مل چکا تھا مگر چلتے چلتے انہوں نے اور چونکا کیا عرض کی کہ ناصر الدین شاہ ایران کی طرف سے ایک جھاڑ کربلا میں روشن ہوا کرتا ہے مین چاہتا ہوں کہ حضرت کی طرف سے بھی جھاڑ روشن ہوا کرے فوراً یہ استدعا مقبول ہوگئی جھاڑ کی قیمت اور جتیوں کے ماہانہ مخارج کے لئے حکم ہوگیا۔

تاریخ امام باڑہ جلیس الدولہ۔ ع

مقام کی ہے بارگاہ۔ سنہ ۱۲۹۰ ہجری۔

یہ مصرع مجز ورجز میں ہے۔ جلیس الدولہ میرزایان شیراز میں سے تھے عہد سلطنت میں آکر بادشاہ کے ملازم ہوئے اور مرتے دم تک ان کی رفاقت میں رہے ان کے مرنے کے بعد ان کے فرزند اکبر حامد الدولہ برتر کو ان کی خدمت عنایت ہوئی یہ شخص فارسی و اُردو دونوں میں اہل زبان تھے اور دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے کلکتہ سے مٹیا برج جہاز پر آرہے تھے کنارہ کے قریب پہنچ کر ایک دوسرے جہاز سے ٹکر ہوئی غریق رحمت ہوگئے۔ مرحوم بڑے پیراک تھے مگر انجن کے پھٹ جانے سے کچھ صدمہ پہنچا کہ اُبھر نہ سکے۔

تاریخ انتقال صاحب عالم مرزا ولیعہد۔ ع

کوکب شد زیر خاک نا تم۔ سنہ ۱۲۹۱ ہجری

خلیج بنگال کے طوفان کی زحمتیں اُٹھا کر بادشاہ جب کلکتہ پہنچے تو فسخ عزم کیا اور انگلینڈ کا جانا موقوف رہا اُسوقت مرزا ولیعہد آمادہ ہوئے کہ آپ نہیں جاتے تو مجھے بھیجئے ان کے اس ارادہ سے بادشاہ بہت خوش ہوئے مرزا اسکندر حشمت اور جناب عالیہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئیں گو والدۂ ولی عہد نواب مخدرۂ عظمیٰ ناراض ہوئیں اور انہوں نے فہمائش کی کہ بادشاہ نہیں جاتے تو تمہارے جانے سے کیا فائدہ ہوگا مگر انہوں نے ایک نہ سنی انگلینڈ میں ان لوگوں کا پہنچنا ایک نیا واقعہ تھا اہل شہر نے ہجوم کیا اور دیکھنے کے مشتاق ہوئے ان کو سرکاری لوگوں کے سوا اور کسی سے ملنا منظور نہ تھا گر مسٹر برڈ اور مسٹر برنڈ ان کی سفارش سے کہ یہ دونوں انگریز متوسلین دولت اودھ میں سے تھے انگلینڈ میں دونوں شاہزادوں نے دربار عام کیا حبشی خواجہ سرا صف بستہ پس پشت کھڑے ہوئے تھے اور مسٹر برڈ ہر ایک شخص کے بروقت تعارف خدمت ترجمانی ادا کرتے تھے اس دربار میں بڑے بڑے رئیس و عمدہ دار انگلینڈ کے آئے تھے جناب عالیہ سے ملنے کو بہت سی معزز انگریز نیں آئی تھیں

اور مسس برنڈن ترجمان تھیں۔ ملکہ معظمہ سے ایک ملاقات ہوئی تھی جس میں زحمت سفر کے سوا کچھ ذکر نہیں آنے پایا تھا کہ ہندوستان کے غدر کی خبریں آنے لگیں اور انگلینڈ کی ساری خلقت اس قدر ان لوگوں سے بیزار ہوگئی کہ وہاں ٹھہرنا مشکل ہوگیا حکیم احسن الزماں نگینہ کے ایک طبیب اس قافلہ کے ساتھ تھے بیان کرتے تھے کہ ہم لوگ مکان کے دروازے بند کئے بیٹھے رہتے تھے کہ ایسا نہو کہ ہندوستان کے غدر کا قصاص ہم سے لیں مایوس ہو کر یہ لوگ پیرس میں چلے آئے دس پندرہ دن کے عرصہ میں جناب عالیہ اور مرزا سکندر حشمت کا انتقال ہوگیا امپراطور فرانس نے مرزا ولی عہد سے ملنا چاہا کہ تعزیت ادا کریں اور ملکہ معظمہ سے ان کی سفارش کریں مگر ولی عہد نے یہ عذر کیا کہ دونوں سلطنتوں میں صفائی نہیں ہے اور ہم کو انگلینڈ کی سرکار سے توسل ہے آپ سے ملنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور یہ ذکر میں نے سنا کہ جب یہ قافلہ لکھنؤ سے کلکتہ آرہا تھا تو رانی گنج سے ریل پر سوار ہوئے راہ میں فرانس ڈانگہ ملا وہاں جب ریل ٹھہری تو ایک ہندو محرر نے مرزا ولی عہد کو یہ صلاح دی کہ یہیں اتر پڑیے اور اپنے معاملات کو دولت فرانس کی وساطت سے طے کیجئے اس سے بہتر ذریعہ آپ کو نہیں ملے گا مگر انہوں نے یہی کہا کہ دولت فرانس سے پناہ لے کر انگریزوں کے قدیمی تعلقات کو قطع کرنا مناسب نہیں ہے۔

مرزا ولی عہد کا ایک دیوان انکی زندگی میں چھپ گیا تھا دوسرا دیوان بھی تیار تھا مگر انتقال انکا ہوگیا کلام بالکل صاف ہے ذرا تصنع و تکلف کو دخل نہیں ہے وطن کا رونا ہر غزل میں ہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تاریخ غسل صحت جہاں پناہ

فلک جاہ واجد علی شاہ اختر — رہیں تا قیامت صحیح و سلامت
سدا ہفت اقلیم ہوں زیر فرماں — ملے تاج و تخت و لوائے حکومت
نہو پھر کبھی اختلال عناصر — رہے بد مزہ دشمنوں کی طبیعت
اُسے صحت حال کی فکر جبدم — بطرز جدید ایک ہاتھ آئی صورت
حروف صحیحہ میں تاریخ نکلی — سپرد عدو علت و حرف علت
زحافات کو اس سبب سے نہ لایا — کہ ہو وزن سالم دلیل سلامت
لکھ اے خامۂ فکر صولت یہ مصرع — مبارک ہو سلطاں کو یہ جشن صحت
۱۲۹۲ھ

سلطان خانہ میں ایک امام باڑہ بیت البکا اور ایک مکان مجمع طیور بنوا رہے تھے کہ مزاج بادشاہ کا ناساز ہوگیا بیماری کو بہت طول ہوا انیس الدولہ ذوالفقار الدولہ دیانت الدولہ یہ تین شخص شب و روز حضرت کے تیماردار تھے ان لوگوں پر بادشاہ کو بڑا اعتماد تھا یوں مہینوں یاد نہیں فرماتے تھے مگر ذرا طبیعت بے مزہ ہوئی اور ان کو بلوا لیا پھر جب تک صحت نہو دم بھر کے لئے ان کا سرکنا پاس سے گوارا نہ تھا۔ بادشاہ کو صحت ہوگئی اور اس اثنا میں وہ دونوں مکان بھی تیار ہوگئے بیت البکا میں سادات ملازمین کی دعوت کی اور حسن عقیدت سے آفتابہ خود ہاتھ میں لیکر کھڑے ہوئے خود سب کے ہاتھ دھلائے۔

مجمع طیور عجب مقام تھا ایک مستطیل نہر کے کنارہ سلطان خانہ میں یہ مکان واقع تھا دونوں طرف آہنی تاروں کا جال تھا اس میں ہزارہا طائر جو آپس میں لڑتے نہیں چھٹے ہوئے تھے چھت کے کارنسوں میں صدہا خانے رکھے گئے تھے کہ آشیانہ بنا سکیں سنگ مرمر کا فرش سنگ مرمر کا مستطیل حوض اس میں غوطہ زن طائروں کے لئے مچھلیاں چھٹی ہوئی درختوں کے نادے اس خوبصورتی سے جابجا حوض کے کنارہ چنے ہوئے کہ گلدستے

معلوم ہوتے تھے اُن وحشی طائروں کو پورا آزادی کا لطف حاصل تھا۔ اس میں ایک جھولا پڑا ہوا تھا بادشاہ جھولے پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور پہروں ان طیور کی خوش فعلیاں دیکھا کرتے تھے اور انکی نغمہ سنجیاں سنا کرتے تھے اس مکان کا طول ڈیڑھ سو قدم کے قریب تھا اور عرض بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا بہت سے فراش جھاڑنے اور صاف کرنے کے لئے مقرر تھے محل سے متصل تھا اس سبب سے ہم لوگوں کی رسائی وہاں تک نہ تھی سلطان خانہ کے تمام پھاٹکوں پر ترک سوارنیوں کے پہرے تھے۔ ایک فراش نے مجھ سے ذکر کیا کہ بادشاہ جھولے پر بیٹھے ہوئے تھے دیکھا کہ ایک بیا تنکے جمع کر رہا ہے اور ایک درخت میں آشیانہ بنانا چاہتا ہے ہم لوگوں سے ناراض ہوئے کہ یہاں تنکے کہاں سے آتے ہیں کہ یہ جو کچھ بنا رہا ہے تم لوگ صفائی کا اچھی طرح اہتمام نہیں کرتے وہ آشیانہ جو بیا بنا رہا تھا پھکوا دیا اور منقیش کے تار جا بجا بکھرا دیئے ہے کو جب تنکے نہ ملے تو اُس نے تاروں کا آشیانہ بنا لیا اور بادشاہ بہت خوش ہوئے۔

تاریخ دیوان شمیم۔ ع

تاریخ تراوشِ شمیم است۔ ۱۲۹۹ھ

شمیم ایک شخص اہل کلکتہ میں منشی ہنر مرحوم کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنا دیوان چھپوایا اور ناسخ والوں میں جلوہ مرحبا ایک شخص تھے انہوں نے بھی اپنا دیوان نعت میں شائع کیا دونوں آدمیوں میں چشمک تھی انہوں نے اُن پر اعتراض کئے انہوں نے اِن پر شاعرانہ بحث ہوتے ہوتے مذہبی جھگڑے شروع ہو گئے مرحبا پیش نماز بھی تھے واعظ بھی تھے صحاح ستہ کے اردو ترجمے بھی دیکھ لیا کرتے تھے شمیم بیچارہ گو اہل سنت میں سے تھا مگر ان کتابوں سے بے خبر تھا جب تک شاعرانہ بحث رہی وہ جواب دیتا رہا ایک رسالہ شمشیر انتقام منشی ہنر صاحب کو دکھا کر شائع کیا اس پر حافظ صاحب نے بہت زہر اگلا ذوالفقار قاطع الکفار رسالہ کا نام رکھ کر چھپوا دیا منشی ہنر وہ رسالہ لئے ہوئے میرے پاس آئے اور یہ کہا کہ ان مذہبی مباحث کا جواب بھلا شمیم سے کیا ہو سکے گا آپ ذرا زحمت کیجئے۔ میں نے شمیم ہی سے اس کا جواب لکھوا دیا اور مولوی کبیر الدین احمد صاحب اُردو گائیڈ کے پاس بھجوا دیا کہ اسے دیکھ لیجئے کہ کہیں سخن سازی و غلط بیانی تو اس میں نہیں ہے وہ بڑے آزاد خیال شخص تھے اُنہوں نے اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی وہ رسالہ چھپا الٰہی تیری پناہ شمیم کی جان کے ہزاروں دشمن ہو گئے۔ ہائیکورٹ کے وکیلوں نے ناخدا کی مسجد میں تمام علما کو جمع کیا ایشیاٹک سوسائٹی سے کتابیں منگوائی گئیں کہ اس رسالہ میں جہاں جہاں غلط بیانی ہے اسکی داد خواہی دادگاہ کلکتہ میں کریں گے اور شمیم کو کالے پانی بھجوا دیں گے۔ مگر نتیجہ اس کنکاش کا یہ ہوا کہ علما وکلا سے خفا ہو گئے اور وکلا سر بگریبان ندامت مسجد سے نکلے۔ علما کی تاویلات کو تمام اہل مجلس نے ناپسند کیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ یہی فرقہ خواہ مخواہ برسر فساد تھا۔

علی حیدر طبا طبائی

خاتمۂ تذکرۂ مالک الدولہ صولت

[مالک الدولہ میرزا جعفر خاں بہادر صولتؔ کے مفصل حالات ادیب کی گذشتہ جلدوں[1] میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہاں انکے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آخری واقعہ شمیمؔ اور حافظؔ کے معرکے سے متعلق ہے۔ مضمون ذیل تذکرۂ صولت کا تتمہ ہے جسے مولانا سید علی حیدر صاحب نظمؔ طباطبائی نے خاص ادیب کے لئے مرتب فرمایا ہے۔ اگرچہ تیرہ مہینے کے بعد یہ تذکرہ مکمل ہوا ہے لیکن "دیر آید درست آید"۔ اس کمی کے پورا کر دینے کے لئے مولانا کا ہمیں بے حد مشکور ہونا چاہئے۔ ساتھ ہی ساتھ مولانا کی سلامت روی اور پاس وضع بھی قابل داد ہے کہ تذکرہ کو جس سرگرمی سے آپ نے ادیب کے لئے شروع کیا تھا اسی لطف کے ساتھ اس کو مکمل بھی کر دیا۔ ایڈیٹر]

صولتؔ کے دیوان پر اپنی رائے میں لکھ چکا تھا اور ادیب میں کئی دفعہ کرکے اُسے شائع بھی کر دیا تھا، جس میں مٹیا برج کے شاعروں کے تذکرے، کچھ بادشاہ کے حالات بھی، اس کے ضمن میں فن شعر کے اکثر نکات بھی قلم سے نکل گئے ہیں۔ اب کچھ اور لکھنے کا میرا ارادہ بھی نہ تھا۔ اس اثنا میں پھر کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا، تو ان مرحوم کا کچھ کلام اور ملا۔ اپنے مرنے کی تاریخ خود لکھی ہے۔ ؎

بعد میرے نہیں باقی نشاں   نام میرا ہوا جو ہو کا تباہ
سن مرض الموت میں صولتؔ لکھے   خاتمۂ نسل ہوا حیف آہ
(ہجری)

مولوی مرزا کاظم علی فقیہ مجتہد کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے فتح الدولہ برقؔ۔ بادشاہ نے مثنوی حزن اختر میں ان کے شاگرد ہونے کا ذکر بھی اپنے حالات میں لکھا ہے۔ منجھلے مرزا آغا جان، چھوٹے مرزا جعفر، وہ دونوں بھائی لاولد رہ گئے۔ مرزا جعفر کے ایک ہی بیٹے مالک الدولہ صولتؔ تھے۔ مالک الدولہ کا بیٹا باپ کے سامنے ہی مر چکا تھا۔ ایک عالم کی نسل کا اس طرح خاتمہ ہو گیا۔

مرحوم کو تاریخ کی بڑی مشق تھی۔ شیخ ناسخؔ کے تتبع میں اُن کے تمام شاگردوں نے "تاریخ کو صنایع شعریہ میں شمار کیا تھا۔ شاعر کا تاریخ گو ہونا لازم سمجھتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں

۱؎ سلسلے کے لئے ملاحظہ ہو ادیب اپریل ۱۹۱۰ء صفحہ ۱۷۱، اکتوبر ۱۹۱۱ء صفحہ ۱۷۱، ستمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۹۰ و ۲۰۲، مارچ ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۵۲۔

غیاپرچ سے میں لکھنؤ آیا تو یہاں دیکھا کہ اکثر شاعروں نے اس کا التزام کر لیا ہے کہ ہر غزل کے مقطع میں تاریخ ضرور ہو۔ اُنھیں دنوں میں ایک طرح ہوئی تھی "جواب اچھی طرح" "حساب اچھی طرح" میں اس مشاعرہ میں شریک تھا۔ اپنے ایک مہربان حکیم مرزا محمد احمد صاحب واقف کا تاریخی مصرع جو حروف تہجی میں ہے مجھے اب تک یاد ہے ع "مجتمع سب لوگ صحبت میں کیا اچھی طرح" اسی زمانہ سے مجھے بندش کا یہ ثقل محسوس ہوتا تھا کہ کسی لفظ کے ساکن دوم کو متحرک کر کے دوسرے لفظ کے الف ماقبل کو گرا دینا اور قافیہ و ردیف میں اس کا التزام کر لینا اور بھی ناگوار خاطر ہوا۔ اس سبب سے میں نے قافیہ بدل کر غزل کہی "جیا اچھی طرح" "خدا اچھی طرح"۔ اب اس زمین کی اصلاح ہو گئی۔ حیدر آباد کے ایک مشاعرہ کا ذکر ہے کہ صحبت ختم ہونے کے بعد دوسری طرح تجویز ہونے لگی ایک صاحب نے زمین نکالی "محبت میں مل گئی، شکایت میں مل گئی"۔ مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ قافیہ و ردیف میں ہل جل کے تنافر کا التزام کر لینا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ غرض طرح کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ "محبت میں چاہیے شکایت میں چاہیے"۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ناسخ بھی تاریخ کو صنائع شعریہ میں سمجھتے تھے مگر تاریخ کہنے کا ذوق تو انھیں بہت تھا آتش نے کبھی تاریخ نہیں کہی۔ انیس نے بھی نہیں کہی اور حقیقت امر یہ ہے کہ تاریخ صنائع شعریہ میں نہیں ہے۔ مالک الدولہ برق کے بھتیجے تھے برق ناسخ کے شاگرد رشید تھے تاریخ کا بہت ہی ذوق رکھتے تھے انھوں نے مرض الموت میں ایک تاریخ ہی نہیں کہی ایک دعائیہ رباعی بھی کہہ کر جہاں پناہ کے ملاحظہ میں بھیجی تھی ؎

یارب یہ بادشاہ ہو کشور کا — اقبال ہو دوا اکا حشم تیر کا
تا قائم دہر میں رہے اس کا دور — یوں اوج گردش ستارہ ہو اختر کا

اور وقت آخر بادشاہ کو اس طرح وداع کیا ؎

اختر تجھے حضرت نے دم جاں بلبا — اللہ و پیمبر کی حفاظت میں دیا

ان کے چچا فتح الدولہ بہادر برق نے بھی وقت آخر بادشاہ کو ایک مطلع لکھ کر بھیجا تھا ؎

برق جو منہ سے کہا تھا وہی کر کے اٹھے — جان دی آپ کے دروازہ سے ہو کے اٹھے

حقیقت امر یہ ہے کہ اس خاندان کے لوگوں کو بادشاہ کے ساتھ اور بادشاہ کو اس خاندان کے ساتھ ایک خاص محبت تھی۔

علی حیدر طباطبائی

مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی

مین ایسے علامۂ وحید العصر کے حالات قلمبند کرنے کی جرأت کر رہا ہون جس کے فضائل کی شان کے موافق الفاظ صرف کرنے کی لیاقت مجھ مین نہین ہے۔ لیکن بمجواے المامور معذور اپنے معلومات کو اختصاراً حوالۂ قرطاس کرتا ہون:-

عالی جناب مولانا نظم طباطبائی لکھنوی مدمجدہم نہ صرف زبان اردو کے مستند شاعر ہین بلکہ مختلف علوم و فنون کے عالم و فاضل ہین شعرا آپ کی قادر کلامی کے معترف اور علما آپکے فضائل علمیہ کے قائل ہین آپ خاندان سادات طباطبائی مین سے ہین۔ حضرت ابراہیم نام حضرت امام حسن کے پوتے پر پوتے تھے جنکی اولاد ابن طباطبائی کہلاتی ہے (قاموس مین اسکی تصریح موجود ہے) لکھنؤ مین نواب یوسف حسین خان یوسف طباطبائی مرحوم اور محمد نواب صاحب طباطبائی۔ مولانا نظم مدمجدہم کے عزیز قریب ہین۔

کلکتہ مین پہلے آپ بسلسلہ ملازمت واجد علی شاہ کی سرکار مین شاہزادون کی عربی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد کلکتہ سے حیدر آباد تشریف لائے جہان آپ کو نظام کالج کی اعلیٰ پروفیسری کی جگہ عطا کی گئی۔ اس کے تھوڑے دنون بعد کتب خانۂ آصفیہ قائم ہوا تو مہتمی کی خدمت جلیلہ پر آپ منتخب و مامور ہوئے۔ لیکن کچھ مدت کے بعد بوجہ ضرورت پھر آپ کو نظام کالج مین خدمت مذکورہ پر واپس طلب کر لیا گیا جس پر ابتک آپ مقرر ہین۔ گو آپ کی طبیعت شعر و سخن اور تصنیف و تالیف کی طرف بہت کم راغب ہے (جس کا اظہار بذریعہ تحریر رسالون مین آپ نے کئی بار فرمایا ہے) پھر بھی آپکے چند تصانیف ہین جن مین بعض مطبوعہ ہین جو مفید و مقبول خاص و عام ہین۔

جب آپ کا ایک مشہور انگریزی نظم کا ترجمہ "گور غریبان" کے نام سے دلگداز مین چھپا تو اسکی عالمگیر شہرت ہو گئی اور ہر ایک ناظر نے عموماً اور خصوصاً انگریزی دان اصحاب نے آپ کی سخن فہمی اور سخن گوئی کی بے حد داد دی اور ترجمہ کرنے کے اصول اس سے استنباط کئے۔ اس نظم مین قابل تعریف یہ امر ہے کہ اصل کا لطف ترجمہ مین بھی باقی ہے۔

"ساقی نامۂ شگفتہ" (شراب کی مذمت مین) آپ کی مثنوی مشہور ہے۔ ہندوستان بھر کے اخبارون اور رسالون نے اس کے عمدہ ریویو لکھے اور کالم کے کالم اس کی تعریف مین سیاہ کئے۔ اور ہر ایک نے آپ کی جرأت کی تحسین کی کہ حیدر آباد سے شہر مین ایسی مثنوی شائع کی۔

نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی فرمایش سے "دیوان اُردوے غالب" کی آپ نے شرح لکھی ہے۔ شرح کیا لکھی ہے اُردو میں جدید و مفید بہترین معلومات کا اضافہ فرمایا ہے۔ فن سخن کے رموز و نکات بیان فرمائے ہیں اور بتایا ہے کہ شاعری کس طرح کرنا چاہئے۔ شعر میں کیا کیا باتیں ہونا چاہئیں۔ جنکو کوئی سمجھ کر پڑھے تو شاعر بن جائے اور فن شاعری سے واقف و ماہر۔

ایک مضمون بعنوان "حقیقت شعر" دکن ریویو میں چھپا ہے اور ایک اور مضمون "ادب الکاتب والشاعر" غنچۂ جاوید" (ایمبی) کے تین نمبروں میں۔

یہ مضامین بھی جدت و ندرت کے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں دقایق و حقایق ادب اُردو کے معلوم کرنے کے لئے ان مضامین سے بڑھکر مفید کوئی مضمون نہ ہوگا۔

کلبس کا تاریخی مضمون جو حال میں بتدریج "مخزن" کے کئی نمبروں میں نکلا ہے داد تحسین طلب کرتا ہے جس قدر اُس میں تعجب خیز باتیں بیان ہوئی ہیں سب بالکل سچی اور لطف یہ کہ نہایت دلچسپ و دلآویز بھی ہیں۔

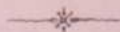
"تقریب الاطفال" لکھ کر تعلیم صرف و نحو بطرز جدید کی ایسی راہ نکال دی کہ جب سے سیکڑوں اہل علم اسی روش پر چل نکلے۔ برسوں میں چلکر جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ اس کے پڑھنے سے مہینوں میں بلکہ دنوں میں آجاتی ہیں بچے اسکے ذریعہ سے بآسانی عربی صرف و نحو جاننے اور عربی جملے بنانے لگتے ہیں۔ اسکے علاوہ اور دو رسالے پڑھانے کے قابل ہیں۔ جبیات۔ متعربات۔

"شرح مسائل غریبہ" عربی عبارت میں تیس برس پہلے کی تصنیف ہے اور فی الواقع نادر معلومات کا گنجینہ ہے۔

آپ کے کئی مضامین "اطلے" قصائد غرا" جوش کی غزلیں، اخلاقی نظمیں، دبدبۂ آصفی محبوب الکلام غنچہ جاوید تویر الشرق مخزن دکن ریویو وغیرہ میں چھپی ہیں جن میں فصاحت و بلاغت کی داد دی گئی ہے۔

اب زمانہ پیرانہ سری کا ہے مگر خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے زمانہ میں ایک ایسا علامہ موجود ہے جس پر قوم کو فخر و ناز کرنا چاہئے۔

ذہین



شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم

گلستانِ دہلی کی وہ روح افزا فضائیں اور بلبلانِ سخن کی وہ رزم گاہیں جنہیں شاہ حاتم۔ سودا۔ درد۔ نصیر۔ مومن و نسیم اپنی تیغ زبان کے جوہر دکھلاتے تھے اور جن کے گلہائے کلام کی خوشبو سارے ہندوستان کو معطر کئے ہوئے تھی، آنکھوں سے پنہان ہوگئیں۔ اے انقلاباتِ عالم کی کالی کالی گھٹاؤ۔ شاید انکو تم نے اپنے دامن میں چھپالیا۔ خدارا میری مشتاق آنکھوں کو وہ جلوۂ تابان دیکھ لینے دو۔

اے شمع شبستان بزم حاتم! دیکھ صبح ہونے آئی۔ اللہ اب تو اپنے آنسو دامن نسیم سے پونچھ۔ تیرا رہ رہ کر جھلملانا، رو رو کر اپنے آپ کو گھلانا، اب زیادہ دیکھا نہیں جاتا۔ ذرا اپنی گردن جھکا کر دیکھ کہ تیرے دلسوز رفیق پروانے، تیرے زار زار رونے پر کسطرح مرمٹے ہیں، اب تو یہ بیچارے منزل عدم کو سدھارے، چین سے ان کو کنج فنا میں سونے دے۔ آہ

اب کہاں تسلیم اگلی شاعری
مرمٹے وہ لوگ انھی جکے لئے

جناب استادی شیخ امیر اللہ صاحب تسلیم اُن چند بزرگوں میں سے ہیں جکے دم سے قدیم اُردو شاعری کا نام زندہ ہے، اور آپ اُن کہن مشاق استادوں میں سے ہیں جنپر مٹے ہوئے لکھنؤ کو ناز اور بجا ناز ہے۔ آپ کی وضع سے ظاہر ہے کہ یہ ہماری پرانی شاعری کے آخری دور کے نشانیوں میں منتخبات سے ہیں۔ آپ کے آبا و اجداد کی سکونت مضافات دریاآباد میں تھی، مگر وہ ترک وطن کرکے مدت تک فیض آباد میں مقیم رہے۔ آپ کا آبائی پیشہ زمینداری اور مالگذاری تھا، مگر بوجوہ چند در چند آپنے اپنے وطن قدیم کو خیرباد کہکر لکھنؤ کی سکونت اختیار کی اور محلہ محمود نگر میں قیام پذیر ہوئے۔ اسی محلہ میں آتش بیان خواجہ آتش بھی مقیم تھے اور انکو اور انکے فرزند جوش کو آپنے بخوبی دیکھا بلکہ انکے خاصان صحبت آپکے رفیق و دمساز تھے۔

آپنے فارسی اپنے والد مولوی عبد الصمد صاحب سے اور بعد میں مولوی شہاب الدین سے پڑھی اور عربی کی تعلیم اپنے بڑے بھائی سے پائی۔ جب ان ہر دو علوم میں آپ خوب ماہر ہوگئے تو آپکو خوشنویسی کا شوق دامنگیر ہوا اور آپ منشی عبد الحی سندیلوی کے شاگرد ہوئے۔ آپکا اول کلیات آپ کی کتابت کا نمونہ ہے، جسکا ثبوت جناب عیش مرحوم کی تقریظ سے بھی ملتا ہے۔ فن شاعری کی تحصیل آپ نے نواب اصغر علی خانصاحب نسیم دہلوی سے کی جنکا نسب نامہ شاہ حاتم، سودا اور درد علیہ الرحمۃ سے ملتا ہے اور اس لحاظ سے اُردو شاعری گویا آپکے گھر کی لونڈی ہے۔ اسی آسمان کے آفتاب فیض نے شرق سے غرب تک اُردو شاعری کے نام کو چمکا دیا۔ اور یہی باعث ہے کہ باوجود لکھنوی ہونے کے آپ کو دہلی کا طرز پسند رہا۔ فرماتے ہیں۔

میں ہوں اے تسلیم شاگرد نسیم دہلوی
مجھکو طرز شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

آپ کی اولاد میں صرف منشی تجمل حسین صاحب پہلی بیوی کی یادگار موجود ہیں۔ مگر شاعری سے انھیں کچھ سروکار نہیں۔

صاحبزادہ موصوف کی والدہ کے انتقال کے بعد آپ نے لکھنؤ مین دوسری شادی کی مگر ۱۳۱۰ھ مین رامپور آکر وہ بھی انتقال کر گئین۔ آپ کے شاگردون مین رشید لکھنوی اور شوق نیموی کا درجہ بہت بلند تھا۔ آجکل بدر لکھنوی و حسرت موہانی کا نام مشہور ہے۔ جناب حسرت کی ذاتی تحریک اور کوششون نے استاد تسلیم اور مرزا محمود ایسے سخندان فن کو علیگڈھ مین اکٹھا کیا تھا، جو گویا بزم آخر تھی۔ رامپور والون مین منشی محمد اسمٰعیل خان صاحب تمنا جو صاحب دیوان ہونے کے علاوہ اور بھی کئی کتابون کے مصنف ہین آپ کے شاگردون مین ممتاز ہین۔ ان حضرات کے علاوہ آپ کے شاگردون کا دائرہ ہندوستان مین بہت وسیع ہے۔

استاد تسلیم کی عمر الیوم نود فزود (نوے) برس کی ہے، مگر اب بھی آپ کا دل و دماغ صحیح ہے۔ یہ عنایت ایزدی ہندوستان کے تمام اساتذۂ اولین و آخرین مین صرف آپ کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ آپکی ذات الشیائی شاعری کے آسمان مین آفتاب لب بام ہے۔ ناسخ مرحوم کی صحبتون کا دیکھنے والا اب بجز آپ کے لکھنؤ مین اور کوئی نہین ہے۔ محمد علی شاہ بادشاہ لکھنؤ کے عہد حکومت مین آپ پانچسو سپاہیون کے افسر تھے۔ مگر واجد علی شاہ کے زمانہ مین برطرفی ہو گئی۔ آپ نے بوساطت اپنے دوست کپتان مقبول الدولہ مہدی علی خان بہادر مقبول شاگرد ناسخ پھر درخواست کی تو نواب واجد علی شاہ نے دست خاص سے عرضی پر یہ حکم صادر فرمایا ؎ اختر

بشنوائے خوشنویس وائے خوشگو ہر دو فن میکنی و ہر دو نکو

اسم تو مندرج بہ دفتر شد بست و دو روپیہ مقرر شد

تا انتزاع سلطنت آپ کو یہ تنخواہ ملتی رہی۔ مگر جب ۱۸۵۷ء کے غدر نے منہ دکھلایا اور خزان انقلاب نے گلشن لکھنؤ کو ویران کر دیا تو ماہران فن سخت تکلیفون مین مبتلا ہو گئے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ کلب علیخان بہادر بے اختیار تھے۔ مگر بوجہ قدردانی استاد تسلیم رامپور تشریف لے گئے۔ وہان آپکا کچھ وظیفہ مقرر نہین ہوا اور سخت تکلیف سے یہ ایام مصیبت بسر کئے۔ جب ہنگامہ غدر کم ہوا تو لکھنؤ کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔ اور آپنے لکھنؤ کی واپسی کا عندیہ ظاہر کیا۔ نواب صاحب نے یکصد روپیہ زادراہ دیکر رخصت کیا۔ جب لکھنؤ پہونچے تو منشی نولکشور صاحب مرحوم نے نیا نیا مطبع قائم کیا تھا۔ آپ نے مطبع کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور مشاہرہ چونکہ کم تھا۔ اسلیے آپ کے استاد بھائی اور شاگرد محمد تقی خان بہادر جو سات سو تنخواہ روپے کے وثیقہ دار تھے، آپ کے کفیل رہے۔ مگر ان کی وفات کے بعد آپ مدت تک پریشان رہے۔ ہوتے ہوتے وہ وقت آن پہونچا کہ نواب کلب علی خان بہادر مسند نشین ہوئے اور حلقۂ امیر، بحر، منیر، جلال اور داغ کے ہمراہ آپ بھی طلب کیے گئے۔ اسی یکجائی نے زمانہ پر روشن کر دیا کہ آپ امیر، داغ اور جلال کے ہمعصر ہین، حالانکہ قریب قریب نصف النصف کا فرق تھا۔

جب ایوان رامپور کا چراغ ہوائے اجل نے گل کر دیا تو پروانے بھی راہی ہو گئے۔ آپ کو نواب صاحب منگرول اکاٹھیاواڑ نے اپنے دربار مین رکھنا چاہا۔ ادھر داغ مرحوم نے بھی حیدرآباد سے طلبی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر آپ نے یہ کہکر ٹال دیا۔

میرے دل مین تمنا ہے دکن کچھ اور کہتی ہے

مگر یاد امیر بے وطن کچھ اور کہتی ہے

(علت و ناکامی امیر مرحوم کی طرف اشارہ ہے) غرض آپ بخیال نمک خواری ریاست رامپور عیش و آرام پر لات مار کے

کریم النفسی، قناعت، توکل آپکا حصہ ہے۔ نخوت سخن آپ مین نام کو بھی نہیں۔ اگرچہ اب اس زمانہ مین کہ سماعت و بصارت بالکل جواب دیگئی ہین، آپ کو دعویٰ سخن نہیں مگر عالم شباب مین بھی آپ نے اپنے آپکو مرد عامی ہی سمجھا۔ اور اسی پاک نفسی کا یہ حاصل ہے کہ تمام ہندوستان آپ کو استاد تسلیم کے نام سے یاد کرتا ہے۔

مشق سخن کے لحاظ سے آپ منیر، قلق، گویا، ظلیل، عیش، رند، شاد، قبول، سرور، اور طپش وغیرہ کے معصر ہین۔ آپ نے داغ مرحوم کو محض صغر سنی کے عالم مین دیکھا تھا جبکہ وہ مولوی غیاث الدین سے گلستان و بوستان کا سبق پڑھتے تھے زمانہ کا ورق آپ کے سامنے الٹتا ہے۔ رشحات صفیر بلگرامی مین آپ کے اشعار بطور سند درج ہین۔

زمانۂ غدر مین آپکا وہ کلیات تو لٹ گیا جو نسیم کی زندگی مین مرتب کیا تھا اور جسکا ذکر کلیات اول مین کیا گیا ہے۔ مابعد ایک دیوان ضخیم شائع کیا اور آجکل ایک اور کلیات رامپور مین زیر طبع ہے۔ علاوہ ازین آپ نے سات مثنویان لکھین اور تین ضخیم جلدون مین ریاست رامپور کی تاریخ لکھکر فرمانروایان قدیم کے مزارون پر آبحیات کا چھڑکاؤ کیا۔

آپکا کلام جمیع عیوب صوری و معنوی سے پاک اور وزن دار ہے۔ اور زمانہ نے اسکو مان لیا ہے کہ نسیم دہلوی و مومن خان کا نام آپ ہی نے روشن کیا ہے ؎ تسلیم

قدرت ناتوان مین نہین کچھ بھی کمی
بے تیل جل رہا ہے چراغ آفتاب کا

آخر مین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کلام کا تھوڑا سا نمونہ بھی نذر احباب کیا جائے۔ و ہو ہذا

گرانے سے کبھی کم ظرف اعلیٰ ہو نہیں سکتا
اٹھائے اگر سر فوارہ دریا ہو نہیں سکتا
اگر [illegible] ذرات سے [illegible] جلوہ آرائی
نہ ہو خورشید سے کا [illegible] ہو نہیں سکتا

کسی کا پردہ دار راز ہون چھیڑو نہ اے ہمدم
لب تصویر کی صورت مین گویا ہو نہیں سکتا
کبھی وہ دل مین بستے ہین کبھی آنکھون مین پھرتے ہین
مرے ان کے کسی صورت سے پردا ہو نہیں سکتا
عبث تسلیم ہے تجھکو بھروسا اہل دنیا کا
تو سب کا ہو رہا ہے کوئی تیرا ہو نہیں سکتا

ہر چند ہے خیال اپنا یہ نقش ہستی
پھر بھی گران جہان مین ہم سب کی جان پر ہین
خورشید و ماہ و اختر کرسی و عرش اعظم
جلوے جو نور کے ہین سب آسمان پر ہین
نقش قدم تھی ہستی سو وہ بھی نہین ہے باقی
ایسے مٹے ہوئے ہم کس بے نشان پر ہین
کس نے مٹا دیا ہے کہہ کہہ کے لن ترانی
بے نام بے نشان ہم کس بے نشان پر ہین

جاؤن ہزار بار مین اس کوچہ مین مگر
مانند عمر رفتہ پھر آیا نہ جائے گا
کتنا ہے مجھ سے ضعف اگر تو گرا نہین
نقش قدم کی طرح اٹھایا نہ جائیگا
مرنے کے بعد گور مین حرص طلب کمال
پھیلا کے پاؤن ہاتھ بڑھایا نہ جائیگا

موت آئی ہی گئے چھٹ کر غم دنیا سے
یہ دنیا مرنا ہے جسکا نام جینا ہو گیا
یاس و حسرت درد و غم ناکامی و رنج و قلق
ایک دل پر ہائے کس کس کا جانا ہو گیا
خاک مین مل جا برومندی کی حسرت اگر
ہو کے پیوند زمین سر سبز دانا ہو گیا

آنسو ہین اس طرح سر مژگان کے ہوئے
گویا چڑھے ہین حضرت منصور دار پر
حاجت نہین ہے نامہ و قاصد کی ہم مین
دل کی خبر لگاتے ہین اشکون کے تار پر
ماتم ہے اپنے مرنے کا گھر گھر مگر یہ تو
خوش ہو کے ہنس رہا ہے ہمارے مزار پر
تسلیم گو ہین پیر مگر دل جوان ہے
مرتے ہین جان بوجھ کے اب بھی نگار پر

جب ہوئے بے آب و دانہ ذکر حق جاتا رہا
[illegible]

ایسے نظرون سے گرے اشک کہ پھر ٹوٹ گیا
اپنے رونے پہ مجھے آپ ہنسی آئی ہے
زندگی جاگتے گذری ہے گھڑی بھر ہمدم
مرگ اے شور قیامت مجھے نیند آئی ہے
چھٹ گئے مرکے ہر اک درد والم سے تسلیم
موت بھی ہمدم اعجاز مسیحائی ہے

چھوڑ دنیا کو سوئے ملک عدم چل تسلیم
راستہ دیکھتی ہے گور غریبان تیرا

آخری شعر کا مضمون آپ اپنے مقطعات و اشعار مین بہت باندھتے ہین اور نئے نئے انداز سے باندھتے ہین۔ مگر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تا دیر آپ کو زندہ و سلامت رکھے۔

عرش (گیاوی)

علامہ جلال مغفور

پیدائش ۱۲۵۰ھ - وفات ۱۳۲۷ھ

حکیم سید ضامن علیصاحب جلال کی ذات بابرکات اس دورکہن کی آخری یادگار تھی جوانیسوین صدی کے آغاز سے شروع ہوکر بیسوین صدی کی ابتدامین ختم ہوگیا۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر لکھنؤ کے پہلے بادشاہ تھے جو ۱۸۱۴ء مین مسند آبائی پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ انہین کے عہد معدلت مہد مین لکھنؤ کی اُس شاعری کی ابتدا ہوئی جو دہلی کی شاعری سے بالکل جداگانہ تھی اور جسے یہین کا ایجاد کہنا چاہیے۔ اسی زمانے مین شیخ ناسخ مرحوم نے کوس لمن الملکی بجایا اور مروجہ زبان اور مذاق شاعری کی کایاپلٹ کردی۔

حضرت جلال اسی خاندان کے نام لیوا اور اردو شاعری کے آخری ارکان ثلاثہ کے تیسرے رکن تھے۔ ان سے پہلے امیر و داغ کی وفات پر ہماری شاعری ماتم کر چکی ہے اور ابھی یہ دونون زخم تازہ تھے کہ اسے تیسرا اور آخری زخم بھی اُٹھانا پڑا جو نہایت حسرتناک ہے۔ کیونکہ انکے ساتھ ہی اُس طرز قدیم اور آداب فن کا بھی خاتمہ ہوگیا جنکی آیندہ نسلین آرزو کرینگی۔

جلال مغفور کی پیدائش کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ناسخ و آتش کی اُستادی کے ڈنکے بج رہے تھے اور رند و صبا، وزیر و خلیل، رشک و برق ایسے جادو بیانون کی شہرت سے تمام لکھنؤ گونج رہا تھا۔ ہوش سنبھالا تو ہر طرف شاعر ہی شاعر نظر آئے اور جدھر کان لگا کر سنا شاعری ہی کے دلکش ترانے سنائی دئے۔ یہی لکھنؤ کی شاعرانہ زندگی کی معراج تھی اور یہی وہ خواب تھا جو خیالی دُنیا مین ابتک دیکھا جارہا ہے۔

بہرکیف حضرت جلال کی ابتدا شاعرانہ دھوم دھام کے زمانے سے ہوئی اور جس آب و ہوا مین اُنھون نے پرورش پائی وہ اس فن کے لیے نہایت موافق تھی۔ جسطرح آج تھیٹر اور بال کے جلسے تہذیب کے اعلیٰ ارکان مین داخل ہین اسیطرح اُس زمانے مین شعر و شاعری کی صحبتین تہذیب کا جزو اعظم خیال کیجاتی تھین۔ اس سے بحث نہین کہ وہ حماقت پر مبنی تھین یا عقلمندی پر۔ کیونکہ ہر زمانے کی حماقت و عقلمندی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے جسپر آیندہ نسلون کو نکتہ چینی کا کوئی حق نہین۔

جلال نے ہوش سنبھالا تو یہی میدان سامنے تھا۔ جوانی کے جوش اور زمانے کی ہوا نے انہین بھی اُسیطرف بڑھادیا۔ مگر یہ بالکل نٹ پونجیے شاعر نہ تھے بلکہ علوم متعارفہ کی دولت سے مالامال تھے۔ فارسی و عربی کی کافی استعداد کے علاوہ فن حکمت مین بھی دستگاہ رکھتے تھے اور یہ اُنکا آبائی پیشہ تھا۔ اُنکے والد حکیم سید اصغر علیصاحب ایک مشہور طبیب تھے اور اپنی شہرت کی بدولت روساء لکھنؤ کے علاوہ ریاستہائے غیر سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ جلال اپنے والد کی حیات مین ضروریات زندگی سے مستغنی تھے اسلئے اُنہین مشق شعر کیلئے کافی وقت اور عمدہ زمانہ ملا۔

لیکن یہ بےفکری زیادہ عرصے تک قائم نہین رہی ۱۸۵۷ء کا غدر وہ سیلاب تھا جو شمالی ہندوستان کے اکثر شہرون کے ساتھ لکھنؤ کی ساری کائنات بہالے گیا۔ لوگ بھاگ گئے جد

جب شہر مین واپس آئے تو اس فردوس مین خاک اُڑ رہی تھی جو حضرت آدم کے باغ ارم سے زیادہ پُر فضا اور مینو سواد تھا۔ مکانات کی جگہ کھنڈر اور محلّون کی جگہ لق و دق میدان تھے۔ جو نقد و جنس ساتھ تھی وہ راستے مین لُٹ گئی اور جو گھر مین دفن کر گئے تھے۔ اور بیر بھاری بھاری تیغے لگا گئے تھے وہ بدمعاشون کی نذر ہوئی۔ بڑے بڑے اچھے اچھے امیرون کے یہان بھی خاک پاک کی تسبیح اور بوھیے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اس تنگ وقت مین حضرت جلال نے اپنا موروثی پیشہ اختیار کیا اور اپنا مطلب شہر کے اُس مغربی حصے مین کھولا جو شرفا اور عمائد شہر کی سب سے بڑی بستی تھی اور مدت سے علم و کمال کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اس مغربی حصے سے میری مراد اُس مقام سے ہے جو میان الماس کے عالیشان امام باڑے کی پشت پر واقع ہے۔ کبھی یہ مقام سارے شہر کا خلاصہ تھا لیکن آج خاک اُڑ رہی ہے اور انسان کیا جانور بھی اس منحوس زمین پر پانون رکھنا پسند نہین کرتے۔

اسی مقام پر ایک رئیس رہتے تھے جنکا نام بخشی نوندہ رائے تھا۔ حضرت جلال کے والد اور ان رئیس مین مراسم قدیم تھے۔ اسی تقریب سے جلال نے اپنا مطب اُنکے دیوان خانے مین کھولا تھا۔ بخشی نوندہ رائے شعر و سخن سے ذوق رکھتے تھے اور شاعرون کے قدر دان تھے۔ میر دوست علی خلیل اُنکے اُستاد تھے بخشی جی گو اعلیٰ درجے کے شاعر نہ تھے لیکن پختہ کلام تھے اور "وقار" تخلص کرتے تھے۔ انکے ایک اور عزیز کا نام بخشی پتمبر داس تھا جنکے یہان منشی امیر اللہ صاحب تسلیم کی نشوونما ہوئی۔ منشی صاحب ابتک ان مرحوم کو چچا کے لفظ سے یاد کرتے ہین۔ لیکن چونکہ اب ہندو مسلمانون مین اگلی یگانگت کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے لہذا اسکی زیادہ تفصیل تحصیل حاصل ہے۔

کہان اب وہ مسلمان اور ہندو
نہ تھی جنمین کہ غیریت سرِ مو

خلاصہ یہ کہ بجائے تشخیص مرض اور نباضی مین نام و نمود حاصل کرنے کے حضرت جلال کو یہان بھی شعر و سخن ہی کی زیادہ مذاولت رہی۔ حالانکہ فن حکمت مین وہ عمدہ دستگاہ رکھتے تھے لیکن طبیعت کا اصلی رُجحان شاعری ہی کیطرف رہا' اور یہی اچھا ہوا۔ کوئی شک نہین کہ اگر وہ طبابت مین جی لگاتے تو اپنے زمانے کے نہایت نامور حکیم ہوتے اور آج بڑی بڑی عمارتین اور کافی دولت چھوڑ جاتے۔ لیکن بہ نسبت اُس عارضی دولت و ثروت کے جسے فنا ہوتے دیر نہین لگتی اُنکی وہ ادبی تصانیف بدرجہا بہتر ہین جو ایک لازوال دولت ہین اور جنھین بقاء دوام حاصل ہے۔

فن شعر مین اولاً وہ جناب ہلال کے شاگرد ہوئے جو میر علی اوسط رشک کے تلامذہ مین ممتاز تھے۔ لیکن تھوڑے عرصے بعد خود رشک مغفور کے زمرۂ تلامذہ مین داخل ہوگئے۔ رشک مرحوم زباندانی اور تحقیق فن مین درجۂ اجتہاد رکھتے تھے۔ ناسخ مرحوم کے بعد اُنکے تمام شاگردون نے انھین کے آگے زانوے شاگردی تہ کیا تھا۔ منشی اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی بھی اُنکی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ رشک مرحوم نے اُردو شاعری کو اپنے فیض کمال سے بہت کچھ سیراب کیا تھا۔ اُردو زبان کا پہلا لُغت اسی یگانۂ آفاق محقق کے قلم سے نکلا تھا جو نہایت مدلل (مبسوط) اور مکمل تھا۔ لیکن اُس زمانے مین چھاپے کی یہ ارزانی نہ تھی جو آجکل نظر آتی ہے اور اسیوجہ سے ایسی قلمی لغت کا کہین پتہ نہین ملتا۔

جلال مغفور کی زندگی کا تابناک زمانہ دربار رامپور سے شروع ہوتا ہے جہان ہنگامۂ غدر کے بعد اہل کمال کا سب سے بڑا مجمع تھا۔ بحر۔ قلق۔ اسیر۔ منیر۔ غالب۔ امیر۔ داغ۔ جلال وغیرہ اُس دور کے تمام نامور اور کامل الفن شاعر اسی دربار کے وظیفہ خوار تھے اور مجمع اہل کمال سے رامپور اصفہان و شیراز پر چشمک زنی کرتا تھا۔ قدردان اور سخن رس رئیس نے ہندوستان کے ہر گوشے سے صاحبان کمال کو کھینچا تھا جبمین علما۔ شعرا۔ قاری۔ حافظ۔ ناشر۔ خطاط اور جملہ علوم وفنون کے ماہر شامل تھے۔

جلال کو تحقیق فن کا شوق اپنے اُستاد رشک مرحوم سے بطور ورثہ ملا تھا جو اُنکی آخر زندگی تک قائم رہا۔ فارسی و عربی مین اعلیٰ استعداد رکھتے تھے اور اُردو اُنکی مادری زبان تھی۔ ان وجوہ سے اُنہین تحقیقِ زبان مین زبردست انہماک تھا۔ چنانچہ رامپور کے مجمع شعرا مین اکثر وہ معاصرین کے کلام پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ اور اسی کے بدولت انکے معاصرین اُنسے خوش نہین رہے۔

نکتہ چینی کی عادت رفتہ رفتہ استقدر ترقی کر گئی کہ رامپور مین اُنکی شہرت کا یہی باعث ہوئی۔ معاصرین سے اکثر شاعرانہ معرکے ہوئے ہین لیکن اُنکے بالتفصیل حالات باوجود کوشش بھی دستیاب نہین ہو سکے۔ مرزا غالب مرحوم سے لفظ "عفی" پر عرصے تک بحث جاری رہی مگر نتیجہ کیا ہوا؟ اسکا جواب کوئی نہین دے سکتا۔ مولوی غیاث الدین مولف غیاث اللغات کو "ملّائے مکتبی" کا خطاب جلال ہی کے شاعرانہ دربار سے ملا تھا جسپر نواب صاحب کا عتاب نازل ہوا تھا۔

لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جلال پھر رامپور بلائے گئے اور وہین اُنکا مایۂ ناز لغت "سرمایۂ زبان اُردو" لکھا گیا تھا جو اُردو محاورات کا سب سے پہلا اور مستند لغت ہے۔ اِس دور کے شعرا مین جلال کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُنہون نے زبان کے اصول و قواعد سب سے زیادہ مدوّن کئے۔ چنانچہ تذکرہ بالا لغت کے علاوہ اُنہون نے تذکیر و تانیث کے متعلق بھی ایک رسالہ لکھا جو اس فن مین سب سے پہلا رسالہ ہے۔ اسیطرح زبان کے بعض قواعد بھی ایک کتاب کی حیثیت مین مدوّن کئے جنکا نام "منتخب القواعد" ہے۔ آخر مین فن عروض پر ایک رسالہ لکھا تھا جسکا مسودہ راقم کی نظر سے گذرا تھا۔ فن تاریخگوئی پر بھی اُنہون نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اسطرح زباندانی کا ایک عمدہ مسالہ اُنکے قلم نے جمع کر دیا جسپر عالیشان عمارتین اُٹھ رہی ہین۔

شاعری مین بھی اُنہون نے چار دیوان کہے ہین اور سب چھپ چکے ہین۔ حالانکہ اُنکے ابتدائی دو نون دیوان اسوقت عنقا ہین لیکن اُنکا اصلی زورِ طبیعت اُنہین دواوین سے ظاہر ہے۔ اُنکا رنگ سخن بہ نسبت جدت طرازی کے زیادہ تر پختگی لئے ہوئے تھا اور اگرچہ اُنکے کلام مین رنگین اشعار بکثرت موجود ہین مگر زیادہ تر صفائی اور روزمرہ ہی پر زور دیتے تھے اور یہی اُنکے کلام کی خصوصیات ہین۔ جلال کی شاعری پر ایک نکتہ شناس کا ریمارک ہے کہ "اُنہون نے اپنے لئے وہ پختہ سڑک تیار کی تھی جسپر لغزش کا خوف نہین"۔

مضمون آفرینی کے میدان مین بھی وہ اپنے معاصرین سے کم نہین رہے لیکن اُنکے اشعار مین پیچیدگی کو دخل نہین۔ سیدھے سادے خیالات، بندھے ٹکے محاورے، استادانہ چُست بندش اور اُستادانہ ترکیبین اُنکی شاعری کی جان ہین۔ اپنے اسکول کے خلاف وہ تصنع اور آورد کے رنگ سے ہمیشہ گریز کرتے رہے اور یہ صفت اُنکے کلام مین ابتدا سے انتہا تک

صاف نظر آتی ہے۔ انکی شاعری مین ایک اور باب الامتیاز بھی ہے اور وہ انکا مذاق صحیح ہے۔ عاشقانہ رنگ مین وہ اُس حد تک نہین جاتے تھے کہ فحش ہوجائے۔ بلکہ اُس مذاق کو بھی جو اُسوقت کی سوسائٹی مین نہایت مقبول تھا جلال نے ایک لطیف پیرائے مین نظم کیا ہے۔ شلاً :-

کنگھی چوٹی مِسی کاجل زیب و زینت ، نازکی
کس نے کس نے انکو روکا ہے گھر آتے ہوئے
ناز سے چلئے ذرا اپنی کمر پر رکھکے ہاتھ
ہم بھی دیکھین ناز کی کو پاؤن پھیلاتے ہوئے

یہ اُردو شاعری کا پُرانا رنگ ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اسمین رشک و برق اور رند و صبا وغیرہ کے مذاق کی جھلک موجود ہے۔ انکا عام مذاق ذیل کے اشعار سے واضح ہے اور یہی انکا خاص رنگ تھا جو اُنکے پہلے اور دوسرے دیوان مین موجود ہے :-

شغل اگر ڈھونڈھتے موجی کے بہلنے کیلئے
دل مین آبیٹھو کلیجہ مرا ملنے کیلئے
شکوہ ہے برق تجلی سے کہ اوٹھا اٹھا نہ اٹ
ہم ہون سُنہ دیکھنے کو اور ہو جلنے کیلئے
مے کہاں روز ہے پی لیتے ہین گاہے ماہے
وہ بھی تھوڑی سی مزہ منہ کا بدلنے کیلئے
دل مرا آنکھ تری دونون ہین بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے
عجب طرح کا رسہ ہے وصل یار کی شام
سفیدہ آنکھ ہو تو صبح کو سیاہ ملے

ان چند اشعار سے اُنکی عام شاعری پر روشنی نہین پڑسکتی مگر اختصاراً اسیقدر کافی ہین۔ خصوصاً ادیب کے صفحات پر اُنکی عاشقانہ شاعری کی زیادہ تفصیل کی گنجائش نہین۔ لاجرم اُنکے حالات زندگی جس حد تک معلوم ہین مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہین۔

رامپور مین جلال جیس بائیس برس تک رہے اور وہان سے ترک تعلق ہونے پر ہندوستان کی ایک دور دراز ریاست منگرول مین جو کاٹھیاوار مین واقع ہے ملازم ہوئے۔ وہان کے قدردان رئیس نے اُنکی قدردانی مین دریا دلی سے کام لیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا اور وہ اپنے وطن مالوف مین اطمینان کے ساتھ رہنے لگے۔ اس عرصے مین اُنکے شاگردون کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ ہندوستان کے ہر گوشے مین انکا ایک نہ ایک شاگرد موجود تھا اور اصلاح کلام کا کام اسقدر بڑھ گیا تھا کہ اکثر شبانہ روز معروفیت رہتی تھی۔ اسکے علاوہ ذاتی تصنیف و تالیف کا کام بھی کچھ کم نہ تھا۔

اُردو رسالون کی ابتدا شاعرانہ گلدستون سے ہوئی تھی جنمین ہر طرح غزلیات شائع ہوتی تھین تھوڑے ہی عرصے مین ان گلدستون کی وہ کثرت ہوگئی کہ بعض اخبارات نے انہین "حشرات الارض" کا خطاب دیدیا۔ بہر نوع ان بیحد و عد گلدستون مین جلال کی غزلین عموماً ہوتی تھین۔ اور یہ محض اسوجہ سے کہ وہ شاعرانہ فرمایشون کو کبھی نہین ٹالتے تھے۔ غزلون کے علاوہ قطعات تاریخ کی فرمایشات کی بھی کثرت رہتی تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ انہین دوسرون کے لئے غزلیات و قصائد بھی کہنا پڑتے تھے۔ مگر انکی مشق سخن اسحد تک بڑھی ہوئی تھی کہ روزانہ دس بیس غزلون کی اصلاح، دو ایک غزلون کی

تصنیف اور اکثر اوقات ایک آدھ قصیدہ بھی کہہ ڈالتے تھے۔

یہ سب کام وہ خود ہی کرتے تھے اور ہمیشہ اپنے کمرے مین اکیلے بیٹھے رہتے تھے۔ عام استادون کیطرح اُنکے گرد شاگردونکا مجمع کبھی نہین دیکھا گیا۔ بعض شاگردون کو عروض وغیرہ کا درس بھی دیتے تھے اور اکثر شاگرد اپنی غزلین بنوانے آتے تھے۔ لیکن یہ سب کام بہت جلد ہو جاتا تھا اور کسیکو دربارداری کی ضرورت نہین لاحق ہوتی تھی۔ وہ زیادہ تر تنہائی پسند تھے اور ایک شاعر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

اُنکے شاگردون مین میرزا ذاکر حسین صاحب یاس مرحوم۔ محمد احسان علیخانصاحب احسان شاہجہانپوری اور سردار اودھم سنگہ صاحب اثر آسری زیادہ نامور ہین۔ انکے علاوہ اُنکے تلامذہ کی تعداد اسقدر زیادہ ہے کہ پوری تفصیل نہین ہو سکتی۔ اُنکے صاحبزادون مین حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال ایک نامور شاعر ہین جو اپنے کامل الفن والد کی جانشینی کی پوری قابلیت رکھتے ہین۔ رسالہ دستور الفصحا انہین کے قلم سے نکلا تھا جسمین متروک اور غلط الفاظ کی تشریح کیگئی تھی اور جسپر عرصے تک معرکہ آرائیان ہوتی رہین۔ اس رسالے مین بعض ایسے الفاظ بھی تھے جو حضرت جلال کے قدیم کلام مین موجود تھے۔ اسلیے لوگون کو اسکی تردید کے لیے ایک زبردست دلیل ملگئی تھی۔ لیکن جلال نے سب کو یہ کہکے خاموش کر دیا کہ جن الفاظ کو ہم ابتدا مین صحیح سمجھتے تھے اب انہین ازروے تحقیق غلط سمجھکر ترک کرتے ہین۔ درحقیقت کوئی شخص ابتدا ہی سے ہمہ دان نہین ہو سکتا۔ پس ایسے دلائل فضول ہین۔

عام طور پر جلال ایک مغرور شاعر کہے جاتے ہین اور یہ بالکل غلط بھی نہین۔ شہر کے مشاعرون مین وہ عام طور پر نہین شریک ہوتے تھے اور کسیکے شعر کی داد دینا اُنکی خلقت ہی مین نہین داخل تھا۔ راقم کی یاد مین وہ ایک مشاعرے مین شریک ہوئے تھے جو نواب امیر بہادر مرحوم کے مکان پر منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے مین شیخ محمد جان صاحب شاد پیرو پیر۔ مولوی علی میان صاحب کامل۔ نواب بنے صاحب مشتاق اور تمام اساتذۂ شہر شامل تھے۔ حضرت جلال کی شرکتِ مشاعرہ کے لیے سخت کوششین کیگئی تھین اور بعد انتظار بسیار وہ اپنے صاحبزادہ جناب کمال کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ شرکار مشاعرہ مین حضرتِ شاد سب سے زیادہ کہنہ مشق اور پرانے بزرگ تھے۔ اُنکی ایک غزل بہت مشہور تھی جسکا مطلع حسب ذیل ہے۔

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤن یہ مرضی مرے جلاد کی ہے

یہی مشاعرے کی طرح تھی اور اسی زمین مین سب نے غزلین کہی تھین۔ مشاعرہ شروع ہوا اور شاد و کامل و مشتاق سب پڑھ چکے مگر جلال کا قفل سکوت نہ ٹوٹا۔ حتیٰ کہ ابھی نصف سے زائد شاعر پڑھنے کو باقی تھے کہ جلال اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے صاحبزادے کیطرف یہ اشارہ کر کے کہ "انہین سُنیئے" فوراً روانہ ہوگئے۔

اسیطرح وہ اپنی شاعرانہ آن بان کو ہر جگہہ لیے رہے اور اسیوجہ سے بعض لوگ بے سبب بھی انکے مخالف ہوگئے۔ چنانچہ جناب شوق نیموی نے "اصلاح" و "ایضاح" نام دو کتابین شائع کر کے جلال پر اعتراضات کی بھرمار کر دی۔ لیکن چونکہ وہ وہ ایک مخالفانہ جوش تھا لہذا دیرپا نہ ثابت ہوا اور زمانے نے اُس مخالفت کو بہت جلد فنا کر دیا۔

سب سے آخر مین جلال ایک اور مشاعرے مین شریک ہوئے جو سید بادشاہ نواب صاحب رضوی رئیس پٹنہ

نے کلکتہ مین منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے مین اُنھون نے اپنی معرکۃ الآرا غزل سے لکھنؤ کی عزّت رکھ لی اور نہایت وقار حاصل کیا۔ اسمین شک نہین کہ اس پیرانہ سالی اور کثرت اصلاح کی حالت مین بھی جب وہ طبیعت پر زور دیتے تھے تو ایسے لاجواب شعر نکال لیتے تھے کہ لوگ دنگ رہ جاتے تھے لیکن عام طور پر اُنکا آخری کلام نہایت پھیکا ہے۔

یہ مسلم ہے کہ وہ اپنے کلام کے سامنے کسی دوسرے شاعر کے کلام کی ہستی نہین سمجھتے تھے۔ تاہم نظام رامپوری کے اکثر اشعار نہایت ذوق سے پڑھا کرتے تھے اور اُنکی پوری داد دیتے تھے۔ اُنکے مزاج مین ایک حد تک خشونت موجود تھی اور شاعرانہ معاملات پر وہ اکثر اُلجھ بیٹھتے تھے۔ لیکن جن لوگون کو اپنا سچا دوست سمجھتے تھے اُنسے اُس لطف سے پیش آتے تھے جو بیان نہین ہو سکتا۔

ضیق النفس اُنکا قدیم مرض تھا جسمین وہ مدت سے مبتلا تھے۔ اور اکثر اسکا دورہ بہت سخت ہوتا تھا۔ تاہم اُنکے روزمرہ کے مشاغل مین مشکل سے کمی واقع ہوتی تھی۔ اصلاح کلام اور تصنیف و تالیف کے علاوہ اُنھین کتب بینی کا شوق اسقدر زائد تھا کہ آنکھون مین ناسور پڑ گئے تھے اور بائین آنکھ کے زخم سے مواد جاری رہتا تھا۔ تاہم روز علی الصباح نہایت باریک خط کے قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور عینک کی کبھی احتیاج نہین ہوتی تھی۔

مرض الموت صرف معمولی بخار تھا جسنے دو چار روز مین کام تمام کر دیا۔ انا للہ وانا علیہ راجعون۔ اُنکے لوح مزار پر جو قطعۂ تاریخ کندہ ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

مہ شوال کی تاریخ چوتھی وہ بدھ کا روز تھا آفت کا سامان
وہ شاعر اُٹھ گیا بزم جہان سے کمال شاعری جسپر تھا نازان
کمال آنکھون سے پنہان ہین جلال آہ
چھپا ہے شاعری کا مہر تابان
۱۳۲۷ھ

نقاد لکھنوی

تصویر ریاض

دیکھکر بے ساختہ جی بھر آیا، آہ! یہ اُسوقت کی تصویر ہے جبکہ ریاض زندہ تھے۔ اسی زمانہ مین کہا گیا تھا۔ ؎

دُنیا کی پڑ رہی ہین نگاہین ریاض پر — کس نوک کا جوان ہے کس آن بان کا

جن لوگون نے اب مردہ ریاض کو دیکھا ہے اُنکے دلون سے پوچھیے کہ جوان ریاض کی تصویر دیکھکر کیا گذر گئی؟ ہاے اُن کمبخت دیکھنے والون مین ایک مین بھی ہون۔ کہہ نہین سکتا کہ زندہ ریاض کی تصویر دیکھکر حسرت نصیب دل پر کسقدر چوٹ لگی؟

ریاض کی موجودہ تصویر اگر ادیب مین دیجاے تو کوئی پہچان نہین سکتا کہ یہ وہی ریاض ہین جو ستمبر کے ادیب مین نظر آتے ہین۔ آہ! اب اُنکی شکل و شباہت، وضع و قطع اور مزاج و طبیعت مین زمین آسمان کا فرق ہوگیا ہے اور بلاشبہ وہ حقیقی معنون مین مردہ ہین۔

علاوہ دیگر تفکرات دُنیاوی و ترددات خانگی کے جو ہمیشہ اُنکو گھیرے رہے آخر عمر مین ایک روحانی صدمہ اور ناگوار مصیبت ایسی پڑی جسنے اُنکی کمر کو توڑ دیا اور دل و دماغ کو قابو مین نہ رکھا۔ ناگوار مصیبت کا ذکر کرنا فضول ہے۔ البتہ روحانی صدمہ کے اظہار مین کوئی مضائقہ نہین۔ آپ یہ سُنکر بیتاب و بے قرار ہوجاینگے کہ حضرت ریاض خود ہی زندہ درگور نہین بلکہ اپنی معنوی اولاد (دیوان) کو بھی کھوے ہوے بیٹھے ہین۔ جسوقت دفتر ریاض الاخبار گورکھپور سے لکھنو منتقل ہو رہا تھا راستہ مین حضرت کا مکمل و مرتب دیوان جاتا رہا اور ایسا گیا کہ آج تک پتہ نہین۔ اس صدمہ جانکاہ سے اُنکی رہی سہی جان بھی سلب کر لی اور قبل از وقت پیر فانی بنا دیا۔

جہان ریاض کی تصویر دیکھکر پُرانے زخم ہرے ہو گئے وہان ایک تازہ چرکا یہ بھی لگا کہ اُنکی شان کے موافق حالات نہین شائع کیے گئے جسپر حکیم برہم عـہ صاحب ایڈیٹر مشرق نے یہ بات بالکل حق بجانب لکھی کہ "جو کچھ حضرت ریاض کے حالات مین لکھا گیا ہے اُس سے زیادہ تو ادیب کے اکثر ناظرین بھی جانتے ہونگے۔" فی الحقیقت ریاض کو بحیثیت شاعر کے دکھایا ہی نہین گیا جس سے پتہ چلتا کہ متاخرین مین ریاض کا پایۂ شاعری کسقدر ارفع و اعلی ہے؟

ہماری یاد مین اُنکی زندگی اور موت کا جو کچھ کلام محفوظ ہے اُسے دو دورون مین تقسیم کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہین۔ پہلا دور زندگی کا ہے اور دوسرا موت کا۔ دونون کے بغور دیکھنے سے خیالات کی تدریجی رفتار اور طبیعت کے تغیر پذیر ہونے کا حال بخوبی معلوم ہو سکیگا۔ ؎

شغل ہستی و عدم آئینہ دکھلاتا ہے — کہ اِدھر سبزہ نظر آتا ہے اُدھر خاک نہین

پہلا دور

بیان خواب کی طرح جو کر رہا ہے
یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا

ان سے کچھ یہ شفق شام لگا بھی آئی — گر شب وعدہ جو آئے تو حیا بھی آئی
درد فرقت کی اذیت کا نہ پوچھو کچھ حال — آدمی گھبرا کے کئی بار قضا بھی آئی
اُنکے دن آئے ہوئے مجکو قفس مین گذرے — جا نکلے کو کبھی گلشن کی ہوا بھی آئی

عـہ حضرت ریاض کے حالات کے لئے سب سے پہلے حکیم صاحب ہی کو تکلیف دی گئی تھی (ایڈیٹر)

بھولتا ہی نہیں کسنا یہ کسی کافر کا تجھے بھولے سے کبھی یاد خدا بھی آئی
کیوں زمیں میں نگہ شرم گڑی جاتی ہے ہچکیاں لینے کو تربت میں حیا بھی آئی
شمع تربت کے لئے جنبش دامن تھی بہت انکے دامن سے لگی باد صبا بھی آئی
تو ہمیشہ رہی قاتل کی کمر میں اے تیغ تیرے صدقے تجھے قاتل کی ادا بھی آئی

آئے میخانہ میں جب مسجد جامع سے ریاض
ساتھ ہی آپ کے قبلے سے گھٹا بھی آئی

چونک رہی ہے روز قیامت کیواسطے وہ صبح بھی نہیں شب فرقت کیواسطے
بنجاسے کوسے یار میں تھی آرزو یہی اک حشر اٹھ گیا مری تربت کیواسطے
تم کہدو آسمان سے جھک کر جگہ بنائے دو گز زمین چاہئے تربت کیواسطے
فتنے انکی چال کی کچھ پڑ رہی تھی بحث کیا اُٹھ رہا کچھ آج قیامت کیواسطے

ہر دم دعائیں دیتے ہیں سرکار کو ریاض
اُٹھتے ہیں ہاتھ دامن دولت کیواسطے

ہنگامہ میں قدموں سے وہ ملنے نہیں دیتے ہم ہچکیوں سے دل کو سنبھلنے نہیں دیتے
وہ کیا لحد غیر کو پامال کرینگے چلتے ہوئے فتنے بھی جو چلنے نہیں دیتے

.. ..

آئی ہے یہ کیسی ہوئی کسکی شب فرقت ہم رنگ زمانہ کو بدلنے نہیں دیتے

.. ..

ہے جان مری کشمکش نزع میں دن رات ارمان تو گیا دم بھی نکلنے نہیں دیتے
جاتا ہوں تو آتی ہے یہی غیرت سے آواز ہم دیکھنے والوں کو سنبھلنے نہیں دیتے

کیا کام ریاض اس سے ہے سودا ہے بلا ہے
بلکو یہ حسین پھر سے پھسلنے نہیں دیتے

کسکی نگاہ رہ گئی انکی نگاہ سے طوفان بجلیوں کا اُٹھا جلوہ گاہ سے
ساتھ انکے لاکھوں فتنے خوابیدہ ہو لئے اک حشر اُٹھا جب اُٹھکے چلے خوابگاہ سے
یہ ایک لعنت لاکھ ستم کا جواب ہے محشر میں ہنس کے کر گئے کچھ داد خواہ سے
توبہ شکن یہ کون ہوا تم سے ہمکنار کیا کیا ملی ہے توبہ کے تیرہ گناہ سے
سیری ہوتی نہ لذت عصیاں سے عمر بھر کیا کچھ کیا مگر نہ بھرا جی گناہ سے

جاتے ہیں اب ریاض کہاں سوئے میکدہ
سجدہ میں آ رہے جو اُٹھے خانقاہ سے

بیٹھا ہے کوئی گیسوؤں کے بل نکال کے عکس آئینے میں آئے ذرا دیکھ بھال کے
بالوں میں اپنے اشک کے موتی پرو لیے آنسو نہ پونچھئے کسی آشفتہ حال کے

اُٹھوا دیئے ہیں ساغر ریاض جلد
آتے ہیں اک بزرگ پرانے خیال کے

خوشامد خور کی منہ دیکھی بڑی ہے تمہاری آرسی دیکھی پڑی ہے
قیامت کی خلش کیوں ہر گھڑی ہے وہ تم سے قد میں کم سن میں بڑی ہے
تمنا کو تم اپنے منع کر دو ہماری جان کے پیچھے پڑی ہے

شب غم کی سحر نہیں ہوتی جو بھی تو میرے گھر نہیں ہوتی
دن چڑھے تک حسین سوتے ہیں انکے گھر بھی سحر نہیں ہوتی
گلشن جنت ہے یہ وقت خرام رہگذر رہگذر نہیں ہوتی
جان لو کچھ گئی گذری ہے اسپر منہ چھپائے جو کوستا جائے

.. ..

ہے ریاض اک جوان مست خرام
ڈپٹئے اور جھومتا جائے!

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے ہجوم حشر میں سے آئے میں پلا کے مجھے
تمام عمر کے شکوے مٹائے جاتے ہیں وہ دیکھتے ہیں دم نزع مسکرا کے مجھے
صیاد کو جو مجھ پہ اب ترس نہ آئے باغوں میں موسم گل الفت میں نہ آئے
ہیں مر کر تہ زمین بھی نہیں اب ٹھکانا مرا کہیں بھی نہیں
چھلکائیں لاؤ بھر کے گلابی شراب کی تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

.. ..

ہو ہو ہم خشت خم کعبہ میں بنائے کیسے پیچ جدھر ساغر گئے ہیں جھومتے میدان نکلا ہے
بیزار تھا اس گلکدہ میں گل اس فضا سے یہی یک پشت خار باغ میں لہو سر شدہ ہوا

حسینوں کی بھری محفل جو ہم ہوں — **ریاض** اک چلبلا سا دل جو ہم ہوں

تھے وہاں گو ہر سخن کے **ریاض** — مگر مرا موتیوں سے بھرے ہیں

دوسرا دور

اب عشق کا صحیفہ یوں دل سے مٹ گیا ہے
جیسے یاد کوئی قرآن کر کے بھولے — **داغ**

خیال شب غم سے گھبرا رہے ہیں — ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں

دم وعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ — بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں

لگا دو ذرا ہاتھ اپنی گلی میں — جنازہ لئے دل کا ہم جا رہے ہیں

یہ اُلجھے ہیں رندوں سے کیا شیخ صاحب — بڑھاپے میں کیوں ڈاڑھی اُلجھا رہے ہیں

قیامت بھی جاتی ہے ہر قدم پر — یہ کون آ رہا ہے وہی آ رہے ہیں؟

دعا دے رہا ہوں یہ دیوانگی میں — چنبیلی پھول سنگ جو چھوا رہے ہیں

سیدھی کرنے خدا میکدے میں
دعا مانگتے کیا **ریاض** آ رہے ہیں

وصل کی بھی ہے اب جوانی جائیگی — یہ شراب ارغوانی جائیگی

موت سے بدتر بڑھاپا آئیگا — جان سے اچھی جوانی جائیگی

بوسہ گیسو سے ہیں چین بجبین — رات بھر کیا سر گرانی جائیگی

جان سے بڑھکر رکھے عزیز — کیا سمجھتے تھے جوانی جائیگی

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — میکدے سے اب پرانی جائیگی

نالے کرنا سیکھتے ہیں عندلیب — اب یہ طرز نغمہ خوانی جائیگی

ساتھ لائے ہیں قفس سے ناتوان — جاتے جاتے ناتوانی جائیگی

پیچھے آتے ہیں فرشتے تو **ریاض**
حشر کے دامن میں چھپائی جائیگی

کوئی جانے بھی ہیں اک جلوہ دیکھنے والے — جیسے وہ آئے موسیٰ جا کے تمنا دیکھنے والے

تری نازک سی صورت کیا سمائی کی نگاہوں میں — ہمارے آپ ہیں خار صحرا دیکھنے والے

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جنہوں وہ ہیں یہاں — ابھی موجود ہیں اہل کلیسا دیکھنے والے

خدا جانے عرش آیا جلوہ گاہ حشر میں کس کو — وہ کس سے پوچھتے ہیں مجھکو دیکھا دیکھنے والے

حنائی ہاتھ کا صدقہ بجھا دے آپ لگی دل کی — لگا کر آگ اس گھر میں تماشا دیکھنے والے

نشیمن میں چمن میں تو شرار برق کیوں جائیں — یہ جا کر کون میرا آشیانا دیکھنے والے؟

یہ مجھے پینے والے ہیں **ریاض** ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جام سے ہیں نور حق کا دیکھنے والے

میرے گھر شب برک کے یہ سامان نکلا — آستین قیس کی فرہاد کا دامان نکلا

وہ اداتھی کہ خدا لاکھ حسینوں کا نشانہ — خون میں ڈوب کے اس ڈھنگ سے پیکان نکلا

شفق شام بنی لالہ رخوں کا دامن — سر تو نکلے حسینوں کا گریبان نکلا

یہ وہ پتھر ہے سجدہ سے جو کبھی ہٹ نہ سکا — سنگ در سے بھی سوا آپکا دربان نکلا

اک زمانہ ہے کہتا تھا کہ کافر ہے **ریاض**
وہی ہر کیش بڑا مرد مسلمان نکلا

بیمار نام کی ہے کام کی بیمار نہیں — کہ دست شوق کیلئے گلے کا ہار نہیں

سحر بھی ہوتی ہے چلتے ہیں رات جل جل کر — اب انکے آنے کا مجھکو بھی انتظار نہیں

مجھے یہ ڈر ہے سنا اور طول حشر کو — مرے گناہوں کا مالک مرے شمار نہیں

جناب شیخ سنے ہے پی تو شرابا کے کرا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

اذیت اس دل مردہ کو کیوں ہے پہلو میں — عذاب گور نہیں قبر کا فشار نہیں

بجھے چراغ لحد تھے بھی تھے قبر کے پھول — اب انکا نقش قدم بھی سر مزار نہیں

خدا کا کے پوچھتے ہیں گلرخوں میں **ریاض**
کچھ انکی ریش مبارک کا اعتبار نہیں

یاد پیری میں ادھر آئی اُدھر بھول گئے — اے جوانی تری ہم شام و سحر بھول گئے

پاس نازک کا یہ احسان بھی ہے تاثیر کو — ذبح کے بعد وہ ٹھکرائے کو مگر بھول گئے

وہ بھی یاد ہیں نیم نگاہی میری — دل میں وہ چیز ہے وہ جگر بھول گئے

کھلے مرقد سے یہ راتوں کو صدا آتی ہے — سونے والے مرے ماتوں کا اثر بھول گئے

* جو لوگ ریاض کے ناگوار مصائب سے واقف ہیں انکے دل سے ان اشعار کی حسرت اور سوز و گداز پوچھئے، مطلع و قطع دونوں ریاض کی موجودہ حالت اور کیفیت کا آئینہ سمجھئے۔ ان کلام میں بھی اگر کچھ جلوہ نظر آتا ہے + بیکسی میں تو ادھر ہوں کہ جو کچھ بھی نہیں۔ دوگیں

.. ..

لے چلے فقیر کے گھر حاصل گلگشت چمن   پھینکنا میری لحد پر گل تر بھول گئے

روؤں کیا بیٹھ کے میں اپنے احباب کو ریاضؔ
اب تو وہ بھی میرے دیدۂ تر بھول گئے

جسوقت حضرت ریاضؔ نے گورکھپور چھوڑا ہے تو لکھنؤ آئے ہین تو بڑی بڑی تمنائیں ساتھ لیکر آئے تھے۔ خود ہی ایک مقطع مین اسکا یون اظہار کرتے ہین۔ ؎

ریاضؔ بھی ہم مقدر ہین بازگشت شباب   جوان ہونے کو پیری مین لکھنؤ آئے

لیکن انھین کیا خبر تھی کہ تقدیر کس اوگھات مین ہے؟ .. .. ..

.. .. ۶۔ جو تھکی شہر شہر رسوائی۔ سچ کہا ہے ؎

قسمت کے پیچ مٹ نہین سکتے کسی طرح
لیلیٰ محل کے آتے ہین زلف سیاہ سے
ریاضؔ

بہر تقدیر مرحوم ریاضؔ (خدا انھین مدتون زندہ رکھے) آجکل "عبرت" کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہین جیساکہ خود [illegible] ایک جگہ ارشاد فرماتے ہین۔ ؎

اب مجرمان عشق سے باقی ہون ایک مین
اے موت رہنے دے مجھے عبرت کیواسطے

ادیب نے اگر جوان اور زندہ ریاضؔ کو پبلک سے روشناس کرایا ہے تو اُسے مردہ دل ریاضؔ کو بھی ایک [illegible] دکھا دینا چاہیے تاکہ دُنیا کی نگاہون کے سامنے عروج و زوال اور بے ثباتی عالم کی صحیح و زندہ تصویر پھر جاے۔ ہاے وہ ؎

مجھے ہین یار الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہین ہزارون بنے ہوئے کیسے

شاہ دلگیر اکبرآبادی

علامہ شبلی نعمانی

علامہ شبلی دورِ جدید کے بہترین ورزند و حکماء اسلام میں سے ہیں۔ اس پر آشوب و قحط الرجال زمانہ میں اب یہی ایک ذات ہندوستان میں باقی رہ گئی ہے جو باقیات الصالحات اور سارے ہند کے لئے باعث افتخار ہے۔ خدا ان کو عمر صد سالہ بخشے اور ان کے فیوض علمی سے ہند کو روشن و منور کرے، اور جن تجاویز عالیہ کی تکمیل میں وہ منہمک ہیں اُن کے پھلوں کو دیکھنا انھیں اپنی زندگی میں نصیب ہو! آمین!

سال گذشتہ میں جب شملہ میں ایک نہایت ہی تجربہ کار وسیع المعلومات جرمن مستشرق کے ساتھ جو ہندوستان میں قریباً چالیس سال سے علمی کاروبار میں مشغول ہیں علماء اور ہندوستان کے علماء و مصنفین کا ذکر آیا تو صاحب موصوف نے فرمایا کہ

> "علماء و مصنفین ہند میں مجھے چند باتوں کی خاص کمی محسوس ہوئی ہے اوّل مادۂ تحقیق و تدقیق دوم جانچ پڑتال۔ سوم جدت۔ چہارم مضبوطی رائے و استدلال۔ علماء و مصنفین ہند کا تخیل تو بیشک زیادہ قوی ہے لیکن ان میں مبالغہ کی عادت ہے۔ ان کے تاریخی لٹریچر اور علمی افسانے مبالغہ و متضاد خیالوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ بخلاف اسکے اہل مغرب کے دماغ منطقی استدلال اور درست الفاظ استعمال کرنے کی عادی ہیں۔ اہل مغرب کے محققانہ و عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی دیسی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوتی ہیں"۔

واقعی یہ رائے نہایت منصفانہ و باوقعت ہے جن جن لوگوں نے علامہ ممدوح کی بیش بہا تصانیف مثل تاریخ علم کلام۔ الفاروق۔ الغزالی۔ شعر العجم۔ موازنۂ انیس و دبیر و مجموعۂ رسائل شبلی وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُردو زبان میں یہ تصانیف بلحاظ عالمانہ و محققانہ و فلسفیانہ استدلال و انداز کے کسی مستند یوروپی تصنیف سے کم نہیں ہیں۔ علامہ ممدوح کی تصانیف کی سب سے بڑی خصوصیت فلسفیانہ تحقیق و تدقیق مضبوطی رائے و منطقیانہ استدلال ہے۔ ان میں ایک قسم کی اُرجنالٹی یعنی جدت بھی ہے، اور طرز ادا میں دل آویزی و عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے۔ عالمانہ تحقیق و جانچ پڑتال و جدت متقدمین ائمہ و مجتہدین کی تصانیف کے بعد اب بہت کم نظر آتی ہے۔ تقریباً سات سو سال سے مسلمانوں میں سے جدت و اختراع کا مادہ زائل ہو گیا ہے۔ اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک کورانہ تقلید کے کنوئیں کے مینڈک یا لکیر کے فقیر ہو رہے ہیں۔ کس قدر افسوس ہے کہ اصول ارتقاء عقل کے یہ لوگ منکر ہو رہے ہیں اور ذرا سی بھی جدت و جودت کو بدعت و کفر سمجھتے ہیں۔ وہ تھوڑا سا زمانہ جس میں صرف قرآن اور عقل کا دور دورہ رہا اب تک اسلام میں طلائی دور سمجھا جاتا ہے۔ اسی آزادی کے دور میں ایسے ایسے علماء و ائمہ و مجتہدین پیدا ہوئے جن کا اجتہاد آج بطور قطعی کے مانا جاتا ہے۔ حالانکہ آج بھی ویسے ہی بلکہ شاید ان سے افضل علماء و مجتہدین پیدا ہو سکتے ہیں بشرطیکہ قانون ارتقاء عقل کو مان لیا جائے اور اس پر عملدرآمد ہو۔ یورپ میں جہاں اس اصول کو مان لیا ہے اور عقول انسانی کے نشو و نما میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی جاتی

فضّلنا بعضهم علیٰ بعض کے مصداق علما و فضلا پیدا ہو رہے ہیں۔ اسلام کی سب سے بڑی پولٹیکل مصیبت تو اس روز پیدا ہوئی جب کہ جمہوری حکومت کی جگہ شخصی حکومت نے غصب کر لی اور اسلام کے پولٹیکل نظام کو بدل ڈالا۔ اس کے بعد جیوں جیوں بادشاہان اسلام قوی و خود مختار ہوتے گئے، انھوں نے اور بھی عقل انسانی کے ارتقا میں مزاحمتیں محض اپنی ذاتی اغراض کے لئے پیدا کرنی شروع کیں۔ علما کو بھی دولت و جاہ و حشم کی تزویر میں پھنسا کر اپنا طرفدار بنایا، اور علما نے عوام کو اپنی گرفت میں لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں حریت کا مادہ رفتہ رفتہ سلب ہو گیا۔ عقلی ضعف بھی آ گیا۔ قوت ارادی پست ہو گئی۔ تقلید کے بندھنوں میں جکڑ گئے۔ لکیر کے فقیر بن گئے۔ ظالم سے ظالم و فاسق سے فاسق بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ عوام کی نظر میں وہی بادشاہ و خلیفہ سب سے زیادہ مقبول ٹھہرا ہو تو ہمہ وحریت کا دبانے والا، اور شخصی و نوعی آزادی میں مخل انداز ہو۔ گو ظاہر میں مذہبی جامہ پہنے ہو۔ آج دنیائے اسلام تقلید و منطقی جھگڑوں میں ایسی جکڑی ہوئی ہے کہ نجات مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جا بجا معدودے چند نفوس قدسی ایسے پیدا ہو چکے ہیں جو اس غلامی و ذلت اور اس کے اسباب کو محسوس کر چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو روحانی و عقلی نجات دلائیں جو پولٹیکل آزادی کے ابتدائی زینے ہیں۔ علامہ مفتی عبدہ مصر میں اسی خیال کے تھے اور علامہ شبلی ہند میں ایک ایسا بڑا کام کر رہے ہیں جس کی اہمیت کا اندازہ مسلمانانِ ہند کو دو سو سال کے بعد معلوم ہو گا۔ کوئی شک نہیں کہ اگر علامہ شبلی اوائل اسلام کے زمانہ میں ہوتے تو آج وہ امام و مجتہد وقت مانے جاتے۔ کیونکہ ان میں اکثر ان خصوصیتوں کی جھلک پائی جاتی ہے، جو اوائلِ اسلام کے ائمہ و مجتہدین میں پائی جاتی تھی۔ عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تحقیق و تدقیق و علمی جانچ پڑتال کی عادت۔ اپنی طبیعت سے کسی بات کا پیدا کرنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں و خارستانوں سے نکال کر و سلجھا کر تقسیم و تحلیل کرنا اور پھر اُسے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے۔ یہ وہ خصوصیتیں ہیں جو علامہ ممدوح کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں۔ اسی کے ساتھ علامہ ممدوح میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ مطلق اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ معاملہ فہمی و دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے۔ ایسے علما تو آجکل بہت ملتے ہیں جن کی شان میں سورۂ جمعہ کی یہ آیت بالکل صادق آتی ہے کہ وہ گدھے ہیں جن پر کتابوں کا بوجھ لدا ہو۔ "چار پائے بر و کتاب چند" یعنی علم کے ساتھ عقل ہو، تحقیق و معاملہ فہمی و دُور اندیشی۔

علامہ شبلی کی زندگی اس قابل ہے کہ دیگر علمائے ہند اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کی تعلیم و تربیت بھی مثل دیگر علما کے اسی قدیم اصول و طرز پر ہوئی تھی جو ہندوستان کے پرانے عربی مدرسوں میں آج تک رائج ہے۔ لیکن آپ نے اپنی محققانہ طبیعت و جودت سے برابر کام لیا اور لکیر کے فقیر نہ بن بیٹھے کہ صرف قالَ قالَ کا درس دیتے اور اقوال کے ظاہر پر فی الفور کفر و الحاد کے فتوے صادر فرماتے ھذا وھابی و ھذا بدعتی اور اخوت اسلامی کا شیرازہ درہم برہم کرتے۔ علامہ شبلی نے علوم اسلامی سے فراغت پا کے یونانی خیالات و جدید یوروپی علمی تحقیقات و انکشافات پر بھی نظر ڈالی، ان کا موازنہ کیا۔ آپ نے منطقی سطح سے قرآن پر غور و خوض کیا۔

اصول ارتقاء عقل پر ایمان لائے۔ جوہر عقل کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اسی کے ساتھ اس کو مبرا من الخطا بھی نہیں سمجھا، کیونکہ اگر ایسا سمجھتے تو ایک طرف تو مقلد ہونا پڑتا اور دوسری طرف انانیت پیدا ہو جاتی۔ علامۂ ممدوح نے اس معاملہ میں وہی طریقۂ اعتدال اختیار کیا جو ائمہ سلف کا خاصہ تھا۔

علامۂ ممدوح کے اشتغال علمی و بیش بہا تصانیف پر اگر سرسری ریویو بھی کیا جائے تو اندیشہ ہے کہ ایک بڑا دفتر بن جائے۔ ہم اپنے ناظرین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ علامۂ ممدوح کی کل عالمانہ تصانیف و رسائل و مضامین و خوبیات کا مطالعہ کریں۔ ان کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت و عظمت و خوبیوں و ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ طلبا اگر انہیں پڑھیں تو اعلیٰ درجہ کے ادیب بن جائیں۔ علما پڑھیں تو ان میں محققانہ مذاق پیدا ہو جائے۔ غیر اقوام پر ان کے مطالعہ سے اسلام کی حقیقی عظمت و خوبیاں منکشف ہوں۔ یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی و دلآویزی و ارزانی میں بھی اپنی آپ نظیر ہیں۔

جن لوگوں کو علامۂ ممدوح سے نیاز حاصل ہے وہ ان کی اسلامی سادگی و خلوص سے نہایت متاثر ہوتے ہیں۔ تبحر علمی پر سادگی و اخلاص سونے پر سہاگا ہے۔ اور علم و سادگی و خلوص و اسلام کا دورہ آپ کے کل خاندان کا شرف ہے۔ چنانچہ آپ کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب عربک پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی میں بھی یہی اوصاف پائے جاتے ہیں، اور اسلام کا گہرا عشق اس پر مستزاد ہے۔

علامۂ شبلی کا مذاق مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک طرف تو آپ کا مذاق سخت فلسفیانہ و محققانہ پہلو لئے ہوئے ہے اور واقعات تاریخی میں کسی قسم کی رنگ آمیزی آپ کو پسند نہیں۔ دوسری طرف آپ بے حد نیچر پرست واقع ہوئے ہیں۔ آپ کی فارسی غزلیات سے جذبات لطیفہ درد و عشق و حسن و جمال کا پتہ چلتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ دنیا میں جتنے انبیا و مشاہیر و حکما گذرے ہیں ان میں نیچر پرستی بے حد رہی ہے۔ کائنات کے حسن و خوبیوں میں انہیں سب سے زیادہ مزہ ملتا ہے۔ اس وقت ہم کو ان کی ایک غزل کے چند مصرعے اتفاق سے یاد آگئے جو نقل کئے جاتے ہیں۔

ہر جلوہ روئے روشن تو جلوہ ساز بود — ہر دیدہ را نظر بجمال تو باز بود
ہر جا حدیث فتنہ ایام کردہ ایم — روئے سخن بآں نگہ فتنہ ساز بود
جانا ز زبان و لب نشود ترجمان دل — ما را امید باز نگہ ہائے راز بود
ان شوخ را بصومعہ ہا چوں گذر فتاد — یکبارہ عشق ہائے حقیقی مجاز بود
تا پرخ سطح صحبت آں شوخ در گرفت — کو فتنہ دوست بودہ و ایں فتنہ ساز بود

شبلی مباش گر سخن از مدعا رفت
شبلی ہنوز اول راز و نیاز بود

اشتغال علمی و تصانیف کے ساتھ ساتھ علامۂ ممدوح نے مختلف قومی خدمات انجام دی ہیں۔ مثلاً آپ انجمن ترقی اردو کے اولین مربیوں میں سے ہیں۔ زبان اردو کو آپ نے بہت کچھ مالا مال کیا ہے۔ جب آپ حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون تھے تو ایک نیا علمی دور حیدرآباد میں چمک اٹھا تھا۔ آپ ایک مشرقی یونیورسٹی کا نظام بھی بنا چکے تھے۔ صرف حضور نظام کی منظوری کی دیر تھی۔

اب علامۂ ممدوح ایک ایسے بڑے کام میں مشغول ہیں کہ اگر وہ مکمل ہو گیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ مشرق میں ایک نیا دور

مسلمانوں پر طلوع ہو گا۔ اگر الندوہ فی الحقیقت کامیاب ہو گیا یعنی ہندوستان کے شیعہ و سنی و وہابی و حنفی وغیرہ علماء درحقیقت اسلام کی عمارت بنانے میں متفق ہو گئے اور ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنائی تو ہندوستان و مشرق میں مسلمان قوم کا ایک زندہ تلج محل بن جانا کچھ مشکل نہیں۔

دارالعلوم ندوہ ہی ایک ایسا انسٹی ٹیوشن مسلمانوں کا ہے۔ جس پر "ٹھیٹھ اسلامی" ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ یہ ہند کا الازہر بن جائے اور اس سے ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے جو ایک طرف تو اندر سے مسلمانوں کی کایا پلٹ کر دے اور دوسری طرف ہندوستان و مشرق میں یدخلون فی دین اللّٰہ افواجا، کے جھنڈے گاڑے! خدا علامۂ ممدوح کو کم از کم ۲۵ سال اور زندہ رکھے اور چشم حاسداں سے بچائے!

جان ملکم

شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرحوم

رہنے کیا آئے تھے دُنیا مین امیر
سیر کرلی اور اپنے گھر چلے

دُنیا فانی ہے اور اُسکی ہر ایک چیز قانون فنا کے تابع ہے۔ یہ ہستی جو انسان کو اپنے حیرت انگیز کرشمے دکھا کر اپنا فریفتہ بنالیتی ہے شے موہوم سے زیادہ وقعت نہین رکھتی۔ زندگی جسکے لئے آدمی تمام عمر مصائب و تکالیف کا شکار بنا رہتا ہے اسکی حقیقت مٹی کے کھلونے کیطرح ہے۔ انسان حرص و ہوا کا بندہ لاکھ سر مارے۔ کوشش کرکے دولت اکٹھا کرے۔ جاہ و منصب حاصل کرے۔ نام و نمود پیدا کرے لیکن ایک دن اُسے تمام دُنیاوی تعلقات سے منقطع ہوکر دو گز زمین کے سپرد ہونا ہے۔ موت کا زبردست ہاتھ کسی ذی روح کو پناہ نہین دے سکتا اور کوئی اسکے جابر شکنجہ سے نجات نہین پاسکتا۔ یہ وہ قانون ہے جسکا اثر امیر و غریب۔ نیک و بد جوان و پیر سب پر یکسان ہوتا ہے شخصی امتیاز۔ مصلحت وقت اسکے سامنے کوئی چیز نہین اور ہر شخص مجبور ہے کہ پیام اجل کے آتے ہی وہ اس جہان سے رخصت ہو۔ فلسفیانہ نظر سے دیکھا جاے تو موت اور زندگی پر رنج یا خوشی کا اظہار کرنا فعل عبث معلوم ہوتا ہے لیکن کسی فرد اکمل کی موت جسکی ذات بنی نوع آدم کے لئے سرچشمہ فیض ثابت ہو چکی ہو قیامت سے کم نہین ہوتی۔ دُنیا مین روز ہزارون نفوس انسانی کا اتلاف ہوتا رہتا ہے لیکن قابل افسوس صرف اس شخص کی موت ہوسکتی ہے جسکی وجہ سے ملکی و قومی منافع منصور تھے۔ مرنا برحق ہے لیکن ایسے وجود کا فنا ہونا حد درجہ کی مصیبت شمار کیجا سکتی ہے جسکی آنکھ بند ہونے سے اسکے قابل قدر کارنامون کا خاتمہ ہوتا ہو۔ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب دہلوی کا حسرتناک انتقال اسی قبیل سے ہے۔ آپ کے انتقال کی غیر متوقع خبر سنکر ہندوستان مین ایک سرے سے دوسرے سرے تک ماتم برپا ہو رہا ہے اور حامیان اُردو سب کے سب خواہ وہ ہندو ہون یا مسلمان سیاہ پوش نظر آرہے ہین۔ اُردو لٹریچر کی خدمت جس مستعدی اور جانکاہی سے شمس العلما مرحوم کے معجز نگار قلم سے ابتک ہورہی تھی آج اُنکا خاتمہ ہوگیا اور اُردو زبان کے اولین محسنون اور سرپرستون کی فہرست سے ایک قابل پرستش نام خارج ہوگیا۔

اُردو زبان کی موجودہ حالت پر جن بزرگون کو عبور حاصل ہے اور جو اُسکے خطرناک پوزیشن سے واقف ہین وہ اس بات کا بخوبی اندازہ کرسکتے ہین کہ اسوقت شمس العلما مولوی ذکاء اللہ ایسے بالغ نظر اور صائب الرائے کی امداد و مشورت کی کسقدر ضرورت تھی تاکہ عوام پر ظاہر ہوجاتا کہ فروعی اختلافات جو آجکل ملک مین شد و مد کے ساتھ پھیلائے جارہے ہین اُنکو مصلحت اندیشی سے رفع کرکے اصول زبان اردو کی بہتری کے وسائل کس خوبی سے مہیا کئے جاسکتے ہین۔ امیر و داغ اور سرشار ایسے خادمان اُردو کی موت پر اشک ماتم بہانے کے بعد ہمین باقی ماندہ اہل قلم بزرگون سے ڈھارس باندھنے کا موقع ملا تھا اور مجروح دل کے لئے یہی خیال مرہم کا کام دے رہا تھا لیکن ایک سال کے قلیل مدت سے

الغرض ادھر مولانا آزاد کے بعد ہی مولوی ذکاء اللہ ایسے ذی علم اور تجربہ کار انشا پرداز کا اپنی جگہ خالی کر دینا پورے طور پر حسرت شکن ہے اور اب غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ذاتی لیاقت و تبحر کے رو سے آپ کی جانشینی کا حق ادا کر سکے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم کے حالات زندگی پر سرسری غور کرنے سے تعجب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی میں جسکا ایک معتدبہ حصہ سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں کا بار سنبھالنے کے نذر ہوا کسطرح اسقدر گرانبہا علمی ذخیرہ اہل ملک کے فائدہ کے لئے مہیا کر دیا۔ اسمین شک نہین کہ آپ اُردو زبان کے سب سے بڑے مصنف اور مولف تھے اور آپ کی کل کتابین مفید مطلب ہونیکے علاوہ آپ کی وسعت نظر اور واقفیت کی ضامن ہین۔ ہم اس مضمون مین معمولی طور پر آپ کی ابتدائی زندگی کا تذکرہ کرکے آپ کے علمی مشاغل پر کسی حد تک تفصیلی نگاہ ڈالنا چاہتے ہین۔ تاکہ ناظرین ادیب کو معلوم ہو کہ اُردو کے اس سب سے بڑے ادیب سے چمنستان اُردو کی آبیاری کس کس طرح کی ہے۔ آجکل جو لوگ ذاتی افکار و قلت وقت کی آڑ مین اپنی زبان کی خدمت سے کوسون دور بھاگنا چاہتے ہین وہ مولوی صاحب مغفور کے حالات سے سبق لیکر اپنے وجود کو ملکی زبان و ملکی ادب کے لئے سود مند ثابت کر سکتے ہین۔

مولوی صاحب مرحوم دہلی کالج کے اُن متعلمین مین سے ہین جنکے کارنامون سے کالج کا نام ابتک روشن ہے۔ کالج عرصہ ہوا فنا ہو گیا لیکن اُسکے بہوت شاگردون کے ذکر کے ساتھ بے اختیار کالج کا نام زبان پر آ جاتا ہے۔ مولوی نذیر احمد، شمس العلماء آزاد اور مولوی ذکاء اللہ صاحبان تینون دہلی کی خاک سے پیدا ہوئے۔ تینون ایک ساتھ ایک ہی کالج اور ایک ہی کلاس مین داخل ہوئے اور غالباً تینون ایکسہی ساتھ فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔ دُنیاوی جھگڑون مین پھنسنے کے بعد بھی ان صاحبون نے ایک حد تک حق رفاقت ادا کیا کہ تینون نے اُردو کی سرپرستی قبول کی اور اپنی بہترین خدمات کے عوض ہر سہ حضرات گورنمنٹ عالیہ کی جانب سے "شمس العلماء" کے امتیازی خطاب سے مفتخر کئے گئے۔

مولوی ذکاء اللہ صاحب کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی جبکہ آپ کالج مین داخل ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد آپ اسی کالج مین معلم ریاضی مقرر ہوئے۔ میرے خیال مین ہر شخص کے لئے یہ امر باعث فخر ہو سکتا ہے کہ جس کالج مین ایک دن وہ طالب علم بنکر آئے اُسمین اپنی ذاتی لیاقت کے وسیلہ سے اُستادی کا درجہ حاصل کرے۔ یہان سے علٰحدہ ہونے پر آپ کی مامورین آگرہ کالج مین اُردو لٹریچر کی تعلیم پر ہوئی خوشکہ اسطرح آپ نے سات سال تک معلمی کا کام کیا اور اسکے بعد ۱۸۵۵ء مین ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر و مراد آباد مین رہے اور گیارہ دس سال تک اس جگہ پر عمدگی سے کام کرتے رہے۔ ۱۸۶۶ء مین "دہلی نارمل اسکول" کی صدر مدرسی کا عہدہ حاصل کیا۔ تین سال کے بعد آپ کو "اورینٹل کالج" مین لکچراری کی خدمت پیش کی گئی لیکن اسکا چارج لینے سے پیشتر آپ میور کالج الٰہ آباد مین اُردو لٹریچر کے پروفیسر مقرر کر دئے گئے۔ دس سال تک آپ اس کالج مین انٹرنس سے۔ ایم۔ اے۔ تک کی کلاسون کو عربی و فارسی کا درس دیتے رہے۔ جس خوش سلیقگی و قابلیت سے آپ نے اپنی مختلف خدمات پوری کین اس سے آپ کی علمیت کا سکہ ملک مین بیٹھ گیا اور آپ کے افسران بالا آپ کے کام سے ہمیشہ مسرور رہے۔

میور کالج کی پروفیسری کی خدمات ایک عرصہ تک قابل اطمینان صورت مین انجام دینے کے بعد آپ نے پنشن لیکر خانہ نشینی اختیار کرلی۔ ۳۶ سال ملازمت سرکاری مین صرف ہوئے اور ۴۴ سال تک وظیفہ سے مستفید ہوکر اہل ملک کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔ بزم اُردو مین آپ کی جگہ خالی پڑی ہے اور آپ ہم سے جُدا ہو گئے ہین لیکن آپ کے علمی کارنامے آپ کو حیات جاوید بخشنے کے لئے کافی ہین اور آپ کی اولاد معنوی سے نامعلوم مدت تک آپ کا نام زندہ رہیگا۔

آپ کی تصانیف کا تفصیلی ذکر ایک مبسوط مضمون کا محتاج ہے اور اگر مضمون نگار اُنپر تنقیدی نظر ڈالکر ذاتی رائے کا اظہار بھی ضروری سمجھے تو گویا اُسے بجائے خود ایک شرح و بسط تصنیف کے لئے آمادہ ہونا پڑے گا۔ اس جگہ ہم صرف شمار واطلاع سے مختصراً آپ کے علمی کارنامون کو نذر ناظرین کرنا چاہتے ہین اُنپر ردو قدح کرنے اور تعریف و تقریظ لکھنے کا یہ موقع ہے نہ اُتنی چندان ضرورت ہے کیونکہ ملک کے سربرآوردہ رسائل مین ایک عرصہ تک آپ کی کتابون پر نقادانہ ریویو شائع ہوتے رہے ہین جو مقبولیت عام کا درجہ حاصل کرچکے ہین۔ ان سطور مین انھین خیال کا اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ نہین ہوسکتا۔

کچھ عرصہ ہوا ایک اخبار مین آپ کی تصنیفات و تالیفات کی ایک جامع فہرست مین نے دیکھی تھی وہ اس جگہ نقل کیجاتی ہے۔

سبجکٹ	مطبوعہ	غیر مطبوعہ	جملہ
ریاضیات	۸۱	۳	۸۴
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
علم ادب	۱۲	×	۱۲
علم اخلاق	۶	×	۶
طبیعیات و ہیئت	۷	۲	۹
سیاست مدن	۲	۵	۷
	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

اس فہرست سے کل کتابون کی تعداد ۱۴۳ پائی جاتی ہے جو کچھ کم حیرت انگیز نہین ہے ۱۸۵۵ء سے لیکر ۱۹۱۰ء کی یہ علمی کمائی ہے۔ گویا بالاوسط فی سال قریب تین جلدون کے ہوتی ہین اب اسمین سے اگر ۳۶ برس ملازمت کے وضع کردیجئے تو اوسط بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ مولانا شبلی نے حضرت امام غزالیؒ کے حالات مین کسی جگہ آپ کی تصانیف کا روزانہ اوسط نکالا ہے جو شاید چار صفحے ہوتے ہین۔ قریب قریب یہی اوسط مولوی ذکاء اللہ صاحب کی دماغی کوششون کا ہے۔ جو ہندوستان ایسے ملک مین جہان علمی مشاغل کی گرم بازاری ایک عرصہ سے مفقود ہے اور لوگون کی طبیعتین اکتساب علوم کیطرف سے متنفر ہین بیشک ایک عجیب بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو مین اسوقت تک کوئی شخص مولوی ذکاء اللہ مرحوم کیطرح کثیر التصانیف نہین گذرا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کی کتابون مین سے ہر ایک کی ایک ایک جلد کا مجموعی وزن کیا جاتا تو خود آپ کے وزن سے وہ زیادہ ہوتا۔

اس فہرست پر سرسری طور سے نظر کرنیکے بعد مصنف کی ہمہ گیر قابلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ریاضی تاریخ جغرافیہ۔ اخلاق۔ ہیئت۔ پالیٹکس کوئی مضمون آپ کی حد نظر سے باہر نہ تھا۔ اس مین شک نہین کہ آپ کو تاریخ و اخلاق سے خاص شغف تھا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بقیہ اصناف علوم مین سے آپ نے جسپر قلم اٹھایا ہے اسی میدان کے سوار نظر آتے ہین۔ مین اُن خوش قسمت لوگون مین ہون جنھین مولوی ذکاء اللہ کی بیش بہا کتابون کے مطالعہ کا بیشتر موقع ملا ہے۔ اُردو کی پہلی دوسری کتاب سے لیکر جو آپ کے

نظر انتخاب کا بہترین ثبوت ہین۔ تاریخ ہندوستان وغیرہ تک کوئی ایسی نہین جو اپنے نامور مصنف کی ہمہ دانی کے لئے کافی شہادت نہو۔ اختلاف رائے اور چیز ہے اور کسی شخص کو اختیار نہین ہے کہ دوسرے کے خیال کو محض اس سبب سے کم وقعت سمجھ لے کہ اُسکی ذاتی رائے اُس سے جُداگانہ ہے لیکن اگر انصاف سے دیکھئے تو جو محنت وکوشش مولوی ذکاءاللہ صاحب مرحوم نے اُردو کیلئے کی ہے اسکے مفید وکارآمد ہونے مین شک نہین۔ اگر کسی جگہ بالفرض کوئی لغزش بھی ہوگئی ہو تو وہ معقول پسند طبقہ مین قابل گرفت نہین قرار پاسکتی۔

آپ کی کتابون مین سب سے زیادہ قابل ذکر تاریخ ہندوستان، تاریخ برٹش گورنمنٹ، سوانح عمری ملکہ معظمہ وغیرہ ہین۔ اول الذکر ۱۴ ضخیم جلدون مین اور دوسری تین جلدون مین ختم ہوئی ہے۔ مولوی سمیع اللہ صاحب مرحوم۔ سی۔ ایم۔ جی۔ جنکے قومی کامون کا زندہ نمونہ الہ آباد مین محمڈن ہوسٹل موجود ہے اور جو ایک عرصہ تک سرسید مرحوم ومغفور کے مشن کے زبردست حامی رہ چکے ہین اُنکے دوست اور احباب کو شمس العلما ذکاءاللہ صاحب کا خاص طور پر ممنون ہونا چاہئے کہ آپ نے آخری وقت اُنکی سوانح عمری تیار کردی۔ مولوی سمیع اللہ صاحب بلاشک قومی لیڈر تھے لیکن سرسید کے نقیض ہوجانے کے بعد آپ نے گویا گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی اور عام طور پر نوٹس مین نہ آتے تھے۔ اسمین کلام نہین کہ اس گوشہ گزینی سے جہان قوم اور ملک آپ کی نفع بخش خدمات سے محروم ہوگیا وہان آپ کے مفید کامون اور سود بخش خیالون کے نتائج بھی مفقود ہوگئے اور خوف تھا کہ کہین آنیوالی نسلین اپنے ایک ذی ہمت محسن کے نام سے بھی ناآشنا نہ رہجائین لیکن مولوی ذکاءاللہ صاحب نے آپ کی لائف لکھکر نہ صرف حق ہمچشمی ادا کردیا بلکہ نوجوانان قوم کے لئے ایک مشعل روشن کردی ہے جسکے اُجالے مین وہ صراط مستقیم سے ہٹ نہین سکتے۔

سُنا گیا ہے کہ شمس العلماء مرحوم آجکل تاریخ اسلام ایسے وسیع سبجکٹ پر طبع آزمائی کر رہے تھے۔ جسکا سلسلہ افسوس ہے کہ آپ کے دم کے ساتھ ختم ہوگیا۔ کاش آپ کی یہ سعی تکمیل کو پہونچتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس چمن مین آپ کیا کیا گل نہ کھلاتے اور اُردو کے خزانۂ ادب کو کن کن جواہرات بے بہا سے نہ بھرتے۔ اُمید ہے کہ آپ کے نامور فرزند اس مسودہ کو خواہ وہ جس حالت مین ہو چھپوا دینگے اور اہل ملک اُسے اپنی زبان کے ایک سرپرست کی آخری یادگار سمجھکر سر آنکھون پر رکھینگے۔

مستقل تصنیفات سے اگر قطع نظر کر کے دیکھا جاے تو آپ کے اُن مضامین کا مجموعہ کئی ضخیم کتابون کے برابر نکلیگا جو آپ نے وقتاً فوقتاً ملکی رسائل واخبارات کے لئے تحریر فرمائے تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ آپ ہندوستان کے تمام سربرآوردہ ماہواری وہفتہ وار پرچون مین مضامین بھیجتے تھے۔ مین کئی ایڈیٹرون سے ملا ہون اُنمین سے اکثر شمس العلما ذکاءاللہ کے خلق ومروت کے مداح پائے گئے۔ اُنکا بیان تھا کہ مولوی صاحب کو مضمون بھیجنے کے لئے جب لکھا گیا تو زیادہ تر بواپسی ڈاک آپ نے بھیجا ہے گویا انکار کرنا آپ کو معلوم ہی نہ تھا۔ رسالہ حسن حیدرآباد دکن، تہذیب نسوان، سائنٹفک گزٹ علیگڈھ۔ ادیب فیروزآباد۔ معارف وغیرہ رسالے آپ کے رشحات قلم معجز رقم سے ہمیشہ فیضیاب ہوتے رہے ہین۔ اب یہ پرچے تو موجود نہین لیکن جو نئے نئے رسالے اُنکی جگہ نکلے رہے ہین اُنکی طرف بھی دست امداد بڑھانے مین آپ نے کبھی کوتاہی نہین کی۔ مخزن۔ زمانہ۔ خاتون۔ علیگڈھ منتھلی مین عرصہ تک آپ کے مسلسل مضامین نکل چکے ہین۔ ادیب مین البتہ کوئی

مضمون آپ کا نہین دیکھا گیا لیکن مجھے امید ہے کہ اگر آپ سے درخواست کیجاتی تو ممکن نہ تھا کہ آپ مضمون نہ بھیجتے۔

پُرانے اور نئے رسالون اور اخبارون کی سالانہ جلدون مین اگر کوئی آپ کے مضامین دیکھے تو اُسے آپ کی وسعت معلومات اور واقفانہ انداز کا پتہ چل سکتا ہے۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ سائنس کیمیا۔ طرز معاشرت۔ پالیٹکس مشکل سے کوئی سبجکٹ بچا ہو جس پر آپ نے کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو۔ شمس العلماء حالی مدظلہ کا قول بالکل راست ہے کہ آپ کا دماغ گویا کسی بنئے کی وہ دکان تھی جسکو جس چیز کی خواہش ہوئی وہان سے مل گئی۔

مضمون نویسی کا شوق آپ کو بالکل ابتدائے عمر سے تھا۔ دہلی کالج مین لڑکون کی حوصلہ افزائی کے لیے وظائف ملتے تھے مولوی ذکاء اللہ مرحوم ان وظائف کے زیادہ تر حقدار ٹھہرتے تھے۔ دو تمغے "بائی پروفشنسی" کے بھی آپ کو وہان سے ملے۔ کالج سے جو علمی شوق آپ لیکر باہر نکلے تھے وہ ہمیشہ قائم رہا جبوقت آپ سررشتہ تعلیم مین ڈپٹی انسپکٹر تھے اُسوقت آپ کو بصلۂ خدمات تعلیم نسوان منجانب گورنمنٹ خلعت مرحمت ہوا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کو ۱۹ سال کی عمر سے علمی شوق تھا اس زمانہ مین آپ جو مضامین لکھکر اخبارون اور رسالون مین بھیجتے تھے انہین کسر نفسی سے اپنا نام درج نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ حقیقت پسند لوگ نمایش سے کسقدر گریز کرتے ہین۔ ایک ہم ہین کہ اگر ایڈیٹر صاحب کسی غلطی سے ہمارا نام مضمون کے تحت مین لکھنا بھول جائین تو گویا اُنسے ناقابل عفو خطا سرزد ہوئی ہے۔

اکثر اہل قلم اس بات کے شاکی پائے گئے ہین اور اُنکا تذکرہ تاریخون مین موجود ہے کہ اُنکی زندگی مین اُنکی تصانیف کی قدر نہین کی گئی۔ مولوی ذکاء اللہ ہندوستان کے اُن خوش قسمت بزرگون مین ہین جنکی کتابین اُنھین کے سامنے ملک سے تولیت کی سند پاگئی ہین اور نہ صرف پبلک نے انھین ہاتھون ہاتھ لیا ہے بلکہ سرکار نے بھی عزت افزائی سے دریغ نہین فرمایا۔ آپ کی کتب ریاضی و طبیعات الہ آباد و پنجاب کی یونیورسٹیون مین بہت عرصہ تک شامل کورس رہ چکی ہین۔ اُردو کتابون کا ایک سلسلہ جو حلقہ بندی مدارس کے لئے آپ نے ترتیب دیا تھا ایک مدت دراز تک رائج رہکر دو چار سال منجملہ موقوف ہوا ہے۔ سلسلہ ریاضیات کے لئے برٹش گورنمنٹ سے آپ کو پندرہ سو کا پیش قرار انعام عطا ہوا اور "خان بہادر" و "شمس العلماء" کے معزز خطابات سے مخاطب کئے گئے۔

آپ کے اخلاق و عادات کی نسبت صرف اسقدر عرض کردینا کافی ہے کہ روشن خیال اور تعلیم جدید کے حامی ہونے کے ساتھ ہی آپ پُرانی وضع کے پابند تھے۔ خلق و ہمدردی آپ کا خاص شیوہ تھا۔ سرسید کے آپ قدیمی رفیق تھے۔ ایک مرتبہ سرسید کے انتقال پر آپ سرسید میموریل فنڈ ڈیپوٹیشن کے ہمراہ لاہور تشریف لے گئے اور ۱۹۰۵ء مین اسلامیہ مدارس کے متعلقین کی جو کانفرنس علیگڈھ مین منعقد ہوئی تھی اُسکے آپ پریسیڈنٹ تھے۔

افسوس ہے کہ فضل و کمال کی یہ زندہ تصویر اب ہماری نگاہون سے پوشیدہ ہے۔ اس قحط الرجال کیوقت ایسے کامل الفن مشاق اور تجربہ کار ہمدرد قوم کا اُٹھ جانا بدنصیبی کی علامت ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اُنکی روح کو اُس دُنیا مین جہان ایک دن سب کو جانا ہے اور جہان سے کوئی پلٹکر نہین آتا راحت اور گروہ کی سوگوار دُنیا کو صبر حاصل ہو۔

سید محمد فاروق

عہ درخواست مین تامل نہین کیا گیا لیکن آپ کے اس جواب سے کہ "اب مین موت کیطرف جا رہا ہون" زیادہ اصرار کی جرأت نہین ہوئی۔ ایڈیٹر

مولانا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر

مولانا اس عہد کے اُن نامور لوگون مین ہین جنھون نے زبان اُردو پر اپنا ایسا سکہ بٹھا دیا ہے کہ ابدالآباد تک قائم رہیگا مولانا کی لائیف اگرچہ اکثر لکھی گئی مگر اسوقت تک صحیح حالات زندگی اور اُنکی تعلیم و تربیت کے ہو بہو حالات کسی کو نہین معلوم ہو سکے۔ ہمنے خاص ادب کی ضرورت سے مولانا کی زندگی کے مفصل حالات کو مولانا کے عزیزون۔ دوستون۔ ہمعصرون اور خود اُنسے دریافت کرکے یکجا جمع کیا ہے جو امید ہے کہ ناظرین ادب کیلئے نہایت دلچسپ ہونگے۔ مگر اُنکے حالات زندگی شروع کرنے سے پہلے اتنا کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شررؔ کی زندگی اس قسم کے باکمالون کی زندگی کا ایک مکمل نمونہ ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے خود ہی بنتے اور خود ہی شہرت حاصل کرتے ہین جنپر انگریزی کے الفاظ "سیلف میڈ" پوری طرح صادق آسکتے ہین۔

مولانا نسباً شیخ ہاشمی و عباسی ہین اور سلسلہ امین الرشید سے ملتا ہے۔ انکا خاندان دولت عباسیہ کے عہد مین عرب سے آکے عراق مین آباد ہوا۔ پھر ارض عراق کو چھوڑ کے ہرات مین آیا۔ اسکے بعد سلطان محمد تغلق کے عہد مین ہندوستان آیا۔ اور سلطنت مغلیہ کے دور مین جب نئے نئے ایرانی اُمرا کا دربار شاہی مین رسوخ ہوا تو یہ خاندان وادی گنگا مین آکے سکونت پذیر ہوگیا۔ اُن دنون یہ لوگ مشایخ اور علما کی شان سے اضلاع جونپور و اعظم گڈھ مین اقامت گزین تھے۔ جہان انکو ایک باوقعت جاگیر بھی ملی تھی۔ مولانا کے پردادا مولوی نظام الدین صاحب نے قصبۂ گرسی کے خطیب صاحب کی بیٹی سے عقد کرکے گرسی کی سکونت اختیار کرلی۔ اور چونکہ خطیب صاحب کی کوئی اولاد نرینہ نتھی اسلئے وہی خدمت خطابت کے وارث ہوے۔

مگر چندہی روز بعد مسٹر مارٹن جنکے نام کو لکھنؤ مین مارٹین کی کوٹھی یاد دلا رہی ہے مولوی نظام الدین کے شاگرد ہوگئے۔ اور اُنسے عربی و فارسی شروع کی۔ مارٹن صاحب اُنکا نہایت ہی ادب کرتے تھے۔ اور اُنکے ساتھ اُنکا ایسا اچھا برتاو تھا کہ مولوی نظام الدین صاحب مع اہل و عیال کے لکھنؤ مین آکے سکونت پذیر ہوگئے۔ چنانچہ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب مارٹین کی کوٹھی ہی مین پیدا ہوئے۔

مولوی نظام الدین صاحب سے اور مشہور شاعر ملک الشعرا مرزا رفیع سودا سے بہت کچھ ربط و ضبط تھا۔ چنانچہ ایک دن سودا ایک خیمہ مین بیٹھے ہوئے تھے ایک چھوٹے سے سوراخ سے شعاع آفتاب نکل کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا دری پر کوئی موتی پڑا ہوا ہے۔ مولوی صاحب نے سودا سے کہا "اسوقت کوئی البدیہہ شعر سنایئے" مرزا رفیع نے دھوپ کی چتی پر نظر ڈال کے ذرا فکر کی اور یہ شعر سنایا۔

عرصۂ دُنیا مین اپنا تنگ کیا کاشانہ ہے
پرتوِ خورشید یان موتی کا جیسے دانہ ہے

مولانا شررؔ کے والد حکیم تفضل حسین صاحب کا عقد اپنے ایک قریبی رشتہ کے ماموں منشی قمرالدین صاحب کی صاحبزادی سے ہوگیا جو رؤسا و شرفاے قصبۂ گرسی مین سے تھے۔ لیکن امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد مین ایک بڑی معزز خدمت پر مامور تھے اور

دربار شاہی مین بہت اثر رکھتے تھے۔

۱۸۵۶ء مین جب انتزاع سلطنت اودھ ہوا اور سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ بہ ارادۂ انگلستان کلکتہ روانہ ہوئے تو مولانا شرر کے نانا منشی قمر الدین صاحب بھی اپنے تعلقات کے باعث بادشاہ کے ہمراہ رکاب کلکتہ گئے۔ اور وہان سے جناب عالیہ مرزا سکندر حشمت جنرل صاحب اور مرزا ولیعہد بہادر کے ہمراہ سررشتہ دار کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئے۔ ان لوگون کا خاندان شاہی کا وہ سفر دور دراز جب ناکامی کے ساتھ ختم ہوا۔ اور مرزا ولیعہد بہادر اپنی دادی اور اپنے چچا کو خاک فرانس مین دفن کرکے واپس آئے تو منشی قمر الدین صاحب بھی شرف حج حاصل کرتے ہوئے کلکتہ مین آئے۔ اور اپنے بے تاج و سریر آقا کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔ مولانا کے والد حکیم تفضل حسین صاحب بڑے قابل اور فاضل لوگون مین تھے۔ عربی کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی تھی۔ فارسی مین یگانۂ عصر تھے۔ اور طبابت مشہور طبیب لکھنؤ حکیم محمد ابراہیم صاحب سے پڑھی تھی۔ غدر کے پانچ چھ برس بعد اپنے خسر منشی قمر الدین صاحب کے تعلقات کی وجہ سے وہ بھی کلکتہ پہونچے۔ اور سلطان عالم واجد علی شاہ کی ملازمت اختیار کرلی۔

مولانا شرر غدر ۱۸۵۷ء کے تین سال بعد ۱۸۶۰ء مین شہر لکھنؤ محلہ جھوائی ٹولہ مین تکیہ پیر غیب کے متصل اپنے خاندانی مکان مین پیدا ہوئے۔ اور پانچ برس کی عمر مین اپنے نانا کے بھائی مولوی محمد حفیظ الدین صاحب سے جو کرادہ جزن بیگ خان مین رہتے تھے اور فارسی و عربی کے مسلم الثبوت اساتذہ مین شمار کئے جاتے تھے۔ الف۔ بے۔ شروع کی۔ لیکن مکتب مین بیٹھے تین سال کے قریب زمانہ گزر گیا اور پارۂ عم سے زیادہ ترقی نہ کرسکے تعلیم کی اس سست رفتاری نے سات ہی آٹھ برس کی عمر مین انھین وطن سے نکال کے کلکتہ پہونچایا۔ جہان انھین والدہ کے کنار عافیت سے دور رہ کے طالب علمی کی تکلیفین اور غربت کی مصیبت کم سنی ہی مین برداشت کرنا پڑی۔

والد بزرگوار نے جب دیکھا کہ لکھنؤ مین تعلیم کی پوری نگرانی نہین ہوسکتی تو ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء مین انھین اپنے پاس کلکتہ مین بلالیا۔ وہان مٹیابرج مین انکا قیام منشی السلطان بہادر کے مکان پر تھا جو دربار شاہی کے ایک بڑے بارسوخ رکن تھے۔ وہین مولانا شرر کو بھی قیام کرنا پڑا۔ حافظ الٰہی بخش صاحب وہان ایک بزرگ تھے ان سے قرآن ختم کیا اور والد بزرگوار سے ابتدائی کتابین پڑھتے رہے۔ یہانتک کہ دو سال مین شرح مائۃ عامل اور گلستان بوستان ختم کین۔ اور شاہزادہ مرزا جہان قدر بہادر کے استاد ملا قمر سے کتب ہدایۃ النحو۔ کافیہ۔ اور شرح ملا جامی کو ختم کیا۔ اور منشی عبد اللطیف صاحب مرحوم سے جو بڑے صاحب علم خوشنویس تھے شرح وقایہ اور قطبی کی تعلیم پائی۔ ان دنون مٹیابرج مین مولوی سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی (جو فی الحال حیدرآباد مین نظام کالج کے پروفیسر ہین) بعض شاہزادون کی تعلیم پر مامور تھے۔ مولانا نے معقولات کی ابتدائی درسی کتابین قطبی و میبذی تک انھین سے پڑھین اور اسی زمانہ مین مولوی محمد حیدر صاحب سے (جو فی الحال امام بارہ مٹیابرج کے متولی ہین) انگریزی شروع کی۔ اور ادب عربی کی بھی دو ایک کتابین پڑھین۔ اسی کے قریب زمانہ مین حکیم محمد مسیح صاحب مرحوم سے طب کی دو ایک کتابین حاصل کین اور چند روز مطب کیا۔ ان دنون معمول تھا کہ ہمیشہ سال دو سال بعد لکھنؤ مین آکے پانچ چھ مہینے رہ جاتے تھے۔ یہان کے قیام مین بھی اکثر اساتذہ سے پڑھا۔ چنانچہ پہلے مولوی محمد یحییٰ صاحب سے پڑھا۔ پھر مولوی عبد الباری صاحب سے جو مولوی محمد عبد الحی صاحب مرحوم کے

ارشد تلامذہ مین تھے درمیانی درجہ کے کتب معقول پڑھے۔ مگر زیادہ قیام مٹیابرج ہی مین رہا کرتا جس مقام سے انھین ایک اُنس ہو گیا تھا۔

اب مولانا کی عمر تیرہ چودہ برس سے زیادہ نہو گی اور صحبت زیادہ تر واجد علی شاہ مرحوم کے شاہزادون خاصۃً مرزا محمد علی مرزا بہادر۔ مرزا کاظم بخش بہادر اور مرزا محمد جلال بہادر سے تھی۔ جنسے اسقدر تعلقات بڑھ گئے تھے کہ اُن شاہزادون کو بغیر مولانا کے چین نہ پڑتا تھا۔ اور نہ مولانا شرر کا دل سوا انکی صحبت کے اور کسی جگہ لگتا تھا۔ تعلیم کے سوا جو کچھ وقت ملتا انھین کی صحبت مین صرف ہوتا بعض شہزادون سے تعلقات اسقدر گہرے ہو گئے تھے کہ زنانخانے تک مین انکی آمد و رفت تھی۔ اور درحقیقت مولانا کیلئے زباندانی کا پہلا مدرسہ یہی صحبت تھی۔ کیونکہ اُس زمانے کا لکھنؤ وہ لکھنؤ نہین رہا تھا جسمین زبان اُردو کا نشو و نما ہو سکتا۔ بلکہ اب اسکا قائم مقام مٹیابرج اور مٹیابرج مین بھی خاص محلات شاہی تھے۔

آخر منشی قمرالدین صاحب نے ترک ملازمت کرکے لکھنؤ کی سکونت اختیار کر لی اور تقریباً ۱۸۷۵ء مین جبکہ مولانا شرر کی عمر پندرہ سال کی تھی اپنے نانا کی خدمت پر مامور ہو کے ملازمین شاہی مین شامل ہو گئے۔ اور یہی اُنکی پہلی ملازمت ہے۔ مگر وہان کی ملازمت مین چونکہ کسی قسم کی پابندیان نہ تھین۔ لہذا مولانا ویسے طالبعلم بنے رہے اور تعلیم کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اب ابتدائی کتابین ختم ہو چکی تھین اسلئے مولانا نے قائمۃ الدین مرزا محمد علی صاحب مجتہد العصر کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا۔ اور انسے مُلاحسن۔ قاضی مبارک اور حمد اللہ پڑھا۔ اسی زمانہ مین ایک بڑے متبحر عالم میرزا ہدایت اللہ شیرازی مٹیابرج مین خاص منشی السلطان بہادر کے مکان پر مقیم تھے۔ انکو مولانا کی غیرمعمولی ذکاوت و ذہانت دیکھ کے انسے بیحد انس ہو گیا تھا۔ اور خود اُنھون نے اپنے شوق سے مولانا کو ملا صدرا کی شرح ہدایت الحکمۃ پڑھائی۔

لیکن باوجود اس اعلیٰ تعلیم کے شاہزادون کی صحبت مین حد سے زیادہ منہمک ہو جانا اور انکے رنگ۔ انکی وضع قطع اور انکے مذاق کو پوری طرح اختیار کر لینا ایسی باتین تھین کہ ہر طرف سے انھین بدوضعی کے الزام دئے جانے لگے۔ اور ہر شخص کا یہ خیال قائم ہو گیا کہ مولانا کی اخلاقی حالت اسقدر خراب ہو چکی ہے کہ اب اصلاح کی کوئی امید نہین۔ یہ حالت دیکھ کے مولانا کے پدر بزرگوار حکیم تفضل حسین صاحب بہت پریشان ہوئے چنانچہ بغیر اسکے کہ مولانا کو خبر بھی ہونے پائے اندر ہی اندر انتظام کرکے مولانا کو ۱۸۷۹ء مین لکھنؤ بھیجدیا۔ اور اسطرح اچانک بھیجا کہ انھین اپنے دلی دوستون اور خاصۃً شاہزادون سے رخصت ہونیکا بھی موقع نہ ملا۔ اور کچھ ایسی گھڑی مین وہ لکھنؤ بھیجے گئے تھے کہ پھر کلکتہ جانا نصیب نہ ہوا۔ اور مدتون اُنھین اپنے کلکتہ کے دوستون سے دوبارہ ملنے کی حسرت رہی۔

لکھنؤ مین اس سے پیشتر جبکہ مولانا چھ سات مہینے کیلئے وطن آئے تھے مولوی محمد نعیم مرحوم کے صاحبزادے مولوی محمد اکرم مرحوم سے ہدایہ اور دو ایک اور کتابین پڑھی تھین۔ اب آتے ہی ابوالحسنات مولوی عبدالحئی صاحب مرحوم کے تلامذہ مین شریک ہو گئے۔ اور تمام کتب درسیہ انھین کے حلقۂ درس مین ختم کے بلکہ بعض کتابین جو مولوی محمد علی صاحب مرحوم سے پڑھ چکے تھے مکرر پڑھین۔

اسی زمانے مین مولوی عبدالحئی صاحب کا ایک رقعہ لیکے مفتی میر عباس صاحب مرحوم کی خدمت مین بھی حاضر ہوئے اور انسے دیوان حماسہ اور مقامات حریری کو ایسے ذوق و شوق سے پڑھا کہ مفتی صاحب کو انسے ایک خاص محبت ہو گئی تھی۔ اور اکثر یہ ہوتا کہ

جو قصائد رات کو کہتے صبح انکو سُناتے اور اُنسے لکھوا لیا کرتے تھے۔

اثنائے تعلیم ہی مین ۱۸۷۹ء مین مولانا کی شادی اُنکے حقیقی ماموں حکیم سعد الدین احمد صاحب مرحوم کی صاحبزادی کے ساتھ ہوگئی۔ مگر اس شادی سے اُنکی طالب علمانہ زندگی مین کوئی فرق نہین آیا۔ کیونکہ اب اُنہین سچا ذوق علم تھا اور تاریخی جستجو کا فطری شوق۔ جسکا اظہار اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ اُن دنون مولوی حامد حسین صاحب مرحوم کا معمول تھا کہ تاریخ و سیر اور حدیث اہل سُنت کی کتابون کا مطالعہ کرتے اور اُنمین جو عبارتین اپنے اغراض مناظرہ کے لئے مفید نظر آتین اُنپر نشان بنا دیتے۔ کئی کاتب مقرر تھے جو اُن عبارتون کو کتاب اور صفحات کے حوالے سے الگ الگ کاغذون پر نقل کرتے رہتے۔ متعدد طلبہ بھی اس خدمت پر نوکر رکھے جاتے کہ اُن عبارتون کا اصل کتاب سے مقابلہ کرکے صحیح کر دیا کرین۔ بعد تصحیح وہ سب مضامین اور سیکڑون کی ترتیب سے جُدا جُدا جلدون مین مرتب کر دیے جاتے۔ اور یہی ذخیرہ ہے جو آج اُنکے جانشینون کے کام آ رہا ہے۔

مولانا شرر اگرچہ مذہب اہل سُنت کے پابند تھے اور یقینی بات ہے کہ مولوی حامد حسین صاحب مرحوم کی اس کوشش کو دل سے ناپسند کرتے ہونگے۔ مگر شوق علم اُنہین لے ہی گیا۔ اور بعض نایاب و بے نظیر کتب حدیث کے مطالعہ کے شوق مین جا کے مولوی حامد حسین صاحب کی نوکری کی۔ اور تقریباً ڈیڑھ دو سال تک اُن عبارتون کی تصحیح کرتے رہے۔

مولانا محمد عبد الحی صاحب کے شاگردون مین ایک طالبعلم تھے مولوی نور محمد صاحب ملتانی۔ یہان اُنسے صحبت زیادہ ہوئی تو علم حدیث کا شوق ہوا۔ اور اُنسے شرح نخبہ پڑھ کے صحیح ترمذی شروع کی اور چند ہی روز مین حدیث کی تعلیم کا ایسا شوق ہوا کہ بغیر اسکے کہ گھر مین کسی کو خبر کرین ۱۸۷۹ء مین یک بیک دہلی جا پہونچے۔

اس زمانے مین سر سید کا شہرہ ہو رہا تھا۔ اگرچہ مرحوم پر ہر طرف سے گالیان پڑ رہی تھین اور شاذ و نادر ہی اُنکا کوئی مدح خوان نظر آتا تھا مگر اُسکے ساتھ ہی مختلف حالات اور کارنامون نے سر سید کو ایک ایسا عجیب و غریب شخص ثابت کر دیا تھا کہ مخالف و موافق ہر شخص کے دل مین اُنکی صورت دیکھنے کا ضرور شوق تھا۔ چنانچہ مولانا شرر بھی دہلی جاتے وقت خاص اُنسے ملنے کے شوق مین علیگڈھ کے اسٹیشن پر اتر پڑے۔ سید صاحب سے جا کے ملے۔ اور دل پر اُنکی باتون کا کچھ ایسا اچھا اثر لے گئے کہ اُنکے ساتھ ایک اُنس پیدا ہو گیا۔ دہلی مین چند ہی روز قیام کیا ہوگا کہ اتفاقاً مسدس حالی نظر سے گذرا جو دیگر طلبہ کی نظر مین تو کھٹکتا تھا مگر مولانا شرر کو اُسکے پڑھتے ہی سید صاحب سے بجائے اُنس کے گرویدگی پیدا ہو گئی۔

دہلی پہونچے تو سند الوقت مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے مدرسہ مین قیام پذیر ہو کے اُنسے حدیث شروع کی اور ڈیڑھ سال مین صحاح ستہ۔ موطا امام مالک اور تفسیر جلالین ختم کرکے لکھنؤ واپس آئے۔

قیام دہلی کے زمانے مین عرب کے شہر نجد کے دو طالبعلمون کے ذریعہ سے مولانا کو محمد بن عبد الوہاب نجدی کا رسالہ التوحید دستیاب ہوا جو اسقدر پسند آیا کہ فوراً اُسکا ترجمہ کر ڈالا۔ اور مولوی تلطف حسین صاحب نے اُسکو چھپوا کر شائع بھی کر دیا۔ اس طریقہ سے مولانا نے تصنیف و تالیف کی دُنیا مین پہلا قدم رکھا۔

۱۸۸۰ء کے آخر مین مولانا دہلی سے واپس آئے۔ چند روز ہردوئی مین قیام کرکے منشی نذیر حسن مرحوم کو جو وہان کی سوسائٹی کے ایک نہایت سربرآوردہ رکن تھے صحیح بخاری کا درس دیا اور

لکھنو چلے آئے۔ اب مولانا کو معاش کی فکر ہوئی۔ مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کو انسے نہایت ہی اُنس تھا۔ اُنھون نے فوراً منشی نولکشور کے پاس بھیجدیا۔ اور سفارش کی کہ اگر انسے عربی کتابون کی تصحیح کا کام لیا جائیگا تو بہت اچھا کام دینگے۔ منشی نولکشور صاحب بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ مولانا سے چند مختلف سوالات کرنیکے بعد کہا "صیغۂ تصحیح آپ کے لئے مناسب نہین۔ اُسمین رہ کے آپ کسی قسم کی ترقی نہ کر سکینگے۔ اگر ممکن ہو تو آپ اودھ اخبار مین مضامین لکھا کیجئے۔"

مولانا نے اس سے پیشتر مختلف اخبارون مین مضمون لکھے تھے۔ اور منشی احمد علی کسمنڈوی مرحوم کی صحبت مین اکثر مضمون نگاری کی تھی۔ انھین کی تجویز سے "شرر" کا تخلص اختیار کیا تھا۔ او دو چار غزلین بھی کہی تھین۔ گو اُنسے تلمذ نہ تھا اور جو کچھ کہتے تھے اُسپر حیدرآباد دکھن کے اپنے پُرانے اُستاد مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن اخبارات کی دُنیا اور مضمون نگاری کیطرف انکو منشی احمد علی کسمنڈوی ہی نے متوجہ کیا تھا۔ غرض جسوقت منشی نولکشور صاحب نے یہ مشورہ دیا ہے وہ مضمون نگاری سے ناآشنا نہ تھے۔ جواب دیا کہ "آپ کوئی سبجکٹ بتائین مین اُسپر مضمون لکھ کے پیش کرتا ہون۔ اگر آپ پسند کرین تو مین اودھ اخبار کی خدمت کے لئے حاضر ہون۔" منشی صاحب نے ایک پولیٹکل سبجکٹ بتا دیا۔ اور مولانا شرر نے دوسرے ہی دن اودھ اخبار کے دو صفحون کا ایک مضمون لکھ کے پیش کیا جسے منشی صاحب نے بہت پسند کیا۔ اور ۱۸۸۲ء مین تیس روپیہ ماہوار پر اودھ اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کیا۔

اب مولانا کو جوہر طبع دکھانے کا نیا میدان ملا تھا۔ برابر مضامین لکھنا شروع کئے۔ لیکن اُنکے مضامین زیادہ تر علمی، تاریخی یا فلسفیانہ ہوتے

کے ہوتے تھے۔ یہ مضامین مسلسل دو سال تک نکلتے رہے۔ اور ملک مین ہر طرف اُنکی ایسی دھوم مچ گئی کہ اسیوقت سے مولانا کے لٹریچر کا شہرہ ہوگیا۔ اور بڑے بڑے پُرانے لکھنے والے چونک پڑے۔ اودھ اخبار کے فائل مین آج بھی وہ مضامین موجود ہین اور بتا رہے ہین کہ محض اُن مضمونون کی وجہ سے اس زمانہ کا اودھ اخبار کسقدر نمایان امتیاز رکھتا ہے۔ روانی طبع کی یہ حالت تھی کہ مولانا صرف چار یا پانچ روز مین بیٹھ کے اتنے مضمون لکھ دیتے کہ جو مہینہ بھر تک اودھ اخبار مین شائع ہوتے رہتے۔ اُن مضامین کے سبجکٹ ایسے ہوتے تھے کہ چاہے کتنے ہی دنون بعد چھپتے پرانے نہ سمجھے جاتے۔

ان مضامین کی خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولانا نے "روح" کے عنوان سے ایک محققانہ مضمون لکھا تھا۔ اسکو پڑھ کے سر سید احمد خان بہادر نے منشی نولکشور کو اس مضمون کا یہ خط بھیجا کہ "اودھ اخبار مین روح پر جو مضمون چھپا ہے بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ مین اس سے چند خیالات کو اپنی تفسیر مین لینا چاہتا ہون۔ لہٰذا اُن صاحب سے جنکا وہ مضمون ہو مجھے اخذ کرنے کی اجازت دلوا دیجئے۔" منشی نولکشور نے مولانا سے دریافت کر کے سید صاحب کو اُنکی خواہش کے مطابق اجازت دیدی

اسی زمانے مین مولوی محمد عبدالباسط صاحب کے نام سے مولانا نے ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ جسکا نام محشر تھا۔ اور اُسکی رعایت سے مولوی عبدالباسط صاحب کا تخلص بھی محشر قرار دے دیا۔ مگر اسمین اوّل سے آخر تک کُل مضامین مولانا ہی کے قلم کے ہوتے تھے محشر عجب نئے رنگین شاعرانہ مذاق کا پرچہ تھا۔ جسمین بہت ہی نازک قسم کی خیال آرائیان ہوتین۔ اور ہر چیز کے سین، مذاہب عالم کے عجیب پُر لطف مذاق مین کھینچے جاتے۔ ایک زمانہ تک اُسمین

"زمانہ کا جائزہ" کے عنوان سے ایک نرالے مضمون کا سلسلہ جاری کیا۔ جس کا ہر تیرا ایک نئی اور نئے رنگ کی صبح سے شروع ہوتا۔ محشر کے مضامین اور خاصۃً اُن ہجوون کا غلغلہ سارے ہندوستان مین بلند ہوا۔ اور ہر طرف سے تحسین و مرحبا کے شور مین یہ کلمات سُنے جا رہے تھے کہ یہ انشا پردازی نہین سحر کاری و معجز نگاری ہو۔ اُردو مین یہ بالکل نیا اور اچھوتا رنگ تھا۔ اور وہ شاعرانہ طبیعتین جو انگریزی مذاق سخن سے نئی نئی آشنا ہونے لگی تھین۔ انکو اسقدر بھلا معلوم ہوا کہ جا بجا لوگون نے اُسی رنگ کو اختیار کر لیا اور ہندوستان کا سارا لٹریچر مولانا ہی کے نقش قدم پر چلنے لگا۔

اُسی زمانے مین رفیق ہند لاہور نیا نیا نکلا تھا اور بڑے زور کا پرچہ تصور کیا جاتا تھا۔ اُسمین پادری رجب علی صاحب راجہ بلی کے نام سے اکثر مضامین لکھتے تھے۔ راجہ بلی نے ایک بار لکھا کہ جو رنگ محشر کا ہو صرف شاعری اور عاشقی کی دُنیا کے ساتھ مخصوص ہو اگر ایڈیٹر محشر کو دعویٰ ہو تو ان دو چار سبجکٹون پر اُسی رنگ مین مضامین لکھین جو ہم بتاتے ہین۔ اور اُنھون نے چند سبجکٹ بھی شائع کیے جنمین ایک تو "روح" تھا۔ ایک یہ کہ "ہندوستان کیلئے استمراری بندوبست مناسب ہو یا میعادی؟" اور اسی قسم کے اور بھی کئی سبجکٹ تھے۔ مولانا نے اُن سب سبجکٹون پر اپنے اُسی رنگ مین نہایت پُر زور مضامین لکھ کے محشر مین شائع کیے جن کو دیکھکر لوگ ہر طرف عش عش کرنے لگے اور راجہ بلی صاحب سے سوا اس کے کہ خاموشی سے قبول کرلین اور کچھ بنائے نہ بنی۔

یہ عجیب بامذاق اور پر لطف پرچہ تھا۔ اور سچ یہ ہو کہ جو مذاق بعد پیدا ہونے والا تھا اُسکی بنیاد پہلے پہل اُسی نے ڈالی۔ اور ہر جگہ کے صاحبان ذوق کوشش کرنے لگے کہ اُسی رنگ مین مضامین لکھا کرین۔ دو سال بعد منشی نولکشور نے مولانا کو اپنا اسپشل کارسپانڈنٹ بنا کر ریاست حیدرآباد دکن مین بھیجا جسکی وجہ سے محشر بند ہو گیا۔ اُن دنون نواب میر لیاقت علیخان بہادر کی مدارالمہامی تھی۔ اور نواب محسن الملک بہادر پر سرکار تھے۔ نواب محسن الملک نے مولانا شرر کو ہاتھون ہاتھ لیا۔ اور بعض اوقات اس بات کا شوق بھی دلایا کہ وہ حیدرآباد کی ملازمت اختیار کر لین۔ مگر مولانا نے اس امر کو اپنی وضعداری کے خلاف سمجھا۔ اور اُنھین حیدرآباد کی زندگی کچھ زیادہ پسند بھی نہ آئی۔ مگر اتفاقاً اخبار ہزار داستان کے مالک صاحب نے اس غلط فہمی مین مبتلا ہو کے کہ مولانا اُنکے اخبار کی ایڈیٹری قبول کرین گے اپنے سابق ایڈیٹر سے ترک تعلق کر دیا۔ اور مولانا کی خدمت مین آ کے مصر ہوے کہ آپ اخبار ہزار داستان کو اپنے ہاتھ مین لین۔ اُنھون نے کہا جب تک مجھے اودھ اخبار سے تعلق ہو یہ غیر ممکن ہے۔ اسپر وہ نہایت پریشان ہوئے اور مولانا کے احباب اور بعض بزرگ اعزہ کے ذریعے سے جو حیدرآباد مین موجود تھے۔ اُن پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ جس طرح ممکن ہو آپ ہزار داستان کو ہاتھ مین لین ورنہ پرچہ بند ہو جائیگا۔ مولانا نے صاف کہہ دیا کہ مین جب تک لکھنؤ جا کر ترک تعلق نہ کرلون آپ کا کام نہین کر سکتا۔ مالک ہزار داستان نے فوراً یہ شرط قبول کر لی۔ اور آمد و رفت کا کرایہ بھی دیا۔ مجبوراً مولانا لکھنؤ واپس آئے۔ اور اودھ اخبار سے قطع تعلق کیا۔ مگر مطبع کے حسابات کا تصفیہ نہین ہونے پایا تھا کہ ہزار داستان بند ہو گیا۔ اور مولانا کو حیدرآباد جانے کی ضرورت ہی نہین باقی رہی۔ اور مولانا نے اس زمانے مین پرائیویٹ طور پر اپنی انگریزی کی قابلیت بڑھانا شروع کی جسمین اچھی اور کافی استعداد پیدا ہو گئی۔

اسی زمانے مین مولانا نے اپنا پہلا ناول دلچسپ لکھا۔ جسے منشی نثار حسین صاحب مالک پیام یار نے چھپوایا اور اُسکو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ دوسرا حصہ لکھنے کے ساتھ ہی پہلے حصے

کا دوسرا ایڈیشن چھاپنے کی ضرورت ہوئی دلچسپ کا شہرہ ملک مین
بڑھتا جاتا تھا کہ مولانا نے درگیش نندنی کا ترجمہ انگریزی سے اُردو
مین کیا۔ اور اُسے بھی منشی نثار حسین نے شائع کیا۔ اس ناول نے بھی
بہت بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اور اب یہ حالت تھی کہ لوگ ہر جگہ
مولانا کے مضامین اور ناولون کے مشتاق ہو رہے تھے۔

۱۸۸۶ء کے آخر مین اتفاقاً مولوی بشیر الدین صاحب
مالک ایڈیٹر البشیر جو ان دنون نجم الاخبار اٹاوہ کے ایڈیٹر تھے لکھنؤ
مین تشریف لائے۔ اور مولانا کو مشورہ دیا کہ ایک مختصر لٹریری
رسالہ صرف ایک جز کا جاری کرین۔ اور اسکی قیمت صرف عہ سالانہ
ہو۔ مولانا نے کہا "آپ کتنے خریدار دین گے"۔ اُنھون نے دس
خریدارون کا وعدہ کیا۔ اور پانچ روپیہ پانچ رسالون کی قیمت کے
بابت اُسی وقت دیدیے۔ انھین روپیون سے مولانا نے دلگداز
کا اشتہار شائع کیا۔ ملک مولانا کی طرز عبارت کا اسقدر مشتاق
ہو رہا تھا کہ اشتہار کے شائع ہوتے ہی کثرت سے درخواستین اور
قیمتین آنا شروع ہو گئین۔ اور اسی آمدنی سے جنوری ۱۸۸۷ء
مین دلگداز کا پہلا نمبر چھاپا اور شائع کیا گیا۔ دلگداز مین اُسوقت
صرف شاعرانہ وعاشقانہ خیالی مضامین ہوتے تھے۔ یا کبھی کبھی
تاریخی مضامین نکل جاتے تھے۔ اور اشاعت کے ساتھ ہی اسقدر
شہرت و مقبولیت حاصل ہو گئی کہ سال ختم ہوتے ہوتے خریدارون
کی تعداد دو ہزار کے قریب پہونچ گئی۔

۱۸۸۸ء مین دلگداز مین اسقدر اضافہ ہوا کہ اسکے ساتھ
ایک جز ناول کا بڑھا دیا گیا۔ اور قیمت بجائے ایک کے دو روپیہ
سالانہ کر دی گئی۔ اتفاقاً اس زمانے مین ایک سفر کے موقع پر
مولانا نے کسی اسٹیشن کے اسٹال مین اسکاٹ کا ناول طلیسمین
دیکھا جسمین تیسری صلیبی لڑائی کے ذیل مین جابجا پیغمبر خدا صلعم
کی توہین کیگئی تھی۔ یہ دیکھ کے مولانا اس قدر برافروختہ ہوئے کہ
دلگداز مین جو پہلا ناول شائع کرنے والے تھے اسکے لیے بھی
لڑائیون ہی کا زمانہ اختیار کیا۔ اور ارض مقدس مین اپنے ناول کا
سین قرار دیا۔ اس طرح پورے ۱۸۸۸ء مین ناول "ملک العزیز
مولانا کے قلم سے تصنیف ہو کے مکمل شائع ہوا۔ جسے اُردو پبلک نے
حد سے زیادہ پسند کیا اور ہر طرف اُسکے شوق مین انجمین بچھ گئین

مولانا نے ناول ملک العزیز کی تکمیل کے ساتھ ہی تاریخی
ناولون کا ایک سلسلہ ڈالدیا اور کوشش شروع کی کہ تاریخ اسلام
مین جتنے دلچسپ واقعات ملین اُنکو ناول کا جامہ پہنا کے اسقدر
دلچسپی کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیا جائے کہ لوگون مین
تاریخ کا شوق بڑھے۔ اور اس ذریعے سے اُنکی واقفیت وسیع ہو
اور ان ناولون نے سچ یہ ہے کہ اس بارۂ خاص مین معجزنما اثر دکھایا
ملک مین ہر کہ ومہ کو تاریخ کی جستجو ہوئی۔ حروب صلیبیہ کا جنھون
نے صرف نام سنا تھا۔ مگر مولانا کے ناول ملک العزیز نے ان تاریخی
لڑائیون کا اسقدر شوق پیدا کر دیا کہ ہر جگہ مطابع سے اور پبلشرز
سے لوگ کروسیڈس کی تاریخین مانگتے تھے اور یہ حالت ہو رہی
تھی کہ گویا لوگ پیاسے ہین اور پانی کہین نہین ملتا۔ الغرض
اس سے ہرگز نہین انکار کیا جا سکتا کہ ملک مین جو تاریخ کا شوق
پیدا ہو گیا ہو اور اردو لٹریچر مین روز بروز تاریخ کو زیادہ جگہ ملتی جاتی
یہ صرف مولانا شرر کی برکت اور اُن کے تاریخی ناولون کی
وجہ سے ہے۔

ملک العزیز کے بعد ۱۸۸۹ء مین دلگداز کے ساتھ ناول
"حسن انجلینا" اور ۱۸۹۰ء مین ناول "منصور موہنا" شائع ہوئے
انکے علاوہ شہید وفا کے نام سے ایک تاریخی ڈراما شائع ہوا۔ یہ
سب تصانیف بڑے ہی ذوق وشوق سے پڑھے گئے۔ انھین

پہلے ناول کو تاریخ روم وروس سے اور دوسرے کو اُس عہد سے تعلق تھا جبکہ مُسلمان پہلے پہل سندھ مین آکے آباد ہوئے تھے۔ ان دونون نے بھی ویسا ہی اثر دکھایا اور شہید وفا کو اسپین کے زمانۂ زوال اسلام سے تعلق تھا جسمین ایک بڑے عبرت ناک واقعے کی تصویر دکھائی گئی ہو۔ شروع ۱۸۹۰ء مین مولانا نے ایک ہفتہ وار اخبار بھی جاری کر دیا جسکا نام مہذب تھا۔ اُسکی لکھائی چھپائی مضامین اور خبرین سب چیزین ایک خاص دلچسپی رکھتی تھین ہر پرچے مین علماے سلف مین سے کسی کی سوانح عمری بھی لازمی طور پر رہا کرتی تھی جن کا مجموعہ بہت سے لوگون کے پاس آج بھی مرتب موجود ہی۔ اور جن نگاہون نے مہذب کو دیکھا ہو آج تک یاد کر رہی ہین۔ اور اکثر لوگونکی طرف سے اب بھی دوبارہ مہذب کے شائع ہونیکا تقاضا ہو رہا ہے۔

۱۸۹۰ء مین مولانا نے منشی سراج الدین صاحب کی خواہش پر جو اُن دنون سرمور گزٹ کے ایڈیٹر تھے اور ہنوز بیرسٹر نہین ہونے پائے تھے) ناول دلکش کا پہلا حصہ لکھا جسمین دلچسپ طریقے سے ہندوستان کی موجودہ سوسائٹی سے بحث تھی۔ اور چند روز بعد اُس کا دوسرا حصہ لکھا لیکن اسپر بھی وہ نامکمل ہی رہا۔

اب دلگداز پریس بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ رسالہ دلگداز بھی نکل رہا تھا۔ جسکے ساتھ ناول یوسف ونجمہ شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اخبار مہذب بھی ہفتہ وار شائع ہو رہا تھا۔ اور ان سب کامون کا بار مولانا کے سر تھا جسے وہ بڑی کامیابی کے ساتھ اُٹھائے ہوئے تھے۔ یکایک بعض مالی دشواریان پیش آئین اور مولانا اپریل ۱۸۹۱ء مین جلیوٗ ہوتے ہوئے حیدرآباد دکن تشریف لیگئے۔ ابتدائی خیال یہ تھا کہ وہان کے دربار سے کچھ مدد حاصل کر کے واپس آئین اور اپنے کارخانے کو ترقی دین۔ مگر وہان پہونچ کے پہلے سفر کے خلاف آپ کی ملازمت کا شوق ہوا اور نواب انتصار جنگ بہادر سے اپنی کیفیت بلا کم وکاست بیان کر کے اپنی خواہش ظاہر کر دی۔ وہ بظاہر مدد دینے کیلئے تو تیار تھے مگر ملازمت کے متعلق اُنھون نے جواب صاف دے دیا۔ مولانا اسی تردد مین تھے کہ ایک دن اتفاقاً فلک نُما کی عمارت دیکھنے کو گئے جہان بعض احباب کے تقریب کر دینے کے باعث نواب وقارالامرا بہادر مرحوم سے ملاقات ہوئی جو اُن دنون معین المہام مال تھے۔ اُنھون نے پہونچتے ہی سوال کیا کہ "مین آپکو اپنے بیٹے کی دینی تعلیم وتربیت کیلئے انگلستان بھیجنا چاہتا ہون۔ آپ جائین گے؟" مولانا نے جواب دینے کے لیے تین دن کی مہلت مانگی۔ اور کل احباب نے قبول کر لینے ہی کا مشورہ دیا۔ اسلیے تیسرے دن جا کے رضامندی اور آمادگی ظاہر کر دی۔ نواب صاحب نے خوش ہو کے فرمایا "تو آپ لکھنو جا کے اپنے مطبع اور کاروبار کا انتظام کر آئیے"۔ مولانا فوراً لکھنو آئے۔ مطبع اور کارخانے کو بند کیا اور انگلستان کے شوق مین پندرہ روز کے اندر ہی حیدرآباد واپس گئے۔

مگر جب وہان پہونچے تو نواب وقارالامرا بہادر نے غالباً اپنے کسی ایسے مشیر کے مشورہ سے جو نہین چاہتا تھا کہ کوئی اور شخص بھیجا جائے ٹالنا شروع کیا۔ اور مولانا کی دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ اپنے خزانۂ پائگاہ سے مقرر کر دی۔ چند روز مین نواب وقارالامرا بہادر مدارالمہام ریاست ہو گئے۔ اور اُنھین زیادہ فکر ہوئی کہ کسی کو اپنے فرزند نواب ولی الدین خان بہادر کی تعلیم کے لئے انگلستان بھیجین۔ مولانا نے اس زمانۂ بیکاری مین اپنی تاریخ سندھ لکھنا شروع کی جسکے مسودہ کو پڑھ کے نواب وقارالامرا بہادر نے اسقدر پسند فرمایا کہ بطور انعام کے پانچ ہزار روپیہ خزانۂ ریاست سے دلوائے۔ مگر انگلستان جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس مین تاخیر دیکھ کے ۱۸۹۳ء مین مولانا نے اپنے ایک دوست کو لکھنو مین اپنے

مطبع کا منیجر مقرر کرکے دلگداز کو پھر جاری کر دیا۔ مگر بجائے اسکے کہ ناول یوسف ونجمہ جو ۱۹۰۱ء مین ناتمام رہگیا تھا اسکا سلسلہ پورا کرین اسپین کے عہد خلافت بنی اُمیہ کا ایک نیا ناول شروع کر دیا۔ جسے لوگ بڑے ذوق وشوق سے پڑھنے لگے۔

ان دنون مولانا نے دلگداز مین "خاندان رسالت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ بعض یوروپین مورخون نے یہ خیال ظاہر کیا ہو کہ "خسروان عجم کے ساسانی خون سے آمیزش کرکے خاندان رسالت معزز بنایا گیا" اس مضمون مین اس خیال کی تردید کی تھی۔ اور دیگر واقعات کے سلسلہ مین ابن خلکان تاریخ طبری اور معارف ابن قتیبہ سے یہ واقعہ بھی نقل کر دیا تھا کہ جناب امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد خود امام زین العابدین نے اپنی والدہ شہربانو کا عقد (نکاح) زبید نام اپنے ایک آزاد کیے ہوے غلام سے کر دیا۔ اس پر اہل تشیع مین سخت برہمی ظاہر ہوئی اسکے خلاف مضامین لکھے گئے۔ مولانا پر مختلف قسم کے حملے کیئے گئے۔ اور بعض سُنّی مولویون سے بھی جو تاریخ سے مس نہ رکھتے تھے استفتے دستخط کرا کے شائع کیئے گئے۔ مگر مولانا نے سوا اسکے کہ اس واقعہ کو جن کتابون سے لیا تھا اُنکے حوالے دلگداز کے ایک دوسرے نمبر مین شائع کر دیئے اور کچھ نہین کیا۔ لیکن دلگداز کے سات آٹھ نمبر ہی نکلنے پائے تھے اور اس نئے ناول کے بھی اتنے ہی جُز ہوئے تھے کہ یکایک نواب وقار الامرا بہادر نے انھین حکم دیا کہ اُنکے صاحبزادے کے ہمراہ جو پندرہ روز کے لیے ہندوستان مین واپس آگئے تھے ایک ہفتہ کے اندر انگلستان روانہ ہو جائین۔ مجبوراً مولانا کو وسط ۱۹۰۳ء مین سفر انگلستان کرنا پڑا۔ اور دلگداز کا سلسلہ پھر رک گیا۔

اب مولانا انگلستان مین تھے اور ہندوستان مین اُنکے ناولون کی مانگ روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ہر کتب فروش ان ناولون کی جلدین بار بار طلب کرتا تھا اور کسی جگہ نہ ملتی تھین۔ آخر بعض مطابع نے بلا لحاظ اسکے کہ اُن پر قانونی ذمہ داری عائد ہوگی اُن ناولونکو چھاپنا شروع کر دیا۔ اور مختلف بلاد ہند کے مطابع مین اُن ناولون کے بیسیون ایڈیشن شائع ہو گئے۔ اور لاکھون جلدین بازار مین پھیل گئین۔ یہانتک کہ یوسف ونجمہ کے ناتمام اجزا کو اور اُسکے بعد والے اسپین کے ناول کے ناتمام اجزا کو [illegible] کے نام سے الگ ایک جداگانہ ناممکمل مین مرتب کرکے [illegible] نے فروخت کرنا شروع کیا۔ اور اُسکے بھی بہت سے ایڈیشن شائع [illegible] یہ بات مولانا ہی کیلیے مخصوص تھی کہ اُنکے ناتمام ناولون [illegible] بھی اُسی ذوق وشوق سے مُلک مین خریدے اور پڑھے جاتے [illegible] جس ذوق وشوق سے کہ مکمل ناول خریدے اور پڑھے جاتے [illegible] اگرچہ پڑھتے ہی لوگ ہر جگہ خطوط لکھ لکھ کے اُن کا بقیہ [illegible] طلب کرتے تھے اور جواب یہ ملتا تھا کہ "موجود نہین"۔

انگلستان مین مولانا ڈیڑھ سال رہے۔ اگرچہ اطمینان [illegible] مستقل تین سال تک رہ سکین گے تو بیرسٹری کا امتحان دینے [illegible] کوشش کرتے۔ مگر باوجود متواتر تحریک کرنے کے وقار الامرا بہادر [illegible] اطمینان نہ دلایا۔ مجبوراً اُنھون نے ایک فرانسیسی پروفیسر [illegible] مین سے فرنچ زبان پڑھنا شروع کی۔ اور اسمین اتنا درک [illegible] کر لیا کہ فرنچ سے اُردو مین ترجمہ کر سکین۔ اور فرانسیسی [illegible] کی سلیس کتابونکو سمجھ لین۔

ہندوستان مین ان دنون مولانا کے لٹریچر کی دھوم [illegible] وہ انگلستان مین خاموش بیٹھے تھے۔ اس دھوم کا یہ نتیجہ [illegible] کی ناتمام ناولون دلکش اور زیادہ علاوہ کی تکمیل کا [illegible] سے تقاضا ہوا تو بعض اور حضرات نے ارادہ کیا کہ اُنکے ناولون [illegible]

مابقی حصہ خود ہی لکھ کے شائع کر دین۔ چنانچہ مرزا حیرت دہلوی نے زیادو حلاوہ کا دوسرا حصہ لکھ کے شائع کیا۔ اور لکھنؤ کے منشی سجاد حسین نے کسی اور صاحب سے لکھوا کے دلکش کا تیسرا حصہ شائع کرایا۔ ان تکملون کو ملک نے جس نظر سے دیکھا اُسکا حال ناظرین ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ کیفیت مولانا نے انگلستان مین سُنی تو ناول زیادو حلاوہ کے ابتدائی حصہ مین بھی تھوڑا بہت ردو بدل کر کے اُس کی تکمیل کی۔ اور ہندوستان واپس آکے اُسے ناول فلورا فلورنڈا کے نام سے شائع کر دیا۔ جو ملک مین ایسی قدر کی نگاہون سے دیکھا گیا کہ زیادو حلاوہ کے دونون حصے اگرچہ کبھی کبھی اب بھی بازار مین نظر آجاتے ہین مگر منسوخ ہو کے کلیتہً مٹ گئے۔

سنہ ۱۸۹۶ء مین مولانا انگلستان سے واپس آئے۔ اور جیسے ہی عرصہ بعد سنہ ۱۸۹۶ء مین خاص حیدرآباد سے دلگداز جاری کیا۔ اور اب کی اُسکی اشاعت کا حساب بجائے سنہ عیسوی کے سنہ محمدی سے رکھا گیا۔ جو مولوی نظام الدین حسن صاحب بی اے ایل۔ ایل۔ بی کا قائم کیا ہوا ایک سنہ تھا اور چند روز کے لیے ریاست حیدرآباد مین بھی مروج رہ چکا ہے۔ اس سال دلگداز کے ساتھ عہد جاہلیت عرب کا ایک ناول شروع کیا گیا جسمین اسلام سے پیشتر کے عربونکی پولیٹکل حالت۔ معاشرت۔ اُن کا مذاق اور اُن کا رسم و رواج بڑی کامیابی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اب مولانا کی توجہ عاشقانہ خیالی مضامین کے عوض تاریخی مضامین کی طرف زیادہ تھی۔ اور دلگداز کے صفحون پر بہت اچھے قیمتی محققانہ مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ سال کے آخری حصہ مین مولانا نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت سکینہ کے سوانح عمری لکھنا شروع کی۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ جناب سکینہ بچپن ہی مین واقعۂ کربلا کے بعد قید خانے مین اہل شام کے جور سے شہید ہوئین۔ مگر اس مضمون مین اس کے خلاف آپ کی اسیرانہ زندگی۔ آپ کے شاعرانہ مذاق اور آپ کی متعدد شادیوں کی کیفیت دکھائی گئی تھی۔ لہذا حضرات شیعہ جو پہلے ہی "خاندان رسالت" والا مضمون دیکھ کے مولانا سے بدظن ہو گئے تھے چونک پڑے۔ اور ہر طرف ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ سُنّی بھی اس جوش مین اُنکے ساتھ تھے۔ اور گو ماخذ بتا دیے گئے اور ثابت کر دیا گیا کہ جو کچھ لکھا گیا ہے بے اصل نہین مگر جوش مخالفت بڑھتا ہی گیا۔ حیدرآباد مین بھی اسکا جوش ہوا۔ اور مضمون سکینہ بنت حسین کے دو ہی نمبر شائع ہونے پائے تھے کہ وہان کے کوتوال نواب اکبر جنگ بہادر نے مولانا سے مل کے کہا کہ "اگرچہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے صحیح ہو مگر بہتر یہ ہوگا کہ دلگداز مین اس لائف کا سلسلہ روک دیا جائے" مولانا کی طبیعت مین ہمیشہ سے آزادی اور ضد رہی ہے۔ اُنھون نے کہا کہ "یہ مضمون نہ نکلا تو دلگداز بھی نہ نکلے گا۔" شیعون مین اِسکے خلاف جوش بڑھتا ہی رہا۔ ایک صاحب نے صوبۂ بہار سے "جواب شرر" کے نام سے ایک بڑا رسالہ بھی شائع کیا۔ مگر مولانا نے نہ کبھی اُسکی طرف توجہ کی اور نہ جواب دیا۔

چھ مہینہ بعد نواب وقار الامرا بہادر سے لکھنؤ مین قیام کرنیکی باضابطہ اجازت حاصل کر کے سنہ ۱۸۹۹ء کے آخر مین لکھنؤ آئے اور یہان آکے پہلا یہ کام کیا کہ سنہ ۱۸۹۹ء کی جلد مین جو ایک نمبر باقی رہ گیا تھا اُسے چھپوایا۔ اُسمین مضمون "سکینہ بنت حسین" کا باقی ماندہ حصہ شائع کر دیا اور اُسی کے ساتھ ناول ایام عرب کی پہلی جلد بھی مکمل ہو گئی۔ ہماری رائے مین "سکینہ بنت حسین" مین مولانا نے واقعات گو کتنے ہی صحیح لکھے ہون

مگر جس رنگ مین یہ مضمون تھا وہ جناب سکینہؑ کی شان کے منافی خلاف تھا۔

قیام حیدر آباد کے زمانے مین مولانا نے ناول فردوس برین تیار کیا تھا۔ اور بحکم نواب وقار الأمرا بہادر ایک بڑی ضخیم تاریخ ارض مقدس لکھنا شروع کی تھی جسکی تکمیل کیلئے ایک کاتب کو نواب صاحب مرحوم نے لکھنؤ آتے وقت مولانا کے ہمراہ کر دیا تھا اُس تاریخ کے ساتھ ستر جز لکھے ہوے مولانا کے پاس موجود ہین جو ابھی تک شائع نہین ہوئی۔ مگر لکھنؤ آتے ہی مولانا نے ناول فلورا فلورنڈا کو جسے انگلستان ہی مین مکمل کیا تھا خود شائع کیا۔ اور فردوس برین کے پہلے اڈیشن کے شائع کرنے کا حق منشی نثار حسین صاحب نثار مہتمم پیام یار کے ہاتھ فروخت کر ڈالا چنانچہ وہ ناول قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ان دونون ناولون نے ملک پر بہت اثر ڈالا۔ اور غیر معمولی ذوق و شوق سے لیے گئے۔

اب سنہ ۱۹۰۰ء مین دلگداز لکھنؤ سے برابر نکل رہا تھا۔ اور اُسکے ساتھ ناول ایام عرب کی دوسری جلد شائع ہو رہی تھی۔ جو سنہ مذکور کے اختتام کے ساتھ مکمل ہو گئی۔ اسی زمانے مین مولانا نے پیام یار کے ساتھ شائع کرنے کیلئے ناول "مقدس نازنین" کو تصنیف کیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء مین دلگداز کے ساتھ تاریخ حروب صلیبیہ مصنفہ سر جارج ڈبلیو کاکس۔ ایم۔ اے کے ترجمہ کا ایک جز بڑھایا گیا۔ اب کی ناول بھی بجاے اسکے کہ خود تصنیف کرین ایک انگریزی ناول "ڈاکو کی دولھن" کا ترجمہ شائع کرنا شروع کیا۔ اور کمل دلگداز کی قیمت ستے؎ سالانہ کر دی۔

مولانا کا خیال کئی سال پیشتر سے مسلمانون کے پردے کے خلاف تھا چنانچہ حیدر آباد مین "معلم نسوان" مین متعدد مضامین پردے کے خلاف شائع کیے تھے۔ اور اسی رسالہ مین اپنا ایک چھوٹا ناول "بدر النسا کی مصیبت" اور اپنا ایک چھوٹا ڈراما "میوۂ تلخ" بھی پردے کی مخالفت مین شائع کرائے تھے۔ اس مسئلہ مین اُنکی دلچسپی اسقدر بڑھی ہوئی تھی کہ لکھنؤ آتے ہی ابتدائے سنہ ۱۹۰۱ء سے ایک ماہوار رسالہ بنام "پردۂ عصمت" اپنے دوست سید حسن شاہ کے نام سے جاری کرا دیا۔ جسمین خود ہی لکھتے تھے اور خود ہی اول سے آخر تک اُسے اڈیٹ کرتے تھے۔ مگر مولانا کا رنگ بھلا چھپاے سے چھپ سکتا تھا۔ ساری دُنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ رسالہ مولانا شرر ہی کے قلم کا نمونہ ہے۔ پردۂ عصمت نے مسلمانون مین عجیب ہل چل ڈال دی جسوقت وہ شائع کیا گیا ہے اُس زمانے مین تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ تمام مسلمانون کو اپنے رسم پردہ پر اسقدر غرور و ناز تھا کہ پردہ کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکالنا کفر بکنے کے حکم مین تھا۔ ہزارہا آدمی مخالف ہو گئے۔ تردید مین رسالے شائع ہوئے۔ کتابین لکھی گئین بعض ناول بھی پردے کی تائید اور مولانا پر حملہ کرنے کیلئے شائع کیے گئے حتیٰ کہ دلگداز کی اشاعت کو بھی ضرر پہونچنے لگا۔ مگر مولانا شرر اسی خیال پر قائم رہے۔ اور اُنکا یہ اعتقاد ہو گیا تھا اور آج تک ہے کہ شرع اسلام مین پردہ صرف مہذب اور ساتر لباس کا نام ہے۔ اور اُسکے حدود یہ ہین کہ چہرہ اور ہاتھ داخل ستر نہین۔ رہی خانہ نشینی جیسا کہ مروج ہے اُس پر عورتون کو مجبور کرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اور ساری اسلامی خرابیان اسی خانہ نشینی سے پیدا ہوئی ہین۔

اب نواب وقار الأمرا بہادر نے مولانا کو حیدر آباد دوبارہ طلب کیا۔ اور جون سنہ ۱۹۰۱ء مین وہ پھر حیدر آباد گئے جسکے ساتھ ہی دلگداز بھی بند ہو گیا۔ اور پردۂ عصمت بھی۔ پردۂ عصمت کی زندگی اگرچہ ڈیڑھ ہی سال کی تھی مگر اُسنے اتنے ہی زمانے مین اپنا مشن پورا کر دیا۔ یا تو ہندوستان مین ایک مسلمان بھی پردے

کی مخالفت کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ یا پردۂ عصمت نے ہر جگہ حسد بلکہ ہزارہا مخالفین پردہ پیدا کر دیے۔ اور آج کوئی شہر اور کوئی صحبت نہین جسمین بعض لوگ پردے کے مخالف نہون۔

مولانا کو حیدرآباد گئے چند ہی مہینے ہوے ہونگے کہ یکایک وہان ایک انقلاب عظیم ہو گیا۔ نواب وقار الامرا بہادر جو مولانا کے مربی اور قدردان تھے وزارت سے علٰحدہ کر دیے گئے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کا دور شروع ہوا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب جو مولانا کے بڑے حامی تھے معزز عہدۂ معتمدی عدالت و کوتوالی وغیرہ سے ہٹا کے ضلع بیڑ کی تعلقداری پہ بھیج دیے گئے۔ اور مسٹر واکر حیدرآباد کی قسمت کے مالک ہوئے جنمین نہ مولانا سے کوئی تعلق ہوسکتا تھا اور نہ کسی قسم کی مراعات کی وجہ تھی۔ چنانچہ اُنھون نے مولانا کا سلسلۂ ملازمت حیدرآباد ہی منقطع کر دیا۔ اور مولانا اوائل سنہ ۱۹۰۳ء مین پھر لکھنؤ واپس آئے۔ یہان آکے جون سنہ ۱۹۰۳ء سے پھر دلگداز جاری کیا۔

لیکن اب کی مولانا دلمین ایک نیا خیال لیکے آئے تھے۔ وہ یہ کہ ہندو مسلمانون مین اتفاق ہونا چاہیے جسکے بغیر کوئی کام نہین چل سکتا۔ اور ہندوستان کی ترقی غیر ممکن ہے۔

چنانچہ آتے ہی دلگداز سے پہلے ہی "اتحاد" نام ایک پندرہ روزہ رسالہ نکالدیا جسکی خاص کوشش یہ تھی کہ ان دونون گروہون مین اتفاق پیدا کرایا جائے۔ مگر مولانا کا خیال ہو کہ زندگی بھر اُنھون نے جتنے کام کیے اُن سب مین کامیابی ضرور ہوئی مگر نہ ہوئی تو اس مقصد مین اور آخر ڈیڑھ سال اُس رسالہ کو جاری رکھ کے اُنھون نے بند کر دیا۔

مگر دلگداز کی اشاعت جون سنہ ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئی تو کئی سال تک جاری رہی۔ اور اُسکے ساتھ ناول شوقین ملکہ جسمین دوسری صلیبی لڑائی کے واقعات بیان کیے گئے ہین شائع ہونا شروع ہوا۔ اگست سنہ ۱۹۰۳ء مین تاریخ حروب صلیبیہ ختم اور مکمل ہو گئی تو ستمبر سنہ مذکور سے مولانا نے اپنی مصنفہ تاریخ سندھ دلگداز کے ساتھ شائع کرنا شروع کی۔

یہ نہایت ہی معرکۃ الآرا تاریخ ہو جسمین سندھ کے زمانۂ حکومت عرب کے حالات عربی کی مستند کتابون قدیم عرب سیاحون کے سفرنامون اور پُرانے جغرافیون سے لیکے جمع کیے ہین۔ جو اسوقت تک کسی مورخ کی نظر سے نہین گزرے تھے۔ اور تمام معاملون مین بڑی تنقید و تحقیق سے بحث کی ہے۔

اسی زمانے مین مولانا نے اپنے ایک قریبی رشتہ دار مولوی محمد سعید الحق صاحب کے نام سے رسالہ "العرفان" نکالا جو اپنی نوعیت کا پہلا اور عجیب و غریب رسالہ تھا۔ اسمین الٰہیات اور تصوف سے بحث کیجاتی اور دینداری کی تعلیم ایسے دلچسپ و موجہ طریقہ سے دیجاتی تھی کہ جس کسی نے اُسے دیکھا پسند کیا۔ اور صوفیون کی دُنیا مین اُسے خاص شہرت حاصل ہو گئی۔ مگر مولانا کے مختلف خانگی افکار اور سفر حیدرآباد کی وجہ سے وہ رسالہ بھی بند ہو گیا۔ لیکن العرفان نے اخباری دُنیا کو دینداری اور روحانیت کیطرف جو توجہ دلائی تھی، اُسکا اثر ہمیشہ زندہ و باقی رہے گا چنانچہ آج تصوف اور علوم باطنی کے متعلق ہندوستان مین کئی رسالے نکل رہے ہین۔ جو درحقیقت العرفان ہی کی یادگار ہین۔

انھین دنون مولانا نے ایک نیا تاریخی سلسلۂ تصانیف شروع کیا جسکا نام "سلسلۂ مشاہیر اسلام" ہے۔ اس سلسلہ کی پہلی کتاب شیخ الطائفہ حضرت جنید بغدادی کی لائف ہو۔ اور دوسری حضرت ابوبکر شبلی کی لائف۔ تیسری کتاب یعنی امام ابوالحسن اشعری کی لائف کا مواد جمع کر چکے تھے کہ سفر حیدرآباد پیش آیا۔ اور وہ آج تک نہین شائع ہو سکی۔ اب اُمید ہو کہ مولانا اُسے عنقریب مرتب فرماکے شائع کر دینگے۔ اس سلسلہ کی کتابونکو صاحب علم مسلمانون نے بے انتہا پسند کیا۔ اور واقعی اُنکے مطالعے سے مولانا کا تاریخی تبحر اور اُنکی وسعت نظر کے ساتھ

انکی تحقیق و تنقید کا حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

اسکے قریب زمانے میں مولانا نے مقدس نازنین کے بعد پیام یار میں شائع ہونے کیلئے ایک ناول "فتح اندلس" تصنیف کیا۔ جو نہایت ہی لاجواب اور مقبول عام ناول ہو" آغا صادق کی شادی" کے نام سے ایک چھوٹا سا ناول مسیح دلگداز سے شائع کیا جسے نہ رسالۂ دلگداز ہی سے تعلق تھا نہ پیام یار سے مگر نہایت ہی دلچسپ با مذاق ہو۔

فروری سنہ ۱۹۰۱ء میں مولانا نے دلگداز میں آٹھ صفحہ اور بڑھا لیے اور اُن صفحات پر مرزا آغا علیخان رئیس لکھنو کے حالات زندگی شائع کرنا شروع کیے۔ اور اسی سال کے شروع سے دلگداز کے ساتھ ناول یوسف و نجمہ جو سنہ ۱۸۹۱ء سے ناتمام پڑا ہوا تھا۔ اُسکے مکمل کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ چنانچہ اختتام سال کے ساتھ ہی وہ تکمیل کو پہونچ گیا۔ اور جنوری سنہ ۱۹۰۲ء سے ایک نیا ناول قیس و لبنیٰ شروع ہوا جو دسمبر سنہ ۱۹۰۱ء میں پورا ہونے والا مگر ان سب چیزونکا تکملہ حیدر آباد میں پہونچکے ہوا کیونکہ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء میں مولوی عزیز مرزا صاحب کے علمی مذاق نے مولانا کو کھینچ حیدر آباد کیطرف کھینچا۔ جہان آپ اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات مقرر ہو کے گئے اور جاتے ہی اپنی خدمت کا چارج لے لیا۔ اور باجازت سرکار نظام دفتر دلگداز کو بھی حیدر آباد میں منتقل کر لیا! اور سنہ ۱۹۰۶ء کے خاتمے کے ساتھ ناول قیس و لبنیٰ تاریخ سندھ کی جلد دوم اور آغائی صاحب کی لائف سب مکمل ہو گئین۔

سنہ ۱۹۰۹ء کے آغاز میں مولانا کو اپنی خدمت کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے بعض اضلاع ریاست میں دورہ کرنا پڑا جسکی وجہ سے پھر اشاعت دلگداز رک گئی۔ یہانتک کہ آخر سنہ ۱۹۰۹ء میں یکایک حضور نظام کا ایک ایسا حکم محکم صادر ہوا جسکی رو سے مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے۔ مولوی ظفر علیخان صاحب بی۔ اے۔ اور مولوی صفی الدین صاحب (جو معزز عہدون پر تھے) بہ عطاے وظیفہ اپنی خدمتون سے سبکدوش اور مولانا شرر جنکی ملازمت ہنوز مستقل بھی نہونے پائی تھی موقوف کیے گئے۔ اور چارون صاحبونکی نسبت حکم ہوا کہ حدود قلمرو نظام سے باہر رہین۔

اس طریقہ سے مولانا اپنے وطن مالوف مین واپس آگئے اور جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے دلگداز پھر جاری کیا ہو لیکن اُسی ابتدائی وضع پر جیسا کہ سنہ ۱۸۸۷ء میں پہلے پہل شائع ہوا تھا یعنی ایک جزو کا رسالہ جس میں صرف مضامین ہوتے ہین۔ ناولون اور تاریخی کتابونکی نسبت اب یہ وعدہ کیا گیا ہو کہ بجائے اسکے کہ ایک ایک جزو دلگداز کے ساتھ شائع ہو مکمل و مرتب کر کے جداگانہ سال میں دو تین مرتبہ شائع ہوا کرینگے۔

مولانا شرر کی زندگی اسی درجہ تک پہونچی ہو اور ہمین یقین ہو کہ ابھی وہ بہت کچھ کرینگے۔ کیونکہ اب وہ فرصت و فراغت کے ساتھ اور زیادہ اور صاحبان ذوق اہل علم کی خدمت گزاری کیلیے مستعد ہو کے بیٹھے ہین۔ اور پہلے سے زیادہ حوصلہ کے ساتھ کام کرنے کو تیار ہین۔

یہ مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم اتنا اور کہنا چاہتے ہین کہ ہمارے صوبے کی گورنمنٹ نے مولانا شرر کی لٹریری خدمت کی کوئی قدر نہین کی اس طبیعت اس مذاق اور اس خوبی کے لوگ تمام مہذب ممالک مین بڑے بڑے خطاب پاتے ہین اور یونیورسٹیون مین انسے مشورے لیے جاتے ہین۔ افسوس ہو اردو زبان کے زبردست انشا پرداز اور تاریخ کے زبردست ماہر محقق سے ہماری گورنمنٹ کوئی فائدہ نہین حاصل کرتی۔

سررشتۂ تعلیم کی کتابونکی جو حالت ہو اور انکی زبان کی جو گت ہو اگر گورنمنٹ اسپر توجہ کرتی تو مولانا شرر کی عزت افزائی نہین بلکہ ملکی زبان کی شائستگی بڑھانے کی ضرور فکر فرماتی۔

مگر ہم مایوس نہین ہین۔ ہمارے صوبے کے موجودہ حکمران ہز آنر سر جان سکاٹ ہیوٹ بالقابہ علم دوست و اہل کمال کے قدر افزا ہین وہ مولانا شرر کے علمی کارنامون سے ضرور فائدہ اٹھانیکی کوشش فرماینگے۔ حکیم برہم

مولوی سیّد احمد صاحب دہلوی

مولوی سید احمد صاحب اپنی بہترین تالیف "فرہنگ آصفیہ" کی وجہ سے علمی دنیا میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت بسیط "ضخیم جامع" اور مستند اردو لغت ہے۔ آپ سے پیشتر کسی اہل زبان نے اس اہم کام کی طرف برائے نام بھی توجہ نہیں کی جس کے سبب اردو زبان ایک ناکمل اور ادھوری زبان خیال کی جاتی تھی۔ آپ نے چونکہ تقریباً اپنی تمام عمر اسی کی تحقیق میں صرف کردی، اور اردو دنیا پر ایک غیر معمولی احسان فرمایا اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپ کا مختصر علمی تذکرہ "ادیب" میں شایع کر کے بادہ نوشان بزم اُردو کو ذوق روحانی حاصل کرنے کا موقع دیں:-

مولانا موصوف نویں محرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۸ جنوری ۱۸۴۶ء کو بمقام دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے اور شاہ صابر بخش کے باغ واقع فیض بازار میں ہوش سنبھالا۔ آپ مولوی حافظ سید عبدالرحمن صاحب مرحوم خلف مولوی سید خواجہ علی صاحب مغفور کے بیٹے ہیں۔ آپ کے جدی بزرگوار سادات وعلمائے بخارا سے حسنی و حسینی سید و حضرت غوث پاک رحہ کی اولاد و امجاد سے ہیں۔ نانیہالی بزرگوار حضرت موت واقع یمن۔ ملک عرب سے اولاد و احفاد امام جعفر صادق قبیلہ بالفقیہ کی نیک یادگار ہیں۔ جنہیں ہمایوں بادشاہ کی وفات پر اس کی حاجتی ملکہ نواب حمیدہ بانو عرف حاجی بیگم والدہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ ہند نے کمال ارادت و عقیدت سے باجازت سلطان روم حج سے واپس ہوتے وقت ۹۸۶ھ ہجری میں تیمناً اپنے ہمراہ زندگی فاتحہ خوانی کے واسطے ہمراہ لے کر آئی تھی۔ اور ان بزرگوں کے نام سے ایک بستی موسوم "عرب سرائے" ہمایوں بادشاہ کی قبر کے پاس آباد کردی۔ اور تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُس قبر پر ایک عالیشان مقبرہ بنوا دیا۔ آپ کے ماموں حاجی مولوی سید عبداللہ بالفقیہ صاحب اُس سلسلہ دہلی ایک بڑے مہمان نواز، مخیر، پارسا، عابد، مشہور امصار و دیار ہنوز زندہ و سلامت ہیں۔ عبادت الٰہی سے کام ہے۔ ہر وقت اصلاح حال و تزکیہ باطن میں مصروف رہتے ہیں۔ حاجی صاحب کے پاس وہ قابل زیارت شجرہ اب تک موجود ہے جو ان کے بزرگوار عرب سے لیکر آئے تھے۔

مولوی سید احمد صاحب نے درسی کتابیں بڑے بڑے اساتذہ سے گھر پر اور سررشتہ تعلیم کی کتابیں مختلف سرکاری مدارس اور نارمل اسکول دہلی میں پڑھیں۔ تصنیف و تالیف کا شوق بچپن سے رہا۔ بالخصوص اُردو زبان کی تدوین پر جان و دل سے مائل و فریفتہ رہے۔ زبان اُردو کے شعرائے ماضی و حال کا کلام متداول دیکھا۔ شہزادگان دہلی و نیز نامی گرامی علما، فضلا، حکما اور شعرا کی صحبتوں میں بھی بیٹھے۔

ایام طالب علمی میں ایک فارسی منظوم لغت نامہ اور ایک انشائے تقویت الصبیان بقید التزام اُردو میں تصنیف کی چنانچہ یہ انشا اُسی زمانہ (۱۸۶۹ء) میں دہلی سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۸۷۹ء میں ایک رسالہ کنز الفوائد یعنی مناظرہ تقدیر و تدبیر تصنیف کر کے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کی خدمت میں پیش کیا۔ جس پر گورنمنٹ کی طرف سے دو سو روپیہ کا انعام مرحمت ہوا۔ اور اول مرتبہ

سرکاری خرچ سے یہ کتاب چھپکر مشتہر ہوئی اور مصنف کو بھی بہت سی جلدیں عطا کی گئیں۔

آپ کو اپنے زمانۂ تعلیم سے یہ دھن لگی ہوئی تھی، کہ کوئی ایسا کی مکمل مصطلحات یا کامل لغات جمع کی جائے۔ چنانچہ [illegible] میں خدا پر بھروسہ کرکے یہ کام شروع کردیا۔ کنز الفوائد کے انعام نے اس کام کے حق میں آب حیات کا کام دیا، مصنف کی ہمت بڑھادی، اور اس رقم سے بہت سا ضروری سامان خرید کیا جس کے سبب سے آپ کی تصنیف وتالیف کا شوق اور بھی دوبالا ہوگیا۔ چنانچہ [illegible] میں ایک اور کتاب موسوم بہ وقائع درانیہ اردو میں تالیف فرمائی۔ گورنمنٹ نے اس کتاب پر بھی ازراہ قدردانی ڈیڑھ سو روپیہ بطور انعام مرحمت فرمایا۔ اس سے اور بھی سہولت حاصل ہوگئی، اور موجودہ مشکلات دور ہوگئیں اور تدوین کا کام اس جوش کے ساتھ شروع کیا گیا کہ آپ کا ایک جوان بھائی محنت شاقہ کی وجہ سے مرض سل میں مبتلا ہوکر لقمۂ موت ہوگیا۔ افسوس!

چونکہ خداوند مطلق کو اُن کے ہاتھوں سے یہ کام لینا منظور تھا اس لئے مولوی صاحب اس صدمۂ عظیم پر بھی اپنے عزم صادق سے باز نہ آئے۔ اور اس طرح جان توڑ کر منہمک ہوگئے کہ چھ برس کے عرصہ میں لغات اردو کا بہت سا حصہ مسودات کی صورت میں تیار کرکے ابتدائی مسودات کی صفائی شروع کردی۔

ہمت اگر سلسلہ جنباں شود   مور تواند کہ سلیماں شود

اسی زمانہ میں ڈاکٹر ایس۔ ڈبلو۔ فیلن صاحب انسپکٹر مدارس صوبۂ بہار ایک ہندوستانی انگلش ڈکشنری لکھ رہے تھے، اور انکو دہلی کے ایک ایسے اسکولر ماہر زبان کی ضرورت تھی جو اُن کی ڈکشنری کی تدوین میں مدد دے۔ چونکہ مولوی صاحب موصوف کی لغت کا تذکرہ گاہے گاہے اخبارات میں چھپتا رہتا تھا پس ڈاکٹر فیلن صاحب نے پتہ لگاکر خود دہلی کا قصد کیا۔ اور [illegible] انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے منشی فقیر چند کو۔ اور اردو میں [illegible] کرنے کے واسطے مولوی سید احمد صاحب کو منتخب فرمایا۔ ڈاکٹر فیلن صاحب ارمغان دہلی کے تیار شدہ اجزا اور مسودوں کو دیکھکر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلنے سے تم کو [illegible] اور ہم کو تم سے بہت کچھ مدد ملے گی۔ مولوی صاحب نے دو [illegible] پیش کئے۔ اول یہ کہ میرے لغات کے کام میں ہرج ہوگا جس کا میں اس کا عاشق ہوں۔ اُس کے ہرج سے میری روح کو صدمہ [illegible] دوم یہ کہ میں نے نارمل سکول میں سرکاری وظیفہ پر تعلیم پائی ہے اور [illegible] نائب مدرس ہوں، حسب قاعدہ تین سال تک دوسری [illegible] نہیں کرسکتا۔ فیلن صاحب نے جواب میں فرمایا کہ آپ کے [illegible] کے کام میں ہرج نہ ہوگا۔ آپ شوق سے اپنا کام جاری رکھ [illegible] رہا دوسرا عذر، میں انسپکٹر صاحب مدارس حلقہ انبالہ اور [illegible] ضلع بہادر دہلی سے اجازت دلوادوں گا۔ میں دانا پور [illegible] دو چٹھیاں ہر دو صاحبان موصوف کے پاس بھیجوں گا [illegible] بطیب خاطر آنے کی اجازت دے دیں گے۔ بالآخر مولوی [illegible] دانا پور تشریف لے گئے، اور فیلن صاحب کے پاس مقیم ہوکر [illegible] کار ہوے

فیلن صاحب ان کے استقلال اور محنت پسندی سے بہت خوش تھے۔ علاوہ تنخواہ کے اور بھی سلوک کرتے [illegible] بعض اوقات منشی صاحب موصوف کے مکان پر آکر ان کی مصروفیت دیکھتے، اور تعریف کرتے جس کا اشارہ انھوں نے [illegible] کئی چٹھیوں میں کیا ہے۔

پورے سات سال میں فیلن صاحب کی ڈکشنری [illegible] [illegible] میں جب طلب مہاراجہ الور اُن کا سفر [illegible]

کے لئے چلے گئے۔ چھ مہینے میں سفر نامہ تیار کرکے تنخواہ کے علاوہ معقول انعام لے کر گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کی نائب مترجمی پر لاہور چلے آئے۔ یہ سفر نامہ دلچسپ اور قابل دید ہے۔

جن لوگوں نے سنہ [illegible]ء کے اخبارات، انجمن پنجاب، کوہ نور لاہور، اودھ پنچ، اکمل الاخبار وغیرہ ملاحظہ کئے ہوں گے وہ بتا سکتے ہیں کہ اس انداز کا سفر نامہ آج تک کسی رئیس نے نہیں لکھا۔ جسقدر سفر نامہ تیار ہوتا جاتا تھا، مولوی سید احمد صاحب اُسکی ایک ایک نقل اخبارات میں دیتے جاتے تھے۔

ہنوز فیلن صاحب کی ڈکشنری زیر تالیف تھی کہ اس عرصہ میں مولوی صاحب نے چند اور کتب تصنیف فرمائیں مثلاً ہادیُ النساء ٹھیٹ بیگماتی زبان میں نہایت دلچسپ اور شوق انگیز تحریر کی، جس پر فیلن صاحب نے صرف زوردار ریویو ہی نہیں لکھا۔ بلکہ گورنمنٹ بنگال میں سفارش کرکے بہت سی کتابیں فروخت کرادیں۔ اتنا ہی ہادی النسا سنہ [illegible]ء سے اب تک، اور رسمی تعلیم سنہ [illegible]ء سے تا حال متعدد مرتبہ چھپ چکی ہیں۔

سنہ [illegible]ء کے اخیر سے سنہ [illegible]ء تک آپ نے اُردو زبان کی لغت کے سلسلہ کا ایک نمونہ اخبار انجمن پنجاب میں چھاپنا شروع کیا تھا۔ یہ نمونہ ان کی مفصلہ ذیل کتب کا تھا۔ جن میں سے ارمغان دہلی کے سوا باقی کتابوں کے چھپنے کی ابتک نوبت نہیں آئی۔ اور آئی بھی کیونکر! فرہنگ آصفیہ کے اخراجات، وقت کی قلت، اور دیگر مصائب نے ان کی بلند حوصلہ طبیعت کے پر پرواز توڑ دئے تھے اگر زمانہ نے فرصت دی تو شاید یہ آرزوئیں بھی پوری ہوکر رہیں! تکمیل الکلام یعنی خاص پیشہ وروں کے اصطلاحات۔ تحقیق الکلام یعنی اُردو زبان کے نکات جن کی جھلک رسالہ "علم اللسان" مطبوعہ رفاہ عام پریس لاہور میں دیکھ لیجئے۔! رس کسان۔ یعنی ٹھیٹ ہندی زبان کے دوہوں، گیتوں، پہیلیوں، مکرینوں، بھجنوں وغیرہ کا عمدہ مجموعہ ہے۔ ریت بھان یعنی اہل ہنود کے اعلےٰ خاندانوں کی رسمیں۔ ناری کتھا۔ یعنی ہندو عورتوں کی روزمرہ دلچسپ بول چال بطور مکالمہ۔ قواعد اردو۔ لغات النساء۔

سنہ ۱۸۸۸ء میں آپ نے ارمغان دہلی کے نام اپنی ڈکشنری کا پہلا حصہ جس میں صرف الف ممدودہ کے الفاظ ڈیڑھ سو صفوں میں کلاں تقطیع پر درج ہوئے تھے چھاپ کر شائع کیا۔ اس حصہ کو دیکھکر جان لینا چاہئے کہ مولف فرہنگ آصفیہ کی آرزو یہ تھی کہ ساری کتاب اسی طرز پر حسب مسودۂ اولین چھاپی اور مشتہر کی جائے۔ مگر زر کثیر کہاں سے لاتے۔ جو اس میں بھی لگاتے، اور اپنی ضروریات زندگی کو بھی پورا کرتے۔ ناچار افسردہ خاطر ہوکر بیٹھ رہے اور موجودہ صورت پر ہی اکتفا کی۔ اب ارمغان کے اس حصہ کو بھی فرہنگ میں شامل کردیا، تاکہ یہ نمونہ آئندہ فرہنگ نگاروں کے لئے مشعل راہ ہدایت ہو۔

اسی اثنا میں آپ نے اور کئی چھوٹی موٹی کتابیں مفید خلایق لکھیں۔ جن میں سے کچھ تو چھپ گئیں اور اکثر مسودات کی صورت میں پڑی رہ گئیں۔ مطبوعہ کتب کے نام یہ ہیں:۔ تحریر النساء یعنی ہادی النساء کا دوسرا حصہ، لڑکیوں کا قاعدہ لڑکیوں کی پہلی کتاب، بی راحت زمانی کا قصہ، جس سے وقت کی قدر مقصود ہے۔ اخلاق النساء، بچوں کا رکھ رکھاؤ۔ یہ سب کتابیں تعلیم نسواں کے متعلق اُنہی کی زبان میں لکھی گئیں ہیں۔ علم اللسان، جس میں ہر ایک زبان کی ابتدائی وسطی اور آخری حالت بطور لکچر بیان کی ہے۔ رسوم دہلی جس میں پیدائش سے بیاہ شادی اور مرنے تک کی رسمیں نہایت دلچسپ عبارت میں بیان کی ہیں۔

غیر مطبوعہ کتب میں سے بعض کے نام اوپر آگئے ہیں، اور بعض کے یہ ہیں۔ جو اُن کے بعد لکھی گئیں۔ تیر خطہ مع تاریخ شملہ جو سر وقار الامرا بہادر وزیر دکن کی تشریف آوری کے موقع پر بمقام شملہ اُن کی یادگار میں پیش کی (یہ کتاب انڈین پریس الہ آباد سے عنقریب باجازت مصنف شائع ہونے والی ہے۔) اُردو ضرب الامثال۔ روزمرہ دہلی۔ رسوم اعلیٰ ہنود ان دہلی حالات فرقہائے مختلفہ مع رسوم۔

جب مولوی سید احمد صاحب ڈاکٹر فیلن صاحب کی ڈکشنری سے فارغ ہو کر آگرہ۔ اور آگرہ سے لاہور، نائب مترجمی کے عہدہ پر آئے تو خیال کیا کہ اتنی بڑی لغات کا چھاپنا میرے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔ نیز ایسی مطول کتاب کی خریداری اہلِ ہند کی مقدرت سے بعید ہے۔ لہٰذا اصل کتاب کا خلاصہ کرنا اور ۱۸۸۸ء سے ملخص رسالہ نکالنا شروع کیا۔ اس موقع پر حسب ضرورت و مصلحت وقت نظائر، نوٹ، وجہ تسمیہ، اور مادّہ وغیرہ کا پورا التزام نہیں رکھا بلکہ معانی بعیدہ سے بھی احتراز فرمایا۔ لیکن با ایں ہمہ وہ خلاصہ بھی ایسا طویل و ضخیم ہوا کہ اس کے چھپوانے کا عقدۂ مشکل پھر بھی حل نہ ہو سکا۔

بالآخر سینہ مہلت تک چالیس نمبر نکال کر آئندہ رحمت خداوندی کے امیدوار ہو کر مجبور رہے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا مشغلہ ترک نہ فرمایا۔ وہ اپنے اشغال و اذکار میں مصروف تھے کہ اُن کی دعا کا تیر نشانہ پر پہنچ گیا۔ اُن کی امید کا پودا سرسبز ہونے کو آیا۔ یعنی ۱۸۹۰ء میں سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام نظام کی مبارک صورت میں ایک فرشتۂ غیبی ملک دکن سے شملہ میں باران رحمت بنکر نزول فرما ہوا۔ یہ اُس زمانہ میں شملہ ہائی اسکول کے ہیڈ مولوی تھے۔ صرف ایک عرضی کے وسیلے سے اُن کے حضور تک پہنچ گئے

پورا مسودہ پیش کیا۔ مطبوعہ رسالے اور دیگر کتب نفیسہ تحفۃً اُن کے سامنے رکھے اور حضور نظام کے نام نامی پر ڈیڈیکیٹ کرنے کی اجازت لی۔ الغرض کل مسودہ مع رسالجات شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی کے سپرد ہوا کہ اس پر رپورٹ کریں۔ سید صاحب نے قابل تحسین رپورٹ کی جس کی نقل جلد چہارم میں موجود ہے۔ اس پر سرِدست پانچسو روپیہ کا انعام اور چارسو جلدوں کی خریداری منظور ہوئی اور ختم کتاب پر معقول انعام کا وعدہ کیا گیا۔ پس اسی وقت سے اس کتاب لاجواب کے طبع ہونے کی بنیاد پڑ گئی اور نام اُس کا "فرہنگ آصفیہ" رکھا گیا۔

غرض جس لغات کی ابتدا ۱۲۹۶ھ میں کی گئی تھی وہ ۱۹۱۲ء میں ختم ہوئی۔ اور ۱۹۰۸ء میں بہمہ وجوہ تکمیل کو پہنچکر حضور نظام والا مقام کی نظر لطف سے پایۂ تحتانی تک شائع ہو گئی ؎

مردے از غیب بروں آید و کارے بکُند

اس عرصہ میں آپ کئی مرتبہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۰ء میں، دوسری بار ۱۸۹۳ء میں، تیسری دفعہ ۱۸۹۶ء میں، چوتھی بار ۱۹۰۱ء میں۔ پہلے سفر میں سر آسمان جاہ بہادر کے عروج کا، دوسرے میں نزول کا زمانہ دیکھا۔ تیسرے سفر میں نواب سر اقبال الدولہ بہادر کا دورہ دورہ نظر آیا۔ چوتھے سفر میں سر مہاراجہ کشن پرشاد کا موجودہ عہد نظر افروز ہوا۔ اور ہر ایک سفر میں کچھ نہ کچھ کام بنتا رہا۔ لیکن افسوس کہ حضور نظام کی حضوری کا شرف حاصل نہ کر سکے جس کی آپ کو کمال آرزو تھی۔ چنانچہ اسی شوق میں آپ نے ایک مضمون موسوم بہ "پیکر خیال" اپنے دلی حال میں لکھا جو قابل دید ہے۔ اور جلد چہارم کے اخیر میں درج ہوا ہے۔

جس وقت یہ فرہنگ ختم ہو گئی، تو حسب وعدہ پانچہزار روپیہ

کا انعام مرحمت ہوا۔ اور بعد میں پچاس روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر ہوگیا۔

فرہنگ آصفیہ میں ساٹھ ہزار کے قریب لغات، محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال وغیرہ موجود ہیں۔ گورنمنٹ پنجاب نے بھی از راہ قدردانی ۱۹۰۰ء میں پانسو روپیہ کا انعام اور ہزار روپئے کی خریداری سے مصنف کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

علیا حضرت قیصرۂ ہند جناب ملکہ معظمہ وکٹوریہ بادشاہ انگلستان اور لارڈ کرزن وائسرائے ہند کی طرف سے بھی قبولیت کا اعزاز بخشا گیا۔ رئیس رامپور اور رئیس ٹونک نے بھی خریداری سے دل بڑھایا۔ ۱۹۰۵ء میں جس وقت شہزادہ پرنس آف ویلز دہلی میں تشریف لائے، تو سر ڈبلیو لارنس صاحب بہادر چیف آف دی اسٹاف کے وسیلے سے ایک پر تکلف نظم "خیر مقدم" اور رسالہ رسوم مسلمانان پیش کیا جس کی قبولیت سے حضور پرنس آف ویلز بہادر بالقابہ نے مفتخر فرمایا۔ چنانچہ "خیر مقدم" اخبار پائونیر، دہوزنگ پوسٹ، وغیرہ میں بھی مع خبر اعزاز قبولیت شائع ہوگیا تھا۔

مولانا موصوف کا مفصل حال فرہنگ آصفیہ کے ہر دو اول اس کے ہر حصہ کے دیباچوں "اور جلد چہارم کے خاتمہ سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ اور یا اُن کی خود نوشت سوانح عمری سے جو کسی موقع پر شائع کی جائے گی۔

الغرض، مولوی سید احمد صاحب نے زبان اُردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور ابھی تک اسی میں منہمک ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کو تا دیر زندہ و سلامت رکھے۔

شہیر (فتحپوری)

مولوی نظام الدین حسن، بی۔اے، بی ایل

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہونے کے بعد اسلامی تمدن اور قابل مسلمان افراد میں جو ضعف اور کمی ہو گئی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ غدر کے پر آشوب زمانہ کے بعد مسلمانوں کے سوکھے ٹکڑے پر قوت تنے اور چیدہ خاندانوں میں جابجا جو چند افراد عالیہ کا ظہور ہوا ہے وہ مغتنمات سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی قوم مغلوب ہو کر غیروں کے قبضے میں آ جاتی ہے تو بہت جلد اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مغلوب و مفتوح قوموں کی طبیعت پر کسل غالب آ جاتا ہے۔ ان کا جوش و ولولہ سرد پڑ جاتا ہے۔ فاتحانہ حیثیت سے گر کر مفتوحانہ حیثیت میں اضمحلال روبہ ترقی ہوتا ہے اور آخر کار وہ قوم گھٹنے اور مٹنے لگتی ہے۔ پس ایک ایسے زمانہ میں اگر کسی مضمحل قوم میں کچھ قابل افراد پیدا ہوں تو وہ نہایت ہی عزت کے لائق ہوتے ہیں۔ مولوی نظام الدین حسن زمانۂ حال کے مسلمانانِ ہند میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اودھ کی مردم خیز خاک سے آپ کا بھی تعلق ہے۔ خاندانی وجاہت اور ذاتی لیاقت دونوں باتوں کے لحاظ سے آپ واجب العزت ہیں۔ آپ کے والد ماجد مولوی محمد حسن صاحب عرصہ تک سرکار انگلشیہ میں جج کے عہدہ پر ممتاز رہے اور وظیفہ لینے کے بعد حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر سرفراز ہوئے۔ مولوی نظام الدین حسن صاحب [illegible] میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم تو پرانی مکتبی طریقہ پر ہوئی لیکن چونکہ آپ کے والد ماجد

اُس زمانہ کے عالمگیر تعصبات سے پاک تھے اس لئے انہوں نے مولوی صاحب ممدوح کو مکتبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دلانا شروع کی اور مولوی صاحب قریباً تمام امتحانات میں اوّل یا کم از کم دوم درجہ حاصل کرتے اور انعامات جیتتے رہے۔ میور سنٹرل کالج الہ آباد سے آپ نے ایف۔ اے کا امتحان اوّل درجہ میں پاس کیا۔ اور کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری [illegible] میں حاصل کی۔ شروع ہی سے آپ کو کچھ وراثت سے اور کچھ ذاتی شوق سے قانون اور ریاضی کی طرف میلان تھا۔ چنانچہ آپ نے الہ آباد ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان [illegible] میں پاس کیا۔ اور ۱۸۹۱ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی ایل کا درجہ حاصل کیا اور لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا نے اسی اثنا میں آپکو صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری کا ممتاز عہدہ عطا فرمایا۔ اور [illegible] سے [illegible] تک آپ صوبہ برار میں اسسٹنٹ کمشنری وجی وغیرہ کے مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ سخت محنت وجفاکشی بچپن ہی سے آپکی طبیعت ثانی بن چکی تھی اسپر اعلیٰ درجہ کی دیانتداری اور فرائض میں انہماک، ایسی خصوصیتیں تھیں جن سے اعلیٰ حکام انگریز اور گورنمنٹ آف انڈیا دونوں کی نظر میں آپکی نہایت عزت و وقعت قائم ہوگئی۔ چنانچہ محکمۂ خارجہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حیدرآباد دکن کی عدالت العالیہ کی ججی پر جس کے لئے اسوقت ایک سخت دیانتدار جج کی ضرورت تھی آپ کی سفارش کی اور مولوی صاحب ممدوح [illegible] سے [illegible] تک یعنی تقریباً ۱۰ سال حیدرآباد کی ججی پر قائم رہے۔ اپنی دیانتداری اور انصاف کا سکہ آپ نے حیدرآباد میں ایسا بٹھایا کہ دوست دشمن سب آپ کی انصاف پروری اور ریاضیانہ تحقیق و تدقیق کے قائل ہوگئے۔ اور قانونی تبحر کے باعث آپ محکمۂ وضع قانون ممالک محروسہ حیدرآباد دکن کے ممبر منتخب کئے گئے۔ چونکہ عوام الناس سنٹیمنٹ پسند ہوتے ہیں اور محض خشک حکیمانہ و فلسفیانہ تحقیق و تدقیق بمقابلہ نمائش و ظاہرداری دنیاسازی و رعایت کے اُن کو چنداں مرغوب نہیں ہوتی بالخصوص دیسی ریاستوں میں جہاں درباردایوں اور سازشوں کے جال ہمیشہ پھیلے رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً انقلابات کے بھونچال آتے رہتے ہیں اور جو شخص اِن درباردایوں اور سازشوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں وہ کبھی ہر دلعزیز نہیں بنتے۔ اس لئے [illegible] میں مولوی صاحب ممدوح حیدرآباد سے اپنے سابق عہدہ ڈپٹی کمشنری پر برار واپس چلے آئے اور ضلع یوت مل کی ڈپٹی کمشنری پر متعین کئے گئے [illegible] میں گورنمنٹ آف انڈیا نے بسبب آپ کی اعلیٰ دیانتداری جفاکشی اور سخت پابندی قانون وضابطہ کے آپ کو ریاست بھوپال کی وزارت مال پر بسفارش روانہ کیا جہاں آپ دو سال تک رہے اور ریاست کے تمام محکموں میں سخت دیانتداری اور فرائض کی انجام دہی پر آپ کا سارا زور رہا۔

بالآخر آپ نے قریباً ۳۰ سال کی مسلسل خدمات و مشقت و مشغولیت کے بعد [illegible] میں وظیفہ لے لیا۔ اور اپنے وطن کے قریب لکھنؤ میں اقامت اختیار کی۔ مولوی صاحب ممدوح کی زندگی و ذاتی خصائص سے زمانۂ حال کے مسلمان نوجوان چند نہایت ہی اہم اور مفید سبق حاصل کرسکتے ہیں۔

(۱) اوّل خصوصیت آپ کی جفاکشی ہے۔ ایام طالبعلمی و ایام ملازمت میں آپ سخت محنت وجفاکشی کے پابند رہے اور ان آخری ایام میں بھی جبکہ آپ اپنی زندگی کی دوڑ کے اختتام پر قریب آرہے ہیں اپنے فرائض ذاتی و قومی و ملکی

ومشاغل علمی میں منہمک رہتے ہیں جسمانی طور پر گو آپ بہت قوی نہیں ہیں لیکن سستی وکاہلی سے آپ ہمیشہ مقابلہ وضد کرتے ہیں۔ یہ خصوصیت اہل یورپ کا تو عام خاصہ ہے مگر اہل ہند اور بالخصوص مسلمانوں میں اس قسم کی کمی پائی جاتی ہے ذرا سی بھی فارغ البالی وخوشحالی ہم کو محنت شاقہ وریاضت وفرائض کی انجام دہی سے روکتی ہے۔ مفتوح ومغلوب قوموں کا سب سے بڑا مرض کسل واضمحلال ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی عربؐ اکثر یہ دعا مانگتے تھے کہ اعوذ باللہ من الکسل والبخل یعنی قومی ترقی کا راز چستی اور مسلسل کام کرنے میں ہے دنیا میں جتنے مشاہیر یا نامور شخص ہوتے ہیں اُن کی زندگی نہایت ہی محنت ومشقت ومصروفیت کی رہی ہو۔ زمانۂ حال ہی کے بزرگوں کو لو۔ مثلاً نواب وقار الملک جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ محنت ومشقت کی گویا کل ہیں۔ شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم۔ مولوی چراغ علی مرحوم۔ جنرل عظیم الدین خاں مرحوم وغیرہ۔ یہ لوگ اس قدر محنتی تھے کہ معمولی آدمی کو حیرت واستعجاب ہوتا تھا۔ اور انکی کامیابی وترقی کا راز اسی میں تھا۔

(۲) مولوی نظام الدین حسن صاحب کی دوسری بڑی خصوصیت سخت دیانت داری وبے لوثی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اس زمانہ کے افراد عالیہ میں بھی خال خال پائی جاتی ہے صاحب اختیار وسخت آزمائش کے عہدوں، کاموں پر رہتے ہوئے سخت دیانت دار رہنا اس زمانہ میں تو قریب قریب فوق العادت بات ہے۔ ایام سلف کے مسلمان البتہ اس میں بڑے ممتاز رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو سخت دیانت دار ہوگا وہ مُسرف ہو ہی نہیں سکتا۔ ذرہ ذرہ اور قطرہ قطرہ کے لئے وہ اپنے کو خدا کا امانت دار وذمہ دار سمجھتا ہے۔ مولوی صاحب ممدوح اس معاملہ میں غالباً ہندوستان بھر میں ایک عجیب الخلقت فرد ہیں۔ آپ نے اپنی تمام زندگی کے حرکات وواقعات، آمدنی ومصارف کی ایسی یادداشتیں رکھی ہیں جن سے جزئیات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ باقاعدہ طور پر کئی درجن حساب وکتاب کے رجسٹر سالہا سال سے آپ کے یہاں رکھے جاتے ہیں جس میں ہر لحظہ وگھنٹہ نہایت صحیح اندراج ہوتے ہیں اور جن کی صحت علم ریاضی کی سی صحت تک پہونچتی ہے چونکہ یہ ایک نادر بات ہے اس لئے مولوی صاحب ممدوح کے اس طریقہ کو اکثر لوگ بنظر استعجاب دیکھتے ہیں۔ مولوی صاحب ممدوح کا دماغ حد درجہ ریاضی واقع ہوا ہے اور اس کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آپ ہر بات کو انتہا ریاضی ومنطقی صحت کے ساتھ جانچنا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ انتہار ریاضی ومنطقی صحت پسند دماغ نہایت ہی اعلیٰ ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسے یکطرفہ رُخ سے انھیں نتائج پر پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے جو اُس بڑے ریاضی داں کا ہوا جو ایک برات کے ساتھ تھا۔ راستہ میں ایک ندی ملی۔ ریاضی داں نے جا بجا سے اُس ندی کے عمق ووسعت کو ناپ کے ایک اوسط نکالدیا اور حکم دیا کہ سب لوگ ندی کو عبور کر سکتے ہیں۔ مگر مولوی صاحب ممدوح یکرخے شخص نہیں ہیں۔ شدت کے ساتھ ریاضی ومنطقی ہونے کے علاوہ آپ کامن سینس میں بھی اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں۔ علی گڈھ کالج کے آپ ٹرسٹی بھی ہیں اور کالج کے حساب وکتاب کے آڈیٹر بھی ہیں۔ آپ کی رائیں نہایت بے رو رعایت وبے لوث ہوتی ہیں۔

(۳) تیسری خصوصیت ممدوح کی اسلامی سادگی واتقا ہے۔ آپ ضلع کے ڈپٹی کمشنر رہے جج رہے لیکن جمعہ کی نمازیں ہمیشہ مثل ایک معمولی مسلمان کے شریک ہوئے۔ امیر غریب سب

آپ کا یکساں برتاؤ ہے۔ ساری عمر نماز و اوقات کی پابندی آپ نے نہایت شدت سے رکھی ہے۔

(۴) اولاد۔ ممدوح صاحب اولاد ہیں۔ اپنے بڑے صاحبزادہ ناظر الدین حسن صاحب کی تعلیم و تربیت کا فرض آپ نے جس خوبی سے انجام دیا وہ نہایت تعریف کے لائق ہے ۱۹ سال کی عمر میں صاحبزادہ موصوف نے نہ صرف علی گڈھ یونیورسٹی کا بی اے پاس کیا بلکہ کیمبرج یونیورسٹی کے ماسٹر آف آرٹ اور ایل ایل ڈی کی ممتاز ڈگریوں کو نہایت عزت کے ساتھ حاصل کیا اور بیرسٹرایٹ لا بھی ہو گئے اور اب لکھنؤ میں پراکٹس کرتے ہیں۔ اور نہایت ہوشیار و خلیق ہیں۔ مسلمان جو کسی زمانہ میں علم کے ساتھ سپاہیانہ خصائل میں بھی ممتاز تھے یہ خصوصیت بھی ناظر الدین حسن صاحب نے قائم رکھی۔ آپ علی گڈھ کالج کے رائڈنگ رسالے کے کپتان تھے۔

(۵) مولوی نظام الدین حسن نے باوجود ملازمت کے مشاغل و خاندانی فرائض کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا چنانچہ آپ نے حسب ذیل مختلف چھوٹے چھوٹے جامع رسالے تصنیف کئے ہیں جو نہایت مفید ہیں صحت و اختصار ان رسالوں کی بڑی خصوصیت ہے۔ یہ رسالے طوالت زوائد مبالغہ و تکرار سے مبّرا ہیں۔

۱۔ رسالہ اوقاف العبارت
۲۔ صفات باری تعالیٰ
۳۔ طلوع و غروب معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۴۔ الرموز
۵۔ بحث الف لام
۶۔ کعبہ کی سمت معلوم کرنے کا طریقہ (انگریزی)
۷۔ فہرست قرآن مجید
۸۔ صحیفۂ حرمت ربا (وغیرہ)

ان رسالوں میں رسالہ اوقاف العبارت ایک نئی تحقیق ہے جس میں مصنف ممدوح نے ثابت کیا ہے کہ موجودہ یوروپی زبانوں میں جو اوقافی نشانات ہیں ان کی ابتدا عربی میں ہوئی تھی اور اہل یورپ نے اُن کو عرب سے لیا ہے۔ اسیطرح قرآن کی فہرست بھی بہت مفید ہے۔

خدا تعالیٰ ممدوح کو بہت دنوں تک صحت کے ساتھ زندہ رکھے اور مسلمانان ہند ان کے نمونہ سے سبق حاصل کریں۔

جان ملکم

شمس العلما ڈاکٹر سید علی بلگرامی مرحوم

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

افسوس! ۳ مئی ۱۹۱۱ء کی صبح کو علمی دُنیا کا ایک بڑا شخص یکایک حرکت قلب بند ہوجانے سے ہمیشہ کے لئے خاک بلگرام کا پیوند ہوگیا۔ مولوی سید علی صاحب بلگرامی مرحوم ان افراد عالیہ مین سے تھے جنپر نوع انسانی فخر کرسکتی ہے۔ آپ کی ناگہانی وفات تمام ہند کے لیے عموماً اور دنیا اسلام کے لیے خصوصاً ایک سخت ناقابل تلافی ملکی وقومی صدمہ ہے اور ملک وقوم انکے لئے جسقدر ماتم کرے بجا ہے۔ پائیونیر ایسے اینگلو انڈین اور سخت مخالف اخبار نے بھی آپ کی وفات پر افسوس کیا اور لکھا کہ "ہندوستان سے ایک علامہ وسیع الخیال و با اخلاق ہردلعزیز شخص جاتا رہا"۔ مرحوم نے جو علمی شہرت حاصل کی تھی وہ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھی بلکہ یورپ کے طبقہ علما مستشرقین مین بھی آپ ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ دو قدیم مختلف علمی زبانون یعنی عربی وسنسکرت کا علامہ ہونے اور یورپ کی مختلف زبانون مین مہارت رکھنے سے یورپ کا کوئی علمی مرکز ایسا نہ تھا جہان آپ کا تعارف نہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم ان "نادر دنیا" افراد مین سے تھے جنکو فطرت نے غیر معمولی ذہانت و عجیب و غریب قوت حافظہ عطا کیا تھا اور انکو اپنی ان خداداد قوتون کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ انھون نے بچپن سے تا دم واپسین ان قوتون سے کام لینے اور انکو ترقی دینے مین کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ آپ کی طالبعلمانہ خصوصیت آخر تک قائم رہی۔ جن لوگون کو مرحوم سے قریبی تعلق تھا اور اُنکی بیش بہا صحبت کی عزت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا تھا وہ اُن کی وسیع و محققانہ معلومات علمی سے متحیر ہوجاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم کا ایک بحر ذخار ہے جو اُنکے دماغ مین موجزن ہے، یا ایک معدن و مخزن ہے جو بے بہا خزائن علمی سے مالامال ہے مہینون اور برسون کی صحبت سے بھی دل سیر نہ ہوتا تھا اور مشاغل علمی سے دل نہ تھکتا تھا۔

مرحوم کی اس غیر معمولی علمی ترقی کا راز تین باتون مین تھا۔ یعنی

اوّل اُنکی خداداد اعلیٰ ذہانت و قوت حافظہ

دوم علوم وفنون کی تحصیل کا بے حد شوق اور مشاغل علمی مین لگاتار معروف رہنا۔

سوم خوش نصیب و فارغ البال زندگی جسکے حاصل کرنے کے بیبہا مواقع مرحوم کو حیدرآباد دکن مین ملے۔

علمی دنیا مین ممتاز بننے اور شہرۂ آفاق ہونے کے لیے تینون مذکورہ بالا باتون کا نہایت قریبی پیوند ہے۔ یہ اکثر کہا گیا ہے کہ کسی مین خداداد ذہانت کے ذرّے مخفی ہین تو اُسکو تحصیل علم کا شوق نہین۔ یا اگر تحصیل علم کا عشق ہے تو دماغی قوا مین اُسی تناسب سے قوت کی کمی ہے۔

اور اگر اتفاقاً اعلیٰ ذہانت و تحصیل علم کا شوق دو تو ان بالقوہ و بالفعل موجود ہین تو پھر زندگی کی دشواریان اتنی مہلت نہین دیتی کہ اس شوق کو پورا کیا جاسے۔ بیشمار خداداد دیسی فطری قوتین عمدہ و موزون موقعون کی کمی اور مربیانہ آبیاری نہ ہونے سے یون ہی نیم شگفتہ ہوسے رہجاتی ہین۔

حیدرآباد دکن علم دوستی و ہنر پروری مین ہمیشہ ممتاز رہا ہے اور ہندوستان کے اس سخت و نازک و کشمکش کے زمانہ مین جبکہ ہر قسم کی دیسی لیاقتون، قوتون اور صنعتون کی کس مپرسی ہے اور انکو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کے موقع حاصل نہین۔ یہ ریاست مغتنمات سے ہے۔ اب ہونہار و باکمال ہندی یوسفون کے لئے حیدرآباد ہی ایک مقر باقی رہ گیا ہے جہان پہونچکر کچھ عزت افزائی ہو جاتی ہے اور اس قدردانی سے ہونہار اور اہل کمال کو اپنے جوہر قابلیت دکھانے کا موقع ملتا ہے اور کسی علم دوست کا یہ مقولہ پورا ہو جاتا ہے

اگر بدبخت باشد من چہ دانم ۔ ولے یکبار بر دولت رسانم

مہدی علیخان مرحوم ایسے مدبر و سید حسن صاحب بلگرامی ایسے لائق و شتاق حسین ایسے متدین اور نواب محسن الملک و نواب عماد الملک و نواب وقار الملک کو ایسے اعلیٰ مدارج پر پہونچنے کے موقعے حیدرآباد ہی مین ملے۔ مولوی چراغ علی مرحوم کے سے لائق۔ راے حکم چند ایسے مقنن۔ علامہ شبلی کے سے فاضل و فلسفی مصنف۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ایسے ادیب۔ داغ مرحوم ایسے شاعر بے بدل دہوی عزیز مرزا ایسے منتظم و علم دوست اشخاص کو اپنی قدر و قیمت کا کچھ صلہ حیدرآباد ہی مین حاصل ہوا۔ اور سید علی صاحب بلگرامی مرحوم بھی آخر دم تک حیدرآباد ہی کے رہین منت رہے۔ یہ دہین کی فارغ البالی کی بدولت تھا کہ آپ کی عالمانہ پیاس کی سیرابی کیلئے بیش بہا کتب کا ایک نایاب ذخیرہ برابر مہیا ہوتا رہا چنانچہ اسوقت جو جائداد اور میراث آپ نے چھوڑی ہے وہ ایک نہایت نایاب لائبریری ہے اور مرحوم اسکو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ مرحوم نے اپنی خداداد لیاقت و حیدرآباد کے بے بہا مواقع سے متمتع ہونے و عالمگیر شہرت حاصل کرنے کا پورا فائدہ اٹھایا اور باوجود حیدرآباد کی امیرانہ و سازشانہ زندگی مین شب و روز گھرے رہنے کے بھی آپ کی زندگی ہمیشہ طالبعلمانہ رنگ لئے رہی۔ چنانچہ آپ اپنی مشہور تصنیف کتاب تمدن عرب کے دیباچے مین لکھتے ہین کہ:—

"جو اشخاص دیسی ریاستون کی ملازمت کی مشکلات سے واقف ہین اور جنھون نے اُن بدنصیب انقلابات کو دیکھا ہے جو ان ریاستون مین ہر روز ہوا کرتے ہین وہ خیال فرما سکتے ہین کہ کسی عہدہ دار کے لئے جو علاوہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ہر وقت دربار داریون اور سازشون کی مصیبتون مین مبتلا ہو ایسی بڑی تصنیف کا ارادہ کرنا اور پھر اسکو ایک سال کے اندر ختم کرنا کسقدر دشوار امر ہے"

مرحوم کی ۶۰ سالہ زندگی پر نظر ڈالنے سے بہت سے بیش بہا سبق حاصل کئے جا سکتے ہین۔ آپ کی زندگی تین حصہ پر منقسم کیجا سکتی ہے۔ اول ابتدائی عمر و طالبعلمی۔ دوم حیدرآبادی زندگی۔ سوم حیدرآباد سے وظیفہ لینے اور زندگی کے آخری ۱۰ سال۔ مرحوم کا مرز بوم صوبہ اودھ کا وہ مشہور و مردم خیز قصبہ ہے جو بلگرام کے نام سے مشہور ہے۔ آپ وہان کے سادات عظام مین سے تھے۔ چونکہ آپ کے والد ماجد خان بہادر سید زین الدین بنگال پراونشل سروس

مین تھے اسلئے مرحوم ۱۸۵۱ء مین بمقام پٹنہ پیدا ہوئے اور
آپ اپنے پانچ بھائی اور ایک بہن مین سب سے چھوٹے
تھے۔ سید حسن صاحب بلگرامی المعروف بہ نواب عماد الملک
آپ کے برادر اکبر ہین جو علاوہ اپنی اعلیٰ لیاقت اور تاریخ دکن
کے مصنف ہونے کے محض اپنی قابلیت اور اعلیٰ درجہ کے
صائب الرائے ہونے کے انڈیا کونسل کی ہندوستانی ممبری
پر سرفراز ہوئے۔ آپ کے دوسرے بھائی میجر حسن ہیں جو
انگلستان کی اعلیٰ سوسائٹی مین نہایت بارسوخ ہین۔ آپ
کے ایک بھائی بنام سید محمد صاحب حیدرآباد کے ایک
بڑے ضلع کے سینیر کلکٹرون مین سے ہین اور آپ کی ایک
ہمشیرہ مسز شجاعت علیصاحب فخر خاتونان اسلام ہین
اور اعلیٰ درجہ کی انگریزی و فارسی لیاقت رکھتی ہین۔ اور
آپ کے کل خاندان پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ۔

این خانہ تمام آفتاب است

سید علی صاحب بلگرامی مرحوم نے اپنی ابتدائی
تعلیم اپنے عم بزرگوار خان بہادر سید اعظم الدین سی۔ آئی۔ ای
کے گھر مین حاصل کی۔ لیکن یہ تعلیم وہی پرانی مکتبی طریقے کی
تھی جسکو آجکل "اولڈ اسکول" کہا جاتا ہے۔ مرحوم کی عربی
و فارسی تعلیم کی یہین بنیاد پڑی۔ پرانے مکتبی طریقہ تعلیم کی
خواہ کتنی ہی ملامت کیجائے مگر اسمین شک نہین کہ اسمین
ذہنی و اخلاقی تربیت کی کچھ خوبیان ضرور تھین۔ کون نہین
جانتا کہ سر سید علیہ الرحمۃ، نواب محسن الملک، وقار الملک،
علامہ شبلی و حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، ذکاء اللہ مرحوم وغیرہ وغیرہ
ایسے عالم فاضل مدبر و معظم اشخاص سب اسی پرانے اسکول کے طالبعلم تھے
اور انکی ابتدائی تعلیم کی بنیاد قدیم مکتبون مین پڑی تھی۔ یہ لوگ
کیرکٹر یعنی عملی قوت کے لحاظ سے جدید اسکول کے فارغ التحصیل
حضرات کے مقابلہ مین جو تفوق رکھتے ہین وہ ارباب بصیرت پر مخفی نہین ہے۔

بلگرامی مرحوم نے اپنی مادری زبان اُردو اور عربی و
فارسی مین پختگی حاصل کر لینے کے بعد پندرھوین سال مین انگریزی
زبان کی تحصیل کی طرف توجہ کی۔ چونکہ بچپن ہی سے خداداد
طور پر طباع اور ذہین تھے اور اسپر قوت حافظہ مستزاد تھی اور
عربی فارسی کی تعلیم سے انکی دماغی تربیت خوب منجھ چکی تھی
اسلئے اُنھون نے انگریزی اسکول مین بھی اس سرعت سے
ترقی کی کہ داخلہ سے صرف آٹھ سال مین پٹنہ کالج کی طرف
سے بی۔ اے۔ مین شریک ہوئے اور اول درجے کے
دُہرے اعزاز یعنی "ڈبل آنرز" کے ساتھ اس امتحان مین کامیابی
حاصل کرلی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس
امتحان مین مرحوم کی سکنڈ لینگوج یعنے دوسری زبان سنسکرت
تھی! اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد آپ میکانکل سائنس
یعنے علم آلات و انجینیری سیکھنے کی غرض سے رُڑکی کالج مین
داخل ہوئے۔ سر سالار جنگ اوّل کو جو اس زمانہ مین حیدرآباد
کے بہترین وزیر اعظم تھے اور جنکا نام ہندوستان کی تاریخ
مین بڑے بڑے مدبرون کی فہرست مین ہے، مرحوم کی عجیب
و غریب ذہانت کی خبر لگی اور اُنھون نے فی الفور بلگرامی صاحب
کو حیدرآباد طلب کر کے اپنے ذاتی اسٹاف مین رکھ لیا اور
جب سر سالار جنگ ممدوح انگلستان تشریف لے گئے تو بلگرامی
صاحب مرحوم کو بھی اپنے ساتھ لیا اور وہان پہونچکر اُن کو
انگلستان کے معدنیات کے شاہی مدرسہ مین داخل کرادیا
یہان آپ کو پروفیسر ہکسلے اور پروفیسر ٹنڈل جیسے مشاہیر علمائے
سائنس و الفنون کی شاگردی کی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ جہدید

آپ ہمیشہ بجا طور سے فخر کیا کرتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے مین آپ نے معدنیات کا امتحان بھی اعزازون کے ساتھ پاس کیا۔ اسکے علاوہ جیالوجی یعنے ارضیات کے مضمون مین بھی ایک اعلی درجہ کا تمغہ حاصل کیا۔ اسی زمانہ مین آپ نے جرمنی، فرانسیسی لاطینی اور یونانی زبانین سیکھنی شروع کین اور بہت جلد ان مین مہارت پیدا کرلی۔ امتحانات سے فارغ ہوکر براعظم یورپ کا سفر کیا اور اطالی زبان خود اٹلی مین قیام کرکے سیکھی۔

یورپ سے حیدرآباد واپس پہونچنے کے بعد آپ انسپکٹر جنرل معدنیات اور پھر ہوم سکریٹری اور ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم اور آخر کار معتمد تعمیرات عامہ اور ڈائرکٹر ریلوے ومعدنیات کے معزز عہدون پر فائز رہے۔ آپکے ماتحت صدہا یوروپین و یوریشین محکمہ تعمیرات و ریلوے و معدنیات مین تھے جن پر حکومت کرنا اور انکو قابو مین رکھنا آسان امر نہ تھا لیکن مرحوم کا سکہ و رعب ان پر جم گیا تھا اور سب آپکی عزت و تعریف کرتے تھے۔ نظام ریلوے کی خوش انتظامی کے صلہ مین آپ کو ریلوے بورڈ انگلستان کی طرف سے ایک گولڈ میڈل عطا کیا گیا جسکی بدولت آپ تا زیست نظام ریلوے اور جی۔ آئی۔ پی۔ ریلوے مین فرسٹ کلاس مین مع دو نوکرون کے بلا کرایہ سفر کرنے کے مجاز تھے۔ یہ اعزاز سوائے انکے کسی دوسرے ہندوستانی کو اب تک نصیب نہین ہوا۔ حیدرآباد سے آپکو سنہ ۱۹۰۱ء مین وظیفہ دیدیا گیا اور آپ انگلستان جاکر دارالعلوم کیمبرج مین مرہٹی کی پروفیسری کی کرسی پر زینت افروز ہوئے۔ حیدرآباد کی بیس سالہ مصروف زندگی مین بھی جبکہ مختلف فرائض منصبی کا بار آپ کے کندھون پر تھا اور انقلابات کے خوف اور سازشون کی مصیبتون مین آپ گھرے ہوئے تھے۔ آپ نے مشاغل علمی کو زور شور سے جاری رکھا۔ سنہ ۱۸۹۲ء مین آپ نے کلکتہ یونیورسٹی کا امتحان بی۔ ایل۔ صرف چار ماہ کی حیرت انگیز کوشش سے پاس کرلیا اور کل امیدوارون مین اول آئے اور گولڈ میڈل یعنی طلائی تمغہ حاصل کیا۔ باوجود حیدرآباد کی نہایت مصروف زندگی کے آپ مطالعہ کے بلاناغہ شائق رہے اور بالتخصیص علوم سنسکرت اور ویدون کے مطالعہ و تحقیق مین محو رہے۔ ان علوم مین آپ کے عبور کا یہ حال تھا کہ مدراس یونیورسٹی کے سنسکرت کے امتحان۔ ایم۔ اے۔ کے آپ ممتحن مقرر ہوا کرتے تھے اور سنسکرت مین آپ نظم لکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف و ترجمے کا کام بھی جاری تھا چنانچہ حیدرآباد ہی کی ملازمت کے دوران مین آپ سے چند قابل قدر تصانیف و ترجمے بھی کئے۔ "ہینڈبک جورس پروڈنس" اور بینظیر کتاب تمدن عرب آپ نے ہی تصنیف و ترجمہ کین۔ "کلیلہ و دمنہ" اور فارسی و سنسکرت کی جداگانہ خوبیون پر بھی آپ کی ایک تصنیف ہے۔ ایک زمانہ مین ایک عربی اخبار بھی آپ نکالا کرتے تھے اور مختلف مشہور رسالون مین وقتاً فوقتاً آپ کے قابل قدر مضامین بھی چھپتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ حیدرآباد مین جو کچھ علمی چرچے و علمی سرپرستیان ہوتی تھین اسکی باعث آپ ہی کی ذات بابرکات تھی۔ دائرۃ المعارف و محکمہ علوم و فنون و کتب خانہ آصفیہ آپ ہی کی سرپرستی مین تھے۔ آپ جب تک حیدرآباد مین رہے اہل علم قلم کی سرپرستی وہ آپ اپنے فرضیات مین سے سمجھتے تھے علم دوستی کی یہ حالت تھی کہ بڑے بڑے نوابان و روسا و انگریز صاحبان آپ کی ملاقات مین منتظر بیٹھے رہتے تھے مگر غریب پھٹے کپڑے پہنے طالب علم کی رسائی آپ تک فی الفور ہوجایا

کرتی تھی اور آپ حسب حیثیت اپنی ذات و سفارش و ریاست سے اہل علم کی مدد کیا اور کرایا کرتے تھے۔ اپنی آمدنی کا ایک بیش بہا حصہ آپ کتب کے خریدنے مین صرف کر دیا کرتے تھے۔ دنیا مین کہین کوئی عمدہ کتاب چھپی اور چند ہی ہفتون مین وہ آپ کی نایاب لائبریری مین آجاتی تھی۔ کتابون کی نسبت آپ کی معلومات اور وسعت نظر حیرت انگیز تھی۔ یورپ کی مشہور لائبریریون کی چیدہ چیدہ کتب کا آپ کو علم تھا اور ہندوستان کے مشہور کتب خانون کی بھی آپ نے سیر کی تھی۔ چنانچہ سالگذشتہ مین آپ رام پور کا مشہور کتب خانہ دیکھنے کیلئے ریاست رام پور تشریف لے گئے اور علم دوست نواب صاحب نے آپ کی بڑی مہمان نوازی کی۔

سنہ [illegible]ء مین بلگرامی مرحوم بھی حیدر آباد کے پولیٹکل ہی کی انقلابات کا شکار ہو گئے مگر انھین بھی ریاست نے اپنی مشہور فیاضی سے معقول وظیفہ عطا فرمایا اور مرحوم انگلستان تشریف لے گئے۔ آپ کی اعلی ذہانت۔ علمی امتیازات کی شہرت انگلستان کے علمی حلقون مین پہلے ہی سے پہونچ چکی تھی۔ چنانچہ کیمبرج یونیورسٹی نے آپ کو مرہٹی زبان کی پروفیسرشپ کی کرسی عطا فرمائی۔ یہ کرسی آپ کو کئی دیگر باعلم و بارسوخ انگریز صاحبان کے مقابلہ مین بازی جیت لینے کے بعد ملی۔ رفتہ رفتہ آپ سنسکرت و عربی زبانون کی تعلیم بھی دینے لگے۔ آپ غالباً پہلے ہندوستانی تھے جنکو برطانیہ کی سب سے معزز یونیورسٹی مین یہ اعزاز حاصل ہوا۔ آپ کے حیرت انگیز تبحر علمی کے لحاظ سے کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور کرائسٹ چرچ کالج نے ایم۔ اے کی اعزازی ڈگری عطا فرمائی اور یونیورسٹی نے آپ کو بورڈ آف اورینٹل سٹڈیز کا ممبر اور اورینٹل لنگوجز ٹرائپاس کے ممتحنی پر سرفراز کر دیا۔

یہ وہ اعزاز ہین جن پر لائق سے لائق انگریز فخر کر سکتا ہے اور شاید مرحوم سے پہلے کسی ایشیائی شخص کو یہ اعزاز علمی حاصل نہین ہوا۔ اسکے علاوہ آپ نے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی کونسل پر بھی کام کیا اور اس ڈیپوٹیشن کے ممبر مقرر ہوئے جو دسمبر سنہ [illegible]ء مین مشرقی زبانون کی تعلیم کی ضرورت جتانے کیلئے وزیر اعظم برطانیہ کی خدمت مین حاضر ہوا تھا اور جسکی استدعا کا نتیجہ تھوڑے عرصہ قبل لندن یونیورسٹی کے ساتھ مشرقی زبانون کی تعلیم کا ایک اسکول قائم ہونے کی صورت مین نکلا ہے۔ کیمبرج کے زمانۂ قیام مین مرحوم نے بارسٹری کا امتحان پاس کر کے اسکی سند بھی حاصل کر لی۔ کیمبرج مین آپ ہندوستانی طلباء کے لئے ایک مایۂ فخر و ناز تھے اور آپ کا مکان غریب سے غریب ہندوستانی طالبعلم کے لئے وقف تھا۔ مختلف طریقون سے آپ اپنے ہموطن طالب علمون کی پردیس مین مدد و ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ کئی ایک غریبون کو مالی مدد دے آپ نے بارسٹر بنوا دیا جسکی بدولت آج وہ لوگ نہایت عزت و فارغ البالی کے ساتھ ہندوستان مین جا بجا روزی کما رہے ہین۔ انگلستان مین لذیذ مشرقی کھانے ہندی طالبعلمون کو آپ ہی کی بدولت میسر ہوتے تھے۔ وقتاً فوقتاً آپ مشاہیر اسلام کے حالات معزز علمی مجلسون مین پڑھا کرتے تھے۔ سنہ [illegible]ء مین آپ اختلاج قلب کے مرض مین مبتلا ہو گئے اور ڈاکٹرون کی راے سے ہندوستان واپس آئے۔ آپ کی شاندار کامیابیون کے صلہ مین کلکتہ یونیورسٹی سنٹ نے یونیورسٹی مذکور کی جوبلی کے موقع پر جب وہان کے بڑے نامور گریجویٹون کی عزت افزائی عمل مین آئی تو مرحوم کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سنہ [illegible]ء مین دی گئی۔ مرحوم کا یہ آخری علمی اعزاز تھا۔ آپ

بہت چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں رہکر بقیہ زندگی بسر کریں
لیکن حیدرآباد کی سازشوں کی بدولت گذشتہ سال کے اپریل
میں راقم سطور کی سفارش پر دہرہ دون تشریف لے آئے
تاکہ کتاب تمدن ہند کے ترجمہ کی تکمیل کریں چنانچہ وہ مکمل
ہوگیا اور اب زیر طبع ہے۔ اوائل سرما میں آپ مع اپنی بیگم
صاحبہ و بچوں کے اپنے وطن مالوف بلگرام تشریف لائے
اور ہردوئی میں ایک بنگلہ خرید لیا۔ ارادہ تھا کہ بقیہ زندگی وہیں
کے قریب ہی اور ملک و قوم کی خدمت میں صرف ہو۔ چنانچہ
تقریباً دو سال سے "آپ علیگڈھ موومنٹ" میں بہت کچھ
دلچسپی لینے لگے تھے۔ گذشتہ جنوری میں آپ "آغا خانی
جشن" کے ساتھ الٰہ آباد میں شریک تھے اور آخر مارچ میں
پنجاب ڈپوٹیشن کے ساتھ بسر کردگی راجہ سر محمد علی محمد خان صاحب
ادہر بھی تشریف لائے تھے۔ علیگڈھ یونیورسٹی کا کانسٹیٹیوشن
مرتب کرنے کا اہم ترین کام آپ کے سپرد ہوا تھا۔ آپ
اسکے سکرٹری تھے اور اسمیں ہمہ تن مصروف تھے۔ اس شوق
و مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ ۱۲۔ اپریل کو آپنے نواب وقار الملک
کو لکھا کہ کل میں نے مسلسل ۹ گھنٹہ کام کیا اور پھر شام کو ۳ گھنٹے
ایسٹر کی تعطیلوں میں اسکا مسودہ آپ نے بمقام علیگڈھ سب
کمیٹی کے سامنے پیش کیا تھا اور ۳ مئی کی صبح کو آپ پھر لکھنؤ
چلنے اور راجہ صاحب ممدوح سے یونیورسٹی کا نسٹیٹیوشن کے
متعلق مشورہ کرنے کے لئے گھر سے روانہ ہوئے تھے
کہ پیام اجل آپہونچا۔ ۲۰ منٹ کے اندر ہی اندر روح نے اس
خاکی جسم سے مفارقت کی۔ آپ کی بیگم صاحبہ جنہیں آپ بہت
عزیز رکھتے تھے کئی مہینے کے بعد حیدرآباد سے اسی روز صبح
تشریف لائی تھیں اور یہ آخری صحبت صرف ۱۴ گھنٹہ کی تھی۔

حسب وصیت آپ بلگرام کے امام باڑہ میں دفن ہوئے۔ افسوس
آپکی رحلت سے نہ صرف قوم اور ملک کو ایک نقصان عظیم پہونچا
بلکہ ایک ایسا فرد دنیا سے اٹھ گیا جسکے مانند مادر گیتی روز روز
پیدا نہیں کرتی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ نے ۶۰ سالہ زندگی میں علمی اعزاز حاصل کئے
وہ حسب ذیل ہیں۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی بی۔ اے
(کلکتہ) ایم۔ اے۔ (کیمبرج) بی۔ ایل (کلکتہ) گولڈ میڈلسٹ
بار ایٹ لا۔ ڈاکٹر آف لٹریچر۔ ایف۔ جی۔ ایس۔ ایسوسیئیٹ
رائل اسکول آف مائنس لندن۔ ممبر آف دی رائل ایشیاٹک
سوسیٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ۔ ممبر آف دی نارتھ آف
انگلینڈ انسٹی ٹیوشن آف مائننگ انجینئرس۔ ممبر ایشیاٹک سوسائٹی
بنگال و بمبئی۔ ممتحن سنسکرت مدراس یونیورسٹی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ماسوائے ان علمی اعزاز کے آپ قریباً چودہ یورپ و
ایشیا کی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ فلسفہ علم الانسان کے
ایک زبردست ماہر تھے لیکن عملی طور پر آپ لاابالی تھے۔ نہایت خلیق
و متواضع و فیاض تھے۔ حیدرآباد میں صرف دو شخص ایسے
گذرے ہیں جنہوں نے اپنے اوج و اقبال کے زمانہ میں
صد ہا بندگان خدا کو روزی سے لگا دیا اور ہزاری ماہوار تک
پہونچا دیا۔ اول نواب محسن الملک مرحوم تھے اور دوسرے
بلگرامی مرحوم۔

مذہباً آپ اثنا عشری شیعہ تھے مگر حضرت عمر کے انصاف
و علمی اوصاف کے ہمیشہ مداح تھے۔ آپ کا مذاق عالمانہ تھا
اور آپ کے خیالات بیشتر فلسفیانہ تھے۔ اصلاح رسوم و تمدن
مسلمانان ہند کے نہ صرف آپ حامی تھے بلکہ عملی طور پر آپ
اسکے کوشاں تھے۔ ہندی پردہ یا صحبت دوام کے آپ سخت

مخالف تھے اور تعلیم نسوان کے بڑے زبردست حامی۔ چنانچہ آپ کی صاحبزادی مس لولو رقیہ بلگرامی ہندوستان مین اسوقت بلحاظ انگریزی تلفظ، عربی قرأت، فرنچ دانی، فنون لطیفہ و باریک خیالی مین اپنے یکتا باپ کی اکلوتی بیٹی ہین۔

ایک عجیب خصوصیت جو مرحوم مین حیدرآبادی زندگی کے باعث پیدا ہوگئی تھی وہ یہ ہے کہ باوجود عالمانہ مذاق و طالبعلمانہ زندگی کے آپ مین اعلیٰ درجہ کا اسٹیٹ کرافٹ یعنی ملک و دربارداری و جوڑتوڑ کا ملکہ بھی پیدا ہوگیا تھا اور مشرقی ریاستون کے راز بازسے آپ خوب ماہر تھے اور مشرقی و اسلامی ممالک کی ساری تباہ حالی ذلت و خواری کا ذمہ دار آپ بادشاہان و امرار مشرق کو قرار دیتے تھے۔ چنانچہ راقم سطور جن ایام مین ایران و استنبول و مصر کی سیاحت کر رہا تھا تو آپ نے مجھے یہ تحریر فرمایا تھا کہ:-

"میرا خیال ہے کہ اس سفر کے بعد آپ بھی اسلام اور مسلمانون کے حالت سے اس درجہ پر امید ہونگے جیسے پہلے تھے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک ہمارے بادشاہ اور امرا نہ جاگین گے تب تک کوئی امید نہین ہوسکتی اور انکی یہ حالت کہ خود تو وہ کسیقدر غافل تھے ہی لیکن یورپ کی قومون نے اپنی خود غرضی سے انکو جام پر جام مسکرات اور منویات کا دیکر سلا رکھا ہے اور جاگنے ہی نہین دیتے۔"

گو مرحوم کو اسلامی اقوام کے پھر ابھرنے سے بعض اوقات بہت کچھ مایوسی سی معلوم ہوتی تھی لیکن جب کبھی انکی ترقی کا کسی گوشہ سے کوئی حال سنتے تھے تو ایک جوش مسرت انکے چہرے سے مترشح ہوتا تھا۔ راقم سطور کو گذشتہ ۱۰ سال سے نہایت قریبی تعلق مرحوم سے رہا۔ مہینون ایک جا بسر ہوتے اور صدہا پرائیویٹ خطوط راقم سطور کے پاس اسوقت مرحوم کے موجو[د] ہین جنسے انکے مذہبی و ملکی و عالمانہ خیالات پر روشنی پڑتی ہ[ے] راقم سطور کا ارادہ ہے کہ انکو وقتاً فوقتاً شائع کرے کہ اس جلیل الق[در] شخص کا اندازہ پبلک کسیقدر کر سکے۔ مرحوم کو اپنے عالمانہ مذاق و عدیم الفرصتی کے باعث طبقہ عوام سے میل جول کا بہت کم مو[قع] ملا۔ انکے آخری ایام کے خطوط سے اپنے ذاتی معاملات سے کسیقدر مایوسی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً مرحوم کے سب سے آخری خط جو انھون نے اپنی موت سے ایک ہفتہ قبل ۲۲۔ اپریل کو مجھے لکھا ایک جملہ یہ ہے:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجابت کو دعا سے بیر ہوگیا ہے"

مرحوم علیگڈھ یونیورسٹی کو نہایت مفید خیال کرتے تھے اور انکو یہ آرزو تھی کہ وہ اس یونیورسٹی کو دیکھین۔ یہانتک خیال تھا کہ خود جاکر علیگڈھ کو ہند کا کیمبرج بنائین اور ہند کے مسلمانون پر جو ایک نیا دور جدید شروع ہوا ہے اُسکے کچھ آثار دیکھ لین۔ لیکن جسطرح حضرت موسیٰ کو زمین موعود کے اندر داخل ہونیکا موقع نہ ملا اور انھون نے دور سے ایک پہاڑ پر سے اُفق مین زمین موعود کی زیارت کی اسیطرح بلگرامی مرحوم بھی یہ داغ حسرت دل مین لے گئے۔

کسی آیندہ نمبر مین بشرط فرصت ہم بلگرامی مرحوم کی زندگی سے جو خاص سبق حاصل کئے جا سکتے ہین اسکا بیان کرینگے اور انکے خیالات پبلک کے سامنے پیش کرینگے۔ یہان صرف اسقدر عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہون کہ پبلک انکی آخری تصنیف تمدن ہند کو ضرور پڑھے۔ یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے جو زیر طبع ہے اور راقم سطور نے سال گذشتہ قریباً پانچ ماہ حیدرآباد دکن مین انکے ساتھ رہکر اس کتاب کی تکمیل مین انکی مدد کی تھی۔

ایم۔ جان

نومبر ۱۹۱۰ء



جلد ۲ نمبر ۵

تذکرہ شعر و سخن

اسوقت کی اُردو شاعری کا حال قابل افسوس ہے۔ بیسیوں گلدستے نکلتے ہیں۔ اکثر رسالوں اور اخباروں میں طرح طرح کی نظمیں چھپتی ہیں مگر جسکا نام شاعری ہے اُسکا کہیں پتہ نہیں۔ اگر آجکل کے مشاعروں میں جایئے تو اکثر اصحاب نظر آئینگے جنکو بیجا ے خود دعوائے اُستادی ہے۔ لیکن گو میرے واسطے یہ کہنا چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے مگر اسوقت کوئی اُستاد شاعر نظر نہیں آتا۔ لکھنؤ میں البتہ ایک دو اصحاب ہیں جو مرثیہ گوئی میں بہت لائق ہیں اور اگر اُردو شاعری بالفعل کچھ ہے تو وہ مرثیوں ہی میں ہے۔ گو اس میدان میں بھی بالخصوص انیس اور دبیر ہی گوے سبقت لے گئے مگر پھر بھی میر نفیس مرحوم حضرت رشید۔ مرزا اوج پر اہل لکھنؤ کا ناز بیجا ہے۔ مگر یہ حضرات بھی مقلد ہیں کسی طرز شاعری کے موجد نہیں۔ اب اگر غزل کو دیکھئے تو یہاں کوسوں چٹ پر میدان پڑا ہوا ہے۔ خصوصاً داغ اور امیر جب سے چل بسے اُسوقت سے تو بالکل ہو کا عالم ہے۔ برسوں میں کہیں کوئی اچھا شعر دیکھنے یا سُننے میں آتا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک مشاعرہ شیش محل لکھنؤ میں ہوا جسمیں یہ طرح تھی۔

"چمن میں اپنا بستر ہم بہ شمشاد کرتے ہیں"

اور لکھنؤ کے بعض بعض مشہور شاعر تشریف رکھتے تھے جنھوں نے غزلیں بھی کہی تھیں۔ اس مشاعرہ کا گلدستہ چھپا ہے جو بہت دلچسپ ہے۔ اسمیں بعض بعض غزلیں بہت اچھی ہیں اور چونکہ اس طرح میں آتش اور اسیر ایسے مشہور اُستادوں کی غزلیں تھیں لہذا اس مشاعرہ میں لوگوں نے بہت فکر سے غزلیں کہیں۔ لیکن جو فرق ماضی و حال میں ہے وہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا۔

آتش

خدا بخشے صنم کہکے مجھکو یاد کرتے ہیں — دعائے مغفرت میرے لئے جلاد کرتے ہیں
خدا جانے یہ آتش کر گئی قتل کس کس کو — طلب جرأت سے شاہد [illegible] کو یاد کرتے ہیں

امیر

عنایت بعد مرگ آئی تو یہ جلاّد کرتے ہین   کسی کو ذبح کرتے ہین تو مجھکو یاد کرتے ہین

جو حال کا رنگ ہے وہ اہل سخن کو گلدستہ مذکور دیکھنے سے ظاہر ہوگا۔ یہ اُن حضرات والامنش پر کوئی خاص اعتراض نہین ہے جنکی غزلین اس گلدستے مین ہین۔ بلکہ جبکہ اُردو شاعری مین پُرانے اُستادون کی تقلید ہوگی اور فرسودہ زمینون مین فکر کیجائیگی تو کامل سا کامل شخص بھی کیا کرسکتا ہے۔

زمانۂ شاہی کو گذرے ہوئے اب پچاس برس ہوئے۔ اس عرصے مین بہت سی ایسی نئی نئی باتین ایجاد ہوئین جنکا اثر اُردو زبان اور لٹریچر پر پڑنا لازم تھا اور پڑا۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ گو اُردو نثر نے ترقی کی مگر شاعری پر زوال آگیا۔ اس مضمون مین کسی خاص مسئلہ پر بحث کرنیکی غرض نہین ہے۔ اس سبب سے جو نظم و نثر اُردو مین تغیر ہوا ہے اُنکے اسباب کے نسبت کچھ نہین لکھا جاتا ہے گو یہ امر شاید سب پر ظاہر ہوگا کہ وہ نئے خیالات اور نئی بندشین نثر لکھنے والون نے جلدی اور کثرت سے اختیار کرلین جنسے شاعرون کو اسوقت تک گریز ہے۔ تھوڑے عرصے سے البتہ بعض انگریزی تعلیم یافتہ اور بعض ایسے جنپر کچھ انگریزی کا اثر پڑ چلا ہے شاعری مین نئی باتون کی طرف رجوع ہوئے ہین اور نئے ڈھنگ کی نظمین کبھی کبھی بہت ہی دلچسپ شائع ہوتی ہین۔ مولانا حالی جو خود انگریزی دان نہین ہین مگر جنپر علیگڈھ کی عمدہ سوسائٹی کا اثر پڑا ہے اُنھون نے البتہ طرز جدید اختیار کرنیکی کوشش کی ہے۔ اپنے کلیات مین اُنھون نے جو مقدمہ لکھا ہے اور جسمین شاعری پر بحث کی ہے وہ بہت خوب ہے اور اُردو والون کو عموماً اور اُردو شاعرون کو خصوصاً اُسکو بغور پڑھنا چاہئے۔ یہ فرض نہین ہے کہ مولانا حالی کی سب باتون سے اتفاق کرلیا جائے مگر اُنھون نے اُردو والون کو اک نئی راہ ضرور دکھائی ہے اور زبان اُردو پر انکا بہت احسان ہے۔ البتہ چونکہ اُنکی طبیعت درحقیقت شاعرانہ واقع [illegible] ہوئی ہے اس لحاظ سے اُنکا جتنا کلام طرز جدید مین ہے وہ [illegible] پھیکا ہے۔ اُنکا مسدس بہت مشہور ہے اور مسلمانون پر اُسکا [illegible] عمدہ اثر ہوا لیکن وہ کچھ منظوم ہے شاعری نہین ہے۔

اگر گذشتہ پچاس برس کی تاریخ اُردو شاعری کی لکھی [illegible] تو خالی از دلچسپی نہو گی۔ اور ایسی کتاب کی سخت ضرورت ہے [illegible] آزاد کی آبحیات زبان اُردو مین اک بے مثل کتاب ہے [illegible] عبارت وہ غالب کی نثر سے ٹکر کھاتی ہے اور جن اصلی [illegible] سے اُردو شاعری کی تنقید کی ہے وہ اُردو والون کے واسطے بالکل نئی ہے۔ مگر اُنکی کتاب ذوق اور غالب اور آتش [illegible] دور تک پہونچی ہے۔ انیس[1] اور دبیر، رند و صبا اور نسیم [illegible] وغیرہ جو لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے اُنکی شاعری کا [illegible] ہے۔ ان شاعرون کے بعد داغ اور امیر بھی اپنے فن مین [illegible] اگر ایسی کوئی کتاب لکھی جائے جسمین ان شعرائے متذکرہ [illegible] اُنکی شاعری کی منصفانہ جانچ کیجائے تو غالباً اُردو [illegible] فائدہ ہوگا اور قدردانان سخن کی تفریح طبع بھی ہوگی [illegible] آتش کے بعد غزل مین امیر سا اُستاد کوئی نہین ہوا۔ [illegible] دیوان ہین تین مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ مجھے ان [illegible] دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور واقعی بہت سی غزلین [illegible] کی ہین تعجب ہے کہ اتنے بڑے لائق اُستاد کا کلام مقبول [illegible] ہوا۔ لکھنؤ مین بھی اُنکے شعر کم سُننے مین آتے ہین [illegible] ہے کہ یہ کلام کا نقص نہین ہے بلکہ مذاق عام کا [illegible] اُنکی مقبولیت کی سدّراہ ہوئی جو اُنکی بزرگی تھی [illegible] اُنھین بھی کوسون مزا نہین ہے مگر جو اُنکی [illegible]

[1] طبع ثانی مین انیس و دبیر پر بھی مختصر مضمون لکھے گئے ہین [illegible]

میں وہ اُردو شاعری کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ امیر نے گو کوئی بات اپنے متقدمین سے بڑھکر نہیں کی۔ لیکن جس پایہ پر اُردو شاعری تھی اُس سے گرنے بھی نہیں دیا۔ گو اُنکے کلام میں ناسخ کا رنگ زیادہ ہے یعنی بلاغت اور مضمون آفرینی۔ مگر پھر بھی مزے سے خالی نہیں۔ چند اشعار جو اُنکے اصلی رنگ میں ہیں وہ تمثیلاً ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ؎

تنگیِ غم دل کو آخر باعثِ راحت ہوئی — اسقدر سمٹی پریشانی کہ جمعیت ہوئی
ہمیں دیگا کیا بھلا ہم سے زبردستی کوئی — مفلسی بھی کیا کسی زردار کی دولت ہوئی
یہ سوے مرنے سے آیا زنداں میں کس کا لطف آہ — ہتھکڑی کو طوق کو زنجیر کو فرصت ہوئی
بھوک کا غم بھوک میں کھایا کئے ہم عمر بھر — جب ہوئی ہمکو تلاشِ رزق بے منت ہوئی

میں جو وحشت میں چلتا ہوں تو کٹتی ہے زمیں — ہر قدم پاؤں کے نیچے سے نکلتی ہے زمین
خوب معلوم ہوا وہ بھی کوئی ناگن ہے — اپنے ہی بچوں کو کمبخت نگلتی ہے زمین

کوسی سے پر اک مرغ چمن زاد ہوا — جو کھلا پھول چراغِ کفِ صیاد ہوا
رگ گردن جو لہو ریز ہے تھوڑا تھوڑا — تیغ قاتل ہوئی نشتر فصاد ہوا

صاف رنگ میں بھی خوب کہتے ہیں ملاحظہ فرمائے ؎

ملتے ختم شوق تمام دو چلا نامہ — پکارتا ہی رہا میں کہ نامہ بر لینا
ذرا سی بات میں ہوتے ہیں اپنے بیگانے — بڑا کمال ہے اپنا کسی کو کر لینا

بے ستون سے جو کوئی شیر کی بو آتی ہے — اب بھی خونِ سرِ فرہاد کی بو آتی ہے
اشک جب چاہتے ہیں سیر زمیں کرتے ہیں — آہ جب چاہتی ہے عرش کو ہو آتی ہے

آنسو زمیں کو آہ فلک کو رولتے ہے — الفت میں بھی نشیب و فراز زمانہ ہے

آہ ساقی میں نہیں گو کہ مروت باقی — خیر زندہ ہے اگر یار تو صحبت باقی

بعض بیلہ ہوا سے رشک مسیحا دیکھی — آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

خزاں تھی جب تنگ مشہور تھے پریزادے — بہار آتے ہی کیسے جاتے ہم بادہ خوار ہیں

امیر کے جو دو دیوان غیر مطبوعہ ہیں اُنمیں صفائی زیادہ ہے گو وہ اُنکا اصلی رنگ نہیں ہے مگر اُس زمانے کا کلام ہے جب رامپور میں مشاعروں کی گرماگرمی تھی اور داغ اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ ناسخ اور آتش کی طرح میں امیر کا پرانا مطلع مشہور ہے ؎

ازل سے سلسلہ ہے اس جنونِ فتنہ ساماں کا — شگافِ خانہ گن چاک ہے اپنے گریباں کا

جو آخر زمانے میں اسی زمین میں غزل کہی ہے اُسکا رنگ ذیل کے شعر سے ظاہر ہوگا۔ ؎

خداوندا فلک کو کیا یہی دو کام آتے ہیں — گھٹانا وصل کی شب کا بڑھانا روزِ ہجراں کا

اسی غیر مطبوعہ دیوان میں ایک غزل کیا خوب کہی ہے جسکے تین شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ؎

چمن تو اب دلِ الم کش کا گھر ہے غریب بلبل کو کیا خبر ہے — ہزار چھپتے کہیں ٹھکانے جہاں ہے بلبل کو کیا خبر ہے
سخن جو اپنا عزیز شاعر ہے اور انکی کب خبر ہے — مثل ہے مشہور اہل صنعت جگر جگر ہے دگر دگر ہے
عجب طرح کی ہے بدحواسی کہ در و دیوار جانتے ہیں — خدا کے گھر میں جو آکے بیٹھا ہے اُسکے دل میں خدا کا گھر ہے

جیسے شعر اوپر لکھے گئے ہیں ویسے امیر کے دیوان میں بہت ہیں مگر اُنکے ساتھ ہی بھرتی کا کلام بھی اتنا ہے کہ جسکا اثر اُنکی شہرت پر پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان تمام دیوانوں کا انتخاب چھاپا جائے تو وہ مقبولِ عام ہو اور میرے نزدیک اب مذاق شاعری میں داغ کا اثر کم ہو چلا ہے اور وہ رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے جو لوگوں کو امیر کے عمدہ کلام کی جانب متوجہ کرے۔

امیر ہی کے ہمعصر وزیر اور صبا اور تسلیم اور رند اور خلیل اور قلق بھی تھے۔ گو اُس پایہ کے نہ تھے مگر ایسے تھے کہ اس پچاس برس میں اگر اُنکا مقابلہ کسی سے ہو سکتا ہے تو صرف داغ اور امیر سے۔ وزیر میں اپنے اُستاد کا رنگ تھا مگر اُنسے مزہ زیادہ تھا اودھ کے بادشاہ تھے اور اُنکے کلام سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اودھ میں کہاں تک خوبی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ اُنکا شعر ہے ؎

ضعف سے جوشِ گریہ کہ گلا کٹ جائے — اب شمشیر نکل جائے آنچھو ہو کر

لیکن جو بناوٹ اپنے حد سے گذر جاتی ہے اُسکی مثال بھی

اسی زمین مین موجود ہے۔ ؎

جان پڑ جاتی ہے زیور مین پسینے سے ترے — کہین اڑ جائے نہ جگنی تری جگنو ہو کر

یہ شعر بھی وزیر نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

ترچھی نظرون سے دیکھو عاشق دلگیر کو — کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

مگر ملاحظہ فرمایئے کہ میر نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔ ؎

چاک پہلو کو کرو دیکھو دل دلگیر کو — یہی وہ جاہے جہان پھر کیا کھا گیا مین تیر کو

دو چار شعر وزیر کے بطور تفنن طبع ناظرین لکھے جاتے ہین۔ ؎

بواب نامہ کیا لایا تن بیجان مین جان آئی — گیا یان سے کبوتر وان سے زیا منع جان ہو کر

کیا فوج نکو حق اسنے سوئے ہم رشک کے مارے — اجل بھی وہ ستم آئی نصیب دشمنان ہو کر

آنکھین کھلی ہوئی ہین عجب خواب ناز ہے — فتنہ تو سو گیا ہے در فتنہ باز ہے

دو حو تسلیم کی مین نے اُدھر تعظیم کی اُسنے — جھکائی مین نے جب گردن تو اٹھایا وہ قاتل کا

آتش کے شاگردون مین رند و صبا نے غزلین خوب کہی ہین خلیل بھی انکے مشہور شاگرد تھے مگر یہ عجیب بات ہے کہ جو دیوان انکا چھپا ہے اُسمین بالکل عامیانہ کلام ہے۔ زبان البتہ صاف ہے اور کہین کہین شعر اچھے ہین مگر اس دیوان سے یہ بات سمجھ مین نہین آتی ہے کہ رند و صبا کے مقابلہ مین کسطرح انکو ترجیح دیجاتی ہوگی۔ رند کے کلام مین صفائی اور شوخی ہے جسمین داغ کی آمد کے آثار موجود ہین مگر پھر بھی آجکل کے مذاق کے دیکھتے ہوئے اُن مین بہت کمی ہے صیاد کی ردیف مین انکی غزل بہت مشہور ہے۔ ؎

کھلی ہے کنج قفس مین مری زبان صیاد — مین ماجرائے چمن کیا کرون بیان صیاد

گیا جہان مین گیا دام لیکے وان صیاد — پھرا تلاش مین میری کہان کہان صیاد

دکھایا کنج قفس مجھکو آب و دانہ نے — وگرنہ دام کہان مین کہان کہان صیاد

اوراس دیکھکے مجھکو چمن دکھاتا ہے — کئی برس مین ہوا ہے مزاجدان صیاد

مزا یہ ہے وہ سُن سُنکے کانپ اُٹھتا — غضب یہ ہے کہ کھلا نہین زبان صیاد

تمھارے ہجر اشفقت سے پر کھلے — یارب نہ یہ عجب مرے صیاد پر کھلے

دیکھا جو روئے یار تو صورت تھی حور کی — بند نقاب کیا کھلے جنت کے در کھلے

صبا کے کلام مین بھی انتہا درجے کی شوخی اور صفائی ہے مگر رند سے انکا رنگ الگ ہے۔ طرز رندانہ ہے اور جابجا رنگ تغزل اور ہر مقام پر انداز عیارانہ۔ اُردو کا کہین نام نہین ہے بلند پروازیان کم ہین مگر خوبی زبان کی وجہ سے سیدھے سیدھے شعرون مین بھی لطف ملتا ہے۔ مین نے سنا ہے کہ انکے دو ہی شغل زندگی تھے شعر کہنا اور گانا سننا اور انکے یہان شعر و سخن کی صحبتین اکثر گرم رہتی تھین۔ ذیل کے اشعار سے انکا رنگ کلام معلوم ہوگا۔ ؎

آیا جو موسم گل تو یہ حساب ہوگا — ہم ہونگے یار ہوگا جام شراب ہوگا

کعبے کی کیا خبر تھی یہ کون جانتا تھا — لیلے کے ساتھ پڑھکر مجنون خراب ہوگا

نزع مین مسیحا کی باتین کیسی — ملک الموت سے الجھیگا

آدم سے باغ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار — وہ ابتدائے رنج تھی یہ انتہائے رنج

اچھے یہ قہقہے نہین عاشق کے حال پر — دیکھو ہنسی ہنسی مین کہین ہو نہ جائے رنج

موسیٰ نہ طور پر نہ مسیح آسمان پر — دونون ڈھونڈھے ہوئے ہین ترے آستان پر

آئے تو دیکھتے لب جانان کے معجزے — اچھے مسیح جاکے جمے آسمان پر

جناب یوسف اگر بزم دوستان دیکھین — جو خواب مین بھی نہ دیکھا ہو وہ سمان دیکھین

ہزارون بار غم اک مشت استخوان کیلئے — مری بلا سے اٹھا تو یہ ہفت آسمان کیلئے

فکر کم مین کی رہتی نہین میخوارون مین — خم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یارون مین

دھوم ہے پیرہن یار کی بازارون مین — دھجیان پڑتی ہین یوسف کے خریدارون مین

شیخ صاحب کبھی مجھے کا بھی دھیان آتا ہے — کچھ وہان کے بھی نئے کشف و کرامات ہوئے

زخم کس نے ہوئے کیف شراب سے — انگور پھٹ گئے جوش شباب سے

طوفان یہ اُٹھا مری چشم پُرآب سے — بدلی ہے آفتاب نے ٹوپی حباب سے

میکشو ابکی تو رنگ ایسا بنا پایا ہے — واعظا مین بھیگو ہین پر ہوایان کالے ہوئے

جنون کا داغ لگا گھر چھٹا اسیر ہوئے — ہزار رنگ کی آفت بہار مین گزری

تمنا کو نہ پس مرگ پوچھنے آیا   کمو فرشتون سے کیسی قبر مین گذری

نسیم کی شاعری کی شہرت اُنکی مثنوی سے ہے جسکو مقبول عام کی سند مل چکی ہے۔ مگر عوام کو یہ نہین معلوم ہے کہ وہ غزل بھی خوب کہتے تھے۔ تینتیس برس کی عمر مین انتقال کیا لہذا زیادہ کہنے کا موقع نہین ملا۔ لیکن جو کچھ کہا بھی اُسکو بھی اُنھون نے حتی الامکان اپنے پاس نہین رہنے دیا۔ اُنکے اعزا و احباب کو مشکل سے اُنکی غزل ہاتھ آتی تھی اور جب کوئی کہتا تھا کہ اپنا کلام رکھیے تاکہ کسی وقت مین آپکا دیوان چھپے تو یہی جواب دیتے تھے کہ اگر میرا نام رہیگا تو مثنوی سے۔ دیوان بڑے بڑے اُستادون نے کہے ہین اُنسے بڑھکے کہنا مشکل ہے اور اگر معمولی دیوان ہوا تو اُس سے کیا حاصل۔ یہ رائے اُنکی نہایت منصفانہ تھی گو اُنھون نے حد سے زیادہ سختی کے ساتھ اسپر عمل کیا لیکن کیا خوب بات ہوتی اگر بہت سے شاعر اس رائے پر عمل کرتے تو اسوقت بہت سے فضول دیوان اُردو مین کیون ہوتے۔ نسیم کی کچھ غزلین اُنکے عزیزون کے ہاتھ لگ گئین اور اُنکا ایک مختصر مجموعہ چھپا ہے جو سراسر چھاپے کی غلطیون سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی بہت سے اشعار خالی از لطف نہین ہین اور اُنمین وہی رنگ طبیعت ہے جسنے مثنوی مین بہار دکھائی ہے۔ بلکہ بعض شعر ایسے ہین جو بڑے بڑے اُستادون کے کلام کے ہمپایہ ہین۔ مثلاً آتش کی طرح مین غزل کہی ہے مگر مطلع ایسا کہا ہے کہ آتش بھی اپنے شاگرد کی طبیعت داری پر خوش ہوئے ہونگے۔ آتش کا مطلع ہے۔ ع

جان بخش لب کے عشق مین ایذا اُٹھائیے   بیمار ہو کے ناز مسیحا اُٹھائیے

نسیم

منت دوا کی نہ اصلا اُٹھائیے   مرجائیے نہ ناز مسیحا اُٹھائیے

نسیم کا ذیل کا شعر تمنا کے شعر کے ساتھ جو اُسی زمین مین ہے اور جو اوپر درج ہو چکا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ ع

تنگی کنار تھی یا ہے فشار قبر   وہ ابتدائے عیش تھی یہ انتہائے رنج

نسیم کے چند شعر جو ذیل مین درج کیے جاتے ہین۔ اکثر ناظرین کے لیے وہ نئے ہونگے۔ ع

جب ہو چکی شراب تو مین مست مر گیا   شیشے کے خالی ہوتے ہی پیمانہ بھر گیا

بتون کو جو دیکھا گئے کیا ہمارا   خدا کی خدائی تماشا ہمارا
بتون کی گلی چھوڑ کر کون جائے   یہین سے ہے کعبے کو سجدا ہمارا

اک عمر سے وظیفہ ہے صاحب کے نام کا   ناخن کے خط ہین انگلیون کی پور پور پر

دل تو کہان وہ ہوش نامہربان کہان   نادان ہے زمین کہان آسمان کہان
ظلمت کدہ مین میرے جو آئے خضر تو ہو   کیا راہ بھولے خیر تو ہے تم یہان کہان
کعبہ کہین کنشت کہین بتکدہ کہین   تیرے لیے خراب ہوئے ہم کہان کہان
ہنس بول لو یہ وقت غنیمت ہے بلبلو   پھر گل کہان بہار کہان آشیان کہان

خم نہ بنکر خود غرض ہو جائیے   مثل ساغر اور کے کام آئیے
ابر رحمت کہتے ہین نام آپ کا   خاکسارون پر کرم فرمائیے
آپ آہو چشم ہین۔ آہو نہین   ہم سے وحشت کی نہ لیجیے۔ آئیے
مہر رخصت ہو تو جانے دیجیے   بیقراری آئے تو ٹھہرائیے

جب نہ پہنچے جی ہوسے کام آئیگی   کیا یہ دنیا عاقبت بخشائیگی
جب نے وہ دل محل پھر کون ہے   بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائیگی

یا ہاتھ توڑے جائینگے یا کھولینگے نقاب   سلطان عشق کا یہی فتح و شکست ہے
پابند بیڑیان مین تو ہاتھ ان مین ہتکڑی   کیا کشور جنون مین مرا بند و بست ہے
تجھے مجوزات دیدہ تر دل بھی ہا پینا   مچھلی کو کیا خبر ہے کہ پانی مین شست ہے
شاگرد خواجہ آتش ہندی ہوں جب نسیم   کہتے ہین پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

لائے اُس بت کو التجا کر کے   کفر توڑا خدا خدا کر کے
حق ترے آب و دانہ کا صیاد   جاؤنگا دام دام ادا کر کے

مین وہ بے آس ہون کہ میرے پاس   یاس آتی ہے آسرا کرکے

روایت ہے کہ ذیل کا شعر نسیم نے مرتے وقت کہا تھا ؎

پہونچی ندامت جسے کسیکا ایسے اذیت کون آئے   جان پڑی تب ہاتھ ملکر تھے مرکے وبال دوش ہے

افسوس کہ نسیم کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ انکی مثنوی گلزار نسیم زبان اُردو مین مدت تک آپ ہی اپنا نظیر رہیگی لیکن جو اشعار لکھے گئے ہین اُنسے ظاہر ہوگا کہ اگر انکی مشق جاری رہتی تو غزل مین بھی کس مرتبے کے شاعر ہوتے۔

گو اس پچاس برس مین اُردو شاعری کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکا میدان ہمیشہ سے تنگ رہا۔ کچھ فارسی اُستادون کی حد سے زیادہ تقلید نے خراب کیا اور کچھ سوسائٹی کا ایسا رنگ تھا کہ ہر قسم کے خیالات آزادی سے ظاہر نہین ہوسکتے تھے اور جن باتون مین کچھ آزادی تھی اُنھین اُن بداخلاقیون کا رنگ آگیا جو ہر سوسائٹی کے زمانہ زوال مین پیدا ہوجاتی ہین۔ مگر پھر بھی یہ بات ضرور تھی کہ پُرانے شاعرون کے عقائد اور خیالات وہی تھے جو انکی سوسائٹی کے تھے اور جو سمان وہ اپنی آنکھون سے دیکھتے تھے اُسکی تصویر اُنکی شاعری مین ہوتی تھی۔ لہذا جو کچھ وہ کہتے تھے وہ اپنے اصلی جذبات ظاہر کرتے تھے اور اسیوجہ سے اُنکے کلام مین اثر ہوتا تھا اور اسوقت تک اُسمین لطف باقی ہے۔ جو باتین اُنکی سوسائٹی مین نہ تھین اُسکا اُنکے کلام مین بھی کہین پتہ نہین ہے۔ حُبّ قوم، حُبّ وطن، پولیٹکل آزادی وغیرہ پُرانی سوسائٹی کے اصول مین داخل نہ تھے۔ لہذا اُسوقت کے شاعرون مین بھی ایسے مضامین نہین ہین۔ اگر تصوف۔ عشق۔ دُنیا کی ناپائداری۔ ابنائے دہر کی بے مہری۔ رندی۔ جوش عیش و مستی یہ باتین موجود ہین اور نہایت خوبی کے ساتھ اُن شاعرون نے انکو ادا کیا ہے۔

گو فارسی کی تقلید سے سبزۂ عارض۔ تُرک یکہ تاز۔ شاہد نیزہ باز۔ افسانۂ محمود و ایاز کی بھرمار اُردو مین ہوگئی۔ نرگس و نافرمان۔ دشت ہامون و دریائے جیحون کے مضامین آگئے۔ ہندوستان کے باغ و صحرا مین آہوے تتار چرنے لگے۔ شفق شام پھولنے لگی۔ موسم بہار مین بلبلین بولنے لگین۔ محفل رندان مین مفتی و محتسب کی پگڑی اُچھلنے لگی۔ جب کسی برق جمال کو دیکھا جلوۂ طور یاد آیا۔ گرم بازاری سینان کا اگر ذکر آیا تو قصۂ یوسف و زلیخا کا مضمون یاد آگیا۔ ان سب باتون کیوجہ سے شاعری نیچر یا اپنی اصلیت سے ضرور ہٹ گئی مگر پھر بھی جو خیالات ان مصنوعی تشبیہون اور استعارون کے پیرایہ مین ظاہر ہوتے تھے وہ شاعر کے اصلی اور سچے خیالات تھے اور جو گو فارسی اُستادون کے طرز کی تقلید تھی مگر چونکہ پہلی پہلی تقلید تھی وہ بھی ایک قسم کی جدّت تھی اور بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اب وہی باتین سُنتے سُنتے بے لطف ہوگئی ہین بلکہ تقلید نے اسقدر ترقی کی کہ جس سے جو کچھ جدّت ہوتی تھی وہ بھی تشریف لے گئی اور پُرانے مضامین کو حال کے شاعر کچھ تھوڑا سا لفظی رد و بدل کرکے باندھنے لگے اور بوجہ عام فیشن ہوجانے کے یہ بات چندان معیوب نہین رہی مثلاً سودا کا شعر ہے۔ ؎

ہر سنگ مین شرار ہے تیرے ظہور کا   موسیٰ نہین کہ سیر کرون کوہ طور کا

آتش کا بھی اسی زمین مین شعر ہے اور اسمین شک نہین کہ سودا کے شعر سے پیدا ہوا ہے مگر بہت خوبی سے کہا ہے ؎

مشتاق اسقدر ہون خدا کے حضور کا   سجدہ کرون جو بت بھی ملے سنگ طور کا

لیکن اب امیر کا شعر ملاحظہ فرمایئے جسمین آتش کے شعر کا پورا نقشہ نظر آتا ہے۔ امیر

اسقدر مشتاق ہون زاہد خدا کے نور کا   بت بھی بنوایا کبھی مین نے تو سنگ طور کا

اسوقت کے اکثر شاعرون کے کلام مین ایسی مثالین صدہا ملینگی۔ بہرحال باوجود فارسی تقلید اور محدود خیالات کے جو لطف پرانے اُستادون کے کلام مین ہے وہ متاخرین مین بہت کم ہے۔ سودا کے دو چار شعر ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

دیار خاطر دل ہے گل کا نہ بر راہ گلستان کا ... برنگ شبنم ہے خودنگہ رسیر فرمائے امکان کا

چمن پہ ابر بہار ہے اب شراب ٹپکے تو کیا عجب ہے ... ہوا ہے رونا قبول ساقی حباب خالی مین بہکیانی

آراستہ جو بزم ہوئی دور فلک مین ... وان جام بجز گردش ایام نہ آیا

کسکی مرگ پر ایدل نہ کیجئے چشم تر ہرگز ... بہت سا رو دیئے انکو جو اس جینے پہ مرتے ہین

بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی ... یہ خواب زلیخا کی تعبیر نظر آئی

ہے گردش چشم اُسکی حلقہ در محشر کا ... موج خط پیشانی زنجیر نظر آئی

تک رہروان قافلہ کیوائے صبا ... ایسے ہی گر قدم ہین تمہارے تو ہم چلے

جب سے کہ چشم خلق صنم تجھسے جا لگی ... کہتا نہین ہے بات کوئی یان خدا لگی

تنزل سے بھی ہم ہرگز ترقی مین نہ کم ہونگے ... جو ہوے کوہ سے پتھر تو پتھر سے صنم ہونگے

میر تقی کے بھی دو شعر تبرکاً لکھے جاتے ہین۔ ؎

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے ... دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

کچھ موج ہوا پیچان اے میر نظر آئی ... شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

میر درد نے بھی کیا خوب شعر کہا ہے۔ ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو ... دامن نچوڑ دین تو فرشتے وضو کرین

آتش کے بھی دو شعر اس زمین مین بہت خوب ہین گو میر درد کا شعر بڑھا ہوا ہے۔ ؎

دیوار عام کیجئے پردہ اٹھایئے ... تا چند بندہ ہاے خدا آرزو کرین

کیا مین مجھے بے ادبی ہوگی اے ... مجھکو گناہ ہوگا نہ جام و سبو کرین

ذوق کا رنگ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوگا۔ ؎

راہ عشق پہ ازبسکہ ثابت ہے قدم میرا ... دم شمشیر قاتل پر بھی جون جاتا ہے جم میرا

دم جولان مین رہ شوق سے ساتھ جانے ہے ... بہ رنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

کیا پتنگ نے یہ وا شمع پر سر جھکا ... عجب رہ ہے جو مرنے کیلئے سر جھکا

وقت پیری شباب کی باتین ... ایسی ہین جیسی خواب کی باتین

اس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا ... لیکن رقیب ہے تو جہنم سے کم نہین

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے ... حسرت اُن غنچون پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

جو جانتے یہ کہ چن کے ہم کو توڑینگے ... تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

سراغ عمر گذشتہ جو ڈھونڈھتے ہے ذوق ... تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

آئی کان مین کیا اُس صنم نے پھونکدیا ... کہ ہاتھ رکھتے ہین کانون پہ سب اذان کیلئے

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف ... اور اس ضعیف سے کل کام دو جہان کیلئے

غالب کا اصلی کمال تو اُنکے فارسی کلام مین ہے لیکن اُردو مین بھی جہان صاف کہا ہے اُسکا جواب نہین ہے۔ اُنکا اُردو دیوان نہایت مختصر ہے اور اُسمین بھی کثرت سے ایسے اشعار ہین کہ جنمین اُردو زبان کا کوئی مزا نہین ہے اور اگر اُنکی فارسی بندشون مین کوئی نزاکت ہے تو میرے احاطہ فہم سے باہر ہے۔ اگر بعض معتقدین غالب محض اسی بات پر اکتفا کرین کہ جتنا کلام اُنکا صاف ہے وہ نہایت عمدہ ہے، فارسی مین بڑے رتبہ کے شاعر ہین اور اُردو نثر کے موجد، تو غالب کیلئے یہ کم تعریف نہوگی اور بہت صحیح تعریف ہوگی۔ مگر اُنکے ہر مشکل شعر مین معنی پنہانا اور اُنکے اُردو دیوان کی شرحین لکھنا کسیطرح اُنکی شاعری کا مرتبہ بڑھانا نہین ہے۔ بلکہ معمولی سمجھ کے لوگ اپنی جگہ پر یہ کہ سکتے ہین کہ وہ اُردو شعر ہی کیا جو بغیر شرح کے سمجھ ہی مین نہ آئے۔ مگر اسمین شک نہین کہ غالب اپنے رنگ مین بے مثل ہین۔ شاید اُردو مین ایسا ظریف شاعر کوئی نہین ہوا۔ سودا بہت اچھی ہجو کہتے تھے مگر غالب کی ظرافت کچھ اور ہی چیز ہے۔ اُنکے دو چار شعر لکھتا ہون۔ ؎

محرم نہین ہے تو ہی نواہاے راز کا ... یان ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

منہ دکھلتے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہین ... زلف سے بڑھکر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ ... ہاے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مین جو کہتا ہون کہ ہم لینگے قیامت مین تمھین ... کس رعونت سے وہ کہتے ہین کہ ہم حور نہین

نیند اُسکی ہے دماغ اُسکا ہے راتین اُسکی ہین ... جسکے بازو پر تری زلفین پریشان ہوگئین

وہ نگاہین کیون ہوئی جاتی ہین یارب دل کے پار ... جو مری کوتاہی قسمت سے مژگان ہوگئین

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ... لڑتے ہین اور ہاتھ مین تلوار بھی نہین

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ... اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب ... ہم بیابان مین ہین اور گھر مین بہار آئی ہے

موت کا ایک دن معین ہے ... نیند کیون رات بھر نہین آتی

رگون مین دوڑتے پھرنے کے ہم نہین قائل ... جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

اُنکے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق ... وہ سمجھتے ہین کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اُردو شاعری مین بمقابلہ فارسی کے ظرافت کا مادہ کم پایا جاتا ہے۔ مشہور شاعرون مین سودا۔ انشا اور غالب ظریف الطبع ہوئے مگر تینون کا رنگ جدا گانہ تھا۔ انشا کا کلام بھی بلحاظ ظرافت اور نیز صفائی و آمد اور شوخی کے لحاظ سے بڑے مرتبے کا ہے۔ اُنھون نے اپنی شاعری مین ہندی الفاظ و محاورے بکثرت استعمال کئے ہین اور اکثر تشبیہین بھی ایسی ہین جو خاص اسی ملک کی ہین۔ افسوس ہے کہ اور شاعرون نے اُنکے اصول پر اُردو زبان اور شاعری کو وسعت نہین دی اور جسکا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہین۔ دیکھئے انشا کے اشعار کس لطف کے ہین۔ ریختہ اور ریختی دونون قسم کا مذاق ہے۔ ؎

ہے ہے بچھڑی ہری لیٹے تیرا ہے سکتے جاتا ... چلتی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی کیا ہی ہوا چمن مین

چھیڑنے کا تو مزہ جب ہے کہو اور سنو ... بات مین تم تو خفا ہوگئے لو اور سنو

لگے وہ مجھسے کبوتر کے جو جوڑے اُڑگئے ... تو یہ بولے کیا کیا ہے ہے گھوڑے اُڑگئے

تیوری محمل کی صبا کو دھری جاتی ہے ... اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

یہ پیاس اپنی کبھی برف سے دور ہوئے ... بجھی تو نرگس ساقی کے آبخورے سے

نشے مین کیون نہ کرون غش دکھا دے تیغ ... وہ دو دو تون دیئے ہین تاک کے کٹورے سے

گرمی کی جو شکوہ تھی سب گرد ہوگئی ... دو چار بوندیون مین جو ابر سرد ہوگیا

یہ بات سب پر ظاہر ہے کہ ناسخ اور آتش نے اُردو زبان کو نہایت صاف کیا۔ گو دونون شاعرون کا رنگ مختلف ہے۔ ایک مین شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی دوسرے مین مضامین شوخ و پُر درد اور زبان کی پاکیزگی اور روانی۔ چونکہ مضمون طویل ہوگیا ہے لہذا صرف آتش کی شاعری کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔ آب حیات مین جو آتش کے حالات لکھے ہین وہ بہت صحیح ہین۔ مین نے بعض بزرگون سے سُنا ہے کہ خواجہ صاحب کی واقعی حالت یہ تھی کہ سرائے معالی خان مین ایک ٹوٹے مکان مین رہتے تھے۔ دالان مین چٹائی بچھی ہوئی اور اک دروازہ کا پٹ اُلٹا پڑا ہوا اُسی پر جو صاحب آتے تھے بیٹھتے تھے۔ مٹی کی ہانڈی مین روٹی کے ٹکڑے بھیگا کرتے تھے معمولی غذا یہی تھی۔ اگر کسی شاگرد نے اپنے ہان کا کھانا اصرار سے کھلایا تو کھا لیا۔ گو فخر لکھنؤ تھے اور بڑے بڑے رئیس شاگرد تھے لیکن زمانے کی قدردانی دیکھئے کہ ابھی صرف ساٹھ ہی پینسٹھ برس اُنکے انتقال کو ہوئے ہین مگر قبر تک کا نشان نہین۔ اُنھین کا شعر اُنکا مصداق حال ہے۔ ؎

بلند ہو نہ زمین سے مزار آتش ... نشان قبر سے منظور مجھکو نام نہین

اُنکا کلام بھی اس بے ترتیبی سے چھپا ہے کہ بہت سی غزلین گم ہوگئین۔ کچھ شعر لوگون کو ادھر اُدھر سے یاد رہ گئے لیکن جسقدر مصطفائی مطبع مین چھپا تھا منشی نولکشور کے مطبع مین اس سے بھی کم رہ گیا۔ وہ غزل جسکے دو شعر ذیل مین لکھے جاتے ہین مصطفائی مطبع والے دیوان مین بھی نہین ہے۔ ؎

جاکے گلزار سے صیاد جو پھر آیا اُٹھا   کیا قفس بار لائے بلبل شیدا اُٹھا

تن کی عریانی سے بہتر نہین دُنیا مین لباس   یہ وہ جامہ ہے کہ جسکا نہین سیدھا اُلٹا

یا وہ غزل جسکا یہ شعر ہے۔ ؎

دُنیا مین آکے زہر ہی انسان کی چاہ ہے   اس خوان کی نمش کف مار سیاہ ہے

یا وہ غزل جسکا یہ لاجواب مطلع ہے۔ ؎

بدگمانی جو ہوئی بزم مین پروانے کو   شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو

روایت ہے کہ ایک مشاعرہ مین انکے پڑھنے کی باری علی الصباح آئی سُنا جاتا ہے کہ حریفون نے عمداً ایسا کیا تھا کہ یہ ایسے وقت پڑھین جب مشاعرہ سرد ہو۔ پہلے انھون نے پڑھنے مین کچھ تامل کیا اور کہا کہ اب صبح ہو گئی ہے لوگ تھک گئے ہین پھر کسی موقع پر دیکھا جائیگا۔ مگر حاضرین نے اصرار کیا اسوقت یہ شعر پڑھا۔ ؎

رات بھر جو ثابت و سیارہ گرم افشان تھا   صبح کو خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

شعر پڑھنا تھا کہ مشاعرہ جاگ اُٹھا اور حریفون کے پاس ہڑکا ہو گیا۔ اسوقت اُردو زبان کی ترقی کے بہت سے لوگ ساعی ہین مگر یہ کسی کو خیال نہین آتا کہ ایسے اُستاد کا کلام تو سب جمع کرکے چھاپا جائے۔ کسی مشاعرے مین ناسخ و آتش دونون موجود تھے ناسخ نے غزل پڑھی جسکا پہلا مطلع یہ ہے اور کس شان کا مطلع ہے۔ ؎

ہمصفیر اس باغ کی ایسی ہوا ناساز ہے   طائر رنگ چمن تک مائل پرواز ہے

دوسرا مطلع یہ ہے۔ ؎

جوشش سودا مین بھی پوشیدہ اپنا راز ہے   زلف جانان کی طرح زنجیر بے آواز ہے

روایت ہے کہ اس دوسرے مطلع پر آتش نے اُسی موقع پر یا بعد مشاعرہ کسی سے یہ کہا کہ مضمون چرایا مگر چوری کرنا نہ آئی اور یہ فارسی شعر پڑھا۔ ؎

زنجیر شکل گیسوئے جانان ست بے صدا   شاید غبار دشت جنون بُرد رنگ بود

ظاہر ہے کہ جو فارسی والے نے بات رکھی ہے وہ اُردو شعر مین نہ آسکی مگر جس درجہ کی تقلید اُستادون نے بھی جائز رکھی ہے اُس لحاظ سے اسکو سرقہ کہنا قرین انصاف نہین ہے چند سال ہوئے کسی مقام پر حکیم مرحوم لکھنوی اُنکے چھوٹے بھائی حضرت افضل اور ایک دو اور صاحب تھے مین بھی تھا شعر و سخن کی باتین تھین مین نے ذوق کا یہ مطلع پڑھا۔ ؎

ہوا مین وحشت کُش مدت سے اس ویرانہ مین   برسون مسجد مین رہا برسون رہا میخانہ مین

جناب حکیم مرحوم نے اسپر فارسی کا شعر پڑھا۔ پہلے مصرع کے ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہین مگر اپنے خیال کے موافق موزون کرکے دیتا ہون۔ ؎

ہر کجا خشتے بہ بینم اُفتادہ در ویرانہ   ہست فرد دفتر احوال صاحب خانہ

ظاہر ہے کہ اُردو کے بڑے بڑے اُستاد شاعرون کو بھی فارسی مضامین سے بالکل الگ کہنا مشکل ہوتا ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا اب چند اشعار آتش کے بطور نمونہ پیش کرتا ہون جس سے اُنکے رنگ کا اندازہ ہوگا۔ میرے نزدیک جو پہلی غزل حمدیہ ہے وہ اپنے رنگ مین بے مثل ہے۔ بہت مشہور غزل ہے لہذا اُسکے اشعار لکھنے کی چندان ضرورت نہین ہے اور متفرق شعر لکھتا ہون۔ ؎

دکھایا آئینہ گلزار نے جب صفائے تب ذکر سخن کا   دہن کو جو پرکھا تو زبان کا زبان کو کھولا دہن کا

برہنہ آیا تھا یان عدم سے برہنہ یان سے چلا عدم کو   فریب دنیا کا ڈر نہین ہے نہ داغ کچھ ہے گلا کفن کا

خواب ہستی مین کسی کو نہ ہوئی فرد دوستان ہو   جلا ہوا شمع سے جو پتنگا غبار خاطر ہوا چمن کا

لحد پر یار آتا ہے مرے شرمندہ کرنے کو   نہ منہ دکھلائی کی جا ہے نہ موقع عذر خواہی کا

لطف جان ہے دل بخش ابرو سے قاتل کی   پڑی سولی ہے نگوڑے مرد سپاہی کا

چھوڑا نہ ہے رحم زنگار سے قاتل زمین کو   وفاداروں کے خون کا داغ کیا دھبا چھپا کا

شراب لالہ گون سے ساقیا جام صبوحی بھر   شفق ہی مجھے دکھلا رہا ہے نور کا تڑکا
عجب محبوب باشوکت ہے اے باد بہار آئی   صدائے خندۂ گل ہے سواری کا تری ہلکا
گل و بلبل کی حالت پر بجا ہے گریۂ شبنم   اسے گلچین کا اندیشہ اسے صیاد کا دھڑکا
سمجھ لیتے ہیں مطلب اپنے اپنے طور پر سالک   اثر رکھتی ہے آتش کی غزل مجذوب کی بڑ کا

یہ غزل کسقدر مشکل زمین میں ہے لیکن ساری غزل صحیح ہے۔ اس زمین میں میں نے حضرت تسلیم دہلوی کی غزل دیکھی ہے لیکن دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔

آتش

شب اسکی زلف گیسو کا جو فسانہ ہوا   ہوا کچھ ایسی بندھی گل چراغ خانہ ہوا
تو انگرون کو مبارک ہو شمع کافوری   قدم سے یار کے روشن غریب خانہ ہوا
نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں   لگا کے آگ مجھے کاروان روانہ ہوا
زبان یار خموشی نے میری کھلوائی   میں قفل جسکے کلید در خزانہ ہوا
خدا دراز کرے عمر چرخ نیلی کی   یہ بیکسوں کے مزاروں پہ شامیانہ ہوا

کل غزل لاجواب ہے۔ اس زمین میں اسیر اور امیر کی غزلیں بھی بہت اچھی ہیں۔ اسیر کا مجھے صرف اک مطلع یاد ہے۔

اسیر

شب عدم آرام میں بیگانہ و یگانہ ہوا   نظر پڑتے ہی کیا منقلب زمانہ ہوا

امیر

قدوم قاصد جانان سے محرم خانہ ہوا   قدم رسول مرا سنگ آستانہ ہوا
ریاض دہر میں پوچھو نہ میری بربادی   برنگ بو ادھر آیا ادھر روانہ ہوا
خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا   ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا
جنون کا جوش گھٹا تھا کہ بوئے گل آئی   سمند ہوش رکا تھا کہ تازیانہ ہوا

اسی زمین میں میر انیس کا سلام بھی ہے جسکے دو شعر یہ ہیں۔

جو زندہ ہیں وہ سمجھتے ہیں قیدیوں پر مرو سے کہتے ہیں   کہ ہم بھی پھرتے تھے یوں ہی اسے زمانہ ہوا
کشاں کشاں مجھے جانا پڑا وہاں آخر   جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

آتش

تری مستانہ آنکھوں کی دگردش کا اثر دیکھا   مئے گلرنگ سے سو سو جگہ پیمانہ بھر دیکھا
مسافر ہی نظر آیا نظر آیا جو دنیا میں   جسے دیکھا اسے آوارۂ گرد سفر دیکھا
خریدار محبت آئے ہیں بازار عالم میں   وہی سودا کیا ہے جسمیں ضرر دیکھا
آشیانہ نہ قفس میں نہ چمن یاد آیا   آنکھ کھلتے ہی زبان تھی کہ صیاد آیا
رو دیا ابر بہاری جو برستے دیکھا   کرم پیر خرابات مجھے یاد آیا

اس زمین میں صبا کا ایک خوب شعر ہے۔

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے   بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

داغ نے بھی اس زمین میں دو غزلہ خوب کہا ہے۔

داغ

کبھی مسجد میں جو وہ شوخ پریزاد آیا   بھیج ہی اللہ کے بندوں کو خدا یاد آیا
کونسا طائر گم گشتہ اسے یاد آیا   دیکھتا بھالتا ہر شاخ کو صیاد آیا
وہی موذن نے شب وصل اذان پچھلی رات   ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

آتش

اسقدر آنکھیں مری محو تجلا ہو گئیں   پتلیاں پتھرا کے آئینہ رنگ ہو گئیں
بدن سا شہر نہیں دل سا بادشاہ نہیں   حواس خمسہ سے بہتر کوئی سپاہ نہیں
شمع گل ہوسے جو صبح شب ہجران ہو گئی   اوس پڑتی بھی جو ہو تو حسرت دیدار ہو گئی
خاک میں بھی جو ملوں میں تو کسی صحرا میں   تجھ سے مٹی بھی نہ اسے گی مسلمان ہو گئی
یہ کیفیت اسے ملتی ہے جو جسکے مقدر میں   مے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں
جہاں جا ہے بسیرا وقفات کرتے جا ودن بلبل   چمن میں آشیانہ ہے قفس صیاد کے گھر میں
زمانہ عاشق و معشوق سے نہیں خالی   گلوں کا قحط نہیں بلبلوں کا کال نہیں

اس زمین میں شیخ فضل احمد کیفت شاگرد میر وزیر علی صبا کا ایک شعر لاجواب ہے۔

یہ کیسے باغ جہاں میں شگوفہ چھوڑ دیا
کہ آج تک گل و بلبل میں بول چال نہیں

آتش

یہ سودائے شہادت ہے جو سر کرتا ہے گردن میں   تری تلوار کا دم بھرتی ہے ہر رگ جو گردن میں

نہیں روزن جو تیرے یار میں پروا نہیں مجھکو   نگاہ شوق رخنہ کرتی ہے دیوار آہن میں

روایت ہے کہ جس مشاعرے میں آتش نے یہ غزل پڑھی وہاں اک لڑکے نے جو بالکل مبتدی شاعر تھا ذیل کا مطلع پڑھا جسپر آتش اور کل اہل مشاعرہ بہت ہی خوش ہوئے۔ ؎

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن مین   پنہائے طوق خط کے یار نے میری گردن مین

غالب کی ایک غزل "پانون" کی ردیف مین ہے اور بہت اچھی غزل ہے اسکا ایک شعر یہ ہے۔ ؎

اللہ رے ذوق دشت نوردی کہ بعد مرگ   ہلتے ہین خود بخود مرے اندر کفن کے پانون

دیکھئے اس زمین مین آتش نے بھی کس لطف کے ساتھ کہا ہے صرف تین شعر یہان لکھتا ہون۔ ؎

کیسا لہراتے ہے چلی آئی باغ مین   شبنم ڈھلا رہی ہے بہار چمن کے پانون

دنیا کو تھوکتے نہین مردان راہ عشق   نادیکھین آنکھون پہ اس مہ جبین کے پانون

آتش زمین شعر ہو ہر چند سنگلاخ   لغزش سے آشنا نہین اہل سخن کے پانون

دیکھئے کس مشکل اور بھدی زمین مین کیسی عمدہ غزل کہی ہے جسکے تین چار شعر لکھے جاتے ہین۔ ؎

سرو بستان تجھے گر اسے یاد مرغ خشک ہو   طیر ممکن ہے بہار آئے جو نخل خشک ہو

خون ہوا جاتا ہے دل کیا دیدہ تر خشک ہو   رو رہا تھا ٹوٹنے مین دم کیونکر خشک ہو

غیر خالق کون کرتا ہے کسی کی پرورش   دایہ پیدا ہو جو آتش شیر مادر خشک ہو

کام حسرت سے جو ادا اگر لیتا ہے   سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے

وہ زبون بخت شجر ہون مین کہ دہقان کبھی   پیچھے ہوتا ہے مجھے پہلے تبر لیتا ہے

ہجر مین وصل کا ملتا ہے مزا عاشق کو   شوق کام تیرا جب حد سے گذر لیتا ہے

در کھتی ہے گلزار کی کیفیت کا ہستی ہے   ابھرنے مین حباب ہوکے کر جوش ہستی ہے

غم و شادی کی حالت دیکھ جا کے مرقع مین   کوئی تصویر روتی ہے کوئی تصویر ہنستی ہے

غنیمت جان یار آئے لحد پر جان کھوتے ہی   ہاں دل ملے گو نہین مگر دیکھ لو ہستی ہے

پڑھا ہے مین نے بھی قرآن قسم ہے قرآن کی   جواب ہی نہین رکھتی ہے گفتگو تیری

یہ گردش فلک پیر سے ہوا ثابت   قوی ضعیف کو کرتی ہے جستجو تیری

شب فراق مین اے رشک وصل تا دم صبح   چراغ ہاتھ مین ہے اور جستجو تیری

سبوئے غنچہ ہے ساغر جام گل لبریز   ٹپک رہی ہے شراب ابر نو بہاری سے

ہاں اسباب سے حاصل ہوا آخر کفن   چلتے چلتے آسمان سے ہم بھی خلعت لے گئے

دیدہ و دل سے گھسیٹا کوچۂ محبوب مین   کھینچکر مجھکو فرشتے سوئے جنت لے گئے

باغ عالم مین ہے نا محرم کو بے برگی کا غم   سبز بختی اس چمن سے زرد صورت لے گئے

دیکھ سکتے تھے کہان کافر مسلمان کی ترو   کھود کر تربت سے آتش سنگ تربت لے گئے

سرمہ لگا کے یار نے ترچھی نگاہ کی   موت آ گئی پھر کسی نہ کسی بیگناہ کی

بوئے یار کی شگفتہ کے صبا نے اڑائے ہوش   یاد مراد نے مری کشتی تباہ کی

مجھ ناتوان کی خاک جو آسمین ہوائی شتر   اٹھ اٹھ کے بیٹھ بیٹھ گئی گرد راہ کی

اس زمین مین آسیر کا مطلع ہے۔ ؎

یارب دراز عمر ہو زلف سیاہ کی   زنجیر بنگئی مرے پانے نگاہ کی

امیر

باندھی ہوا جو حشر کے دن مین نے آہ کی   اڑ ہی پھر گئی فرد ہمارے گناہ کی

جناب نواب رضا حسین خانصاحب مشہدی محلت اکبر جناب نواب جعفر علیخانصاحب (شیش محل لکھنؤ) کا مطلع بھی بہت خوب ہے۔ ؎

پہلوئے دل کر لاکھ جگہ دی پناہ کی   آخر کو چھین لیگئی شوخی نگاہ کی

آتش

فسون کوئی نہ تو اعجاز یار رکھتا ہے   فریب حسن سے عاشق کو مار رکھتا ہے

کھلا یہ یار کے الطاف غائبانہ سے   خیال بندہ کا پروردگار رکھتا ہے

محل ادب کا ہے ٹھکرا کے چل نہ قبرون کو   پیادہ ہوکے قدم یان سوار رکھتا ہے

پرانے استادون کے جو چند اشعار اوپر لکھے گئے ہین انسے

یہ غرض ہے کہ باوجود محدود خیالات کے اُنکا مذاق کتنا عمدہ تھا اور اُنکے کلام مین کسقدر لطافت، درد اور سچا جوش ہے۔ طوالت کے لحاظ سے بہت سے پرانے شاعرون کا ذکر نہین کرسکا۔ خصوصاً میر انیس و مرزا دبیر کے نسبت کچھ لکھنے کی نوبت نہین آئی۔ میرا ارادہ تھا کہ کچھ انکے کلام کے نسبت بھی لکھون اور کچھ ان باتون کے تذکرے بھی ہون کہ جو سید محمود صاحب مرحوم (جو اپنے زمانہ مین فخر ہندوستان تھے) کی صحبتون کے متعلق ہین جبکہ وہ لکھنؤ مین تشریف رکھتے تھے اور مجھے شاید اُنسے قریب قریب روز گھنٹو گفتگو کا موقع ملتا تھا اور شعر و سخن کے تذکرے رہتے تھے۔ اُنکے بہت سے خیالات اس معاملے مین یادر کھنے کے قابل ہین مگر وہ باتین بھی اب اس موقع پر نہین لکھی جاسکتین۔ نیز یہ خیال ضرور تھا کہ اس زمانہ کے شاعرون کے بھی کچھ تذکرے ہون اور اُنکے کلام کے نمونہ دکھائے جائین خصوصاً امیر و داغ و جلال کی شاعری پر روشنی ڈالی جائے مگر ناظرین ادیب کے تھکا دینے کو یہی مضمون کافی ہے۔ لہذا انشاءاللہ پھر کبھی۔

بشن نراین در۔

علہ بنگالیون کی اُردو شاعری

قصۂ یاران رفتہ ہی بلا سے چھیڑیے
نیند آنکھون سے اُڑے ایسا کوئی افسانہ ہو

بنگال کی اُردو زبان دانی کا خاکہ ہمیشہ اُڑایا گیا ہے اور گو کہ خاص الخاص بنگالہ کی زمین پاک سے عبدالغفور خان نساخ اور سید محمود آزاد ایسے کامل الفن حضرات اٹھے ہین اور اب بھی اچھی اچھی اُردو نظم و نثر لکھنے والے موجود ہین مگر کیا غضب ہے کہ پھر بھی یہ دھبہ بنگالے کے دامن سے دور ہوتا ہوا نظر نہین آتا۔

عجب پُر لطف اصطلاح ہے کہ بنگالے کے مسلمان اپنے ہندو برادران وطن کو "بنگالی" کہتے ہین اور اپنے آپ کو "مسلمان" گویا بنگالی ہندو کا مترادف ہے اور اب یہ انوکھی اصطلاح حدود بنگال سے نکلکر سارے ہندوستان مین مشتہر ہو گئی ہے۔ اس اصطلاح کے بنا پر ہمنے بھی اپنے اس مضمون کا یہی عنوان پسند کیا ہے۔

ایسی کوئی وجہ وجیہ نہ تھی جس سے ہمارے بنگالی بھائی اُردو کی جانب متوجہ ہوتے۔ بیشک جب آج سے ستر برس پہلے بنگال کی عدالتون کی زبان فارسی تھی اُسوقت انھین بنگالیون مین لایق سے لایق فارسی دان موجود تھے اور اُسوقت بھی یہی لوگ لوجہانی صحیح غلطی اور ماوہ کے برسر کار تھے۔ چنانچہ خاص بنگال کے مشہور بانی مذہب راجہ رام موہن راے کی تحفۃ الموحدین فارسی زبان کی مشہور تصنیف ہے۔ اور اسی طرح ڈھاکہ کے رئیس خوشنویس منشی مدنموہن کی مشق اور وصلیان ابتک اچھی قیمت باقی ہین۔ مگر یہان کی عدالتون مین فارسی کا استعمال بنگلہ کے ساتھ یکایک ہو گیا۔ ایسی حالت مین بنگلی اُردو کی جانب کون متوجہ ہوتا۔ لیکن ہندو مسلمانون کے قدیم محبتانہ برتاؤ اور تعلقات معاشرت کا اثر (جسکے فقدان کا تمام محبان وطن کو افسوس اور سخت افسوس ہونا چاہیے) خالص بنگالی خاندانون مین اُردو زبان دانی اور اُردو شاعری کی صورت مین ظاہر ہوا۔ مجھے بڑی تلاش کے بعد کچھ ایسے اصحاب کا پتہ لگا ہے جو اُردو کے اچھے شاعر تھے اور چونکہ یہ گنتی کے چند لوگ ہین اسلیے ہم ناظرین ادیب کیلیے معرفی بننے کی جسارت کرتے ہین۔

ارمان۔ جب کلکتہ نیا نیا آباد ہونا شروع ہوا ہے اُسوقت راجہ نبکرشن وہان کے رئیس شمار ہوتے تھے اور سوتڑی جو کلکتے سے قریب ہی ہے وہان رہتے تھے۔ ارمان تخلص ہے راجہ موہن کے نبیرہ راجہ نبکرشن کے پوتے تھے۔ اپنے وقت مین اُردو کے بڑے حامی اور شاعرون کے زبردست معاون شمار ہوتے تھے۔ اُنھون نے شعراے اُردو کا ایک تذکرہ بہار دلکشا نام بھی لکھا تھا۔ حضرت شیخ کے دوست اور ہم اُستاد تھے اور ۱۸۵۰ء تک بقید حیات تھے انکے دو شعر حاضر ہین۔

کام اپنا دکبھی تجھسے مری جان نکلا ۔۔ تن سے جان نکلی مگر دل کا نہ ارمان نکلا
رات بھر نالے کیا کرتا ہون گر دن کو ۔۔ پوچھیے کیا ہین مرے قات کو آپ

لے مضمون ہٰذا مین شعراء ضلع جہانگیر نگری، تذکرۂ شعراے ہنود، اور گلدستۂ خیال رحلش جہانگیر نگری، تذکرۂ شعراے ڈھاکہ وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

ذرہ ۔ تخلص ہے منشی اتواری لال باشندۂ کلکتہ کا نساخ نے انھین اپنا ملاقاتی لکھا ہے ۱۲۸۱ھ تک زندہ تھے ایک شعر انکے یادگار ہے ۔ ؎

رفتار کی خاطر سے دل آزار بھی چھوڑا ۔ الفت میں سمن رویوں کے گلزار بھی چھوڑا

راجہ ۔ مرزا جان طپش مرحوم جو درحقیقت بنگالہ کی اُردو شاعری کے آدم تھے اور جنکے شمس البیان پر میرا ریویو نومبر کے ادیب میں شائع ہوچکا ہے راجہ انکے تلمیذ رشید تھے ۔ راجہ راج کشن نام تھا اور راجہ نبکشن بہادر رئیس اعظم کلکتہ کے صاحبزادے تھے ۔ ایک ضخیم دیوان انھون نے اپنی یادگار چھوڑا ہے ۔ یہ تمین گذرین کہ میری نظر اس دیوان کے مطالعہ سے فیض اُٹھا چکی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ اب بالکل نایاب ہے ۔ صرف ایک ہی شعر ہدیۂ ناظرین ہے ۔ ؎

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب ۔ تو مجھکو سحر تک نہ یہان پاؤ گے صاحب

کشن ۔ تخلص بابو کشن چند گھوس باشندۂ کلکتہ ۔ اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہوا ۔ وله ؎

صدف اپنے گوہر کو بے آب سمجھے ۔ یہ دندان تمھارے دہن مین جو دیکھے

کنور ۔ الولد سر لابیہ کے اصول پر راجہ راج کشن بہادر کے صاحبزادے نے بھی شغل شاعری کو برجا رکھا ۔ کنور صاحب کا نام راجہ اپورپ کشن بہادر تھا ۔ اپنے فاضل والد کے شاگرد تھے ۔ انکے بھی ایک ضخیم دیوان یادگار ہے ۔ مین نے اُسے بہت دن ہوئے دیکھا ہے مگر اب کمیاب ہے ۔ معقول کلام ہے ۔ ؎

شہداے عشق مین ہے دل شمع و شا ... ۔ کہ اب تک ہے یاد مین تیرے حباب کا
دم ... ہے جو مجھے ... ۔ شال شمع ... رونے روتے سوہی رات

مشفق ۔ تخلص ہے راجہ جادوب کشن بہادر کا اور یہ بھی اسی خاندان کے نونہال اور صاحب دیوان گذرے ہیں ۔ مولوی غلام امام شہید ... جو مرشدآباد کے شاہزادے تھے اور ایک زمانہ مین کلکتے
مین انکی شاعری کی بڑی دھوم تھی راجہ صاحب انھین کے شاگرد تھے ...

... نگاہ ناز مین قربان ہم سمجھتا ہو ۔ ہے قیامت کا گمان سب کو قد رعنا ...
نیند تو آتی نہین جو خواب مین دیکھون اُسے ۔ حیف آتا ہے مجھے اس ...

ملک ۔ ملک خاندان اب بھی کلکتے مین نہایت مشہور ... صاحب اثر خاندان ہے ۔ بابو جگبندھو پرشاد اسی خاندان کے ایک ... تھے ۔ میر باسط علی موری الہ آبادی کے اثر صحبت سے یہ شاعری کے جانب بھی متوجہ ہوے ۔ حضرت نساخ نے انھین اپنا ملاقاتی بتایا ہے ...

دل پہ اک سانپ سا پھرتا ہے اسوقت ملک ۔ زلف جانان کی جو مارے گی ...

موہن ۔ بابو ہری موہن داس پروفیسر فارسی ... کا تخلص ہے ۔ حضرت موہن ڈھاکہ کے قدیم باشندے تھے ... کی اوائین اُنھین اتنی تحسین کہ انکے بعد کوئی انکا مثل ہی باقی نہ ... سال ہوے انتقال کیا ۔ اسوقت سواے تاریخ ذیل کے ... میرا ذخیرہ خالی ہے اسلئے اسی پر اکتفا کی گئی ۔ ؎

میرے شفیق منشی عالی خیال طپش ۔ شعر و سخن مین ہے انھین ...
تقریر جو لکھی ہے یہ تو طرز دلفریب ۔ ہے شاہد ان ... کا اب ...
ظاہر ہے خوبی اسکی نہین حاجت بیان ۔ تعریف اسکی مین جو کرون ...
تاریخ اسکی لکھتا ہون موہن بشوق دل
۱۳۱۹ھ
ہے یہ نیا کھلا ہوا گلدستۂ خیال

ناظرین ادیب ! کیا آپ اس خبر کو نہایت رنج سے ... یہ تمام فہرست مردہ شاعرون کی ہے اور اب بنگال بھر مین ایک ... ایسا نہین ہے جو اُردو شاعری کا نام لیوا ہو اور جو ہر ... یہ انتخاب اُن حدود کے اندر کیا ہے جہان بنگلہ زبان رائج ہے ... بنگال مین بہار و اڑیسہ بھی شامل ہے ۔ یا دش بخیر بہار مین اب بھی ... مین اور اگر تلاش کیجاے تو صرف زندہ شاعرون کی ایک بڑی تعداد ...

حبیب الرحمن

املاے اُردو

عبارتون کے ہر اک لفظ کو درست پڑھو
لکھو تو صاف لکھو اور پڑھو تو چست پڑھو

عبارت کی لکھاوٹ کی اصل تعریف یہ ہے کہ پڑھنے والا (عام ازین کہ اس لفظ کے معنی نہ بھی سمجھتا ہو تاہم) پوری اور صحیح آواز سے اسکو ادا کرسکے۔ اگر محض معنی و مطلب و سیاقِ کلام سے لفظون کو صحیح پڑھا تو املا کا تکلف کیا ہوا۔ جہان تک مجھے اطلاع ہے مذکورۂ بالا عیب ہر زبان کے املا مین ہے مگر کسی مین کم اور کسی مین زیادہ اور کسی مین بہت زیادہ۔ تخمیناً اسی برس قبل تک کی فارسی معمولی تحریرین میرے پاس موجود ہین ہرچند اُنمین اشارات املائی و دیگر قوائدِ حسنِ املا سے کام نہین لیا گیا ہے تو بھی وہ تحریرین ایسی صاف و واضح ہین کہ پڑھنے والے کو بہت کم دقت ہوتی ہے مگر اسکے بعد سے تو فارسی اور اُردو لکھنے والون نے رسم الخط کو اپنی بے اعتنائی سے ایسا بگاڑا گیا کہ بخصوص اُردو کی تحریر و املا پر سیکڑون الزام اور اعتراض وارد ہو گئے۔ مجبور ہو کر سرکار نے بھی صوبہ بہار کے سرکاری دفترون سے اُردو تحریر کو قطعاً نکال دیا۔ اس سے زیادہ غریب اُردو کی اور کیا بدقسمتی ہو سکتی ہے۔ گو اُردو کے موقوف ہو جانے سے چندان فائدہ نہوا بلکہ دقتین اور مشکلین اس سے کہین زیادہ بڑھ گیئن۔

مجھکو خوب یاد ہے کہ اُردو کے برخلاف جو موویل اسوقت

سر رچرڈ ٹمپل صاحب لفٹنٹ گورنر بنگال کے حضور مین پیش کیا گیا تھا۔ اُسپر علاوہ ہمارے ہم وطن ہندو بھائیون کے مسلمان بھائیون کے بھی دستخط تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری آفسون مین طوالتین اور پریشانیان دو نون کے لئے بڑھ گئین۔

اس مین شک وشبہ نہین کہ میموریل مین اُردو کے املا پر جو الزام واعتراض کئے گئے تھے۔ اُنمین بہت سے اعتراض ناقابل قبول اور بہت سے اعتراض قابل تسلیم اور بہت سے اعتراض ایسے تھے جو دوسری زبانون پر بھی بطور عائشۃ الورود کے وارد ہوتے ہین۔

مین یقیناً کہتا ہون کہ اسمین نہ تو میموریل دینے والون پر چندان اعتراض ہے نہ سرکار پر۔ بلکہ سارا الزام اُن اُردو نویسون پر ہے جنھون نے اپنی کمالات یا زود نویسی یا بے اعتنائی یا ناواقفیت سے اُردو کی لکھاوٹ کو مورد الزام بنا دیا۔

منجملہ اعتراضون کے جو میموریل مین مذکور تھے یہ بھی اعتراض تھا کہ اُردو کی تحریر مین جعل بنا لینے اور لفظون کو دو تین طرح پڑھنے اور بہ اندک تغیر معنی ومطلب کے بدل دینے کی بڑی گنجایش ہے اور اس دعوے پر چند مقدمات عدالت کی نظیرین بھی بطور دلیل پیش کی تھین۔ ایسے قابل تسلیم اعتراض اُسی زمانے سے میرے دل مین کھٹکتے تھے۔ ایک مجھی پر کیا منحصر ہے اکثر اُردو کے خوش خیال مویدون نے اس بدنما داغ کو اُسکے نورانی چہرے سے دھونے کی تدبیر کی بلکن یہ ایک ایسا مشکل کام ہے کہ جبتک قریب قریب کل انشا پرداز اس کام پر متفق نہ ہو جائین صرف دو چار شخصون کے اتفاق کر لینے سے کام چلنا دشوار ہے۔ اب سے چودہ پندرہ برس قبل مین نے کتاب اُردو تعلیم مین حتی الوسع اُن اصلاحون اور تدارکون کو مذکور بھی کیا جن سے بہت کچھ اُن قابل قبول اعتراضون کا دفیعہ ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ پہلی کتاب محض بچون کی تعلیم کے لئے لکھی گئی تھی۔ پڑھے لکھے حضرات نے اُن اصلاحون اور ہدایتون پر یا تو سرسری نظر ڈالی اور بھیانک ہو گئے یا سرے سے ملاحظہ ہی نہ کیا۔

بالفرض معمولی خط وکتابت مین اگر ان ہدایات پر عمل نہ کرین تو چندان قباحت نہین ہے۔ کیونکہ نئی بات پر عمل کرنا تا وقتیکہ عادت نہ ہو سخت دشوار ہے۔ لیکن دستاویز اور چھپی ہوئی کتابون مین اس کا لحاظ نہ رکھنا تو اُردو تحریر کو بے چھُری ذبح کرنا ہے۔ یاد رہے کہ بغیر رسم الخط کی درستی اور اشارات املائی کے اُردو کا لٹریچر بالکل ناتمام اور ہمیشہ مورد الزام ہے۔

مجھکو ہرگز یہ دعوی نہین ہے کہ اُردو کے سیاق ورسم الخط کو مین پورا پورا درست کر سکتا ہون۔ لیکن ہان ہمارے ہم قوم چندے ہمارا ساتھ دین اور اپنی بیش قیمت رایون سے اس بارہ مین مدد کیا کرین تو لامحالہ باتفاق راے بہت سے نقائص املاے اُردو کے دُور ہو سکتے ہین۔ ذیل مین جو ہدایات مین درج کرتا ہون اگرچہ اُن مین بعض ایسے بھی ہین جنکو چند خوش خیال مطبع والون نے جاری کیا ہے ورنہ باقی ہدایات غالباً نئے ہین۔ مجھکو اُمید ہے کہ ہندوستان کے شایق انشا پرداز عموماً میرے ان ناچیز نوٹون پر غور فرما کر کوئی ایسی صورت جلد قائم کر دین گے کہ اُردو کے املا سے یہ نقائص بہت جلد دفع ہو جائین گے۔

مین نے حتی الوسع ذیل کی ہدایتون مین بھی اس بات کا رسم الخط کا کسیقدر التزام کیا ہے ملاحظہ ہو۔

پہلی ہدایت

اکثر لکھنے والے لفظ (اُس) بضمِ الف و سکونِ سین میں کلمہ یعنی اشارہ بعید کو واؤ کے ساتھ لکھا کرتے ہیں یعنی (اُوس) حالانکہ حرف واؤ کے بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں حرف الف ماقبل پر پیش دینا اور اشارہ قریب کے لیے الف کو زیر دینا کافی ہے۔

دوسری ہدایت

کسی زمانے میں کہا گیا تھا کہ سہ عاقلاں در بے نقطہ روند۔ مگر اس روشن زمانے میں یوں سمجھنا چاہئے کہ عاقلاں ہنکتہ می گیرند بر ہر نقطہ۔ بے احتنائی سے نقطہ دار حرفوں کے نقطوں کو چھوڑ دینا یا دو خواہ تین نقطوں کی جگہ ایک ہی نقطہ پر قناعت کرنا یا ٹھیک جگہ پر نقطہ نہ دینا سلیقۂ تحریر کے بالکل خلاف ہے نقطہ دار حرفوں کی ٹھیک جگہ پر نقطے دینے چاہئیں۔ حرفوں کے شوشے ہرگز مشتبہ نہ ہونے پائیں تاکہ پڑھنے والے کو امتیاز تام رہے۔

تیسری ہدایت

الف کا بیان

جو الف شروع لفظ میں آئے اور اس کی آواز دو الف کی طرح نکلے یعنی الف الف زبر آ تو حقیقت میں بھی وہ دو ہے۔ مگر ایک لکھا جاتا ہو ایسے الف کے اوپر مد دینا ضروری ہے جیسے آج آہ آم اور جو الف کھڑی آواز کے ساتھ یوں نہ پڑھا جائے اور ابتدا میں واقع ہو تو اس پر وہی حرکت دے دینی ضروری ہے جو اس کی ہو جیسے اِمتحان۔ اُستاد۔ اَبتر۔ الف ساکن کے ماقبل حرکت دینا کچھ ضرور نہیں ہے کیونکہ ایسے الف کے پہلے ہمیشہ زبر ہوا کرتا ہے جیسے شام۔ دام۔ دُعا۔ دَوا

چوتھی ہدایت

حرف واؤ کا املا

واؤ ہمیشہ پوری لکھی جاتی ہے۔ جس واؤ ساکن کے پہلے حرف پر پیش ہو اور خوب کھینچ کر پڑھی جاتی ہو جیسے دودھ تو اس پر جزم معکوس دینا چاہئے جیسے جوتا۔ سوت۔ نور وغیرہ۔

اور اگر ایسی واؤ ساکن خوب کھینچ کر نہ پڑھی جائے جیسے ہوش۔ بھور۔ تو اس واؤ پر جزم معمولی دینا چاہئے مثال گویا زور۔ شور وغیرہ۔ اگر واؤ ساکن کے قبل زبر ہو جیسے غور۔ طور۔ وغیرہ تو اس پر جزم منقلب دینا چاہئے مثال۔ موج۔ نوج۔ دور۔ قوم وغیرہ۔

اگر واؤ ساکن لکھی تو جائے مگر آواز اس کی پڑھنے میں نہ آئے تو اس واؤ پر جزم معلق دینا چاہئے جیسے خود۔ خوش خواہ وغیرہ

پانچویں ہدایت

حرف یا (ی) کا املا

جو حرف یا (ی) لفظ کے آخر میں ہو اور خوب کھینچ کر پڑھی جاتی ہو پوری اور گول لکھی جائے گی ایسی یا کو یائے معروف کہتے ہیں جیسے ولی۔ گھڑی۔ دہلی وغیرہ۔

اور جب ایسی ساکن یا لفظ کے بیچ میں آئے جیسے زمین۔ تیر وغیرہ تو اس پر جزم معکوس دینا چاہئے مثال زمین مہین۔ جینا۔ پینا وغیرہ۔

جب یا (ے) آخر لفظ میں ہو اور خوب کھینچ کر پڑھی جائے تو وہ یا ہمیشہ بازگشتی لکھی جائے گی ایسی یا کو یائے مجہول کہتے ہیں مثال گھوڑے۔ قصے۔ بچے۔

اور جب مذکورہ بالا یا درمیان میں آئے اور شوشہ دار ہو تو اس پر جزم عمودی دینا چاہئے مثال پیڑا۔ بیڑا۔ کھیل۔ بیل وغیرہ

جو یا کہ ساکن ہو اور قبل اسکے زیر ہو اور آخر لفظ میں آئے وہ ہمیشہ نصف دائرہ لکھی جائیگی مثال۔ طے۔ ادی۔ مے۔ شے وغیرہ۔

اور جب مذکورہ بالا یا درمیان میں لفظ کے واقع ہو تو اس پر جزم منقلب دینا چاہئے مثال۔ ذیل۔ بیل۔ ایسا۔ میل وغیرہ

اگر شروع لفظ میں ایسی شوشہ دار یا آئے تو جو اس کی حرکت (زبر۔ زیر۔ پیش) ہو اس پر ضرور دے دینی چاہئے مثال یکے۔ یکانی۔ یل وغیرہ۔

چھٹی ہدایت

حرف نون کا املا

اگر نون دامن دار ہو اور اس کی خوب پوری آواز نہ نکلتی ہو جیسے گانون۔ پانون وغیرہ تو اس نون کے دامن میں نقطہ نہ دیا جائے گا۔ مثلاً میں۔ چھاؤں۔ ہیں۔ کہاں۔

اور اگر اس نون کی پوری آواز ظاہر ہوتی ہو تو نقطہ ضرور دیں گے جیسے جان۔ مہمان۔ زمین۔ حسین وغیرہ۔

جو نون ساکن کہ لفظ کے اندر ہو اور بہ طور غنہ کم آواز کے ساتھ پڑھا جائے جیسے گوند۔ چاند وغیرہ اس نون پر جزم معلق دینا چاہئے مثلاً آنکھ۔ بانس۔ دانت۔

جو نون ساکن درمیان لفظ میں اپنی پوری آواز سے پڑھا جائے اس پر جزم عمودی دینا چاہئے جیسے فرزند۔ پیوند۔ انداز۔ ہند۔ وغیرہ۔

ساتویں ہدایت

ہائے ہوز کا املا

جو ہا مخلوط التلفظ یعنی اپنے پہلے کے حرف سے ملا کر پڑھی جاتی ہو جیسے جھاڑو۔ پنکھا۔ تو وہ ہمیشہ دو چشمی لکھی جائے گی ایسی ہا ہندی لفظوں میں آتی ہے جیسے بھا[illegible] دودھ۔ گھر۔ ٹھوکر۔ ڈھونڈھ۔ واضح رہے کہ ایسی ہا کو بجز مقام مذکور کے دوسری جگہ نہ لکھنا چاہئے ورنہ اشتباہ ہوگا۔

جو ہائے ساکن آخر لفظ میں ہو اور اپنے پہلے حرف سے ملی جلی لکھی جائے اور اسکی آواز دبی ہوئی نکلتی ہو اس کا شوشہ بہت ذرا سا نکالنا چاہئے جیسے توبہ۔ ترکہ۔ غلہ۔ نہ۔ چنانچہ وغیرہ۔

اور اگر اس ہا کی آواز زیادہ نکلتی ہو تو شوشہ اس کا زیادہ کیا جائے گا جیسے کنبہ۔ شبہ۔ گنہ۔ شبہہ۔ لیکن اس کے قبل کے حرف پر جو حرکت ہوگی وہ ضرور دی جائے گی۔

جو ہائے ہوز آخر میں ہو اور لفظ کے ساتھ ملی نہ ہو بہ شرطیکہ آواز اس کی کم نکلے تو وہ مدور یعنی گول لکھی جائے جیسے بندہ۔ پردہ۔ برآمدہ۔ کجاوہ وغیرہ۔ اور اگر زیادہ آواز دیتی ہو تو اس ہا کا الگ شوشہ نکال دینا چاہئے جیسے راہ یا الف آخر میں بڑھا دینا چاہئے جیسے بلا۔

آٹھویں ہدایت

لفظوں کا ایک ساتھ ملا کر لکھنا

اکثر لکھنے والے دو دو لفظوں یا لفظوں کے ٹکڑے جو الگ الگ لکھے جا سکتے ہوں بے کار ایک ساتھ ملا کر لکھ دیا کرتے ہیں۔ جس پڑھنے والے کو اس زبان سے لگاؤ ہو وہ ضرور الجھے گا۔ جہاں تک ہو سکے

لکھتے وقت یہ ضرور خیال رکھے کہ پڑھنے والا عبارت کو آسانی سے پڑھ لے۔

ذیل میں چند مثالیں لکھی جاتی ہیں انھیں پر باقی کو قیاس کر لیجیے۔

یوں نہ لکھے	یوں لکھے	یوں نہ لکھے	یوں لکھے
کیونکر	کیوں کر	او بجکر	اُبجھ کر
اونکیساتھ	اُن کے ساتھ	نکر	نہ کر
غرضکہ	غرض کہ	دیکھکر	دیکھ کر
جمعدار	جماعدار	بطور	بہ طور

نویں ہدایت

اشاراتِ املائے و علاماتِ قرأت

بطور آدمی باتیں کرتے وقت کہیں ذرا سا کہیں زیادہ ٹھہر جاتا ہے۔ کہیں کسی لفظ کو کھینچ کر کہیں مختصر آواز سے کہیں کسی لفظ کو بلند صدا سے کہیں آہستہ بول جاتا ہے، چاہیے کہ لکھنے میں بھی وہی بات پیدا ہو۔ اس لئے یہاں لکھنے کے چند ایسے قاعدے لکھے جاتے ہیں جن کی پابندی سے بہت اشتباہ مٹ جائیں گے

(نجم و نجمین)

یہ تو معلوم ہو کہ پوری بات کو جملہ کہتے ہیں۔ جب جملہ ختم ہو جائے تو وہاں سطر کی سیدھ میں ایک نقطہ دے دینا چاہئے جیسے بخشو بہت نیک بخت لڑکا ہے۔ اس کا گھر دلی میں ہے" ایسے نقطہ کا نام نجم رکھنا چاہئے یہ بھی واضح رہے کہ جب پہلے اور دوسرے جملہ میں کچھ لگاؤ ہو تب ایک نقطہ (نجم) دیں گے اور اگر بعد کا جملہ بے لگاؤ ہو تو دو نقطے دینے چاہئیں ان نقطوں کا نام نجمین ہو گا۔ مثال" امامن کو آج جھوٹھ بولنے کی سزا مل گئی۔ کل میں نے ایک کتاب مول لی" واضح رہے کہ نجم والے جملہ کے بعد بہت کم ٹھہر کر دوسرا جملہ پڑھنا چاہیے اور نجمین والے جملوں کے درمیان کسی قدر زیادہ ٹھہرنا چاہیے۔

دسویں ہدایت

نجم السوال خطِ فصل خطِ وصل

اگر عبارت میں کوئی بات بطور سوال یعنی پوچھنے کے آجائے تو وہاں ایک نشان یوں بنا دینا چاہیے ؟ کہ خبر اور استفہام میں امتیاز رہے ایسے نشان کو نجم السوال کہیں جیسے" آپ کا مزاج تو اچھا ہے" میں تو آج سیر کو نہ جاؤں گا اور آپ ؟

مختلف دو بیانوں یا مختلف دو مضمونوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا خط کھینچ دینا چاہیے جیسے" غرض کہ دنیا میں سلیقہ بڑی نعمت ہے —" اب ہم محبت کا بیان کرتے ہیں" ایسے خط کو خطِ فصل کہنا چاہیے۔

جب کسی عبارت میں کئی لفظ ایسے آجائیں کہ سب ایک ہی طرح یا ایک ہی قسم کے معنی اور حکم میں داخل ہوں تو ان سب لفظوں پر چھوٹے چھوٹے ایک ہی طرح کے نشان بنا دینے چاہئیں جن سے معلوم ہو جائے کہ یہ سب لفظ ایک ہی حکم میں داخل ہیں۔ ان نشانوں کو خطِ وصل کہنا چاہیے۔ جیسے "کیا آپ امیر غریب عالم جاہل سب کو برابر جانتے ہیں۔

گیارھویں ہدایت

خط المتن خطِ تمیز خط الجلی

اگر کسی عبارت کے معنی و مطلب بیان کرنے مقصود

بعض اہل علم کی رائے ہے کہ انگریزی کی جس قدر اشارات املائے میں جوں کا توں اُن کو اُردو میں بھی استعمال کرنا چاہیے حاشیہ

ہیں۔ اس طرح پر کہ پہلے اُس عبارت کو لکھیں اور اُس کے معنی و مطلب کی شرح کریں تو اس پہچان کے لئے کہ یہاں سے یہاں تک وہ عبارت ہے جس کا ہم مطلب کہتے یا شرح لکھتے ہیں تو اصل عبارت یعنی متن پر برابر ایک سیدھا لمبا اور صاف خط کھینچ دیں گے اس خط کو خط المتن کہیں گے۔ جیسے "علم تمام نعمتوں اور دولتوں کی کنجی ہے۔ جاننا چاہیے کہ جتنی چیزیں آنکھوں سے دکھائی دیتی یا جو چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ ان کی کنہ تک پہونچنے کا نام علم ہے۔

جب عبارت میں کوئی ایسا لفظ یا جملہ لکھیں جس سے یہ مقصود ہو کہ پڑھنے والا سمجھ لے کہ لکھنے والے نے خاص کر کے اس لفظ یا اس جملہ پر زیادہ توجہ دلوائی ہے تو اس لفظ یا جملہ کے نیچے ایک سیدھا خط کھینچ دیں گے اور ایسے خط کو خط تمیز کہیں گے۔ جیسے "یوں تو دنیا میں سب نیک صفتیں انسان کو انسان بناتی ہیں لیکن سب سے بڑھ کر سچ بولنا ہے"

اگر عبارت کے شروع یا بیچ میں ایسا لفظ آ گیا ہو کہ خواہی نخواہی پڑھنے والے کی توجہ اُس پر بہت زیادہ دلوانی منظور ہو تو اُس لفظ یا جملے کو اس عبارت کے قلم کے اعتبار سے کسی قدر جلی قلم سے لکھ دیں گے یا خط شکست یا خط نسخ یا اُس خط میں لکھ دیں گے جو اُس عبارت کے خط کے شیوے سے الگ ہو اور ایسے لفظ کو خط الجلی کہیں گے۔ سب کی مثالیں برسات کا موسم شروع ہو گیا۔ دریا کا پانی بڑے زور پر ہو آپ پیرنا موقوف کیجئے۔ اس سال پانی بہت کم برسا پیداوار کی طرف سے بالکل یاس ہے۔

بارھویں ہدایت

توسین۔ واوین۔ کواک

اگر عبارت میں کوئی ایسی زائد بات آ جائے کہ اگر اُس بات کو وہاں سے نکال بھی ڈالیں تو معنی میں کوئی فرق نہ ہو۔ خواہ وہ لفظ یا جملہ کسی پہلے لفظ کی شرح یا معنی یا کسی بات کے کھول دینے کے لئے لائے ہوں تو اس لفظ یا جملہ کو ان ٹھیڑے نشانوں سے گھیر دیں گے تاکہ پڑھنے والا سمجھ لے کہ یہ لفظ یا جملہ عبارت میں زائد ہے ان ٹیڑھے نشانوں کو توسین کہیں گے۔ جیسے سبحان (کریم کا بیٹا) آیا تھا۔ سچی بات (کھری بات) تلخ (کڑوی) ہوتی ہے

اگر اپنی عبارت میں کسی دوسرے کی عبارت یا مثل یا کہاوت یا کسی اپنے ہی مضمون کو لے آئیں اور مقصود ہو کہ وہ جملہ یا لفظ نمایاں رہے تو جہاں سے وہ لفظ یا عبارت شروع کی ہو اس جگہ سے میں یا لفظ کے اوپر دو اُلٹے واو لکھ دیں گے اور جہاں وہ لفظ یا جملہ ختم ہوا ہے وہاں بھی ایسے ہی دو اُلٹے واو بنا دیں اور ان کو واوین کہیں گے۔ جیسے ماسٹر صاحب نے بچے سے فرمایا کہ "تعطیل میں بھی کتابوں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔ آدمی اگر شریف ہو تو اُس کا طور طریق شرفا کا ہو نہ کہ وہ کان پھٹیکا پکوان"

اگر اپنی یا غیر کی عبارت میں کچھ الفاظ طوالت یا کسی سبب سے چھوڑ کر لکھیں گے تو چھوڑی ہوئی عبارت کی جگہ مسلسل پانچ سات یا دس بارہ نقطے دے دیں گے تاکہ معلوم ہو کہ یہاں سے عبارت چھوڑ دی ہے۔ ایسے نقطوں کو کواک کہیں گے۔ جیسے۔ ماسٹر صاحب نے کہا کہ "یاد رکھو جمن سے کہہ دینا کہ اگر اب کسی لڑکے کی شان میں کوئی لفظ ......

بات کی تو میں خوب ......

تیرھویں ہدایت

خط الخطاب خط العتاب خط انکشاف

اکثر جگہ منادے میں حرف ندا کو محذوف کر کے لکھتے ہیں جیسے "اے دوست" کی جگہ صرف "دوست" "ای میرے بھائی" کی جگہ "میرے بھائی" تو ایسی جگہ بعد منادے کے ایک نشان بنا دیں گے۔ مثال۔ دوست! تم کیا کہتے ہو!۔ "ناظرین! میں پھر اس عبارت کو نقل کرتا ہوں" یعنی ای دوست اور ای ناظرین ایسے خط کو خط الخطاب کہیں گے۔

اگر عبارت میں کوئی ایسا لفظ یا جملہ آجائے کہ زبانی کہتے تو ڈانٹ کر یا غل مچا کر کہتے۔ ایسی جگہ اس لفظ یا جملے کے بعد ایک نشان بنا دیں گے اور ایسے نشان کو خط العتاب کہیں گے۔ جیسے "انھوں نے کہا کہ ابیں مردود تو پڑھتا نہیں ہوگا۔ یہ کہہ کر رمضانی کو پکارا "رمضانی! او رمضانی"۔

جب عبارت میں خوشی یا تعجب یا افسوس کا کلمہ آجائے تو اس لفظ کے بعد خط الخطاب کی طرح دو نشان یا تین یا چار (جیسا مقتضا ہو) بنا دینا چاہئے۔ اس خط کو خط انکشاف کہیں گے۔ جیسے۔ سید علی نے بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا!! اور سب سے اول رہا!!! مگر اس کا بھائی فیل ہوگیا!!!!

چودھویں ہدایت

نقطہ اختصار۔ خط تشدید۔ خط اتصال

کسی نام یا کسی اصطلاح یا کسی فقرے کو بسبب طوالت کے اگر چاہیں تو لکھنے میں مختصر کر کے ایک دو حرف اس کے ہر ٹکڑے کے لکھ دیں گے مگر ہر ایک ٹکڑے کے بعد ایک نقطہ اختصار بنا دینا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہاں سے کچھ حرف کم کر دیئے گئے ہیں۔ بعض جگہ کئی کئی لفظوں کے ایک ایک حرف کو ایک ہی جگہ لکھ دیتے ہیں۔ مثال اول "بنگال پولیس" کی جگہ ب۔ پ یا ایسٹ انڈین ریلوے کی جگہ ای۔ آئی۔ آر۔ مثال دوم۔ الی آخرہ کی جگہ الخ یا علیہ السلام کی جگہ ع۔ م۔

اگر عبارت میں ایسا لفظ یا جملہ آگیا ہے کہ زبانی کہا جاتا ہو تو اپنے تیور اور اپنے لہجے سے کہ گویا مخاطب پر تشدید کر رہے ہیں یا دھمکی دیتے ہیں اس لفظ یا جملے کے بعد ایک ٹیڑھا نشان بنا دینا چاہئے۔ اور اس نشان کو خط تشدید کہیں گے جیسے کیوں صاحب! تم ہماری نہیں سنتے ہو دیکھو پھر ہم اپنے نام کے ہیں وہ چھڑی رکھی ہوئی

اگر ایک سطر میں دو عبارتیں ایسی آجائیں کہ ایک کی تفصیل دوسری میں بطور حاشیہ کے ہو تو درمیان میں ایک ٹیڑھا خط کھینچ کر دونوں کا فرق ظاہر کر دیں گے اور اس خط کو خط اتصال کہیں گے۔ جیسے

ٹھاکر پرشاد
ہیرا لال } رہنے والے کندن نگر کے قوم کایستھ

پندرھویں ہدایت

تنبیہ السہو۔ خط الشک۔ خط الیقین

اگر عبارت میں کوئی لفظ لکھنے میں بھول گئے ہیں۔ تو اس لفظ کو عبارت کے اوپر ٹھیک جگہ پر اس کو لکھ دیں گے اور نیچے ایک نشان بنا دیں گے تاکہ معلوم ہو کہ یہ لفظ اس مقام پر چھوٹ گیا تھا۔ اس نشان کو تنبیہ السہو کہیں گے۔ جیسے۔

گائے بھی عجیب بے آزار جانور ہے دودھ دیتی ہے۔ دودھ اس کا
سب کو مفید ہے۔ اگر ایسی عبارت لکھنی پڑے جس کے مضمون
میں لکھنے والے کو یہ شک ہے کہ آیا تحقیقت میں بھی یہ بات
صحیح ہے یا نہیں تو اس جگہ ایک نشان بنا دیں گے اور اس کو
علامت شک کہیں گے۔ جیسے سیٹھی سے معلوم ہوا کہ بکس میں
پچاس روپے رکھے تھے؟ وہ چوری گئے؟

اگر دوسروں کو شک ہو مگر لکھنے والے کو اُس بات
کا یقین ہو تو ایسے مقام پر لکھنے والا ایک نشان حسب ذیل
بنا دے گا اور اس کو خط الیقین کہیں گے۔ جیسے وہاں کل لوگوں
کا بیان ہے کہ "مار پیٹ نہیں ہوئی" مگر ایک شخص اقرار کرتا ہے۹

سولھویں ہدایت

اگلے زمانے میں تو فضول لمبے چوڑے القاب و آداب
کا خطوں اور کتابوں کے عنوانوں پر لکھنے کا بے حد رواج
تھا۔ ایسے ایسے مبالغہ آمیز القاب اختیار کئے جاتے تھے
کہ ممدوح کی ہجو ملیح ہو جاتی تھی۔ مگر اب سمجھتے سمجھتے لوگ سمجھتے
جاتے ہیں کہ بے ضرورت لمبے لمبے القاب لکھنے میں اوقات
کے ضائع ہونے کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ البتہ القاب
میں مختصر طور سے دو ایک ایسے لفظ نام کے ساتھ بڑھائے جائیں
کہ جن سے ممدوح کی اصلی شان یا رُتبہ نمایاں ہو تو مضائقہ
نہیں ہے۔ یورپ میں کیسے کیسے علما فضلا امرا حکام روسا ہیں
مگر نہ خطوں میں کہیں اُن کے نام پر گڑھ گڑھ کر القاب مبالغہ
آمیز لکھے جاتے ہیں اور نہ اُن کے اعلا درجہ کی تصنیفوں
پر صرف وہی القاب یا خطاب درج کئے جاتے ہیں جو
ان کو گورنمنٹ یا کسی یونیورسٹی سے ملے ہیں۔ اس سے
بڑھ کر ہمارے یہاں اور کیا شرم کی بات ہو سکتی ہے کہ کتابوں کے

مصنف خود ہی تو اپنی کتاب چھپواتے ہیں اور عنوان
خود ہی اپنے نام پر لمبے چوڑے مبالغہ سے بھرے القاب
چھپواتے ہیں جہاں مذکورہ بالا باتیں قابل لحاظ
ہیں وہاں یہ بھی بات قابل اعتراض ہے جو مخاطب کے
میں فی زمانہ بے پروائی اور بے تکلفی برتی جاتی ہے۔
کسی دوست کا پورا نام بابو سندر لال خواہ سید رحمت
ہے۔ اب خواہی نخواہی دوستانہ خط میں اُسکی طرف
یا رحمت کر کے خطاب کر رہے ہیں۔ مخاطب کا پورا نام (
س کی شان کا مقتضا ہو) ضرور لکھنا چاہیے۔

اگلے وقتوں میں بلکہ اب بھی اہل علم و تمیز اپنے برابر
والوں اور بے تکلف دوستوں خواہ اندک تفاوت مراتب میں
مخدوم و معظم یا معظم و مکرم کے لقب خطوں میں لکھا کرتے ہیں
مگر اس زمانے میں بزرگوں اور اپنے سے کہیں ذی رتبہ لوگوں
کو بھی خطوں میں اسی القاب سے ملقب کیا کرتے ہیں بعض
حضرات اپنے باپ کے ہم رتبہ و ہم منصب بزرگوں کو
معظم لکھ دیا کرتے ہیں۔ گو کہ معنا یہ القاب کیسے ہی
مگر اہل تمیز مخدوم معظم مکرم فقط برابر والوں ہی کو لکھیں گے
نہ کہ بزرگ رتبہ حضرات کو۔ "التماس" کا لفظ بھی برابر والے
دوستوں کی شان میں استعمال ہوتا ہے نہ کہ بزرگوں کے

سترھویں ہدایت

مختصر القاب خطوط و مکاتیب کے

میرے نزدیک اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ خط و کتابت
طول و طویل القاب سے کام لیا جائے۔ اگر ذیل کے مختصر القاب
خطوں کے لئے مخصوص کر لئے جائیں تو نہایت مناسب ہے
بہت کم سنوں کے لئے خواہ وہ ذی قرابت ہوں

مخدومن" یا "میرے عزیز" کافی ہو۔

جن دوستوں یا برابر والوں سے ملاقات کم ہو اُن کے لئے مکرمی یا مکرم من اور جن سے زیادہ ربط و آمد و رفت ہو اُنکے لئے مخدومی خواہ مخدوم من مناسب ہو اور متوسط درجہ کے بزرگ ہوں اُن کی شان میں "جناب عالی" اور جو اعلا درجہ کے بزرگ ہوں اُن کی شان میں "حضور عالی" لکھنا چاہئے۔

ف

اکثر لکھنے والے واوِ عاطفہ کو شروع سطر میں لکھتے ہیں حالانکہ معطوف الیہ گزشتہ سطر میں لکھا گیا ہو۔ چاہئے کہ معطوف الیہ کے ساتھ ہی (گو کہ آخر سطر میں ہو) واوِ عاطفہ کو بھی لکھ دینا چاہئے۔

خاتمہ

اس وقت تک جس قدر میری فکر نے یاری دی ہے غور کر کے اُردو تحریر کے با املا اور باسلیقہ لکھے جانے پر اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو غالباً اس بیان یا طریقہ پر یہ پہلا مضمون ہے۔ اس لئے اس میں ضروری فروگذاشتوں کا ہو جانا کوئی نئی بات نہیں ہو۔ مجھے پوری اُمید ہو کہ عالی خیال انشا پرداز اُن فروگزاشتوں کی اصلاح کر کے آئندہ اور اور فوائد بھی اس پر بڑھا کر اُردو تحریر کے اس درجے کو ضرور بڑھائیں گے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہ۔

سید علی محمد شاد

امپیریل لائبریری

لارڈ کرزن سابق ویسرائے ہند گو السنۂ مشرقیہ کے فاضل نہ کہلاتے ہون لیکن معاملات مشرقی کے بہت اچھے واقفکار سمجھے جاتے ہین اور اُنکے دماغ کو شرقی مسائل سے ایک خاص اُنس بھی ہے۔ اسی شفقت کا نتیجہ ہے کہ لارڈ ممدوح نے ایک شاندار اور فلک نما عمارت مین بمقام کلکتہ امپیریل لائبریری قائم کی ہے۔ یہ کتب خانہ بہت سی خصوصیات سے ہندوستان بھر کے کل سرکاری کتب خانون سے ممتاز ہے۔ مین گزشتہ گرمی کے روح فرسا اور جگر سوز موسم مین ایک خاص ضرورت سے کلکتے گیا تھا۔ بڑی دقتون سے کچھ وقت نکالکر مین نے اس عظیم الشان اور بے نظیر کتب خانہ کی سیر کی۔

امپیریل لائبریری کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اسمین بُہار لائبریری کے نام سے علوم مشرقیہ کا ایک الگ کتب خانہ موجود ہے۔ بُہار بردوان کے ضلع مین ایک قصبہ ہے۔ یہان مولوی سید خلیل الدین نام ایک فاضل گزرے ہین۔ جنکی علمی شفقت کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا ابو العیاش عبد العلی محمد بحر العلوم اُنکے مدرسہ کے مدرس اعلیٰ بنکر لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ مولانا بحر العلوم مدتون اس مدرسہ مین طالبان علوم کو مستفید کرتے رہے۔ اس زمانہ مین اس مدرسہ کی گورنمنٹ مین بھی بڑی وقعت تھی۔ اور یہین کے فارغ التحصیل علماء صدر آلصدور اور صدر اعلیٰ بنائے جاتے تھے۔ اُسی زمانے مین یہ بے نظیر کتب خانہ بھی مدرسہ کے ساتھ قائم کیا گیا تھا اور اسوقت سے کچھ مدت قبل تک مولانا جلال الدین کے وارثون کے قبضہ مین تھا۔

لارڈ کرزن نے جب امپیریل لائبریری قائم کی اور اسمین بہت سی کتابین السنۂ مشرقیہ کی رکھی گئین تو اُنکے اصرار سے اس کتب خانہ کے مالک مولوی سید صدر الدین صاحب نے اسے بھی امپیریل لائبریری مین شامل کر دیا۔

میری بڑی دلچسپی بُہار لائبریری سے تھی۔ اس لیے باوجودیکہ مین وقت کی کمی اور موسم کی سختی سے اچھی طرح دیکھ نہ سکا۔ تاہم دو چار سطرین صرف اسی کتب خانہ کے لیے نذر ناظرین کرتا ہون۔

اس کتب خانہ مین قریب قریب اکثر کتابین قلمی ہین۔ اور جو مطبوعہ ہین وہ بھی اندنون نایاب اور کمیاب ہین۔ چونکہ مولانا بحر العلوم کے قیام کے اثر سے مجھے امید تھی اس کتب خانہ مین معقولات کی کتابین بہ نسبت دیگر فنون کے بہت زیادہ ہین۔ اور مولانا کی بھی اکثر تصانیف موجود ہین اور شائد ان مین کئی ایک ابتک غیر مطبوعہ ہین بعض نسخے یہان تاریخی دلچسپی بھی رکھتے ہین جیسے شہزادہ دارا شکوہ کا لکھا ہوا پنجسورہ جو وکٹوریہ میموریل ہال کے لیے الگ کر لیا گیا ہے۔ یا شمس البیان جو اردو قواعد و مصطلحات مین جو اہل زبان کی تصنیفات مین سے سب سے پہلی کتاب ہے یا تاریخ شہنشاہی جو مشہور سادات بارہ کے متعلق صرف ایک ہی تاریخ ہے۔ بہت سی کتابین ہین جنپر شاہی مہرین لگی ہوئی ہین۔ چند کتابین جو سرسری نگاہ مین مجھے ممتاز معلوم ہوئین صرف

آنکے نام پر اکتفا کی جاتی ہے۔

تفسیر امام حسن عسکری۔

تفسیر امام جعفر صادق۔

تفسیر سورۂ اخلاص از شیخ ابو علی سینا۔

تفسیر شاہی از ابو الفتح۔

اعلام الہدیٰ از شیخ شہاب الدین سہروردی۔

زیج از ابو علی سینا۔

میر باقر اور علامہ محقق طوسی کے تصنیفات بہت کثرت سے موجود ہیں۔ علاوہ ازیں چند نام اور ملاحظہ فرمائیے

شرح ہدایت الحکمت از میر کبیر جنگی۔

شرح ہدایت الحکمت از نصر اللہ۔

حاشیہ صدرا از بحر العلوم۔

حاشیہ صدرا از ملا نظام الدین۔

حاشیہ صدرا از ملا حسن۔

حاشیہ شمس البازغہ از ملا حسن۔

شرح مسلم الثبوت از ملا حسن۔

شرح مسلم الثبوت از ملا نظام الدین سہالوی۔

شرح مسلم الثبوت از ملا عبد الشکور۔

اخیر کے سطور میں وہ کتابیں ہیں جنکے نام لینے والے صرف ربع صدی تک اور پائے جائینگے۔ ورنہ آیندہ کے لئے زمانہ انکو پیدا کرنے کا خیال ترک کر چکا ہے۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی اپنی لاجواب کتاب سبحۃ المرجان میں میر قمر الدین اور انکی نادر الوجود تصنیف "مظہر النور" کی بیحد تعریف کرتے ہیں۔ مظہر النور کا کامل نسخہ مصنف کے وقت کا لکھا ہوا یہاں محفوظ ہے۔

چنگیز خانی دور دورے میں بغداد کا علمی سرمایہ جسطرح ضائع کیا گیا وہ داستان درحقیقت نہایت دردناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکمائے قدیم کی تصانیف میں سے اگر کوئی نسخہ مل جاتا ہے تو اسکی سخت زندگی پر ضرور تعجب ہوتا ہے۔ اس کتب خانہ میں علم دوست حضرات کو کتب ذیل ضرور جا کر دیکھنی چاہئیں۔

یازدہ رسائل حکمائے سلف۔ اس نام سے معلم ثانی ابو نصر فارابی کی ایک بے مثل تصنیف موجود ہے۔ جسمیں انہوں نے ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ پر محاکمہ کیا ہے۔ اسی مجموعہ میں ارسطو کی کتاب الربانی بھی موجود ہے۔

اثولوجیہ۔ عبد المسیح بن عبد اللہ بن ناعمۃ الحمصی نے ابو یوسف بن اسحاق کندی کی اصلاح سے احمد معتصم کیلئے ارسطاطالیس کی فن الٰہیات کا ترجمہ کیا تھا۔

اقوال افلاطون۔ اس نام سے ایک کتاب موجود ہے جسمیں افلاطون نے طریق تحصیل حکمت پر بحث کی ہے۔ مترجم کا نام معلوم نہیں۔

ثمرۂ بطلیموس۔ بطلیموس نے احکام تنجیم میں اپنے شاگرد سیورس کے لئے چار کتابیں لکھی تھیں۔ یہ ایک کا ترجمہ ہے۔

میار طیس ارسطو۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے ابو بکر بن طاہر الصانع الغزاری کوئی بزرگ ہیں جو متعدد اسناد و روایات کی بنا پر اس کتاب کو ارسطو کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ یہ ایک باتصویر کتاب ہے اور مختلف طلسمات و نیرنجات پر بحث کیگئی ہے۔ اسی جلد میں جسپر لائبریری کی غلطی سے الگ نمبر نہیں ہے۔ ایک دوسری تصنیف ہرمس کی ہے جسے عطارد بن المحاسب نے ترجمہ کیا ہے۔ یہ کتاب "تاثیر الاجسام" کے بیان میں ہے۔ سارا کتب خانہ ایک علمی سند ہے جسکی تشریح کیلئے یہ مختصر مضمون کافی نہیں تاہم بعض علم دوست حضرات کیلئے یہ چند سطور بھی دلچسپی سے خالی نہ ہونگی۔

حبیب الرحمن

ندوۃ العلماء

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئے قسم کی تحریک ہے، اور جب کبھی مسلمانوں کی علمی اور مذہبی تاریخ لکھی جائے گی تو ندوۃ العلما کا ایک مستقل اور نمایاں عنوان قائم کرنا ہوگا، وہ کیونکر قائم ہوا؟ کس نے قایم کیا؟ کیونکر رفتہ رفتہ اس نے مختلف دورطے کئے؟ ایک دلچسپ داستان ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ملک کا بڑا حصّہ اندرونی اسرار سے اب تک بے خبر ہے، اس لئے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کے حالات لکھتے ہیں۔

کسی ملک میں جب کوئی انقلاب آتا ہے تو ہر صیغہ کا اعلیٰ طبقہ ہمیشہ ایک مُدّت تک انقلاب کے قبول کرنے پر راضی نہیں ہوتا کیونکہ وہ اب تک ایک خاص درجہ اور رتبہ رکھتا تھا اور بظاہر اپنے شعبہ کا حکمراں ہوتا تھا، اس لئے جدید انقلاب کے قبول کرنے کو وہ گویا اپنے اقتدار کی شکست سمجھتا ہے۔ ہندوستان میں دَورِ حکومت کے بدلنے نے جب نئی ضرورتیں پیدا کیں، تو کم درجہ کے لوگوں نے فوراً ان ضرورتوں کو محسوس کرلیا اور ان کے سامنے انہوں نے گردنیں جھکادیں جس طرح کہ مغل امپائر کے زمانہ میں فارسی زبان اور اسلامی معاشرت سب سے پہلے کایستھوں نے سیکھی جو برہمن اور چھتری سے کم درجہ رکھتے تھے۔ راجپوتوں نے جاں نثاریاں کیں، خون بہائے، قرابت تک کی لیکن اپنی وضع قطع، طور طریقہ، بول چال کو مطلق نہیں بدلا۔

انگریزی حکومت نے جب ملک میں انگریزی تعلیم پھیلائی تو ملک کا اعلیٰ طبقہ اس کی طرف بہت کم متوجہ ہوا یہاں تک کہ بنگال میں بھی اوّل اوّل برہمن اور اعلیٰ قومیں اس سے الگ رہیں مسلمانوں میں ایک مدت تک اس کا رواج نہ ہوسکا اور چونکہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم میں بڑا حصّہ مذہبی تعلیم کا تھا اور اس کے علم بردار **علما** تھے اس لئے علما کے گروہ نے انگریزی تعلیم کے قبول کرنے کے بجائے علانیہ اس کی مخالفت کی۔

لیکن زمانہ نہ صرف انگریزی تعلیم پھیلاتا بلکہ خیالات میں بھی سخت انقلاب پیدا کررہا تھا، اس بنا پر سخت ضرورت تھی کہ **علما** اپنے نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرتے جو زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ہوتیں اور جدید خیالات کا مقابلہ کرسکتیں۔ لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں چاہا۔ ایک مدت تک یہ حالت رہی اور یہ مقدس گروہ زمانہ کے پرزور سیلاب کا بے فائدہ مقابلہ کرتا رہا آخر جب ضرورت حد سے زیادہ گذر گئی تو ایک انقلاب پیدا ہوا لیکن اس کی تحریک علما کی طرف سے نہیں بلکہ دنیاداروں کے طبقے سے شروع ہوئی۔

مولوی عبدالغفور ایک شخص اس زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے جو بالآخر ریاست رامپور کے وزیر مقرر ہوگئے تھے، ان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ عربی مدارس کا نصاب اصلاح کے قابل ہے اس لئے علما کی ایک انجمن قائم ہونی چاہیے جو نصاب اور دیگر امور کی اصلاح کرے، اس خیال کی بنا پر انہوں نے ایک مولوی صاحب کو جن کا نام مولوی مشتاق احمد تھا اس کام پر متعین کیا کہ وہ جلسہ دستار بندی مدرسہ فیض عام میں شریک ہوں اور وہاں چونکہ بہت سے علما کا مجمع ہوگا اس لئے ان سے مل کر ایک

متعلق مشورہ کریں، ۱۳۱۰ھ میں جب فیض عام کا جلسہ ہوا تو مولوی صاحب موصوف شریک جلسہ ہوے اور علما کے سامنے یہ تجویز پیش کی سب نے نہایت پسند کی اور اسکی ضرورت پر دستخط کر دیئے، اس کے بعد ڈپٹی صاحب نے مولوی صاحب موصوف کو متعین کیا کہ ہندوستان کے تمام علما کی خدمت میں حاضر ہو کر اس تجویز کو ان سے منظور کرائیں اسکے ساتھ تمام مدارس عربیہ کی رپورٹ لکھ کر لائیں۔

سب سے پہلے مولوی صاحب موصوف، مولانا شبلی صاحب نعمانی کے پاس مشورہ کے لئے گئے، انہوں نے یہ رائے نہایت پسند کی اور ایک نقشہ بنا کر دیا کہ اس کے موافق مدرسوں کی رپورٹ مرتب کر کے لائیں، مولوی صاحب موصوف نے ہندوستان کے اکثر شہروں کا دورہ کیا یہاں تک کہ حرمین شریفین گئے حضرت حاجی مولانا امداد اللہ صاحب نے بھی اس تجویز کو نہایت پسند کیا اور اس کاغذ پر جس میں ایسی مجلس کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی دستخط فرمائے۔

۱۸۹۴ء میں جب فیض عام کا جلسہ ہونے کو تھا تو مولانا مولوی محمد علی صاحب کانپوری جو اس تجویز کے حامی تھے، اُن کی طرف سے علما کے نام خطوط شائع ہوے کہ جلسہ میں تشریف لائیں تاکہ انجمن کی باقاعدہ بنیاد قائم کی جائے۔

مولوی شبلی صاحب نعمانی اور مولوی عبدالحق صاحب دہلوی جلسہ سے کئی روز پہلے آئے اور مشورہ میں شریک رہے، جلسہ بڑی شوکت و شان سے منعقد ہوا اور علما کا اس قدر ہجوم ہوا کہ آج تک غالباً کسی موقع پر نہ ہوا ہوگا۔ انجمن کے ابتدائی اور سرسری قواعد بنائے گئے، اور اس کا نام ندوۃ العلما رکھا گیا، ندوہ کے دو اصلی مقصد قرار دئے گئے، ایک یہ کہ موجودہ اور مروجہ نصاب تعلیم کی اصلاح کی جائے، دوسرے یہ کہ علما میں باہم جو جھگڑے اور نزاعیں اور خانہ جنگیاں رہتی ہیں دور کی جائیں۔ جلسہ خیر و خوبی سے ختم ہوا لیکن مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کو ایک جزئی شکایت پیدا ہو گئی جو آگے چلکر ایک سخت مخالفت کے قالب میں نمودار ہوئی یہاں تک کہ مولوی صاحب موصوف نے ندوہ کی مخالفت میں قریباً ۲۰۰ رسالے لکھے اور ان کی مخالفت نے ملک کے ایک بڑے حصہ کو غلطی میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ بمبئی میں اب تک وہ زہر آلود خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔

مولانا محمد علی صاحب ندوہ کے ناظم یعنی سکریٹری قرار پائے، اور نہایت جد و جہد سے انہوں نے ندوہ کی ترقی کی تدبیریں شروع کیں اور حقیقت یہ ہے کہ انہی کو ندوہ کا بانی کہا جا سکتا ہے، انکی تحریک سے نواب وقار الامرا وزیر اعظم حیدر آباد نے پچاس روپیہ ماہوار ندوہ کے لئے مقرر فرمائے اور پچاس خود مولوی صاحب موصوف کی ذات کے لئے، لیکن مولوی صاحب موصوف نے ایثار نفس سے وہ ماہوار بھی ندوہ کی طرف منتقل کر دی، مولانا موصوف کی اعانت کے لئے مولوی سید عبدالحی صاحب ان کے مددگار مقرر کئے گئے اور سچ یہ ہے کہ ندوہ کی بقا اور ترقی میں مولوی صاحب موصوف کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، ان دونوں بزرگوں کے سوا مولانا شاہ سلیمان صاحب، مولانا عبدالحق دہلوی، مولوی مسیح الزماں خاں صاحب کا نام ندوہ کے محسنین میں یادگار رہے گا۔

دوسرے سال ندوہ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جسکی مہمانداری نہایت عالی حوصلگی سے منشی اطہر علی صاحب مرحوم نے کی، مصارف کا تخمینہ تین ہزار تھا جو خود منشی صاحب مرحوم نے اپنی جیب سے ادا کیا، اس جلسہ میں بھی کثرت سے علما

شریک ہوئے اور مقاصد ندوہ پر تقریریں اور نظمیں ہوئیں حیدرآباد میں نواب وقارالامرا نے ریاست کی طرف سے ڈیلیگیٹ بھیجے اور کئی سال تک مولانا لطف اللہ صاحب کو جو عدالت العالیہ کے مفتی تھے ندوہ کی شرکت اور صدارت کی غرض سے بھیجتے رہے۔

دو تین سال تک بڑے زور شور سے جلسے ہوئے اور ہر گروہ و طبقہ کے لوگ کثرت سے شریک ہوئے نئی روشنی والوں نے ندوہ کا خیر مقدم کیا چنانچہ سرسید نے اسکی تائید میں متعدد آرٹیکل لکھے، اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں جو علی گڈھ میں منعقد ہوا تھا، نواب محسن الملک نے ندوہ کے مقاصد کی تائید کا رزولیوشن پیش کیا، اور نہایت مفصل تقریر کی سید محمود صاحب نے رزولیوشن کی تائید کی، اور بالاتفاق پاس ہوا۔

چونکہ ندوہ کا ایک بڑا مقصد طرز تعلیم کی اصلاح تھی اور ندوہ میں اس کے متعلق جو تجویز قرار پائی تھی، وہ اس لئے بیکار رہتی تھی کہ مدارس موجودہ کے مہتمم اور مدرس، نصاب کی تبدیلی پر راضی نہیں ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ نظر آتا تھا کہ جس قسم کے علما موجودہ زمانہ کے لئے درکار ہیں وہ قدیم طرز تعلیم اور قدیم طرز تربیت سے تیار نہیں ہو سکتے، اس لئے مولانا شبلی صاحب نعمانی نے مولوی محمد علی صاحب ناظم ندوہ کو خط لکھا کہ ایک مدرسہ قائم کرنا چاہئے، جس کا نصاب تعلیم اصلاح یافتہ ہو، اور جس میں خاص طریقہ سے تربیت دی جائے مولوی شبلی صاحب نے ایک مسودہ بنا کر مولوی محمد علی صاحب کے پاس بھیجا کہ اس کو تمام علما کے پاس بھیجا جائے، اور انکی رائیں حاصل کی جائیں، یہ مسودہ چھاپ کر شائع کیا گیا، اور قریباً تمام علمائے ہندوستان نے اسکی تائید و تحسین کی مولوی محمد علی صاحب نے علما کی تمام تحریریں ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیں اور اس پر اتفاق ہو گیا کہ ایک مدرسہ دارالعلوم کے نام سے قائم کیا جائے۔

شوال ۱۳۱۳ھ میں ندوہ کا جلسہ بریلی میں منعقد ہوا، اس جلسہ میں دارالعلوم کا مسودہ مع آرا علما پیش ہو کر منظور ہوا، اور مولانا مفتی لطف اللہ صاحب نے جو جلسہ کے صدر انجمن تھے، اسکی منظوری کا اعلان کیا۔

۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء میں بمقام کانپور یہ طے ہوا کہ بالفعل دارالعلوم کا ابتدائی درجہ بمقام لکھنؤ کھول دیا جائے۔ جناب منشی اطہر علی صاحب مرحوم کی کوشش سے نو ہزار روپیہ پر ایک مکان خریدا گیا، یہ رقم جناب منشی احتشام علی صاحب نے بطور قرضہ کے عنایت کی (یہ قرضہ اب ادا کر دیا گیا) ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کا ابتدائی درجہ کھولا گیا، اور رسم افتتاح میں مسٹر ہارڈی صاحب کمشنر اور مسٹر گرے صاحب ڈپٹی کمشنر شریک ہوئے۔

۱۸۹۹ء میں بمقام شاہجہانپور ندوہ کا جلسہ ہوا، دارالعلوم کے لئے مولوی عبدالواجد خانصاحب نے ایک گاؤں وقف کیا، اسی جلسہ میں مولوی عبدالرافع خاں صاحب نے اپنا کتب خانہ جس میں تین ہزار کتابیں تھیں دارالعلوم پر وقف کیں۔

ندوہ جسطرح ترقی کرتا جاتا تھا، اور جس طرح روز بروز اس کا اثر پھیلتا جاتا تھا، اس سے توقع ہوتی تھی کہ ایک سال وہ تمام ہندوستان کا مذہبی مرکز ہو جائے گا، لیکن دفعۃً اس کو ایک سخت صدمہ پہنچا، اس زمانہ میں مکڈانل صاحب لفٹنٹ گورنر تھے۔ بعض قوم فروشوں نے ان سے جا کر شکایت کی کہ ندوہ درحقیقت ایک پولیٹکل تحریک ہے۔ مکڈانل صاحب سخت ناراض ہوئے اور پہلا کام جو انہوں نے کیا یہ تھا کہ منشی اطہر علی صاحب مرحوم

سے ناراضی ظاہر کی، صوبہ کی گورنمنٹ کی ناراضی کا اثر دفعتہً ہر جگہ پھیل گیا، اور ندوہ کی رفتارِ ترقی بالکل بند ہو گئی۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم حیدرآباد چلے گئے، مولوی محمد علی صاحب حج کو تشریف لے گئے، مولوی شبلی صاحب نے ندوہ میں آکر رہنا چاہا، لیکن معلوم ہوا کہ مکڈانل صاحب ان سے بھی بدظن ہیں اور ان کا رہنا اس وقت ندوہ میں مضر ہوگا، اس لئے وہ بھی اپنے وطن میں جاکر مقیم ہوئے۔ ادھر مولوی احمد رضا خاں صاحب کے رسالے اور اشتہارات جو نہایت کثرت سے ندوہ کی مخالفت میں ہمیشہ شائع ہوتے رہتے تھے، انہوں نے بہت سے عوام کو برگشتہ کر دیا، اب ندوہ ایک معمولی مدرسہ رہ گیا اور سالانہ جلسے بند ہو گئے، سب سے اخیر جلسہ مدراس میں ۱۹۰۲ء میں منعقد ہوا، جس کے بعد کئی سال تک کوئی جلسہ نہ ہو سکا۔

مولوی شبلی صاحب نعمانی حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون ہو گئے تھے، ندوہ کے یہ حالات سنتے تھے اور نہایت افسوس کرتے تھے، بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ندوہ میں چل کر قیام کرنا چاہیے اور اس کے متعلق ہر قسم کی کوشش کرنی چاہیے۔ حسن اتفاق یہ کہ مکڈانل صاحب کا زمانۂ حکومت ختم ہو گیا تھا اور وہ ولایت جا چکے تھے، غرض مولوی صاحب موصوف نے حیدرآباد سے لکھنؤ آکر قیام کیا۔ ان کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ گورنمنٹ سے ندوہ کے تعلقات صاف کئے جائیں، چنانچہ اس کے متعلق انہوں نے کوشش شروع کی، کئی برس کے بعد اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ موجودہ لفٹنٹ گورنر صاحب مسٹر ہیوٹ کو صحیح حالات سے اطلاع ہوئی اور انہوں نے ندوہ پر مہربانی ظاہر کی، چنانچہ پانسو روپیہ ماہوار امداد مقرر ہوئی۔ گورنمنٹ سے تعلقات کے صاف ہونے کا تمام تر کریڈٹ جناب کرنل عبدالمجید خاں صاحب کو حاصل ہے جو ریاست پٹیالہ کے فارن منسٹر ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ ندوہ کی مالی حالت درست کی جائے، اور مولوی شبلی صاحب نے جب ندوہ میں آکر دارالعلوم کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا تو ندوہ کی کل آمدنی مستقل سوا سو روپیہ ماہوار تھی، اور خرچ ۴۵۰ ماہانہ تھا، مولوی صاحب موصوف نے ملک سے خط و کتابت کی، بھوپال اور رام پور کا سفر کیا، سر آغا خاں صاحب کو ندوہ میں لائے۔ چنانچہ بھوپال سے ۵۰۰ ماہانہ اور جناب نواب صاحب رام پور اور سر آغا خاں صاحب نے پانچ پانچ سو سالانہ مقرر کیا، مولوی غلام محمد صاحب شملوی جو ندوہ کے سفیر ہیں ان کی کوشش سے رئیس بہاولپور کی دادی صاحبہ نے پچاس ہزار کی رقم دارالعلوم کی تعمیر کے لئے عنایت کی۔ دارالعلوم کے لئے کوئی معقول عمارت نہ تھی اس لئے اس کے متعلق کوشش شروع ہوئی، چنانچہ لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر نے ایک نہایت عمدہ اور خوش فضا ٹکڑا زمین کا عنایت فرمایا جو ۳۱ بیگہ پختہ ہے۔

دارالعلوم کا نقشہ سید جعفر حسین صاحب نے طیار کیا، ۲۸ نومبر ۱۹۰۸ء کو دارالعلوم کے سنگ بنیاد رکھنے کا جلسہ بڑے شوکت و شان سے منعقد ہوا، اکثر رؤسا، علما اور حکام ضلع شریک ہوئے۔

لفٹنٹ گورنر صاحب نے اپنے ہاتھ سے پتھر رکھا، اور ایک نہایت عمدہ تقریر کی۔ لکھنؤ کا قدیم دارالعلوم فرنگی محل کا محلہ ہے، جہاں بڑے بڑے علما و فضلا پیدا ہوئے، اور جن کا طریقۂ درس آج تک ہندوستان میں جاری ہے۔

اس محلہ کا نام فرنگی محل اس وجہ سے ہے کہ یہاں ایک انگریز تاجر رہتا تھا۔ لفٹنٹ گورنر صاحب نے ندوہ کے دارالعلم کی بنیاد رکھی، تو میر اکبر حسین صاحب نے یہ لطیفہ پیدا کیا، کہ اصل فرنگی محل یہ ہے، چنانچہ فرماتے ہیں :۔

رکھی بنائے ندوہ، ہز آنر نے آکے خود سچ پوچھے اگر تو فرنگی محل یہ ہے

ندوہ کا کارنامہ | یہ ندوہ کی ایک مجمل تاریخ تھی، ندوہ نے اسلامی ضروریات کے متعلق جو نمایاں کام انجام دیئے انکی تفصیل حسب ذیل ہے :۔

(۱) سب سے مقدم یہ کہ علما کے گروہ میں جو عام جمود تھا اس میں جنبش پیدا کی، علما، زمانہ کی ضروریات سے بالکل ناواقف تھے، لیکن اب یہ عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ نصاب تعلیم میں بہت کچھ اضافہ اور اصلاح کی ضرورت ہے، نصاب تعلیم کے علاوہ، اور معاملات کے متعلق علمار کے خیالات میں جو انقلاب پیدا ہوا، ندوہ ہی کا اثر ہے عجیب بات یہ ہے کہ ندوہ کا اثر مصر و شام تک پہنچا سید رشید رضا ایڈیٹر المنار جو مصر و شام کے مشہور رفارمر ہیں، انہوں نے ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام مدرسۃ العلم والارشاد ہے، اس کی تمہید میں انہوں نے بیان کیا ہے کہ یہ مدرسہ ہندوستان کے ندوۃ العلما کی تقلید ہے، دیوبند میں جو موتمر الانصار قائم ہوئی ہے، وہ درحقیقت ندوہ ہی کا اندرونی اثر ہے۔

(۲) ندوہ نے عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی بھی لازمی قرار دی۔ اس تجویز کے متعلق اگرچہ ابتدا بہت مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ اس تجویز کے منظور ہو جانے کے بعد مدتوں تک اس پر عمل نہیں کیا جا سکا، لیکن رفتہ رفتہ کامیابی ہوئی، دو تین برس سے انگریزی اسٹاف مکمل ہو گیا ہے اور قطعی امید ہے کہ پانچ چھ برس میں ایسے علما طیار ہو سکیں گے جو عربی کے ساتھ انگریزی سے بھی کافی طور سے واقف ہوں گے، جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ انگریزی میں مقاصد اسلام کی اشاعت کر سکیں گے، یورپ کی تصنیفات سے مستفید ہو سکیں گے، اور نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر اثر قائم کر سکیں گے

(۳) ندوہ نے طریقۂ تعلیم میں بہت سی اصلاحیں کیں، قدیم فلسفہ و منطق کی بیکار کتابیں کم کر دیں۔ ادب اور تفسیر کو ترقی دی، اور ایک خاص درجۂ تکمیل کھولا، جسمیں طالب العلم دو برس تک صرف تفسیر یا ادب کی تکمیل کر سکتا ہے۔ ندوہ کے طلبہ عربی زبان دانی میں جو مہارت رکھتے ہیں اور جس طرح عربی زبان میں تقریر و تحریر کر سکتے ہیں، ہندوستان کے کسی مدرسہ میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

(۴) ندوہ نے عربی کا ایک نہایت وسیع اور نایاب کتب خانہ مہیا کیا تاریخ اور ادب کی تمام نایاب کتابیں فراہم کی گئیں۔ مولوی شبلی صاحب نے اپنا کتب خانہ جو مدتوں کی کوشش سے جمع کیا گیا تھا ندوہ کو دیدیا نواب عماد الملک بلگرامی نے بھی اپنے کتب خانہ کا ایک بڑا حصہ ندوہ پر وقف کر دیا، اس کتب خانہ میں انگریزی کی بھی اکثر نایاب کتابیں ہیں۔

(۵) ندوہ نے چند اور تجویزیں منظور کیں جنکے متعلق کوشش جاری ہے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی زبان میں، اس کام کو نواب عماد الملک بلگرامی انجام دے رہے ہیں چنانچہ پانچ پارہ کا ترجمہ انہوں نے چھپوا کر ندوہ میں بھیجا ہے۔

(۲) انگریزی مدرسوں میں مسلمانوں کے زمانۂ حکومت

کی جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، ان میں اکثر غلط واقعات ہیں۔ ندوہ کے جلسہ سالانہ میں ایک رزولیوشن اس کے متعلق پاس ہوا، اور اس کے متعلق کوشش جاری ہے۔

(۳) وقف اولاد کا مسئلہ جو پریوی کونسل سے غلط فیصل ہوگیا، اسکی اصلاح کے متعلق ندوہ کی کوششیں بارور ہونے کے قریب ہیں۔

(۴) عربی زبان میں جو بہت سے نئے الفاظ داخل ہوگئے ہیں جنکی وجہ سے عربی اخبارات، ہمارے ملک کے علما سمجھ نہیں سکتے، اس کے لئے ندوہ ایک لغت طیار کرا رہا ہے۔ یہ لغت تیار ہوگیا ہے، اور نصف کے قریب چھپ چکا ہے۔ سید سلیمان صاحب پروفیسر ندوۃ العلما نے اس کام کو انجام دیا۔ لیکن اب تک جو کچھ ہوا ہے، سب ابتدائی باتیں ہیں جب تمام ہندوستان کے علما ندوہ کو علوم عربیہ اور مذہبی کاموں کا مرکز قرار دیں گے اسوقت ندوہ کے اصلی مقاصد کی تکمیل ہوسکیگی۔

شاہنامہ فردوسی طوسی

مشہور بات ہے کہ سلطان محمود غزنوی نے حکیم فردوسی سے شاہنامہ مرتب کرایا اور بوجوہات چند اُسکو دل شکستہ کر دیا۔ ان امور کی تفصیل یہاں بیان کرنا فضول ہے۔ ہمکو صرف شاہ نامہ کی تاریخ لکھنی ہے۔

سلطان محمود کے انتقال کے بعد غزنی میں فتنہ فساد کی آگ بھڑک اُٹھی اور ایسی حالت میں کیسے ممکن تھا کہ فردوسی کی جاں کاہی اور سلطان کے شوق کا نتیجہ شاہ نامہ سلامت رہ جاتا۔ چنانچہ اسی بنا پر علامہ لطف علی خاں آذر نے اپنے آتشکدہ آذر میں لکھدیا:-

"حالانمی تواں گفت کہ دریں کتاب شعرے از فردوسی باقی ماندہ باز انچہ مانندہ بمقابل اشعار فصیح بلند او وانکار بلیغ فصحاء در ہر باب شعر خوب و سخن مرغوب دارد۔" علامہ ممدوح کی اس تحریر سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کے وقت میں شاہ نامہ کے اشعار ایسے خلط مبحث ہو گئے تھے کہ اصل کو نقل سے جدا کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

ایک وقت میں اہل ایران کو تدوین شاہنامہ کی جانب خیال ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہت سی جلدیں مرتب ہو گئیں۔ مگر کسی میں کچھ کم تھا اور کسی میں زیادہ۔ اب ہم بتلانا چاہتے ہیں کہ شاہنامہ کی کامل ترتیب کا سہرا کس کے سر رہا اور موجودہ شاہنامہ کی تدوین کیسے ہوئی۔

بعہد شاہ عالم دہلی میں کوشش کی گئی تھی کہ جس قدر نسخے موجود ہیں سب کو جمع کر کے ایک عمدہ اور صحیح نسخہ مرتب کر دیا جائے مگر غلام قادر خاں روہیلہ کی شورش اور چند اسباب سے یہ امر معرض التوا میں رہا۔ قسام ازل نے اسکا شرف سلطان نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کی قسمت میں لکھا تھا۔ اُس نے خود ہی ارادہ کیا اور ایک حد تک اس میں کامیاب بھی ہوا۔ ذیل میں اُن تمام نسخوں کی تفصیل درج ہے جو شاہ اودھ نے فراہم کر کے ایک نسخہ موجودہ شاہنامہ مرتب کیا۔

پہلا نسخہ مولانا عبد الرحیم بن مولانا عبد اللہ القریشی کا لکھا ہوا ۱۰۱۲ھ کا دستیاب ہوا۔ یہ ایرانی خط میں تحریر تھا اور اس میں ۵۱۲۴۳ اشعار تھے، نہایت صحیح، عمدہ اور مطلا تھا۔

دوسرا نسخہ۔ ایرانی خط میں نہایت عمدہ اور صحیح لکھا ہوا محمد حافظ رہتکی کے قلم کا۔ اس میں اشعار کی تعداد ۵۰۰۷۴ تھی اور سال رقم ۱۱۱۱ ہجری تھا۔

تیسرا نسخہ نجد میں بخط نسخ لکھا گیا تھا۔ یہ بھی صحیح اور خوش خط تھا اشعار کی تعداد ۵۰۵۰۰ تھی اور سال رقم ۸۸۸ ہجری۔

چوتھا نسخہ خط نستعلیق نسخ نما میں ایران کا لکھا ہوا تھا۔ صحت کے اعتبار سے غیر درست اور کل اشعار ۵۰۶۷۵ تھے۔ سال رقم ۸۸۸ ہجری۔

یہ چاروں نسخے آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی نے سلطان نصیر الدین حیدر کو ارسال کئے تھے۔

ایک نسخہ سید التفات حسین خاں صاحب کا بہت کہا ہوا دستیاب ہوا۔ اس کا کاتب حاجی علی شیرازی المخاطب بہ کاتب مجلل تھا یہ سب سے زیادہ صحیح اور مستند تھا۔ خط لاجواب اور نہایت عمدہ مینا کاری ہر صفحہ پر تھی۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مہر تھی۔ اور اشعار تعداد میں ۵۲۲۴۳ و سال رقم ۹۹۰ھ تھا۔

ایک نسخہ مسٹر ریکس نے نذر کیا تھا۔ یہ بھی ایرانی خط میں تحریر تھا اور اسکا کاتب عبدالصمد بن علی محمد الحسینی ایک مشہور ایرانی تھا۔ بڑا صحیح اور قابل اعتبار تھا۔ اشعار کی تعداد ۴۹۵۸۲ اور سال رقم سنہ [illegible]ھ۔

دو نسخے منتظم الدولہ نے بھیجے تھے۔ ایک اُن میں سے نہایت صحیح اور خوشخط نستعلیق میں لکھا ہوا۔ اور دوسرا متوسط درجہ کا تھا۔ پہلے میں ۵۵۰۹۰ اور دوسرے میں غالباً ۵۵۰۰۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ سے آیا۔ اس کا خط نہایت عمدہ اور طلائی کام تھا۔ نظام بن محمد شیرازی کاتب اور سنہ رقم سنہ [illegible]ھ تھا۔ ۵۱۱۳۳ اشعار تھے۔

ایک نسخہ مڈلٹن صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب ابن حسن نورالدین اصفہانی تھا۔ کتابت و صحت میں متوسط۔ اس میں ۵۵۹۱۱ اشعار تھے۔ اور سنہ [illegible]ھ میں لکھا گیا تھا۔

ایک نسخہ راس صاحب نے بھیجا تھا۔ اس کا کاتب عبدالکریم بن عبدالغنی جونپوری تھا۔ کتابت و صحت دونوں عمدہ تھیں سال رقم سنہ ۱۰۲۳ھ تھا۔

ایک نسخہ لیمر صاحب کے پاس سے آیا تھا مگر اس میں ایک لاکھ اشعار شریک تھے گشتاسپ نامہ اسدی کے اور دوسری داستانیں فردوسی کی تھیں۔ خط بہت اچھا اور طلاکاری خوب تھی۔ سال رقم سنہ ۱۰۱۹ ہجری تھا۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں لکھا ہوا نہایت معتبر و خوشخط جس میں ۵۶۰۰۰ اشعار تھے اور سال رقم سنہ ۱۰۴۲ھ تھا۔

ایک نسخہ محمد خان قزوینی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت ہی خوشخط اور طلاکار۔ یہ ایسا نفیس و پاکیزہ تھا کہ اسکو تمام جمع شدہ شاہناموں کی عروس کہا جا سکتا ہے۔ اس میں ۵۵۰۰۰ اشعار تھے۔

ایک نسخہ ایرانی خط میں نہایت خوشنما لکھا ہوا جسمیں ۸۰۹۱۱ اشعار تھے۔ گویا بہت زیادہ تھے۔ سات ہزار شعر تیں بغداد و شریف کی تعریف میں بھی تھیں۔ سال رقم سنہ [illegible]ھ۔

ایک نسخہ میں ابتدائے حکمرانی کیکاؤس سے لیکر لہراسپ تک کا حال لکھا ہوا تھا۔ مگر صحت قابل اعتماد تھی سنہ [illegible] ہجری سال رقم تھا۔

ایک نسخہ میرزا علی اصفہانی نے بھیجا تھا جس میں ابتدا سے ہجیر کا گودرز کے پاس کیخسرو کا خط لیکر آنے تک صحیح واقعات مندرج تھے۔

ایک نسخہ آنریبل مسٹر ملول نے بھیجا تھا۔ اس میں سوسن رامشگر کے قصہ سے لیکر آخر تک واقعات ہیں۔ جب ان تمام نسخوں کو دیکھا گیا تو بڑا فرق نظر آیا۔ لیکن نہایت محنت و وقت سے سب شاہناموں کو سامنے رکھکر اُس زمانے کے علما نے ایک اصح نسخہ مرتب کیا۔ اور اصلاح سے سیکڑوں برس کا اختلاف دور ہو گیا۔ ایران پر سب سے بڑا حق ترتیب شاہنامہ کا تھا کیونکہ وہیں اسکی نشو و نما ہوئی لیکن قدرت نے یہ فخر ہندوستان کی قسمت میں لکھا تھا۔ اسی صحیح نسخہ سے غالباً منشی نول کشور نے شاہنامہ طبع کیا۔ اور اسی کی نقل آقا سمیع شیرازی ایران لے گئے جن کے محررہ نسخہ سے سنہ ۱۳۰۹ھ میں ایک عالم ایرانی آموزندۂ شیر مرد فارسی ایرانی نے بمبئی میں بذریعہ فوٹو لیتھو شاہنامہ چھاپا۔ اسکی تقطیع [illegible] اور قیمت [illegible] تھی۔

بعہد سلطان عالم واجد علی شاہ مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور لکھنوی نے سرور سلطانی کے نام سے شاہنامہ کو اردو نثر کا مقفّٰی مسجع لباس پہنایا۔ انگریزی، ہسپانوی اور فرنچ زبانوں کے ترجمے کا مجھے بھی علم ہے۔ ممکن ہے کہ اور یورپین زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے ہوں۔

اُردو زبان اور ناول

ابھی بہت زمانہ نہین گذرا کہ اُردو زبان مین ناول نویسی اور ناول خوانی کی دھوم تھی - پنڈت رتن ناتھ سرشار مولوی عبد الحلیم شرر - منشی عاشق حسین اور حکیم محمد علی یہ اسماء گرامی اُنھین دنون کی یادگار ہین - حالانکہ ان صاحبون مین سے بجز مولوی محمد علی کے اور کسی کو مالی فروغ نہین حاصل ہوا - اور ہندوستان کے سوا دنیا کے کسی دوسرے ملک مین اُنکی آمدنی بڑے بڑے راجاؤن کی آمدنی سے ٹکر کھاتی - تاہم اُنکی کتابون کے پڑھنے والے اور اونکی قدر کرنے والے کم نہ تھے - یہ لوگ اس صنف ادب مین پیشرو کا کام کر گئے اُردو دنیا کے لئے ناول ایک اچھوتی چیز تھی - زبان مین ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانون سے زیادہ دلاویز - اور معمولی مثنویون سے زیادہ پر لطف تھی اسلئے پبلک نے حسب حیثیت ناولون کو ہاتھون ہاتھ لیا - اور ہمارے چندے ناولون کی خوب گرم بازاری رہی - مذکرہ بالا مصنفین کے سوا اور کتنے ہی درجہ دوئم وسوئم کے ناول نویس بھی میدان مین آئے اور اپنی یادگارین چھوڑ گئے - یہانتک کہ رینالڈس کا کوئی ناول ترجمہ ہونے سے نہ بچا - یہ ترجمے بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے - اور ہاتھون ہاتھ بکتے تھے - شاید عام اُردو خوان حضرات کو انگریزی مصنفین مین بجز رینالڈس کے اور کسی دوسرے مصنف سے مطلق دلچسپی نہ ہوگی - ورہار لندن کے اسرار - روزا لیمبرٹ - طلسمی فانوس - حرم سرا - ایلن پرسی - یہ کتابین مہینون تک جوش سے پڑھی جاتی تھین - اور عبرت کو تو لوگ فسانہ نگاری کی معراج سمجھتے تھے - راقم کو بھی اُن دنون ناول لکھنے کی دُھن سوار تھی - شاعری کی طرح ناول نویسی بھی بیکاری کا مشغلہ ہو رہا تھا - ناول کے چند صفحے لیکر ایک مولوی صاحب کی خدمت مین حاضر ہوا جو اپنے تئین شاعر کہا کرتے تھے - اور نثر مین بھی دعویٰ کمال رکھتے تھے - نو مشق مصنفون کو داد کلام لینے کا خبط ہوتا ہے - راقم کو بھی یہی ہوس اُنکی خدمت مین لیگئی - مگر پہلا سوال جو اُنھون نے مجھسے کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے "عبرت" کا مطالعہ کیا ہے - راقم نے معذرتاً کہا کہ وہ کتاب ابھی نظر سے نہین گذری مولوی صاحب نے فوراً مُنھہ پھیر لیا - اور بولے پہلے اُسے خوب غور سے پڑھ جایئے اور تب ناول لکھنے کے لئے قلم اُٹھایئے - گویا "عبرت" ناول نہین - بلکہ ناول گر تھا - اس تیز روی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کس و ناکس نے ناول لکھنا شروع کیا - اسکول اور کالج کے طلبا - اور معمولی لیاقت کے لوگ جنھین سو پچاس اشعار یاد ہو گئے - قلم لیکر بیٹھ گئے اور سمان باندھنا شروع کر دیا - کئی کئی صفحے [illegible] کے بعد بازاری حسن وعشق کا قصہ چھیڑ دیا - موقع بے موقع اشعار چسپان کر دیئے - عاشق کی بیقراری اور معشوق کی بے نیازی دکھائی - کچھ دنون تک جدائی کی تکلیفین اُٹھا کر میان عاشق پر جنون سوار ہو گیا - تب دوستون کی ہمدردی نے پوشیدہ ملاقاتین کرائین - اور عاشق و معشوق کا وصل ہو گیا - قصہ تمام ہوا - شرر اور سرشار کے سوا قریب قریب

سبھون نے یہی طرز اختیار کیا۔ اسی خاکے پر ہر ایک مصنف اپنی لیاقت اور مذاق کے موافق رنگ بھر لیا کرتا تھا۔ آخر ناولون کی ایسی افراط ہو گئی کہ پڑھنے والے تنگ آ گئے۔ منّ و سلوی بھی اگر افراط سے ملے تو اس سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ یہ خاصہ انسانی ہے۔ سنجیدہ مذاق کے لوگون مین رفتہ رفتہ ناول خوانی کا شوق کم ہونے لگا۔ دیکھتے دیکھتے ناولون کا بازار سرد ہو گیا۔ حضرت شرر نے قصّے لکھنا ترک کر دیا۔ اور مجنید و مجنون کے حالات کی تفتیش کرنے لگے۔ محمد علی صاحب نے فسانہ نگاری کو خیر باد کہہ دیا۔ اور آج کوئی مصنف ایسا نہین ہے جسے ہم خصوصیت سے ناولسٹ کہہ سکین۔

اس امر کی تنقیح کہ اُردو ناولون کی بیقدری کے کون کون اسباب محرک ہوئے آسان نہین۔ ملک کی افلاس اور ناولون کی کثرت ایسے عام وجوہ ہین جو ہندوستان کی ہر ایک زبان پر یکسان جاری ہین۔ بنگالی اور گجراتی پبلک اُردو خوان پبلک سے زیادہ مالدار نہین اور نہ ان ملکون مین ناول نویسون کی تعداد اُردو ناول نویسون سے کم کہی جا سکتی ہے۔ جس زبان کے نام لیوا کروڑون کی تعداد مین ہون اُسپر آدھے درجن ناولسٹون کا بار ناقابل برداشت نہین ہو سکتا۔ مگر گجرات اور بنگال مین ناولون کی قدر روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور اُردو کی کیفیت اسکے بالکل برعکس ہے۔ آج شرر کے ناول بہت کم پڑھے جاتے ہین۔ اور عمرت کی طرف بہت کم کسی کی نگاہ عبرت پڑتی ہے۔ فسانہ آزاد کی بھی آج اتنی قدر نہین ہے جتنی آج سے کئی سال پہلے تھی۔ رینالڈس کے ترجمے بھی کم و بیش ناقدری کی زد مین آ گئے۔ اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سرد بازاری کے خارجی اسباب سے قطع نظر کر کے معنوی اسباب ڈھونڈھنے کی کوشش کی جائے۔

اُردو ناول کے حُسن و قبح پر اسکے قبل بعض ادبی اخبارات مین بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ افسانہ خوان طبقے کی تعداد دو بڑے حصّون مین منقسم کی جا سکتی ہے۔ ایک عامیانہ مذاق والے۔ اور دوسرے سنجیدہ مذاق والے اُردو ناول ان دونون کو مایوس کر دیتا ہے۔ نہ اُمبھی ہوئی سین بندیون۔ اور پیچیدہ ترکیبون کا لطف عامیانہ مذاق کو ملتا ہے۔ اور نہ علمی خیالات و جذبات۔ اور لیاقت اخلاق سے گرے ہوئے کیرکٹر سنجیدہ مذاق کو پسند آتے ہین۔ عامیانہ مذاق چاہے موزون اشعار پر لوٹ بھی جائے مگر مذاق متین کی ضیافت کا سامان بہت کم کسی ناول مین نظر آتا ہے۔ اُردو کا چارلس ڈکنس موجود ہے۔ مگر اُردو کا تھیکری۔ چارلس ریڈ۔ میری کارلی۔ جارج ایلیٹ ابھی وجود مین نہین آئے۔ اس بیقدری کی ایک اور وجہ ہے۔ اُردو ناول نویس ابتک بجز سرشار کے تقریباً سب مسلمان تھے۔ اور انھون نے اپنی کتابون مین اُس ہندو جذبہ کی مطلق پروا نہین کی جو مسلمان ہیرو اور ہندو ہیروئن کے تعشق سے پیدا ہوتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ہندوستان ریویو مین ایک مسلمان نے اپنے مضمون مین لکھا تھا کہ اکثر بنگالی ناولون مین ہندو ہیرو اور مسلمان ہیروئن کا جوڑ ملایا گیا ہے جسے پڑھکر مسلمانون کے خون مین جوش آ جاتا ہے اُردو کے کئی مشہور ناولون مین اس لغویت کی بالکل پروا نہین کی گئی۔ علاوہ برین اب ناول مین یہ ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہین رہی کہ عالم شباب مین شادی نہ کرنے

ـه حضرت شرر نے پھر ناول نویسی شروع کر دی ہے اور اُنکے دو تصنیف ناول حال ہی مین شائع ہوئے ہین (ایڈیٹر)

کیا کیا اخلاقی نتائج پیدا ہوتے ہین۔ یا پردہ کرنے سے کیا کیا نقصانات ظہور مین آتے ہین۔ یا صغر سنی کی شادی کہانتک مضر ہے۔ یہ مسائل اب بحث مباحثہ کی منزلین طے کر چکے۔ اور امر مسلمہ کے درجہ تک پہونچ گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے فسانہ نگارون کو ایسے مسائل پر ناول لکھنے کی جرأت کیونکر ہوئی۔ اگر ایک ناول نویس یہ دکھا سکتا ہے کہ پردہ کرنے سے نقصانات پیدا ہوتے ہین۔ تو دوسرا اُسی منطق سے اسکی ضد پایۂ ثبوت کو پہونچا سکتا ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جب ان مباحث کو لوگ ناولون مین ڈھونڈھا کرتے تھے۔ ایسے اخلاقی مسائل کا تصفیہ افسانہ گو کی خیالیون سے نہین ہوا کرتا۔

لیکن ناولون کی اس کشادہ بازاری کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہم تیار ہو جاتے اگر اسکا اثر ہماری ناول نویسی کا معیار اونچا کر دیتا۔ اگر فسانہ نگار طبائع انسانی کے سچے نمونے پیش کرنے لگتے۔ بدقسمتی سے اسکا اثر ناولون کو ملک عدم کیطرف لیجا رہا ہے۔ ۱۹۰۹ء کے اُردو مطبوعات کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صوبہ مین صرف دو ناول شائع ہوئے۔ یہ صوبہ اُردو زبان کا مرز بوم ہے۔ جب یہان یہ کیفیت ہے تو اور مقامات کا کیا ذکر۔ اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے شیدائی اور معاونین اس خیال کو دور کرنے کی کوشش کرین کہ ناول پڑھنا لغو محض اور تضیع اوقات ہے۔ جسطرح ہر ایک صنف کلام مین اعلیٰ ادنیٰ کی قید لگی ہوئی ہے اُسی طرح ناولون کی کیفیت بھی سمجھنا چاہئے۔ اسمین ذرا بھی شک کی گنجایش نہین ہے کہ ادبی دنیا مین قصہ کا وہی رتبہ ہے جو کسی محفل مین صدر مجلس کا۔

کسی زبان کا ادب لے لیجئے۔ افسانہ کا رنگ غالب نظر آئے گا۔ قصہ کا رنگ مذہب۔ اخلاق۔ سیاست۔ غرض جمیع مشاغل زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔ قصون کے ذریعے سے اخلاق کی تزئین۔ معرفت کے رموز۔ تاریخ کے انقلابات زمانۂ قدیم سے ظاہر ہوتے چلے آئے ہین۔ عربی ادب کا نام ایک قصۂ الف لیلہ سے روشن ہے۔ ہارون الرشید کے زمانہ کے طرز تمدن۔ طرز سیاست۔ طرز تعلیم۔ اخلاق و آداب کی اس سے بہتر تاریخ نہین ملسکتی۔ عربی ادب کے شعرا۔ فلسفہ نگار۔ مورخین کسی کے نام سے دنیا آشنا نہین ہے۔ مگر الف لیلہ کی داستان شاید ہی کسی بدقسمت شخص کی نظر سے نہ گذری ہو۔ اُردو مین بنگلہ ادب سے بہت کم لوگ واقف ہونگے۔ مگر بنکم بابو کا نام ہر شخص جانتا ہے۔ گوبندرام ترپاٹھی کا جو گجراتی زبان کے مشہور و معروف ناول نویس تھے پچھلے سال جب انتقال ہوا تو ایک گجراتی رسالہ نے ایک کارٹون کے ذریعہ سے یہ دکھایا تھا کہ گجراتی ادب کا آفتاب غروب ہو گیا۔ جسطرح بنکم بابو بنگلہ ادب کے بادشاہ تھے۔ اُسی طرح گوبندرام گجراتی ادب کے تاجدار تھے۔ علیٰ ہذا اور مثالین بھی دی جا سکتی ہین جنسے معلوم ہو جائیگا کہ ناول نویس کا رتبہ ادبی دُنیا مین کیا ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کو لیلو۔ ڈکنس اور تھیکری اسکاٹ اور ایلیٹ کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ شکسپیر کو بھی نصیب نہین۔ سر جان لبک نے اپنی ایک کتاب مین دُنیا کے بہترین سو کتابون کی فہرست دی ہے۔ اسکاٹ کے سب قصے اُسمین موجود ہین۔ لارڈ بیکنسفیلڈ جو ملکہ وکٹوریہ کے زمانہ مین کئی بار وزیر اعظم رہے لارڈ لٹن

جو ہندوستان کے والسراے رہ چکے ہین انگریزی ادب کے رکن سمجھے جاتے ہین۔ اور یہ دونون اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہین۔ ابکی کانگرس کی پریسیڈنشل تقریر مین آنریبل پنڈت مدنموہن مالوی نے رومیش چندر دت مرحوم کے وفات پر اظہار ماتم کرتے ہوے اُنکی ادبی خدمات کو اُنکے ملکی اور سیاسی خدمات پر ترجیح دی تھی کسی صوبہ کا کمشنر ہو جانا کسی ریاست کا دیوان بن جانا ہر ایک شخص کے حیطۂ اقتدار مین ہے۔ مگر "فاتح بنگالہ" اور "سنسار" لکھ لینا ہر شخص کا کام نہین ہے۔ بنگلہ ادب کے موجودہ صدر نشین بابو ربندرو ناتھ ٹھاکر ہین اور وہ اعلیٰ پایہ کے ناولسٹ ہین۔ گیٹی جرمن زبان کا سب سے مشہور مصنف ہے اور وہ ناولسٹ ہے۔ کاونٹ ٹالسٹاے روس کے موجودہ ادب کے بادشاہ ہین۔ اور وہ ناولسٹ ہین۔ ان مثالون سے یہ کافی طور پر واضح ہو گیا ہوگا کہ ناول نویس کا رتبہ ہر ایک زبان کے ادب مین سب سے زیادہ ممتاز ہوتا ہے۔ اور ادبی دنیا اُسکے احسانات و خدمات کے بوجھ سے سبکدوش نہین ہو سکتی۔ ایسی حالت مین کیا یہ افسوس اور عبرت کا مقام نہین ہے کہ اُردو زبان مین ناول اور ناول نویسی کی یہ بیقدری ہو رہی ہے۔ اس مین زیادہ قیل و قال کی گنجایش نہین ہے کہ ہندوستان کی دیگر زبانون کی طرح اُردو مین بھی قدیم طرز کے افسانون کا نعم البدل ناول ہی رہیگا۔ گویا ناول ادب کا وہ اہم ترین حصہ ہے جسے افسانہ کہتے ہین۔ کیا حامیان اُردو اپنے ادب کا اس بیدردی سے گلا گھونٹین گے۔ دنیاے تخیل مین مشرق ہمیشہ سے مغربی اقوام کا محسود رہا ہے۔ وہ بلند پروازیان۔ وہ وسعت خیال۔ وہ بندش کی رنگارنگی۔ جو مشرقی افسانون مین نظر آتی ہے مغربی قصون مین عنقا کا حکم رکھتی ہے۔ یوروپ باوجود اسقدر ادبی مزاولت کے آجتک الف لیلہ کا ثانی نہ پیدا کر سکا قصہ حاتم طائی ایک عام کتاب ہے۔ مگر مغرب مین شاید ہی کسی نے ایسا دلآویز قصہ لکھا ہو۔ باغ و بہار بھی اپنے طرز کی بے نظیر کتاب ہے۔ کیا دلدادگان اُردو فسانہ نگاری کی بیقدری کر کے ایسے ادبی معجزات کے لئے میدان باقی رکھین گے۔

یہان پر اس خیال کے تردید کرنے کی بھی ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ قصہ خوانی ایک فضول عادت ہے۔ بعض اصحاب فرماتے ہین کہ ناول خوانی سے مذاق بگڑتا ہے۔ اور طبیعت مین کسی ادق مسئلہ پر غور کرنے کی قابلیت نہین باقی رہتی۔ ان اصحاب سے ہم صرف یہ عرض کرینگے کہ آپ فطرت کے قواعد کلیہ نظر انداز نکرین۔ اچھی سے اچھی چیز کا بیجا استعمال بھی مضر ہوتا ہے۔ لقمۂ لطیف بھی اعتدال سے زائد ہو جاے تو معدہ کو سنگین کرتا ہے۔ اگر کسی شخص کو خدا نے نظر تمیز نہین عطا کی تو اسمین جنس کا کیا قصور ہے۔ اچھے برے کی تمیز ہمیشہ مد نظر رکھنی چاہئے۔ ناول ہی پر کیا فرض ہے۔ ادنیٰ قسم کی شاعری۔ ادنیٰ مذاق کا فلسفہ۔ تعصب سے بھری ہوئی تاریخ بھی اپنے دائرہ مین نقصان دہ ہو جاتے ہین۔ مگر اس خیال سے شاعری فلسفہ یا تاریخ کو عضو بیکار نہین سمجھا جاتا۔ پھر ناول نے کیا گناہ کیا ہے کہ

اُسمین اچھے بُرے کی قید ہی نہ رکھی جاے۔ اعلیٰ مذاق کا ناول انسان کی عادت پر اس سے بدرجہا زیادہ اخلاقی اثر پیدا کرتا ہے جتنا کہ کوئی فلسفیانہ۔ مورخانہ۔ یا شاعرانہ تصنیف کر سکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ تمدن مین بعض اوقات ناول نے ایسے ایسے معرکے کے مسئلے طے کر دئے ہین جنپر ملکی مدبر فلاسفر اور مورخ مدتون تک سر کھپایا کئے۔ غلامی کی قبیح رسم کا انسداد ایک ناول ہی کی بدولت ہوا۔ ابھی حال ہی مین ہیگ مین جس کنفرنس کا جلسہ ہوا جسکا مدعا یہ تھا کہ دول یوروپ مین باہمی صلح و آشتی کی کوشش کی جائے۔ اس کوشش مین کامیابی حاصل کرنے کے لئے کنفرنس کو سب سے زیادہ مفید یہی تجویز معلوم ہوئی کہ صلح پر ایک پُر زور ناول لکھا جاے۔ اسکے لئے پانچہزار پونڈ صلہ قرار پایا۔ یہ ناول ہالینڈ کی ایک مصنفہ نے آرمس ڈاون کے نام سے لکھکر گران بہا عطیہ حاصل کیا۔ ان دو انگریزی الفاظ کے معنی ہین "تیغ در نیام"۔ اس کنفرنس مین دنیا کے کل سربرآوردہ اقوام کے وکیل شامل تھے اُن کے ذرائع لامحدود تھے۔ وہ اس موضوع پر فلسفیانہ شاعرانہ مورخانہ۔ غرض ہر ایک صنف کی تصنیف لکھوا سکتے تھے۔ مگر اُنھین ناول ہی سب سے زیادہ کارگر معلوم ہوا۔ جو لوگ سب ناولون کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہین وہ غالبًا یہ فراموش کر جاتے ہین کہ تاریخ یا پالیٹکس یا فلسفہ کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لئے ممکن نہین۔

دنیا مین زندگی کی زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ انسانی آبادی کا بیشتر حصہ کسب معاش کی فکرون مین پریشان رہتا ہے۔ سارے دن اور کچھ رات گئے تک ہمہ دل و دماغ کا عطر سا نکلتا رہتا ہے۔ ایسی حالت مین فلسفہ پالیٹکس یا تاریخ کا مطالعہ بجاے دلچسپی کے خود ایک ریاضت شاقہ ہو جاے گا۔ جنھین فرصت ہے۔ جنھین ہوادار کمرون مین آرام کرسیون پر لیٹے لیٹے۔ یا دن بھر مین دو چار گھنٹون کی سیر سپاٹے کے بعد لقمۂ لطیف کھانے کو مل جاتا ہے اُن کے لئے تاریخ۔ فلسفہ۔ جغرافیہ۔ ریاضی منطق سب کچھ زیبا ہے۔ مگر ایسے لوگ فیصدی کتنے ہین۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ وہی ہے جسے چوبیس گھنٹون مین بارہ گھنٹے نذر معاش کی نذر کرنا پڑتے ہین۔ یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہین۔ یا کچھ نہین پڑھ سکتے۔ یہی سبب ہے کہ آج یوروپین زبانون مین سائنس۔ فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہین۔ تاکہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہو جاے۔ اور علم کے خشک مسئلے اقل درجہ کی دماغی کاوش سے اوسکے ذہن نشین ہو جائین۔ اہل یوروپ نے ناول کو ادب کا سب سے ضروری صیغہ تسلیم کر لیا ہے۔ اور ناول نویسی کو سائینس کا رتبہ دیدیا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو پبلک یوروپین علم ادب کی اس رفتار سے بیخبر ہے۔

ناول نویسون کو بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اردو ناول کا مستقبل اُنکے ہاتھ مین ہے۔ انھین اُستادان فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہئے۔ انکا فرض ہے کہ طبائع انسانی کا نظر غائر سے مشاہدہ کرین۔ اور سچے

جذبات کے نمونے پیش کرین۔ پبلک کا ادبی معیار روز بروز اونچا ہوتا جاتا ہے۔ اور انگریزی تعلیم یافتہ لوگ اپنی زبان مین بھی وہی خوبیان دیکھنے کے متمنی ہین جنکی اُنکی نگاہین عادی ہو رہی ہین۔ بندشون مین جدت۔ خیالات مین تازگی۔ جذبات مین عمق یہ اچھے ناول کے ضروری لوازم ہین۔ بنگلہ زبان کے ناولونکا مطالعہ اُنکے لئے بہت سبق آموز ثابت ہوگا۔ ناول لکھنا آسان کام نہین ہے۔ شاید کسی صنف ادب مین اسقدر جذب خیال۔ اسقدر دماغی انہماک اور اسقدر زور تخیل کی ضرورت نہین ہوتی۔ اُنھین راتین خیال مین ڈوبکر کاٹنی ہونگی۔ انھین صبح و شام تنہا پُر فضا مقامات کی سیر کرنی ہوگی۔ انھین اساتذۂ قدیم کے کلام کی خوشہ چینی کرنی ہوگی۔ تب کہین اُنکے قلم سے پُر زور ناول نکلیگا۔ اب وہ زمانہ نہین رہا جب پبلک بیدانہ کوششون سے آسودہ ہو جاتی تھی۔ پبلک کی نقادانہ نگاہ اب پختہ ہوتی جاتی ہے۔ ہمارے ناول نویس اگر زندہ رہنا چاہتے ہین تو انھین زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم بڑھانا چاہیے۔

د۔ ر

خوفِ رُسوائی

(۱)

ایک آراستہ و پیراستہ کمرہ میں ایک نازک اندام نفیس پوش عورت میز کے سامنے رخساروں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہرے خیال میں غرق ہے۔ مگر ظاہراً اس خیال میں غور کی محویت نہیں ہے۔ بلکہ بے چینی اور انتشار۔ اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار اُس کے حسین چہرے پر نمودار ہیں۔

سرلا۔ بابو دھرن چودھری کی بیوی تھی۔ دھرن کلکتہ کے ایک ہونہار بیرسٹر تھے۔ خلیق اور غریب نواز فیشنبل سوسائٹی سے محترز رہنے والے۔ نہ بال سے رغبت۔ نہ گھوڑ دوڑ کے شیدا۔ وہ تھیٹروں اور پولیٹکل جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے۔ ان کی اوقات کا بیشتر حصہ اپنے مقدمات کی تحقیق و تدقیق میں صرف ہوتا تھا۔ ان کے دوستوں کا حلقہ نہایت محدود تھا۔ جہاں تکلف اور ظاہرداری کے بدلے خلوص اور دوستی کے مراسم برتے جاتے تھے۔ دھرن کو فیشن سے انتہا درجہ کی نفرت تھی۔ باوجود اس کے کہ کلکتہ کا ہر ایک گوشہ پولیٹکل خبروں سے گونج رہا تھا۔ مگر دھرن کو اُنسے صرف اتنی ہمدردی تھی کہ اخبار میں اُن کا تذکرہ دیکھ لیا کرتا۔ پولیٹکس سے اُسے مناسبت نہ تھی وہ اپنے دوستوں میں ایک سیدھا سلیم الطبع، صلح پسند، میانہ رو، خوش باش آدمی مشہور تھا۔ اس کے برعکس سرلا نئے خیالات کی عورت تھی۔ اُس نے اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم پائی تھی اور ہندوستان کے پولیٹکل اور اقتصادی معاملات سے اُسے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک بار وہ اپنے کالج کی لیڈی پرنسپل سے صرف اس بنا پر جھگڑ پڑی کہ لیڈی صاحبہ نے برسبیل تذکرہ ہندوستانی عورات کے متعلق زبان سے کچھ اہانت آمیز کلمات نکالے تھے۔ آزادی نسواں کے متعلق بھی اس کے خیالات بہت وسیع تھے۔ باوجود ان اسباب کے وہ ہندوستانی محبت اور جذبات کی عورت تھی۔ وضع کی پابند شوہر کی ادب اور محبت کرنے والی۔

سرلا سوچتی تھی "کیا یہ ممکن ہے؟" "وہ نفیس ان معاملات سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب کسی بدخواہ کی شرارت ہے۔ کسی سیہ باطن شخص نے یہ دروغ اختراع کیا ہے۔ ایسا ہرگز ممکن نہیں"!

(۲)

حقیقت یہ تھی کہ آج پولیس سپرنٹنڈنٹ نے کئی کانسٹبلوں کے ساتھ دھرن بابو کے مکان کی تلاشی لی تھی بنگال کے روز چارپنج شام کو ہیریسن روڈ کے کنارے ایک نوجوان بنگالی نے ایک انگریز افسر پر بم گولہ چلایا تھا اس ہولناک حادثہ نے سارے شہر میں کھلبلی ڈالدی تھی۔ خانہ تلاشیوں کی گرم بازاری تھی۔ اور سب سے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ دھرن بابو پر اس قتل کی اعانت کرنے کا جرم لگایا گیا تھا جو شخص سنتا اُسے حیرت ہوتی۔ دھرن بابو! نہیں۔ وہ ہرگز ایسے معاملوں میں شریک نہیں ہو سکتے!۔ وہ ایسے سیدھے سادے، سلامت پسند، اپنے کام میں شب و روز محو رہنے والے آدمی تھے کہ کسی کو اُن کے متعلق ایسی متوحش خبر سنکر اعتبار نہیں آتا تھا اور دھرن بابو پر یہ شبہ محض ایک مخبر کے بیان کی بدولت عائد ہوا تھا۔ مخبر نے صاف صاف کہا تھا کہ شکل کو چار بجے دھرن بابو ہیریسن روڈ پر موجود تھے۔ اور اُنہوں نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے

پر گودہ دیا تھا۔ اسی بیان کی بدولت آج دھرن بابو کی خانہ تلاشی ہوئی۔ صندوق، الماریاں، کاغذات، خطوط ایک بھی تفتیش کنندہ افسر کی متجسس نگاہوں سے نہ بچا۔ اور باوجود یکہ کوئی ثبوت ایسا نہ ملا جس سے دھرن بابو پر اعانت جرم کے شبہ کی تائید ہو سکے۔ تاہم سپرنٹنڈنٹ نے انھیں زیر حراست لے لیا۔ سرلا انھیں پریشان کرنے والے واقعات کے اثر سے اس وقت بے چین ہے۔

وہ خیال کرتی تھی: "ضرور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے غلطی ہوئی اس نے دھوکا کھایا۔ منگل کو چار بجے دھرن عدالت میں ہوں گے، عدالت سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ ان کے موکل اور احباب اسکی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر دھرن نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے روبرو اپنی بریت کا ثبوت کیوں نہ دے دیا۔ ممکن ہے اس وقت گھبراہٹ میں انھیں خیال نہ رہا ہو۔ اب ضرور انھوں نے صفائی کرا لی ہوگی اور غالباً آتے بھی ہوں گے۔"

ان خیالات سے سرلا کا دل ذرا ہلکا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک موٹر کار دروازہ پر آ کر رکی۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ وہ مسرت سے بیتاب ہو کر زینہ سے نیچے اتری۔ موٹر گھر ہی کا تھا۔ مگر اس میں دھرن بابو کے بجائے جوتندرو بیٹھے ہوئے تھے۔ جو دھرن کے دلی دوستوں میں سے تھے۔

سرلا نے پوچھا: "دھرن کہاں ہیں۔ دیکھا پولیس والوں نے کیسی حماقت کی ہے۔ تم جانتے ہو منگل کے دن شام کے وقت وہ ہائی کورٹ میں تھے۔ کیوں صفائی ہو گئی نہ۔ کب تک آئیں گے؟ تم ان سے ملے تھے جو؟"

جوتندرو کے چہرہ نے سرلا کے خیال کی تائید نہیں کی۔ وہ فکر مند اور دردناک نگاہوں سے سرلا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے گھبرا کر کہا "جوتن تم اس قدر پریشان کیوں ہو صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔؟"

جوتن نے کچھ سوچ کر جواب دیا: "شاید دھرن آج شب کو نہ آ سکیں۔ ممکن ہے کچھ توقف ہو۔ جونہی ان کی صفائی ہو گئی۔ غالباً ان کا تیسے ملنا ضروری ہے۔ میں خیال کرتا ہوں ——" یہ کہتے کہتے جوتن بابو رک گئے۔ سرلا تاڑ گئی کہ یہ کوئی منحوس خبر لائے ہیں۔ گھبرا کر بولی "جوتن! مجھے اس وقت پہیلیاں مت بجھواؤ۔ جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہو۔ مجھ میں اب برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ کیا دھرن ابھی رہا نہ ہو سکیں گے۔ کیا انھوں نے اپنے بریت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ وہ منگل کو چار بجے عدالت میں تھے۔ میرے خیال میں یہ تو بہت کافی ثبوت تھا۔"

جوتندرو نے لمبی سانس لیکر کہا "وہ منگل کو سہ پہر کو عدالت میں نہیں تھے۔"

سرلا: "کیا! عدالت میں نہیں تھے۔ آخر تب کہاں تھے؟"

جوتندرو: "یہی تو وہ بتاتے نہیں۔"

سرلا: "کیوں آخر وجہ، کیا آپ ہی اپنے دشمن ہو گئے ہیں؟"

جوتندرو: "وہ مطلق کچھ نہیں ظاہر کرتے۔ عدالت میں ان کے دو بجے تک رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر کہیں گئے مگر کہاں گئے اور دو بجے سے دس بجے تک کہاں رہے۔ اس کا وہ کچھ بھی پتہ نہیں دیتے۔"

سرلا نے عالم دہشت میں سر کو ہاتھوں سے تھام کر کہا "میری عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ دھرن کو کیا ہو گیا ہے! یہ غیر ممکن ہے کہ وہ اس سازش میں شریک ہوں۔ اگر وہ خود اپنی زبان سے کہیں تب بھی مجھے اعتبار نہیں آ سکتا۔ مگر وہ صاف صاف حقیقت حال کیوں نہیں کہتے۔ کیا تم لوگوں نے انھیں سمجھایا نہیں؟"

جوتندرو: "سمجھایا کیوں نہیں۔ گھنٹوں بیٹھے سر مغزی کرتے

رہے۔ مگر جب کچھ ان کے خیال میں آئے۔ اور وہ ایسے کم فہم نہیں ہیں کہ ہم کو ان کے سمجھانے کی ضرورت ہو۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ یہ ایسے نازک موقع پر ان کا کچھ صاف صاف نہ کہنا کیسے خطرناک نتائج پیدا کرے گا۔ مگر اس وقت وہ کسی کی نہیں سنتے۔ کہتے ہیں بابے میں چند سالوں کے لئے جلاوطن ہو جاؤں گا۔ جلاوطنی اور قید بھگتنے کے لئے آمادہ ہیں مگر مشکل کو کہاں تھے۔ یہ نہیں بتاتے۔ اس لئے میں تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید کچھ تمہیں معلوم ہو۔ کچھ معلوم ہے؟ وہ زیادہ تر کہاں آتے جاتے ہیں؟"

سرو نے سر ہلا کر جواب دیا "میں نے انھیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ میں تو اب تک اسی خیال سے خوش تھی کہ کل کو چار بجے وہ ضرور کچہری میں رہے ہوں گے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آخر وہ کیوں خاموش ہیں۔ کیا سمجھے ہوئے ہیں۔ ذرا مجھے ان کے پاس لے چلو۔ شاید وہ مجھ سے کچھ اپنے دل کی بات کہیں۔ ضرور کہیں گے۔ میں انھیں سمجھاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں ان کی زبان سے حقیقت حال سن لوں گی۔ وہ میری درخواست کو رد نہیں کر سکتے۔ بس مجھے ان کے پاس لے چلو۔"

سرلا کا گلا بھر آیا۔ جوتن دردِ تسکین دہ لہجہ میں بولے "میرا بھی خیال ہے کہ شاید تم سے وہ کچھ بتلائیں۔ اسی لئے میں تمہارے پاس آیا تھا۔ مگر اب رات زیادہ آگئی ہے۔ اور اس وقت ان سے ملاقات کرنے کی کوشش فضول ہے۔ مجسٹریٹ کی اجازت ملنی مشکل ہوگی۔ میں کل تمہیں وہاں لے چلوں گا۔ ایشور نے چاہا تو سب اچھا ہی ہوگا۔ ہائیں۔ یہ کیا۔ دل کو ڈھارس دو۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

سرلا کی آنکھوں میں اشک امڈے ہوئے تھے۔ مگر اُسے ضبط کیا۔ اور جوتن سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی "جوتن تمہاری ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میری زبان میں الفاظ نہیں ہیں۔ مگر میں انھیں فراموش نہیں کر سکتی۔"

سرلا کی آواز پھر رک گئی۔ وہ کیسی خوش خوش زینے سے اتری تھی۔ دھرن کی واپسی کی امید نے اس کے چہرہ کو روشن کر دیا تھا۔ مگر اب اس پر حسرت و یاس کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ جوتن بابو آہستہ آہستہ۔ فکرمند کمرہ سے باہر چلے گئے۔ وہ سوچتے جاتے تھے "غریب! ابھی اُسے کیا خبر کہ کیا بیتنے والی ہے۔ کاش وہ ظالم اپنی زبان سے کچھ کہہ دیتا۔ مگر تب بھی۔ عجیب گومگو کا معاملہ ہے۔"

(۳)

دس بج گئے تھے۔ سرلا نے کچھ نہیں کھایا۔ نوالے منہ سے باہر نکل آتے تھے۔ وہ پلنگ پر گئی۔ مگر نیند نہ آتی تھی۔ میز کے سامنے اخبار لے کر بیٹھی۔ مگر اخبار ہاتھ میں تھا اور آنکھیں کھڑکی کی طرف۔ تب وہ اٹھکر ٹہلنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اسی وقت دھرن کے پاس چلوں۔ چلکر مجسٹریٹ سے کہوں کہ مجھے ان سے ملاقات کرنے دو۔ کیا وہ انکار کرے گا؟

ملے۔ دھرن اس وقت کیا کرتے ہوں گے۔ کاش میں ان کے پہلو میں ہوتی۔ کیا وہ مجھ سے بھی اپنے دل کا حال چھپائیں گے۔ کیا اس وقت انھیں میرا خیال ہوگا۔ کبھی کبھی اس کا دل جھنجھلا اٹھتا اور وہ اپنے شوہر کو بے رحم خیال کرتی۔ کیا انھیں خبر نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں۔ اتنے دنوں کا ساتھ رہنے پر بھی انھیں میرے دل کا اور میری محبت کا اندازہ نہ ہوا۔ وہ کیوں خاموش ہیں۔ وہ کیوں۔

ٹہلتے ٹہلتے اُس کی نگاہ دھرمیندر کی میز پر پڑی۔ خطوط۔ کاغذات۔ اخبارات اوراق پریشاں کی طرح بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ سرلا اضطراری طور پر بیٹھ گئی۔ اور انھیں سمیٹنے لگی یکایک اس کی نگاہ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پڑی جو میز کے نیچے گرا ہوا تھا۔

اس نے چاہا کہ اسے اٹھا کر دوسرے خطوط کے ساتھ رکھ دے۔ مگر اس پرزے پر چند ایسے الفاظ نظر آئے جو خود بخود اُسکی آنکھوں میں چبھ گئے۔ یہ وہ الفاظ تھے جن کے پردہ میں اس کی پریشانیوں کا راز پوشیدہ تھا۔ "منگل کے دن ۴ بجے" سرلا چونک پڑی۔ اُس نے پرزے کو اٹھا لیا۔ منگل کے دن ۴ بجے ہی کا تو یہ واقعہ ہے۔ اُس نے ان الفاظ کو پھر غور سے دیکھا۔ کیا اس پرزہ کو ان واقعات سے کوئی تعلق ہے۔ کیوں میں نہ اُسے پڑھوں۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ انداز تحریر سے بھی وہ مانوس معلوم ہوتی تھی۔ مگر خط کو پڑھوں؟ سرلا باوجودیکہ شوہر کو دل وجان سے چاہتی تھی لیکن انگریزی تعلیم کے اثر نے اُس کے دل میں یہ خیال قایم کر دیا تھا کہ مجھے اپنے شوہر کے پوشیدہ خطوط پڑھنے کا کوئی مجاز نہیں ہے کیا میں اس خط کو پڑھ لوں تو وہ مجھ سے ناراض ہوں گے۔ یقیناً اس سے ان معاملات پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑے گی اس میں کوئی ایسی بات ہرگز نہیں ہو سکتی جو دھرن مجھ سے چھپانا چاہتے ہوں۔ بالفرض اس میں کوئی مخفی بات ہی ہو۔ تاہم میں اس وقت اسے پڑھنے کی مستحق ہوں۔ تہذیب جدید کی پابندیاں ایسے نازک موقعوں پر عمل میں نہیں آسکتیں۔ کیا مجھے اُن کے رازدار بننے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ میں ثابت کر دوں گی کہ میرے دل میں بھی باتیں اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہیں جس طرح اُن کے دل میں۔

اس نے خط کھول کر دیکھا۔ یہ ایک مختصر سا خط تھا۔ سرلا ایک ہی نگاہ میں اُسے پڑھ گئی۔ اور اُسے ایسا معلوم ہوا گویا میرے بدن میں جان نہیں ہے۔ وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس و حرکت ہو گئی۔ اس کی انگلیوں کے بیچ میں کاغذ کا وہ پرزہ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھیں دیوار کی طرف گڑی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ خاک کی طرح زرد ہو گیا تھا بلکہ عضو مفلوج کی طرح اس کے دل ودماغ اس وقت بیکار ہو گئے تھے خط کا مضمون بھی خیال میں نہیں آتا تھا۔ وہ بہت دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی۔ یکایک اس کی نگاہوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اور ساری کیفیت نظروں کے سامنے صورت پذیر ہو گئی۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور کرسی پر گر پڑی آہ اس خموشی کے یہ معنی ہیں! اسی لئے زبان پر مہر لگی ہوئی ہے" خیر۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ سرلا سوچنے لگی۔

بیشک یہ خط دھرن کو اس الزام سے بری کر دے گا۔ جو اُن پر عائد ہے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔ میں اسے مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دوں گی۔ ذرا سی تحقیقات میں سارے واقعات کھل پڑیں گے۔ اور دھرن فوراً رہا ہو جائیں گے۔ لیکن اسکے بعد پھر کیسے نبھے گی! کیا اس کے بعد بھی ہم ایک دوسرے کی محبت کر سکیں گے۔ !!

اسے پھر خیال آیا۔ کیا یہ مناسب ہے کہ میں اس راز کو اس طرح طشت ازبام کر دوں جن کے مخفی رکھنے کے لئے دھرن یہ سب کچھ جھیلنے کو تیار رہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ میں خموشی اختیار کروں۔ اور انھیں اس الزام کا خمیازہ اٹھانے دوں جس سے وہ بالکل پاک ہیں۔ انھیں بچانا میرا فرض ہے۔ آخر اُس کے دل نے فیصلہ کر لیا۔ وہ کھڑکی کی طرف گئی۔ باہر جھانک کر دیکھا۔ پھر اپنے کمرہ میں آ کر ایک چادر اوڑھ کر باہر نکل پڑی۔ نوکر چاکر سب سو گئے تھے۔ گلیوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اُسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔

سرلا قدم بڑھاتے ہوئے تھوڑی دیر میں ایک خوبصورت مکان کے سامنے آ گئی۔ کمرہ میں لیمپ جل رہا تھا۔ اور ایک عورت میز پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھتی دکھائی دیتی تھی۔ سرلا کو دیکھتے ہی اس عورت نے گھبرا کر

پوچھا "سرلا! تم یہاں کہاں؟ اتنی رات گئے۔ کیا معاملہ ہے۔ کیا دھرن بیمار تو نہیں ہیں؟"

سرلا نے میز کے سامنے آکر کہا "کیا تم نے نہیں سُنا کہ دھرن پر حادثۂ بم میں شریک ہونے کا جرم عائد ہوا ہے۔ مخبر کا بیان ہے کہ جس وقت قاتل کے ہاتھ میں بم دیا گیا اُس وقت دھرن وہاں موجود تھے۔ یہ منگل کے چار بجے دن کا واقعہ ہے دھرن کا بیان ہے کہ مجھے ان سانحات کا مطلق علم نہیں۔ اور نہ اُس وقت میں وہاں تھا۔ لیکن یہ وہ نہیں بتاتے کہ اُس وقت تھے کہاں۔ میں تم سے پوچھتی ہوں منگل کے دن چار بجے شام کو وہ کہاں تھے؟"

وہ عورت چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی "منگل کو بہ بجے!۔ اُس دن تو وہ.... " کچھ کہتے کہتے رک گئی اور بہت مدھم لہجہ میں بولی "کیوں وہ کچھ بتاتے نہیں کیا۔ سوا کچہری کے اور کہاں ہوں گے!"

سرلا نے جواب دیا "وہ نہیں اُس دن عدالت میں نہیں تھے"

گو ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ "اُگل پڑی" "اور اس معاملہ میں وہ اس لئے خاموش ہیں کہ شاید اظہار حال کسی کے نام نیک پر دھبہ لگا دے اب میرے سامنے ایسی بھولی نہ بنو۔ میں سب جان گئی ہوں۔ ہاں مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا ہے یہ دیکھو" یہ کہکر اس نے وہی خط میز پر پھینک دیا

اس عورت نے ایک گھونٹ اُٹھالیا۔ اور اس پر اُٹھتی ہوئی نگاہ ڈالکر کسی قدر حیا کانہ لہجہ میں بولی "مجھے کسی کا خوف نہیں ہے۔ بیشک دھرن کو مجھ سے محبت ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ تب سرلا نے تحکمانہ انداز سے کہا "تو تم یہ کیوں نہیں لیتیں۔ اس خط کو مجسٹریٹ کے پاس بھیجدو۔ اور دھرن فوراً چھوٹ جائیں گے" یہ کہکر وہ لوٹ پڑی۔ اور اپنے خانۂ عزلت میں چلی آئی۔

دھرن کی رہائی کی فکر نہ تھی اس فکر سے اب وہ آزاد ہوگئی تھی۔ مگر جن فکروں نے اس وقت اسے گھیرا تھا وہ اس سے بھی زیادہ [illegible]

"تھوڑی دیر میں وہ یہاں آتے ہوں گے۔ مجھے ملاقات ہوگی کیا میں ان سے مل سکوں گی؟ اب میں کس دھو لے پر، کس برتے پر اُن سے ملوں گی۔ جب یہ میں جانتی ہوں کہ انھیں مجھ سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہے۔ تو میں کونسا منہ لیکر ان کے سامنے جاؤں گی جب تک میں الفت کا خواب دیکھ رہی تھی۔ مجھے اُن پر اعتبار تھا۔ مگر اب آہ اب میرے لئے زندگی میں کیا امید ہے میرا دل، میری جان میری آرزوئیں، میری زندگی کی خوشیاں سب ان کی ذات سے وابستہ تھیں۔ محبت سے عورت کا سہاگ قائم ہے میرا سہاگ لٹ گیا"

سرلا کی آنکھیں کھڑکی کے باہر سبزہ زار کی طرف لگی ہوئی تھیں گویا وہ مستقبل کے وسیع میدان میں قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اُس کے دماغ میں اب احساس کا مادہ نہ رہا تھا۔ بھوک اور پیاس، نیند اور تکان۔ یہ ضرورتیں اسے بالکل محسوس نہ ہوتی تھیں سست رفتار دن چڑھتا جاتا تھا اور سرلا وہیں کھڑکی کے سامنے انھی خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ دھرن کی اب تک کچھ خبر نہ تھی۔ مگر سرلا کو اس کی زیادہ تشویش نہ تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ہمیشہ ایک حلیم اور متین شخص سمجھتی رہی۔ اُس نے بارہا اُن سے اُن کی بے تکلفی اور بے اعتنائی کی شکایت کی تھی۔ مگر اس خیال سے اس کے دل کو تسکین ہوگئی تھی کہ ان کی طبیعت ایسی متین واقع ہوئی ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ طبعاً اظہار جذبات سے محترز رہتے ہیں وہ اس کی طرف سے ہمیشہ بے تعلق سے رہتے تھے۔ کچھ پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ کیسے رہتی ہے۔ کن چیزوں کا شوق ہے ایسا شاذ ہی کبھی اتفاق ہوا تھا کہ وہ دُرگا پوجا کے دن اس کے لئے کوئی تحفہ لائے ہوں۔ سرلا سمجھتی تھی کہ معاملات کی صورت

ان بے اعتنائیوں کا باعث ہو۔ اسے یقین تھا کہ گو ظاہر نہ سہی۔ مگر دل سے وہ میری محبت کرتے ہیں۔ مگر اب ان سرد مہریوں کا راز سمجھ میں آگیا۔ وہ اب دوسری عورت کے دام محبت میں گرفتار ہیں۔ جب محبت کا رشتہ نہ رہا تو تمدنی رشتہ کس کام کا گو باوجود ان سرد مہریوں کے وہ شوہر کی محبت میں مخمور رہی۔ اُس نے انھیں اپنے دل میں جگہ دیدی تھی اور اب کسی طرح ہٹا نہیں سکتی تھی۔ خواہ وہ محبت اُس کے لئے سوہان روح ہی کیوں نہ ہو۔ بیشک یہ خیالات حسد اور جلن کے سبب سے پیدا ہوئے تھے۔ مگر حسد کی تیزی اور جلن ہی محبت کی کسوٹی ہے۔

بہت دور تک سوچنے کے بعد سرلا اس نتیجہ پر پہنچی "میں اب ان کا دامن چھوڑ دوں گی۔ اس کے سوا میرے لئے اب اور کوئی تدبیر نہیں ہے میں نے اب تک نادانستہ انھیں قید جبر میں رکھا ہے اب میں انھیں چھوڑ دوں گی۔ اُن کا گلا چھوٹ جائے گا اُن کی زندگی آرام سے گذرے گی۔ ایشور کرے وہ ہمیشہ خوش رہیں۔ سرسبز ہوں۔ انھیں خوش دیکھکر میں بھی خوش ہولیا کروں گی"!

انھیں خیالات میں دس بج گئے۔ سرلا اب تک وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک ایک گاڑی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ دھرن بیٹھے ہوئے تھے۔ سرلا کا کلیجہ دھڑکنے لگا مگر وہ بے جان لاش کی طرح بیٹھی رہی۔ زینہ پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ اور ذرا دیر میں دھرن کمرہ میں داخل ہوئے۔ سرلا اب بھی کچھ نہ بولی۔ اُسے الفاظ ہی نہ ملے دھرن نے اُس کے پاس آکر آغوش محبت میں لینا چاہا۔ اور بولے "کیوں سرلا تم میری خاطر بہت پریشان تھیں"؟ سرلا نے منہ پھیر لیا اور ہٹ گئی۔ دھرن نے کچھ خیال نہ کیا۔ کہنے لگے "پولیس والوں نے کیسی حماقت کی۔ خیر جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا۔ کسی طرح خانہ عافیت میں تو پہنچے۔ رات بھر مصیبت میں مبتلا رہا"!

سرلا خاموش اُن کے چہرہ کی طرف تاکتی رہی کیسی مکر کی باتیں ہیں۔ دھرن کے برتاؤ میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہی بے تکلفی وہی آزادی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ سرلا زیادہ متحمل نہ ہو سکی۔ ترش لہجہ میں بولی "تم یہاں کیوں آئے"؟ دھرن نے تعجب آمیز لہجہ میں کہا "سرلا یہ کیسی باتیں کرتی ہو۔ اپنے گھر کے سوا اور کہاں جاتا۔ تم میرے آنے سے خوش نہیں معلوم ہوتیں۔ کیوں کیا بات ہوئی ہے"؟

سرلا "ابھی اُس سے ملاقات کی یا نہیں"؟

دھرن "کس سے؟ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا"!

سرلا "دھرن۔ اب یہ تجاہل مت جتاؤ۔ اب حیلہ سازیوں کا موقع نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ ہم میں صفائی کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔ مجھ پر تمہاری ساری باتیں روشن ہو گئیں ہیں۔ ایک خط میری نظر سے گذر چکا ہے جو مجھے میز کے نیچے گرا ہوا ملا۔ یہ خط میں نے تمہاری معشوقہ کو دکھایا۔ اور غالباً اُسی نے اسے مجسٹریٹ کے یہاں پیش کر دیا اس لئے اب مجھ سے دخل فصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری خوشی میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمھیں شوق سے لطف زندگی اٹھانے کے لئے آزادی دیتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں مجھے اور پہلے کیوں نہ معلوم ہو گئیں ورنہ تمھیں اتنے عرصہ تک قید بے جا میں نہ رہنا پڑتا"!

دھرن بغلیں جھانکنے لگا۔ آخر راز طشت از بام ہو گیا میں نے کیا حماقت کی کہ خط کو چاک نہ کر دیا۔ اس نے وہ خط مجسٹریٹ کے یہاں دیکھا تھا۔ اور حافظہ پر بار بار زور ڈالتا تھا کہ کیونکر یہ وہاں پہنچا۔ مگر یاد نے کچھ کام نہ دیا تھا۔ اب حقیقت معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اوپر جھنجلایا۔ مگر سرلا کی خوشامد کرنے لگا "میری جان! میں سخت نادم ہوں۔ واقعی مجھے سخت ندامت ہے۔ مگر کیا تم میری اس خطا کو

معاف نہیں کر سکتیں۔ اگر کسی کے کان میں اس کی ذرا بھی بھنک پڑگئی تو میری خیر نہیں۔ ابھی تک یہ بھید چھپا ہوا ہے۔ مجسٹریٹ بڑا دانا شخص ہے۔ اُس نے خط کو دیکھکر مجھے فوراً رہا کر دیا۔ مگر اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا۔ ابھی تک یہ راز سربستہ ہے مگر تم خوب جانتی ہو کہ لوگوں کو ایسی باتوں کی کیونکر تلاش رہتی ہے۔ پبلک کو دوسروں کی رسوائی و بدنامی میں مزہ آتا ہے۔ میری خاطر سے تم اس تذکرے کو زبان پر نہ لاؤ۔ غلطیاں انسان سے ہوتی ہی ہیں۔ اگر تم اسی میں خوش ہو تو حلفیہ کہتا ہوں کہ اب کبھی اُس کے دروازہ پر نہ جاؤں گا۔"

سرلا:۔ "کیوں تم اُس پر عاشق نہیں ہو؟ اس کی آبرو کے خوف سے تم قید اور جلاوطنی بھگتنے پر آمادہ تھے۔ اور اب تم کہتے ہو میں اُس کے دروازے پر نہ جاؤں گا۔ کیا اتنی جلد دل سے نقش محبت مٹ گیا۔! ان فریب کی باتوں سے کچھ حاصل نہیں۔ تم شوق سے خوشیاں مناؤ۔ میں ذرا بھی مخل نہوں گی۔ حسد کا کانٹا بنکر کسی کے پہلو میں کھٹکنا نہیں چاہتی۔"

دھرن کرسی پر بیٹھ گئے اور غمناک لہجہ میں بولے "سرلا! ایسی باتیں بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہیں جب تم دیکھتی ہو کہ میں حد درجہ نادم اور پشیمان ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ اب اس سے کوئی سروکار نہ رکھوں گا۔ تو تمہیں ایسی باتیں کر کے میرا دل نہیں دکھانا چاہئے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ ان باتوں کو پوشیدہ رکھنے کے لئے میں کس حد تک نقصانات اٹھانے کے لئے تیار تھا۔ اگرچہ میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مگر مجھے جلاوطن ہونا گوارا تھا بجائے اس کے کہ مشکل کے دن اپنے حرکات کا پتہ دوں۔ اب تک طرح طرح کی افواہیں اڑتی ہوں گی۔ یقین مانو اس رسوائی کے مقابلہ میں میں جلاوطن ہونا بہتر سمجھتا ہوں۔"

سرلا:۔ "اگر راہ محبت میں قدم رکھا ہے تو رسوائی کا کیا خوف! اگر تمہاری محبت سچی ہے تو تمہیں سوسائٹی کا اس قدر خوف نہ کرنا چاہئے۔"

دھرن:۔ "کیسی باتیں کرتی ہو، سرلا! سوسائٹی کا خوف خدا کے خوف سے بھی زیادہ ہے۔ اگر تم نے یہ روش اختیار کی تو میری عزت خاک میں ملا دوگی۔ اور میرا مستقبل سیاہ ہو جائے گا میں سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ سرلا۔ تم اس وقت غصہ میں ہو مگر جب تمہاری طبیعت ٹھنڈی ہوگی۔ غصہ فرو ہو جائیگا اور تم اس مسئلہ پر غور کروگی تو یقیناً میری یہ خطا معاف کر دوگی۔ ایسی بہت کم عورتیں ہوں گی جنھیں اپنی زندگی میں ایسی گتھیاں نہ سلجھانی پڑتی ہوں۔ میں مبالغہ نہیں کرتا ہوں۔ سوسائٹی میں ایسی باتیں آئے دن ہوا کرتی ہیں۔ مگر پردہ کے اندر۔ میں دوسرے کا شیدا سہی۔ کیا تمہیں بھی میری محبت نہیں۔ اسی محبت کے صدقے تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں پختہ وعدہ کرتا ہوں کہ اب پھر ایسا موقعہ کبھی نہ آئے گا۔" یہ کہکر دھرن باہر چلے گئے۔ اور سرلا دیر تک خاموش بیٹھی سوچتی رہی "سوسائٹی کا شیرازہ ایسے کچے دھاگے سے بندھا ہوا ہے"!

د۔ ر

بیغرض محسن

(۱)

ساون کا مہینہ تھا۔ ریوتی رانی نے پیرون مین مہندی رچائی مانگ چوٹی سنواری اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جاکر بولی "امّان جی! آج مین بھی میلہ دیکھنے جاونگی"

ریوتی پنڈت چنتامن کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا مین زیادہ نفع نہ دیکھکر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر اور مہاجنون کے برخلاف بجز خاص خاص حالتون کے ۲۵ فیصدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچے کو گود مین لے کھٹولے پر بیٹھی ہوئی تھین۔ بہو کی بات سنکر بولین "بھیگ جاؤگی تو بچے کو زکام ہو جائے گا"

ریوتی۔ "نہین امّان۔ مجھے دیر نہ لگے گی۔ ابھی چلی آؤنگی"

ریوتی کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا۔ دوسری لڑکی لڑکی ابھی گود مین تھی اور لڑکا ہیرامن ساتوین سال مین تھا۔ ریوتی نے اُسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ نظر بد سے بچنے کے لئے ماتھے اور گالون پر کاجل کے ٹیکے لگادے۔ گڑیان پیٹنے کیلئے ایک خوشرنگ چھڑی دیدی اور اپنی کئی ہمجولیون کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتون کا بڑا جمگھٹ تھا۔ نیگون گھٹائین چھائی ہوئی تھین۔ عورتین سولھون سنگار کئے۔ ساگر کے پُر فضا میدان مین۔ ساون کے رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھین۔ شاخون مین جھولے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی۔ کوئی ملار گاتی۔ کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہرون سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا۔ پانی کی ہلکی ہلکی پھوہار۔ پہاڑیون کی نکھری ہوئی ہریالی۔ لہرون کے دلفریب جھکولے موسم کو توبہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیون کی بدائی ہے۔ گڑیان اپنے سسرال جائینگی۔ کنواری لڑکیان ہاتھ پاؤن مین مہندی رچائے۔ گڑیون کو گہنے کپڑے سے سجائے انھین بدا کرنے آئی ہین۔ انھین پانی مین بہا آئینگی اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہین۔ مگر دامن عافیت سے نکلتے ہی آن ناموسمت مین پلی ہوئی گڑیون پر چارون طرف سے چھڑیون اور لکڑیون کی بوچھار ہونے لگی۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی اور ہیرامن ساگر کے زینون پر اور لڑکون کے ساتھ گڑیان پیٹنے مین مصروف تھا۔ زینون پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً اسکا پیر پھسلا تو پانی مین جا پڑا۔ ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کی دم مین وہان مردون اور عورتون کا ایک ہجوم ہو گیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نکرتی تھی کہ پانی مین جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے۔ سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائینگے! دُھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائیگی! کتنے ہی مردون کے دلون مین یہ مردانہ خیالات آرہے تھے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر کوئی شخص کمر ہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب ریوتی پچھاڑین کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ اژدحام دیکھکر اتر پڑا اور ایک تماشائی سے پوچھا "یہ کیسی بھیڑ ہے؟" تماشائی نے جواب دیا "ایک لڑکا ڈوب گیا ہے"۔

مسافر۔ کہان؟

تماشائی۔ "جہان وہ عورت کھڑی رو رہی ہے"۔

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اتاری اور دھوتی کسکر پانی مین کود پڑا۔ چارون طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ کون شخص ہے۔ اسنے پہلا غوطہ لگایا۔ لڑکے کی ٹوپی ملی۔ دوسرا غوطہ لگایا تو اسکی چھڑی ہاتھ لگی اور تیسرے غوطے کے بعد جب اوپر آیا تو لڑکا اسکے گود مین تھا۔ تماشائیون نے واہ واہ کا نعرہ بلند کیا۔ مان نے دوڑکر بچے کو لپٹا لیا۔ اس اثنا مین پنڈت چنتامن اور کئی عزیز آپہونچے اور لڑکے کو ہوش مین لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹہ مین لڑکے نے آنکھین کھول دین۔ لوگون کی جان مین جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی مین اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب لوگ اپنے گمنام محسن کو ڈھونڈھنے لگے تو اسکا کہین پتہ نہ تھا۔ چارون طرف آدمی دوڑائے۔ سارا میلہ چھان مارا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔

(۲)

بیس سال گزر گئے۔ پنڈت چنتامن کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔ اس دوران مین اسکی مان نے ساتون جاترائین کین۔ اور مرین تو انکے نام پر ٹھاکر دوارا تیار ہوا۔ ریوتی بہو سے ساس بنی لین دین بہی کھاتہ ہیرامن کے ہاتھ مین آیا۔ ہیرامن اب ایک وجیہہ تجیم و شجیم نوجوان تھا۔ نہایت خلیق۔ نیک مزاج۔ کبھی کبھی باپ سے چھپاکر غریب اسامیون کو بلا سودی قرض دیا کرتا۔ چنتامن نے کئی بار اس گناہ کے لئے بیٹے کو آنکھین دکھائی تھین اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرامن نے ایک بار ایک سنسکرت پاٹھشالا کے لئے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اسپر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہین کھایا۔ ایسے ناگوار واقعے آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انھین وجوہ سے ہیرامن کی طبیعت باپ سے کچھ کھنچی رہتی تھی۔ مگر اسکی یہ ساری شرارتین ہمیشہ ریوتی کی ساز شسے ہوا کرتی تھین۔ جب قصبہ کی غریب بدھوائین یا زمیندارون کے ستائے ہوئے اسامیون کی عورتین ریوتی کے پاس آکر ہیرامن کو آنچل پھیلا پھیلا کے دعائین دینے لگتین تو اُسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت

آدمی دُنیا میں کوئی نہ ہوگا۔ تب اُسے بے اختیار وہ دن یاد آجاتا جب ہیرامن کیرت ساگر میں ڈوب گیا تھا اور اُس آدمی کی تصویر اُسکی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی جسنے اُسکے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اُسکے تہِ دل سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا کہ اُسے دیکھ پاتی تو اُسکے پیروں پر گر پڑتی۔ اُسے اب کامل یقین ہوگیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا۔ بلکہ کوئی دیوتا تھا۔ وہ اب اُسی کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر اُسکی ساس بیٹھتی تھی اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرامن کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اُسکا دست کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا اور یہی ایک بیجا صرف تھا جسمیں پنڈت چنتامن بھی اُسکے شریک ہوجاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گمنام محسن کے لئے اُسکے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوتی تھیں۔ اُسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور یہ سکھ دیکھنا میسر ہوا ہے!

(۳)

ایک دن ہیرامن نے آکر ریوتی سے کہا "آماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے۔ کہو تو میں بھی دام لگاؤں"۔

ریوتی "سولہوں آنہ ہے؟"

ہیرامن "سولہوں آنہ۔ اچھا گاؤں ہے۔ نہ بڑا نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ چار ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سو دو سو میں ختم ہوجائیگا"۔

ریوتی۔ "اپنے دادا سے تو پوچھو؟"

ہیرامن۔ "اُنکے ساتھ دو گھنٹے تک سر مغزن کرنیکی کسے فرصت ہے"۔

ہیرامن اب گھر کا مختارِ کُل ہوگیا تھا اور چنتامن کی ایک نہ چلنے پاتی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدے پر بیٹھے پنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے تھے۔

دوسرے دن ہیرامن کے نام پر سری پور ختم ہوگیا۔ مہاجن سے زمیندار ہوئے۔ اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گاؤں کی سیر کرنے چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی۔ نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانچویں دن شام کے وقت ہیرامن گاؤں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تِلک لگایا گیا اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے اُنکی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختار عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جو اسامی زمیندار صاحب کے سامنے آتا وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپیہ اُنکے پیروں پر رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پانچسو روپیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

ہیرامن کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز زہریلا قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ جب اسامیوں کی فہرست ختم ہوگئی تو مختار سے بولے۔ "اور کوئی اسامی تو باقی نہیں ہے؟"

مختار۔ "ہاں مہاراج۔ ابھی ایک اسامی اور ہے۔ تخت سنگھ"۔

ہیرامن۔ "وہ کیوں نہیں آیا؟"

مختار۔ "ذرا مست ہے"۔

ہیرامن۔ "میں اُنکی مستی اُتار دونگا۔ ذرا کوئی اُسے بُلا لائے"۔

تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور ڈنڈوت کرکے زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اُسکی یہ گستاخی دیکھکر ہیرامن کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے۔ "ابھی کسی زمیندار

سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک کی ہیکڑی بھلا دونگا۔"

تخت سنگھ نے ہیرامن کیطرف غور سے دیکھکر جواب دیا "بیر سامنے بیس زمیندار گئے اور چلے گئے۔ مگر کبھی کسی نے اس طرح گھڑکی نہیں دی۔"

یہ کہکر اُسنے لاٹھی اُٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا "دیکھا زمیندار کو؟ کیسے آدمی ہین۔

تخت سنگھ:- "اچھے آدمی ہین۔ مین انھیں پہچان گیا۔"

ٹھکرائن:- "کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے۔"

تخت سنگھ:- "میری انکی بیس برس کی جان پہچان ہے۔ گڑیون کے میلے والی بات یاد ہے نہ؟"

اُس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

(۴)

چھ مہینہ کے بعد ریوتی کو بھی سری پور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اسکی بہو اور بچے سب سری پور آئے۔ گانو کی سب عورتین اُنسے ملنے آئین۔ انہین بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی، اسکی بات چیت، سلیقہ اور تمیز دیکھکر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تمسے ملکر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اس طرح دونوں عورتوں مین رفتہ رفتہ میل ہو گیا۔ یہان تو یہ کیفیت تھی۔ اور ہیرامن اپنے مختار عام کے مشاطے مین آکر تخت سنگھ کو بیدخل کرنے کی بندشین سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورنماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریان ہونے لگین۔ ریوتی چھلنی مین میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا "ٹھکرائن۔ ہمارے یہان کل تمہارا نیوتہ ہے"

ٹھکرائن:- "تمہارا نیوتہ سر اور آنکھون پر۔ کونسی برس گانٹھ ہے؟"

ریوتی:- "تیسوین۔"

ٹھکرائن:- "نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سو دن تمہین ا[…] دیکھنے نصیب ہون۔"

ریوتی:- "ٹھکرائن۔ تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر […] کئے ہین تب تملوگون کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہو[…] یہ تو ساتوین ہی سال مین تھے کہ انکے جان کے لالے پڑ[…] گڑیون کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ یہ پانی مین گر پڑے۔ با[…] ایک مہاتما نے انکی جان بچائی۔ انکی جان انھین کی […] ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا مگر اُنکا پتہ نہ چلا۔ ہم ہر […] پر انکے نام سے سو روپیہ نکال رکھتی ہون۔ دو ہزار سے […] کچھ اونچا ہو گیا ہے۔ بچّہ کی نیت ہے کہ اُنکے نام سے […] سری پور مین ایک مندر بنوا دین۔ سچ مانو ٹھکرائن ایک […] اُنکے درشن ملجاتے تو زندگی سپھل ہو جاتی۔ جی کی […] نکال لیتے۔"

ریوتی جب خاموش ہوئی تو ٹھکرائن کی آنکھون سے […] جاری تھے۔

دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن […] اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔

ٹھکرائن بولی "مین ریوتی رانی کے پاس جا کر دہائی مچاتی ہو[…]"

تخت سنگھ نے جواب دیا "میرے جیتے جی نہین۔"

(۵)

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جان بخش دیا […] سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ […] حسرتناک اور آرزومند نگاہین اُنکے ساتھ ساتھ جاتین […] زمین اُنھین اپنے دامن مین چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ اب دن […]

دن اُسے چرایا کرتا۔ اُسکی زندگی کا اب یہی ایک سہارا تھا۔ اُسکے اُپلے اور دودھ بیچکر گذران کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کرنا پڑ جاتے۔ یہ سب مصیبتیں اُسنے جھیلیں۔ مگر اپنی بینوائی کا رونا رونے کے لئے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اُسے زیر کرنا چاہا تھا مگر خود زیر ہوگیا۔ جیتنے پر بھی اُسکی ہار ہوئی۔ پُرانے لوہے کو اپنی کینہ مند کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا "بیٹا! تمنے غریب کو ستایا۔ اچھا نہ کیا۔"

ہیرامن نے تیز ہوکر جواب دیا "وہ غریب نہیں ہے۔ اسکا گھمنڈ میں توڑ دونگا۔"

ثروت کے نشے میں متوالا زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جسکا وجود ہی نہ تھا۔ جیسے بے سمجھ بچہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

(۶)

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کرکے کاٹا۔ پھر برسات آئی۔ اُسکا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن تک موسلا دھار مینہ برسا تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی۔ دبکر مر گئی۔ تخت سنگھ کے بھی سخت چوٹ آئی۔ اُسی دن اُسے بخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹا۔ ظالم بیدرد مصیبت نے کچل ڈالا۔ سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا کہ ریوتی اُسکے گھر گئی۔ تخت سنگھ نے آنکھیں کھولدیں اور پوچھا "کون ہے؟"

ٹھکرائن۔ "ریوتی رانی ہیں۔"

تخت سنگھ "میرے دھن بھاگ۔ مجھپر بڑی دیا کی۔"

ریوتی نے شرمندہ ہوکر کہا "ٹھکرائن۔ ایشور جانتا ہے میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں۔ تمہیں جو تکلیف ہو مجھے کہو۔ تمہارے اوپر ایسی آفت پڑ گئی اور ہم سے خبر تک نہ کی!"

یہ کہکر ریوتی نے روپیوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھدی۔

روپیوں کی جھنکار سُنکر تخت سنگھ اُٹھ بیٹھا اور بولا "رانی ہم اسکے بھوکے نہیں ہیں۔ مرتے دم گنہگار نہ کرو۔"

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہوا خواہوں کو لئے اُدھر سے جا نکلا۔ گرا ہوا مکان دیکھکر مسکرایا۔ اُسکے دل نے کہا آخر میں نے اسکا گھمنڈ توڑ دیا۔ مکان کے اندر جاکر بولا "ٹھاکر اب کیا حال ہے؟"

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا "سب ایشور کی دیا ہے۔ آپ کیسے بھول پڑے؟"

ہیرامن کو دوسری بار زک ملی۔ اُسکی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پیروں کو آنکھوں سے چومے اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اسی رات کو غریب۔ آزاد منش۔ ایماندار۔ بیغرض ٹھاکر اس دُنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۷)

بڑھی ٹھکرائن اب دُنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اُسکے غم کا شریک اور اُسکے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ تھا۔ بینوائی اور بے مائگی نے غم کی آنچ اور تیز کردی تھی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں۔ مگر مرہم کا کام ضرور دیتے ہیں۔

فکر معاش بڑی بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چُن لاتی اور اُپلے بنا کر بیچتی۔ اُسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھکر بوجھ سے ہانپتے ہوئے

تے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک کہ بیرامن کو بھی اُس پر ترس آگیا۔ ایک دن اُنھوں نے آٹا دال چاول تھالیوں میں رکھا اُسکے پاس بھیجا۔ ریوتی خود لیکر گئی۔ مگر بڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی "ریوتی جبتک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پیر چلتے ہین مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نکرو۔"

اُس دن سے بیرامن کو پھر اُسکے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرات نہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اُپلے مول لئے۔ گانو مین پیسے کے تیس اُپلے بکتے تھے۔ اُسنے چاہا کہ اس سے بیس ہی اُپلے لون۔ اُس دن سے ٹھکرائن نے اُسکے یہان اُپلے لانا بند کردیا۔

ایسی دیویان دُنیا مین کتنی ہین! کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی کہ ایک راز سربستہ زبان پر لاکر مین اپنی جاںکاہیون کا خاتمہ کر سکتی ہون۔ مگر پھر وہ احسان کا بدلہ ہوجائیگا۔ مثل مشہور ہے نیکی کر اور دریا مین ڈال۔ شاید اُسکے دل مین کبھی یہ خیال ہی نہین آیا کہ مین نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضعدار، آن پر مرنیوالی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال تک زندہ رہی۔ یہ زمانہ اُسنے جس تکلیف سے کاٹا اُسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہین۔ کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے۔ کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اُپلے چُرا لیجاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے۔ کھانے والے نہین۔ کوئی یون رو رو کر زندگی کے دن کاٹتا ہے۔

بُڑھیا نے یہ سب دُکھ جھیلا۔ مگر کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہین پھیلایا۔

(۸)

بیرامن کی بیسوین سالگرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریان پک رہی تھین۔ دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے منزز برہمنون کے لئے۔ تیل کی غریب۔ فاقہ کش نیچون کے لئے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آکر کہا "ٹھکرائن بیچاری کیسی ہوئی جاتی ہین۔ تمہین بُلا رہی ہین۔"

ریوتی نے دل مین کہا ایشور آج تو خیریت سے کاٹنا کہین بڑھیا مر نہ رہی ہو۔

یہ سوچکر وہ بڑھیا کے پاس نہ گئی۔ بیرامن نے جب دیکھا اماں نہین جانا چاہتین تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اُسے کچھ دنون سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر ریوتی مکان کے دروازہ تک اُسے منع کرنے آئی۔ یہ رحمدل۔ نیک مزاج۔ شریف ریوتی تھی۔

بیرامن ٹھکرائن کے مکان پر پہونچا تو وہان بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جان کندنی کی حالت طاری تھی۔ بیرامن نے زور سے کہا "ٹھکرائن! مین ہون بیرامن!"

ٹھکرائن نے آنکھین کھولین اور اشارہ سے اُسے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا۔ پھر رُک رُک کر بولی "میرے سرہانے پٹاری مین ٹھاکر کی ہڈیان رکھی ہوئی ہین۔ میرے سہاگ کا سیندور بھی وہین ہے۔ یہ دونون پراگ راج بھیجدینا۔"

یہ کہکر اُسنے آنکھین بند کرلین۔ بیرامن نے پٹاری کھولا تو دونون چیزین بحفاظت رکھی ہوئی تھین۔ ایک پوٹلی مین دس روپئے بھی رکھے ہوئے تھے۔ یہ شاید جلنے والے کا زاد راہ تھا۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفون کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوگیا۔

اُسی رات کو ریوتی نے خواب دیکھا۔ ساون کا میلہ ہے گھٹائین چھائی ہوئی ہین۔ مین کیرت ساگر کے کنارے کھڑی

اتنے مین ہیرامن پانی مین پھسل پڑا۔ مین چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ دفعتہً ایک بوڑھا آدمی پانی مین کود اور ہیرامن کو نکال لایا۔ ریوتی اُسکے پیرون پر گر پڑی اور بولی "آپ کون ہین؟"

اُسنے جواب دیا "مین سری پور مین رہتا ہون۔ میرا نام ہے تخت سنگھ۔"

+ + + + + + +



سری پور اب بھی ہیرامن کے قبضے مین ہے۔ مگر اب اُسکی رونق دوچند ہو گئی ہے۔ وہان جاؤ تو دور سے شوالے کا سنہرا کلس دکھائی دینے لگتا ہے جس جگہ تخت سنگھ کا مکان تھا۔ وہین یہ شوالہ بنا ہوا ہے۔ اُسکے سامنے ایک پختہ کنوان اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہان ٹھیرتے ہین اور تخت سنگھ کا جس گاتے ہین۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونون اُسیکے نام سے مشہور ہین۔

د۔ ر

دھوکے کی ٹٹی

(۱)

لال مرچ دیکھنے میں کیسی خوبصورت ہوتی ہے، مگر کھانے میں کیسی کڑوی! سریندرو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دیکھنے میں بہت خوش وضع، خوش لباس، زبان کا بہت میٹھا، دوستوں میں بہت ہر دلعزیز۔ مگر بلا کا نفس پرور، بداخلاق، شریر۔ مدرسہ کی انٹرنس جماعت میں پڑھتا تھا۔ سِن سولہ سال سے زائد نہ تھا مگر مزاج میں ابھی سے آوارگی کا دخل ہو چلا تھا۔ شراب کی لذتوں سے زبان مانوس ہو چکی تھی، اور گھر سے صندوق کھول کر روپے چُرا لینا تو ایک معمولی سی بات تھی۔ والدین سمجھا بجھا کر رہ گئے۔ سکول ماسٹروں نے مار پیٹ، جرمانہ سب کچھ آزما دیکھا، مگر سریندرو نے جو شیوہ اختیار کی تھی اُس سے ذرا بھی نہ ٹلا۔ شہر میں کہیں برات آئے، کہیں ناچ ہو، کہیں عیش و طرب کی محفل ہے، سریندرو کا وہاں پہنچنا ایک شرطی امر تھا۔ اُسے کبھی کسی نے کتاب پڑھتے نہیں دیکھا، مگر تعجب یہ تھا کہ وہ ہر سال امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ اسکا راز بجز اُسکے خاص دوستوں کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں امتحان کے دنوں میں وہ ہیڈ ماسٹر اور دیگر ماسٹروں کے ملازموں سے زیادہ ربط ضبط کر لیتا۔ عام والدین اُسوقت تک لڑکوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوتے جب تک وہ ایک ہی درجہ میں بار بار فیل نہ ہوں۔ سریندرو یہ نوبت نہیں آنے دیتا تھا، اور اس لئے اُسکے والد جو ایک بہت متین آدمی تھے اُس سے زیادہ باز پرس نہ کرتے۔ سریندرو میں ایک بڑا وصف یہ تھا کہ اُسکی نگاہ انسان کے کمزور حصہ پر بہت جلد جا پہنچتی تھی اور اس وصف سے اُسکا بڑا کام نکلتا۔ کوئی سکول ماسٹر ایسا نہ تھا جسکے داغ اور دھبے اُس پر روشن نہ ہوں۔ اس گُر نے اُسے انٹرنس تک نباہ دیا۔ یہاں تک کہ انٹرنس کا سالانہ امتحان آیا۔ سریندرو نے اس موقع کے لئے بڑے اہتمام کئے تھے۔ سب سکول ماسٹر اُسکے خیراندیش بن گئے تھے۔ کامیابی کی سب صورتیں اُسکے موافق تھیں؛

گویں اُسوقت جبکہ اُسکی دُزدیدہ نگاہیں دوڑ دوڑ کر برسوں کا کام لمحوں میں پورا کئے دیتی تھیں ایک گرجتی ہوئی آواز اُسکے کان میں آئی "سریندر رو اقطار کہہ وانہیں اب لکھنے کی اجازت نہیں ہے" سریندر نے ماتھا پیٹ لیا۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب تھے۔ اشتہاری مجرم گرفتار ہو گیا اور اُسکا نام اسکول سے خارج کر دیا گیا۔

(۲)

سریندر رو کے لئے اب بجز اسکے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ کہیں اور تعلیم کا سلسلہ قایم کرے، مگر اس حادثہ نے اُسکے دل پر کوئی اصلاح بخش اثر نہیں پیدا کیا۔ اس نے تو منہ مانگی مراد پائی۔ اُسے اب نئی دنیا دیکھنے کا نئی دلچسپیوں کے لطف اُٹھانے کا، نئے دوستوں کی صحبت کا موقع ہاتھ آیا۔ کسی دوسری صورت میں یہ آرزوئیں مشکل سے پوری ہوتیں، اب وہ خود بخود اُسکے روبرو دست بستہ کھڑی تھیں۔ وہ جس وقت مدرسے چلا اُسکا چہرہ کچھ تمتمایا ہوا تھا، مگر یہ غصہ بہت جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس کے دل نے خوش ہو کر کہا ملک خدا تنگ نیست، لیکن اب کلکتہ یونیورسٹی میں داخلہ غیر ممکن تھا، اور الہ آباد یونیورسٹی میں کوئی صورت نہ نکلی۔ اسلئے سیدھا لاہور جا پہنچا اور وہاں ایک مدرسہ میں شریک ہو گیا۔ کرکٹ کا زبردست کھلاڑی، فٹ بال میں مشاق، شکل و صورت کا بشکیل، فراخدل، بلند حوصلہ، ایسا طالب علم جہاں جائے اُسے دھول کی کمی نہ رہے گی۔ لاہور میں بہت جلد دوستوں کی کافی تعداد ہو گئی، اور پھر وہی چہچے اور قہقہے اُڑنے لگے۔ مگر ذرا احتیاط کے ساتھ، شرم کا پردہ رکھے ہوئے۔ صبح کو باغوں کی سیر، شام کو کرکٹ اور فٹ بال، رات کو رندی اور مے نوشی پھر ترنم پردازیوں کے مشغلے۔ کبھی کبھی انہیں اشغال میں راتیں گذر جاتیں، مگر یہ سب آزادیاں اور مستیاں چند برگزیدہ معتمد احباب تک محدود تھیں، ورنہ عام طور پر یہ حضرت بہت فرشتہ صفت تھا، حلیم و سلیم مشہور تھے۔ یہاں تک کہ کالج کے پرنسپل مسٹر کاشن جب لڑکیوں کے مدرسہ کا معائنہ کرنے جاتے تو کبھی کبھی سریندر رو کو اپنی امداد کے لئے ساتھ لے جاتے۔ مبارک ہوتا وہ دن جب بانکا البیلا سریندر رو لڑکیوں کے مدرسہ میں داخل ہوتا۔ ہیڈ مسٹرس مس گپتا کا مسکرا کر اُس سے ہاتھ ملانا! آہ اُس کف بلورین کا اُسکے ہاتھ میں آنا آنکھوں میں نشہ کے ایک طوفان کا آنا تھا۔ اُسکا دل اُمنگ سے پھول اُٹھتا، اور دل کی فرحت اور شگفتگی اُسکی صورتِ زیبا کا رنگ اور بھی چوکھا کر دیتی۔ پھر یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مس گپتا کو اُس کی ہونے والی بیوی پر رشک آتا۔

ایک دن سریندر رو کالج سے آ رہا تھا کہ کلکتہ کے ایک پُرانے رفیق سے آنکھیں چار ہوئیں۔ یہ بابو ہری موہن تھے۔ اُنہیں دیکھتے ہی سریندر رو کا خون سرد ہو گیا۔ ہری موہن اُسکی ناہمواریوں کے کرشمے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ بہت گھبرایا، مگر تپاک سے بڑھکر سلام کیا اور خیر و عافیت پوچھی۔ ہری موہن نے اُسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ خاکہ وہی تھا، مگر رنگ نیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ جب علحدہ ہونے لگے تو سریندر رو نے بہت منت آمیز لہجہ میں کہا "بھائی صاحب! جسے خدا نے خراب بنایا ہے وہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ نیکبخت بن جاؤں، مگر نہ بن سکا۔ ہاں نیکبختی کی شہرت حاصل کر لی۔ یہاں بجز آپ کے کوئی دوسرا میرے حالات سے واقف نہیں ہے۔ اسلئے مجھ غریب پر نظر عنایت رکھیے گا۔ آپ چاہیں تو بات کی بات میں میرا رنگ پھیکا کر سکتے ہیں۔ میں بالکل آپ کے بس میں ہوں، مگر مجھے آپ پر بھروسہ ہے۔ آپ کو میں ہمیشہ اپنا بزرگ اور خیر اندیش سمجھتا رہا ہوں۔"

سریندر رو کی باریک نگاہیں ہری موہن کے کمزور حصہ پر جا پہنچیں۔ اُن کے چہرہ پر ہمدردانہ مسکراہٹ نظر آئی۔ بولے "مجھے تم ہمیشہ اپنا دوست سمجھنا۔"

(۳)

سُرنیدر و نے لاہور میں ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ اس نے ایک "ینگ مینس یونین" قائم کر لی اور خود اسکا سکریٹری بن بیٹھا۔ اس یونین کے مقاصد بہت اعلیٰ تھے۔ نوجوانوں کے آداب و اخلاق کی تہذیب، عملی اور علمی ترقی، اتفاق باہمی کی اشاعت، وغیرہ۔ ممبروں کو کچھ ماہواری چندہ دینا پڑتا اور از روئے حلف اقرار کرنا پڑتا کہ میں اس یونین کے کسی ممبر کو کسی آفت میں دیکھوں گا تو ہر ممکن صورت سے اُس کی مدد کروں گا۔ چندہ کی رقم سے چند اخبار آتے، اور جو کچھ بچتا وہ کار خیر میں صرف ہوتا۔ اس کام میں سرنیدرو کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ ایک ماہ کے اندر یونین میں سو سے زیادہ ممبر ہو گئے۔ پچیس روپیہ ماہوار چندہ آنے لگا پانچ یتیموں اور کئی بیواؤں کی پرورش ہونے لگی۔ اس کامیابی کا سہرا مسٹر سکریٹری کے سر تھا جس کی شہرت دن دُونی اور رات چوگنی ہوتی جاتی تھی۔ پرنسپل کالن اُسے پہلے ہی سے مانتے تھے، اب مرید ہو گئے۔ شہر میں بھی یونین کا چرچا ہونے لگا، مگر یہ شاندار نام کا یونین بجز شہدوں کی ایک جماعت کے اور کچھ نہیں تھا۔ مختلف کالجوں کے چھٹے اوباش، آوارہ مزاج، بدوضع، بدقماش اسپلائی طلبا تھے وہ سب اسکے ممبر تھے۔ یونین کلب کو ان کی وابستگیوں کا اکھاڑا تھا۔ یہاں وہ گاتے بجاتے، اور یہاں ہی اُن کی رندانہ مجلسیں آراستہ ہوتیں کیونکہ فن موسیقی کی اشاعت بھی یونین کے پروگرام میں داخل تھی۔ یونین کے سارے ممبر سرنیدرو کو اپنا رہبر اور پیشوا تسلیم کرتے تھے۔ اُس نے ہر ایک کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اگر تم بلا محنت اور مشقت کے امتحان پاس کرنا چاہتے ہو تو بجز اسکے اور کوئی علاج نہیں کہ یونین کے رکن بن جاؤ۔ سرنیدرو کو امتحانی پرچوں کی سُراغ رسانی میں ید طولیٰ تھا، اور یہی اُسکے اثر اور دباؤ کا راز تھا۔ کالج میں سرنیدرو کی وہی عزت تھی جو کسی پروفیسر کی شہر میں اُسکے آگے اچھے اچھوں کے سر جھک جاتے کیونکہ کئی بار اُسے اس مقولے کے عملی ثبوت دینے کا موقع مل چکا تھا کہ اتفاق ایک زبردست طاقت ہے۔

یونین کے ممبروں کی زندگی واقعی قابل رشک تھی۔ امتحان کے دن سر پر آ گئے تھے۔ عام طلبا پر خواب و خور حرام ہو گیا تھا۔ رات کی رات اور دن کے دن مشق اور مطالعہ کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ورزش کا میدان، کلب لائبریری سب ویران پڑے ہوئے تھے۔ ہر امیدوار کسی سنیاسی کی طرح مراقبہ میں بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جسے دیکھئے اپنی کوٹھری میں مالا جپی لگائے بیٹھا ہے۔ اس شبانہ روز کی دیدہ ریزی اور دماغ سوزی نے دردِ سر، دردِ چشم، ثقل معدہ، بخار اور دیگر عوارض کا ایک طوفان برپا کر دیا ہے۔ آنکھیں پھوڑے کی طرح دُکھ رہی ہیں مگر کتاب ہاتھ میں ہے۔ مارے درد کے سر پھٹا جاتا ہے مگر نصاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ بخار سے بدن تو ہو رہا ہے مگر زبان ورد میں مصروف ہے۔ اِدھر تو یہ آفتیں تھیں، اُدھر یونین کے ممبر چین کی بانسری بجاتے تھے۔ کبھی گانا ہو رہا ہے کبھی چاء پارٹی، کبھی پک نک۔ جسے دیکھئے بے غم اور بے فکر، چہچہے اُڑاتا نظر آتا ہے۔ کسی کو امتحان کی ذرہ برابر فکر نہیں۔ یہاں تک کہ امتحان کے دن آئے اور یونین کے بھاگ جاگ گئے۔ کالج کے تمام طلبا بمشکل چوتھائی کامیاب ہوئے۔ یونین کے ایک سو ممبروں میں صرف پچیس فیل تھے۔ لوگ اچنبھا ہو گیا۔ مگر یہ راز کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ سرنیدرو جس نے خواب میں بھی کتاب کی صورت نہ دیکھی اوّل درجہ میں پاس ہوا۔

(۴)

اسی اثنا میں مس گپتا کا تبادلہ ہوا، اور مس روہنی سرکار کلکتہ سے اُنکی جگہ پر مقرر ہو کر آئیں۔ روہنی حُسن و ادا میں مس گپتا کی نعم البدل تھی پھر طرہ یہ کہ دوشیزہ! سرنیدرو نے پہلے ہی نگاہ میں اپنے شکار کو تاڑ لیا۔ او روہنی بھی پہلی ہی ملاقات میں اُسکی مردانہ وضع، شریفانہ بشرہ، اور دلکش بے تکلفی سے صد درجہ متاثر ہوئی۔ مس گپتا نے اُس سے سرنیدرو کی

بے انتہا تعریفیں کی تھیں۔ اور اس تذکرے نے اُسکے دل میں سریندر رو سے ایک لگاؤ سا پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے اُسے اُن تمام اوصاف و کمالات سے آراستہ پایا جنکا اپنے شوہر میں موجود رہنا وہ ضروری سمجھتی تھی۔ سرو قامت، چھریرا بدن، مسکراتا ہوا چہرہ، خوش اخلاق، خوش بیان گو ایک یا دو ملاقاتیں ایک ایسے اہم معاملہ میں تصفیہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہوسکتیں مگر سریندر رو نے اتنے دنوں بھاڑ نہیں جھونکی تھی جب سے ہوش سنبھالا اس نے اسی کوچہ کی خاک چھانی اسی بحر کی غواصی کی۔ اسنے دیکھ لیا کہ مچھلی چارہ کترنے لگی اب پھنسنے میں دیر نہیں ہے۔ روہنی دن بھر سریندر رو کی تعریفیں سُنتی۔ یونین کے ایکسو ممبروں میں سے ہر ایک شخص موقع و محل دیکھکر سریندر رو کا ذکر خیر اُس سے کر جاتا۔ اُن کی بیویاں بہنیں آتیں اور اُسکا گمان کرتیں۔ غرض صبح سے شام اسی طرح کی باتیں اُسکے کان میں پڑتی رہتیں۔ یہانتک کہ ان عملیات نے اس سادہ لوح لڑکی کو محبت سے دیوانہ بنا دیا۔ یہ بسی کرن منتر اپنا کام کر گیا۔ اب روہنی کو دور دو تنہائی کی کسک محسوس ہونے لگی ہر وقت اکیلے پن کا خیال دل کو ستانے لگا۔ مکان اور باغ اور سیر گاہیں سونی معلوم ہونے لگیں۔ غرض آنکھیں آٹھوں پہر سریندر رو کے انتظار میں ڈبڈبانے لگیں۔ ایک بھولا بھالا دل نمائشات کے نذر ہو گیا۔ جب یہ منزل دشوار طے ہو گئی تو منگنی اور بیاہ میں کیا دیر لگتی۔ یہ دونوں مراسم بہت سادگی اور متانت کے ساتھ ادا کئے گئے۔ جسوقت اچاریہ رسم نکاح ادا کر رہے تھے سریندر رو ایسا متین اور مرعوب نظر آتا تھا گویا وہ اس نئی زندگی کی ذمہ داریوں کے خیال سے دبا جاتا ہے۔ جب دعائے نکاح ختم ہوئی تو سارے مجمع نے آمین کہا۔ صرف ہری موہن کی زبان سے یہ دعا نہ نکلی۔

یونین کے ممبروں نے شادی کی خوشی میں ایک زبردست اور پُرشور محفل سجائی۔ رات بھر ہو حق ہوا کی۔ شراب کے خُم کے خُم خالی ہو گئے۔

خوش قسمتی سے سریندر رو اسی سال بی۔ اے میں کامیاب ہو گیا۔ یونین کی حیرت انگیز کامیابی نے سب کو حیرت میں ڈالدیا۔ ایک ممبر جی فیل ہوا۔

(۵)

شادی ہو گئی۔ دوستوں نے خوب دل کھول کر مبارکبادیں دیں۔ بالخصوص مس گپتا تو پھولی نہ سمائیں۔ وہ دہلی سے اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئیں۔ ہفتہ بھر تک جشن ہوتے رہے۔ اسکے بعد میاں بیوی شملہ کی سیر کو روانہ ہوئے۔ یونین کے ممبر گرلس اسکول کا اسٹاف اور دیگر احباب رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے۔ ان میں بابو ہری موہن بھی تھے۔ جب سب لوگ رخصت ہو گئے اور انجن نے چیخ کر گاڑی کھینچی تو ہری موہن نے بھی وداعی مصافحہ کیا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں افسوسناک خیالات بھرے ہوئے تھے۔ وہ وہاں خاموش گاڑی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیر تک کھڑے رہے۔ یہانتک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اُن کا دل کہتا تھا کہ "یہ مسرت کا سفر نہیں رنج و غم کا سفر ہے"۔

مہینہ بھر تک روہنی اور سریندر رو شملہ میں رہے اور اس مہینہ بھر میں انہیں ایک دوسرے کی خو بو کا پورا تجربہ ہو گیا۔ شروع میں روہنی نے مس گپتا کو جو خطوط لکھے وہ عشق اور محبت کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ مس گپتا ان خطوط کو بار بار پڑھتی اور سیر ہوتی مگر رفتہ رفتہ ان خطوط کا رنگ اندوہ و حسرت کی طرف مائل ہونے لگا۔ یہانتک کہ آخری خط جس میں لکھا تھا کہ آج ہم لوگ یہاں سے لاہور روانہ ہو رہے ہیں بہت دلشکن تھا۔ اسکے آخری الفاظ یہ تھے "پیاری بہن! مجھے ایسا خوف ہوتا ہے کہ اس خواب مسرت سے بہت جلد بیدار ہونا پڑیگا۔ جس چیز کو میں نے خالص سونا سمجھا وہ محض چمکتا ہوا پیتل نکلا۔ افسوس! میں نے اپنی محبت کی دیوار بالو پر کھڑی کی تھی۔ خدا کرے میرے شبہے غلط ہوں۔ خدا نہ کرے کہ میرے یہ وسوسے صحیح ہوں۔ مگر پیاری بہن! میرا دل بار بار کہتا ہے اور قرائن اسکی تصدیق کرتے ہیں کہ [illegible]

ختم ہو گیا۔ اب بقیہ زندگی رونے میں کٹے گی؟" مس گپتا اس پُر درد خط کو پڑھکر بہت روئیں۔

لاہور میں جب معلوم ہوا کہ یہ لوگ واپس آرہے ہیں تو لوگوں کو تعجب ہوا۔ دو مہینے کا سامان کرکے چلے تھے۔ اور قیاس یہ کہتا تھا کہ شاید وہاں کی دلفریبیوں سے اتنی جلد طبیعت آسودہ نہو۔ مگر اسکے برعکس یہ لوگ ایک ہی ماہ میں اُکتا گئے۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ آخر مقررہ وقت آیا۔ احباب اُن کا خیر مقدم کرنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ گاڑی آئی اور میاں بیوی اُس میں سے اُتر پڑے۔ نہ کپڑوں کا بکس تھا، نہ ٹرنک، نہ بستر۔ سُریندرو کی آنکھیں شراب سے سُرخ ہو رہی تھیں اور روہنی! آہ وہ تو شگفتہ پھول اب مُرجھا کر زرد ہو گیا تھا۔ چہرہ ایسا پژمردہ اور افسردہ تھا گویا حسرت و یاس کی تصویر ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سارا اسباب شراب کے نذر ہوا، اور زیور جوئے کے۔ کان کے آویزے تک نہ بچے!

(۶)

لاہور میں آکر روہنی تو اپنے درس و تعلیم میں مصروف ہوئی اور سُریندرو میکشی میں۔ بزمین کا شیرازہ اب بکھر گیا تھا۔ اسلئے بجز شراب کے دلبستگی کا اور کوئی ذریعہ باقی نہ رہا۔ اگر کبھی روہنی سمجھانے کی کوشش کرتی تو سُریندرو کے تیور بدل جاتے۔ پرنسپل کاٹن نے یہ سمجھکر کہ بیکاری نے اسکی یہ گت بنا رکھی ہے اُسے اکونٹنٹ کے دفتر میں ایک بہت معقول جگہ دلا دی۔ مگر جس شخص کی تحصیل کا زمانہ سرمستیوں میں گذرا ہو وہ صبح سے شام تک دفتر میں خشک کاغذوں اور روح فرسا اعداد کے ساتھ کیونکر سر مارتا۔ ایک روز ہیڈ کلرک نے اُسے چند اعداد کا میزان مرتب کرنے کا حکم دیا۔ میزان لکھوں تک پہنچتا تھا۔ سُریندرو اعداد کی نامتناہی قطار دیکھکر ایسا گھبرایا کہ دفتر سے بے تحاشا بگٹٹ بھاگا اور گھر پر آکر دم لیا۔ اسکے بعد کئی ماہ تک وہ مختلف دفاتر کی خاک چھانتا رہا مگر نحوست اور وحشت نے کہیں قدم نہ جمنے دیا یہانتک کہ پرنسپل صاحب مایوس اور جملہ دفاتر کے دروازے اسکے لئے بند ہوگئے۔

غریب بیکس روہنی اب اپنے کئے پر پچھتاتی تھی۔ مگر دل پر جو کچھ گذرتا خاموشی کے ساتھ جھیلتی۔ کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی۔ جب اُس نے دیکھا کہ سُریندرو کو سمجھانے بجھانے کی کوشش ہمیشہ سخت کلامیوں کا باعث ہوتی ہے تو قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ رہی۔ قسمت مایوسوں کی امید اور بدنصیبوں کا سہارا ہے۔ اخراجات کے باعث مُلازموں کو جواب دینا پڑا۔ بیچاری بیزبان عورت دن بھر لڑکیوں کو پڑھاتی اور گھر کا سارا کام کرتی۔ ان مصیبتوں نے اس کی صورت کو یہاں تک مسخ کر دیا تھا کہ بابو ہری موہن جب مدراس سے سال بھر کے بعد لوٹے تو اُسے مشکل سے پہچان سکے۔

اس کے بعد معلوم نہیں اُن بدنصیبوں پر کیا گذری۔ پرنسپل کاٹن نے آئے دن کی حجت و تکرار سے تنگ آکر روہنی سے استعفا لے لیا اور خدا جانے کس کس دیس کی خاک چھانتے ہوئے بالآخر وہ کشمیر پہنچی۔ وہاں سے روہنی نے مس گپتا کو جو خط لکھا وہ نہایت دردناک اور جگر دوز تھا:-

بہن! میرا کیا حال پوچھتی ہو! اب زندگی سے جی بھر گیا۔ مجھے اپنی کچھ فکر نہیں ہے۔ مگر تمہارے بہنوئی صاحب کی حالت نہایت خراب ہے۔ خدا گواہ ہے میں اب بھی اُن کی پرستش کرتی ہوں۔ میں نے اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیا۔ مگر ہائے شراب! تیرا ستیاناس ہو۔ ہائے جُوا! تیرا بُرا ہو۔ یہ دو مرض اُن کی جان کے گاہک ہو رہے ہیں۔ بس اور زیادہ نہ کہوں گی۔ تم سے کہتے شرم آتی ہے۔ اور شرم کی تو انہیں پروا نہیں۔ کیونکہ مدت ہوئے اسے رخصت کر چکے۔ مگر تمہیں سنکر رنج ہوگا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہاری بھولی بھالی روہنی اب اپنے کئے پر پچھتاتی اور خون کے آنسو روتی ہے۔

نواب رائے

کیفرِ کردار

(۱)

اعظم گڑھ کے ضلع میں سرجو ندی کے کنارے ایک چھوٹا سا میدان ہے۔ اس کے دوسری طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے جو یہاں سے ایک میل مشرق کی طرف چلکر سرجو ندی سے مل گئی ہے تیسری طرف ایک دشوار گذار، اتھاہ دلدل ہے۔ چوتھی طرف ندی کے نشیب و فراز میں ہوتی ہوئی ایک پتلی سی پگڈنڈی ہے جس نے اس میدان کو دنیا کا ایک حصہ بنا رکھا ہے۔ اسلئے گو یہ میدان جغرافی اصطلاح میں نہ جزیرہ تھا نہ جزیرہ نما، شاید جغرافیہ میں اس کے لئے کوئی اصطلاح موزوں نہیں ہے، مگر فی الواقعی وہ ایک غیر آباد، ویران جزیرہ تھا جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ سے ایک اہیر نے اس ویرانے کو آباد کر رکھا تھا۔ نہیں معلوم زمینداروں نے اُسے گاؤں سے نکال دیا، یا کسی وجہ سے اُسے آبادی سے دور رہنا پڑا۔ اُس غریب نے اِس دلدلی مقام میں سکونت اختیار کی تھی یہاں ایک چھوٹا سا جھونپڑا، چند گائیں بھینسیں بھیڑ بکریوں کے گلے چرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُس حوصلہ مند اہیر نے جسے شیو رام کہتے تھے ایک چھوٹی سی کشتی بھی بنا رکھی تھی جسپر بیٹھکر وہ قریب کے قصبہ میں اون، گھی، اور دودھ بیچنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مچھلیوں کا شکار بھی کھیلتا۔ شیو رام کو اس ویرانے کا آباد کرنا مبارک نہ ہوا۔ یہاں آنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد اُسکی بیوی ملیریا کے نذر ہو گئی اب اُسکی صرف ایک لڑکی تھی جسکے سر پر گرہستی کا سارا بوجھ تھا۔ شیو رام اس تاک میں تھا کہ کہیں سگائی ٹھہر جائے تو بیچاری گورا کے سر سے یہ بلا ٹلے۔ مگر خدا جانے کیوں برادری میں لوگ اُسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ گورا کی اُس نے ابتک شادی نہیں کی تھی۔ یہ ایک سانولے رنگ کی بھولی صورت والی نازنین تھی، جسے حسین تو نہیں کہہ سکتے، مگر دلفریب ضرور کہتے ہیں۔ گورا کے لئے یہ جھونپڑا قیدخانے سے کم نہ تھا۔ صبح سے شام تک شیو رام یا تو مویشیوں کے ساتھ رہتا، یا بازار کرنے جاتا، یا مچھلیاں پکڑتا، اور گورا سارے دن اکیلی بیٹھی کبھی گھر کا کام کاج کرتی، کبھی بیٹھی بیٹھی اُکتا کر رو دیتی۔ مگر جھونپڑے سے باہر نکلنے کی ممانعت تھی اور نہ وہ نکل سکتی تھی۔ ہاں اب اس قید تنہائی سے جلد رہائی ملنے والی تھی کیونکہ گورا کی سگائی ایک نوجوان اہیر سے ہو گئی تھی جو سرجو کے لب ساحل ایک دوسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ لیکن

جب گورا سوچتی کہ مجھے اب یہاں سے جانا پڑے گا تو اُسکا دل بیٹھ جاتا" اور وہ ایشور سے مناتی کہ یہ قید تنہائی ہمیشہ قایم رہے۔

ایک دن شام کے وقت گورا اپنے جھونپڑے میں بیٹھی ہوئی آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھ رہی تھی۔ اُسکے سُسرال سے ایک سُرخ ساری اُسکے لئے آئی تھی۔ گورا نے اُسے زیب بر کیا تھا" اور آئینہ میں دیکھ رہی تھی کہ یہ مجھ پر کھلتی ہے یا نہیں۔ کبھی وہ آنچل کو آدھے سر تک رکھتی کبھی ماتھے تک۔ اُسکا چہرہ بہت شگفتہ تھا، کیونکہ ایسی خوشرنگ ساری اُس نے کبھی نہیں پہنی تھی اور نہ وہ خود اپنی نگاہوں میں ایسی حسین معلوم ہوئی تھی۔ اُسے اپنے بھولے بھالے حسن کا آج کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوا" اور آئینہ کے سامنے سے ہٹی تو اُسکی آنکھوں میں اطمینان اور غرور کی دلاویز جھلک موجود تھی۔ اُسے یاد نہیں آتا تھا کہ اپنے سے زیادہ اچھی صورت کبھی دیکھی ہے یا نہیں۔

اتنے میں اُسے دروازہ پر کسی کے پانوں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اُس نے سمجھا میرے باپ آگئے۔ جلدی سے ماتھا چھپا لیا اور آئینہ کو اٹھا کر چارپائی کے نیچے ڈالدیا۔ مگر جب بجائے اُسکے باپ کے ایک اجنبی صورت کے نوجوان نے دروازہ کھول کر کمرہ میں جھانکا تو گورا کے مُنہ سے ایک چیخ نکل آئی اور دل دھڑکنے لگا اس نے کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا "تم کون ہو؟" اور یہ کہکر ہاتھ میں ایک سونٹا لیکر کھڑی ہوگئی۔

نوجوان کمرہ کے اندر چلا آیا" اور بہت منت آمیز لہجہ میں بولا "تم ڈرو مت" میں تم سے کچھ نہیں بولونگا مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو دو۔ بھوک سے مرا جاتا ہوں"۔

گورا۔ "تم کون ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟"

نوجوان۔ "ایک بدنصیب آدمی ہوں اور کون ہوں۔ دن بھر سے جنگل کی خاک چھان رہا ہوں۔ سیکڑوں آدمی میری تلاش میں گھوم رہے ہیں۔ نگانوں کا گانوں میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ کل رات کو ہردت پور میں ایک بڑا ڈاکہ پڑا۔ وہاں کا نمبردار اُس ڈاکہ میں مارا گیا۔ اب مجھ غریب پر لوگ شبہ کر رہے ہیں۔ مگر میں ایشور سے کہتا ہوں کہ میں اس گناہ میں بالکل نہیں شریک تھا۔ یہ میرے دشمنوں کی شرارت ہے۔ اسوقت مجھے قسمت یہاں لے آئی۔ مگر یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ جدھر جاتا ہوں پانی اور دلدل کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ اگر اُسی راستے لوٹ جاؤں جدھر سے آیا ہوں تو ضرور گرفتار ہوجاؤنگا کیونکہ لوگ میری گھات میں لگے ہوئے ہیں۔ تم مجھے کچھ کھانے کو دیدو، اور تب مجھے یہاں سے جان لیکر بھاگ نکلنے کا کوئی راستہ بتادو۔ تمہارے دل میں رحم ہے۔ ایشور تمھیں اس نیکی کا بدلہ دیں گے"!

گورا یہ سرگذشت سنکر کانپ اٹھی۔ اُسے اس نوجوان کی بیگناہی کا یقین نہ آیا۔ "ضرور یہ قاتل ہے" اور میں اس سنسان جگہ میں اسکے سامنے کھڑی ہوں۔ یہ مجھے بھی مار ڈالے اور یہاں کی ساری چیزیں اٹھالے جائے تو کیا کرونگی۔ فریاد بھی تو نہیں کر سکتی۔ یہاں کون بیٹھا ہوا ہے۔ دادا نہ معلوم کب تک آئیں گے۔ یا ایشور تو میری مدد کر"۔ اس طرح دل میں سوچکر اس نے نوجوان سے کہا "میں تمھیں کھانے کو دیدوں تو تم بھاگ جاؤگے نہ؟ اگر جلد نہ بھاگو گے تو میرے باپ آکر تمھیں پکڑ لیں گے"۔ نوجوان نے جواب دیا۔ "کیا تمہارے باپ جلد آجائیں گے؟"

گورا۔ "ہاں وہ آتے ہی ہوں گے۔ تم کھانا کھالو اور فوراً بھاگ جاؤ"۔ یہ کہکر اس نے تھوڑا سا دودھ اور چند روٹیاں ایک تھالی میں رکھکر اُسے دیدیں۔ نوجوان کھانے پر ایسا ٹوٹا گویا کبھی دانہ کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ جبتک وہ کھاتا رہا گورا سونٹا مضبوطی سے

بکڑتے ہوئے اسکی طرف غور سے دیکھتی رہی۔ اُسکا دل دھڑک رہا تھا اور کان شیو رام کے قدموں کی آہٹ سننے کے لئے بیقرار ہو رہے تھے۔ جب نوجوان کہا چکا تو گورا نے دیکھا کہ وہ اِدھر اُدھر شرارت آمیز نگاہوں سے تاک رہا ہے۔ گویا کسی لاٹھی کی تلاش میں ہے۔ گورا نے ڈانٹ کر کہا "اب تم یہاں سے چلے جاؤ"۔

نوجوان "جانِ من۔ میں گھُڑکیاں سننے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہارے ہاتھ میں سونٹا دیکھکر میں ذرا بھی نہیں ڈرتا۔ میں چاہوں تو ابھی تمہارے ہاتھ سے وہ ہتھیار چھین لوں۔ مگر تم نے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ اسلئے میں تمھیں زیادہ تکلیف نہ دونگا۔ تم چلکر مجھے راستہ بتا دو"۔

گورا کا خون سرد ہو گیا۔ نوجوان نے جو کچھ کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ بولی۔ "یہاں سے کہاں جاؤگے۔ کہیں راستہ نہیں ہے"۔

نوجوان۔ "ندی کے کنارے کوئی ناؤ نہیں ہے؟"

گورا۔ "تیرے باپ کی ناؤ ہے۔ مگر تم اُسے لیجاؤگے تو واپس کون لائیگا"۔

نوجوان "اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں ہے۔ بس تم مجھے اُس ناؤ تک پہنچا دو"۔

گورا کے لئے مفر کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ سونٹا لئے ہوئے ندی کے کنارے چلی۔ نوجوان پیچھے پیچھے اسکے ساتھ چلا۔ کنارے پر پہنچکر یکایک وہ درشت لہجہ میں بولا "اپنے کپڑے اُتار کر مجھے دیدو۔ زنانہ بھیس میں مجھے کوئی نہ پہچان سکیگا۔ کیوں کیا سوچتی ہو۔ یہ بڑی ذرا فت ہے (جس چیز کو بزور لے سکتا ہوں اسکے لئے تم سے فقیروں کی طرح سوال کرتا ہوں۔ کیا ایک انسان کی جان بچانے کے لئے تم اتنی سی تکلیف بھی برداشت نہ کروگی"۔

بیکس اور بے بس گورا نے اس نوجوان سے زیادہ سوال و جواب کرنا فضول سمجھا۔ روتے ہوئے اُس نے اپنی خوشرنگ ساری اُتار کر اُسے دیدی۔ اور جلدی سے اُس صافے کو جسے نوجوان نے اُسکی طرف پھینک دیا تھا پہن لیا۔ تب اُس ظالم نے ساری پہنی اور لمبا سا گھونگھٹ نکال کر کشتی کی طرف چلا۔ یکایک کچھ سوچکر وہ مڑا اور تیزی سے لپک کر گورا کے ہاتھ سے ڈنڈے کو چھین لیا۔ گورا خوف سے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اور تب نوجوان نے اس بیہوشی کو دیر تک قایم رکھنے کے لئے زور سے ایک ڈنڈا اُسکے سر پر مارا۔ اور کشتی پر بیٹھکر ایک طرف کو چلدیا۔ "اب اگر تمہارا باپ آیا بھی تو تم نہ بتا سکوگی کہ میں کون ہوں اور کدھر گیا"۔

(۲)

نوجوان ڈاکو تیزی سے ڈانڈا چلاتا ہوا چار میل تک چلا گیا اور تب اُسے کنارے پر ایک گانوں کے آثار نظر آئے۔ جابجا دھندلی روشنی کے چراغ ٹمٹما رہے تھے جنکا عکس پانی میں گلفشانی کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھاٹ پر کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ کچھ نہا رہی تھیں۔ ملاحوں کے جھونپڑوں میں چولھے جل رہے تھے۔ کشتیاں کھونٹوں سے بندھی ہوئی پانی میں جلکورے لے رہی تھیں۔ نوجوان نے یہاں رات بسر کرنے کی نیت سے کشتی کنارے پر لگا دی۔ اور اُسے ایک کھونٹے سے باندھکر لپکتا ہوا گانوں میں جا پہنچا۔ گانوں میں بالعموم لوگ سرِ شام ہی سے سو جایا کرتے ہیں۔ ہاں جابجا بوڑھے آدمی بیٹھے اپنے حقّے سے دل بہلاتے ہوئے نظر آتے تھے جس سے زیادہ ہمدرد اور غمگسار عالمِ ضعیفی میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ڈاکو کا منشا یہ تھا کہ اندھیرے میں کوئی بھلا مانس مل جائے تو اُسپر ہاتھ صاف کروں کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے۔ اور قسمت جو کچھ دلائے اُسے لیکر ندی کے کنارے اپنی کشتی پر جا بیٹھوں۔ اور دو گھڑی رات رہے پوا ٹھکر آگے کو چلدوں۔ وہ انھیں منصوبوں میں تھا کہ دفعتاً ایک نوجوان لالٹین ہاتھ میں لئے سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔

اُس نے اس زنانے ڈاکو کو دیکھا تو چونک پڑا اور بولا "کون ہے گورا! تم یہاں کہاں؟ خیریت تو ہے؟" یہ وہی آدمی تھا جس سے گورا کی منگنی ہوئی تھی۔ وہ خوشرنگ ساری جو اسوقت ایک قاتل کے گناہوں پہ پردہ ڈالے ہوئے تھی اُسی نے گورا کے لئے بھیجی تھی۔ گانوں میں اس وضع کی ساری کسی دوسری عورت کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اُسے معاً خیال گذرا کہ شاید یہ گورا ہے۔ اُسکا باپ کسی کام سے یہاں آیا ہوگا۔ اُسکے ساتھ وہ بھی چلی آئی ہوگی۔ نوجوان ڈاکو یہ آواز سنتے ہی چونکا اور قدم تیز کر دیئے تاکہ کسی تاریک گلی میں پہنچ جائے مگر اُس دیہاتی نوجوان نے لپک کر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "گورا! اسوقت مت شرماؤ۔ تم یہاں کیسے آئیں۔ تمہارے دادا بھی آئے ہیں؟"

ڈاکو نے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دیا تاکہ بھاگ جائے۔ مگر اُس دہقانی جوان نے اُسے خوب مضبوط پکڑا تھا۔ اُس نے گھونگھٹ ہٹا دیا اور ایک مرد کا چہرہ دیکھکر قہقہہ مار کر ہنسا۔ "واہ! آپ تو کوئی بھگت جی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ زنانہ بھیس کب سے لیا؟ آیئے چوکیدار کے یہاں ذرا آپ کی مزاج پرسی کروں۔ آج آپ کسی منحوس آدمی کا منہ دیکھکر اُٹھے تھے۔ گوبردھن کے ہاتھ میں پھنسکر چوروں کا گھومڑ نکل جاتا ہے۔ سر کے ایک بال بھی نہیں رہتے۔ وہی گت تمہاری ہوگی۔ تم نے میری پیاری گورا کے گھر میں سیند ڈالی ہے۔ یہ وہی ساری ہے جو میں نے کل اُسکے لئے بھیجی تھی۔ کیوں ہے نہ یہی بات؟"

ڈاکو سمجھ گیا کہ اب یہاں سے چھٹکارا پانا غیر ممکن ہے۔ قسمت نے کہاں لاکر پٹکا۔ بولا "ایشور گواہ ہے۔ گورا نے مجھ پر ترس کھا کر یہ ساری مجھے دیدی ہے۔ میں نے اُس کے گھر میں سیند نہیں ماری۔ میں چور نہیں ہوں۔ ایسی بھولی عورت کو میں نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ چاہے چور یا قاتل ہی کیوں نہ ہوتا۔ جس آدمی کی حالت پر گورا نے رحم کیا ہے کیا گورا کا منگیتر اُسی آدمی کے گلے پر چھری پھیرے گا۔ میں قسمت کا ستایا ہوا غریب آدمی ہوں۔ بھولتا بھٹکتا گورا کے جھو… تک جا پہنچا۔ اُس نے میری رام کہانی سُنی۔ اُسے رحم آگیا۔ یہ ساری مجھے دیدی کہ کسی طرح اسکی جان بچ جائے۔ میں بالکل سچ کہتا ہوں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔"

گوبردھن پھر ہنسا اور بولا "بیشک آپ بہت سچے اور … آدمی ہیں۔ کچھ اپنا حال مجھ سے بھی کہو۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔ تم … مکان پر کیسے پہنچے۔ یوں میں نہیں چھوڑنے کا سمجھے؟"

ڈاکو۔ "میں ساری کہانی کہہ دونگا۔ کل رات کو ہردت پور میں ایک ڈاکہ پڑا۔ تھبردار مارا گیا۔ ڈاکو بھاگ گئے۔ مگر وہاں لوگوں کو شبہ ہے کہ میں بھی اُس ڈاکہ میں شریک تھا۔ مگر یہ دشمنوں کی کارستانی ہے۔ خواہ مخواہ میرے سر یہ الزام تھوپ دیا۔ مجبور ہوکر میں بھاگ نکلا۔ کل سارے دن نالوں اور گڑھوں میں چھپتا پھرا۔ ورنہ اسوقت تمہارے سامنے کھڑا ہوتا؟"

گوبردھن۔ "اچھا تو آپ ہردت پور کے ڈکیتوں میں ہیں۔ یہ گورا شاید بڑی رحمدل ہے جو ڈکیتوں کی جان بچاتی پھرتی ہے۔ اچھا یہی سہی۔ مگر اُس نے اپنی پرانی ساری کیوں نہیں دی؟ وہ نئی ساری کیوں دی جو میں اُسکے لئے بریلی سے … روپیہ میں لایا ہوں اور جسے پہنکر وہ رانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتاؤ۔ کوئی اپنی منگیتر کی دی ہوئی چیز کو یوں لٹاتا ہے؟"

ڈاکو کچھ سٹ پٹا گیا۔ مگر سنبھلکر بولا "تمہاری دی ہوئی ساری تو وہ خود پہنے ہوئے ہے۔ وہ بھلا مجھے کیوں دیتی۔ یہ ساری … اُسی رنگ کی ہے۔ یہ اُسکے باپ نے اُسے دی ہے۔ دونوں ساریاں بالکل ایک رنگ کی ہیں۔"

گوبردھن۔ "اچھا یہ بھی سہی تو اُس نے اپنے باپ کی ناؤ تمہیں کیوں دی؟ کیا وہ اتنا نہیں جانتی کہ ناؤ آپ ہی آپ اپنے ٹھکانے …

نہیں چلی آتی۔ اسکا جواب دیجئے۔ اُسکو اگر نقصان کا خیال نہوا تو کیا اپنے باپ کا خوف بھی نہوا؟"

ڈاکو اب چوکنا ہو گیا تھا۔ بولا "اُس نے مجھے کہا تم ناؤ بیچ دو۔ میرے دادا پوچھیں گے تو میں کہدوں گی کہ ایک پرانی ناؤ کے کھو جانے سے اگر کسی بیگناہ کی جان بچ جائے تو اُسکا افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ میں تو خود اسے نہیں لیتا تھا۔ مگر اُس نے زبردستی مجھے اسپر بٹھا دیا اور کہنے لگی میرے دادا ایسے لالچی اور خود غرض نہیں ہیں۔ تم لے لیجاؤ۔ اگر ہو سکے تو کل تک کسی معتبر آدمی کی معرفت بھیجدینا۔

گوبردھن کو اپنے اعتراضات کا جواب تو ملا، مگر دل کو اطمینان نہوا۔ بولا "بھائی سُنا! مجھے تمہاری باتوں پر وشواس نہیں آتا۔ مجھے شک ہے کہ تم نے ضرور شیورام مہتو کا گھر لوٹا۔ اور شاید گورا کو مار بھی ڈالا ہو تو تعجب نہیں۔ تم ڈاکو ہو۔ تمہارا یہی پیشہ ہے۔ اسلئے جبتک اُس کی زبان سے تمہاری باتوں کی تصدیق نہو گی میں ہرگز نہ مانونگا۔ ابھی بہت رات نہیں گئی ہے۔ دس بجتے بجتے ہم لوگ پہنچ جائیں گے۔ مجھے گورا کے دیکھنے کا ایک بہانہ ہاتھ آجائیگا۔ دو چار میٹھی میٹھی باتیں سنونگا، اچھے اچھے کھانے کھاؤنگا، اور صبح لوٹ آؤنگا۔ لیکن اگر تم نے اسکا بال بھی بیکا کیا ہے تو تمہاری جان کی خیر نہیں۔ کتوں سے بوٹی بوٹی نچوا لونگا۔"

یہ کہکر گوبردھن نے اپنی ماں کو گھر میں سے بلایا، اور چند لفظوں میں صورت حال بیان کرکے بولا کہ میں شیورام مہتو کے گھر تک جاتا ہوں۔ رات کو نہ آؤنگا۔ کواڑ بند کر لینا۔ بڈھی عورت نے منع کیا کہ رات کو مت جا۔ ڈاکو ہے نہ جانے کیا پڑے کیا نہ پڑے۔ صبح کو جانا۔ مگر گوبردھن نے اسکی تشفی کی، اور ڈاکو کو کھینچتا ہوا گھاٹ تک لایا۔ اسکی کشتی کھولی، اور اُسے اُس میں بٹھا کر خود ڈانڈا ہاتھ میں لے لیا۔ پانی کی دھار تیز تھی، اور کشتی کو چڑھاؤ کی طرف جانا تھا، آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

(۴۳)

آدھ گھنٹہ تک ان دو آدمیوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ یکایک ڈاکو نے پوچھا "اگر تمہیں ثابت ہو جائیگا کہ میں نے شیورام کے گھر میں سیند نہیں ماری تو مجھے چھوڑ دو گے نہ؟"

گوبردھن "میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہاں چلکر بتاؤنگا۔"

ڈاکو "میں وہاں تک اسی شرط پر چلونگا کہ اگر میں نے شیورام کے گھر میں سیند نہ ماری ہو اور گورا کو کوئی تکلیف نہ دی ہو تو تم مجھے چھوڑ دو گے۔ ورنہ میں یہیں ندی میں کود پڑونگا اور تیر کر کہیں نکل جاؤنگا۔ پولیس کے ہاتھوں میں میں نہیں جانا چاہتا۔"

گوبردھن "تمہارا اختیار ہے جی چاہے پانی میں کود پڑو یا اپنا سر پٹک لو۔ تمہاری خاطر سے اتنا کہتا ہوں کہ اگر تم نے یہاں کوئی شرارت نہیں کی ہے تو تمہیں پولیس کے حوالے نہ کرونگا۔"

ڈاکو۔ قسم کھاؤ۔"

گوبردھن "تمہارے سر کی قسم"

ڈاکو خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کشتی کنارے پر لگی تو ایک آواز سنائی دی۔ "دادا! آج تم نے اتنی دیر کیوں کی؟"

گوبردھن نے آواز پہچان لی اور خوش خوش، ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے کشتی سے اُتر کر بولا "کیا ابھی تمہارے دادا نہیں آئے۔ آدھی رات ہونے آئی ہے۔ کیا تم یہاں دیر سے کھڑی ہو؟"

گورا نے گوبردھن کو ڈاکو کے ساتھ دیکھا تو مارے شرم کے عرق عرق ہو گئی۔ اُس نے سر جھکا لیا اور وہاں سے ذرا ہٹ گئی۔ گوبردھن نے دیکھا کہ اُسکی ساری گھٹنے سے اوپر تک آکے رہ گئی ہے۔

گھونگھٹ نکالنے کی کوشش میں ننگی پیٹھ کھلی جاتی تھی۔ گورا اسوقت وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اپنے منگیتر کے سامنے اس بُری حیثیت سے وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ مگر گوبردھن ڈاکو کا ہاتھ پکڑے ہوئے گورا کے سامنے آیا اور بولا "دیکھو گورا! اسوقت شرماؤ مت۔ جب مجھ آویں تو جی بھر کر لجا لینا۔ تم اس عورت کو جانتی ہو؟"

گورا اسنے آہستہ سے کہا "ہاں"

گوبردھن "اُس نے تمہارے یہاں سے کوئی چیز چرائی؟"

گورا۔ "نہیں"

گوبردھن "تم نے اپنی ساری اسے دیدی؟"

گورا۔ "اُس نے مجھ سے چھین لی"۔

ڈاکو نے بولنا چاہا۔ مگر گوبردھن نے ڈانٹ کر اُسے خاموش کر دیا اور پھر گورا سے جرح کرنے لگا۔ "تمنے اپنی ناؤ اسے دی؟"

گورا۔ "اُس نے زبردستی کھول لی۔ مین تو منع کرتی رہی"۔

گوبردھن "تمھیں اس نے مارا تو نہیں؟"

گورا زبان سے نہ بولی۔ مگر اس کی دھیمی دھیمی سسکی سنائی دی۔ گوبردھن سے اب صبر نہو سکا۔ اس نے وہی ڈنڈا اُٹھا لیا جو ڈاکو نے گورا سے چھینا تھا اور ڈاکو کے پیچھے دوڑا۔ ڈاکو جان بچا کر بھاگا۔ اور اُس طرف جدھر اتھاہ دلدل تھا تیزی سے بھاگتا ہوا چلا گیا۔ صبح کو جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو دلدل میں اُنھیں پیروں کے نشان نظر آئے۔ اسکے بعد ایک گڑھا سا دکھائی دیا۔ لوگ سمجھ گئے کہ یہی اُس ڈاکو کی قبر ہے۔ "جیسی کرنی ویسی بھرنی!"

نواب رائے

سگِ لیلیٰ

[واروِن ہوتا تو ہربرٹ کے ہاتھ چوم لیتا اور اس کے کرتب کو سلامِ ارادت کی بین دلیل ثابت کرتا۔ یہ سگِ لیلیٰ سگِ اصحابِ کہف تو نہ تھا اور لیلیٰ بھی وہ لیلیٰ نہ تھی جس کے لئے قیس سا سیانا مجنوں ہو گیا۔ یہ لیلیٰ ولایتی مس لیلی تھی جس کو سادہ لوح سمجھ کر لارڈ ہربرٹ اپنا مصنوعی عشق جتلایا کرتے تھے۔ خیریت ہوئی کہ روبن جیسا کتا موجود تھا جس کی بدولت کھوٹے کھرے عشق کی جانچ ہو گئی۔ اور اُن کے رقیب مسٹر جان بارٹن سے ڈوئیل[1] بازی کی نوبت نہ آئی وہ تو لارڈ ہربرٹ کی سلامتی تھی کہ روبن بُل ڈوگ نہ تھا۔ ورنہ ہربرٹ پر انقلاب برپا کر دیتا اور لیلیٰ لاکھ زور کرتی پھر بھی لارڈ ہربرٹ کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں کتیا کی اس حرکت سے کہ بچوں کو منہ سے اٹھا اٹھا کر سیلاب سے محفوظ جگہ میں لے آتی تھی اگر ایک بزرگ نے یہ سمجھا تھا کہ یہ طوفان آنے والا ہے تو کیا کچھا۔ یہاں روبن نے وہ کام کیا کہ شاید و باید۔ اس دلچسپ حکایت کو منشی نواب اے صاحب نے خاص ادیب کے لئے انگریزی سے ماخوذ کیا ہے۔ اڈیٹر]

(۱)

مس لیلی نے اپنے عاشقِ زار مسٹر بارٹن سے کہا "آج کی چاندنی رات کیسی سہانی ہے"!

بارٹن نے کسی قدر شاعرانہ تصرف کے ساتھ جواب دیا "ہاں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب منہ پر ایک سنہری نقاب ڈالے ہے"۔

اتنے میں ایک تیسرا شخص کمرہ میں داخل ہوا۔ یہ ایک نہایت خوش وضع اور سجیلا جوان تھا جس کے بشرہ سے امارت اور ریاست کے آثار نمایاں تھے۔ آتے ہی اُس نے مس لیلی کو مخاطب کر کے کہا "اس وقت افریقہ کے ریگستان میں عجیب بہار ہو گی"۔

بارٹن گو ایسا خوش لباس آدمی نہ تھا جیسا یہ تازہ وارد نوجوان لارڈ ہربرٹ مگر اُس کے چہرہ سے متانت و شرافت ٹپک رہی تھی۔ اس کے خیالات شاعرانہ ضرور تھے مگر زبان میں روانی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ سال بھر سے مس لیلی کے عشق میں گھل رہا تھا لیکن یہ حوصلہ نہ ہوا کہ اُس سے اپنے دردِ دل کی داستان کہتا اور زخمِ جگر پر مرہم رکھواتا۔ یا تو اُسے کبھی مناسب موقع ہی نہ ملتا یا خیالات دل سے نکل کر ہونٹوں تک آتے اور وہیں سے لوٹ جاتے۔ علاوہ بریں اس کی زبان میں وہ شوخی و طراری بھی نہ تھی جو بے ساختہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ اس کے برعکس لارڈ ہربرٹ نہایت رنگین مزاج اور رسیلا آدمی تھا۔ زبان میں وہ روانی تھی کہ گھنٹوں گلفشانی کیا کرتا۔ مزاج میں شوخی اور جدت کا مادہ بھرا ہوا تھا۔ وہ سیاح بھی تھا اور روئے زمین کے بیشتر مقامات کے حالات سے واقف تھا۔ یہ سیاحت اس کے سلسلۂ کلام کی تازگی اور روانی میں بہت مدد کرتی تھی۔ اُس نے مس لیلی کو پیرس میں دیکھا تھا جب سے سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بارٹن کو روز بروز اپنا پہلو کمزور ہوتا نظر آتا تھا۔ جس وقت ہربرٹ کمرہ میں آتا لیلی اُس کی طرف ہمہ تن گوش ہو جاتی اور اس کی سیاحت کے واقعے بڑے غور سے سنتی اور وہ اس کی ایک ایک بات پر مسکراتی۔ اس کے آتے ہی لیلی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا اور وہ بلبل کی طرح چہکنے لگتی۔ بارٹن انھیں دیدۂ

---

[1] [illegible]uel-fight ولایتی عشق بازی کی وہ جنگ جو دو رقیبوں کو برسرِ پیکار کر کے صداقتِ عشق کی تصدیق کے لئے ایک رقیب کو تیغ و طپنچہ کے ذریعہ صفحۂ ہستی سے ناپید ہونے کا پروانۂ راہداری دے دیتی ہے۔ اڈیٹر

ہربرٹ کی صورت سے بیزار تھا۔ اُس نے کئی بار ہربرٹ سے ڈوئیل بازی کا ارادہ کیا لیکن محض لیلی کے خوف سے باز رہا۔ جس وقت لارڈ ہربرٹ موجود ہوتا، بارٹن کے ہونٹوں پر سکوت کی ایک مضبوط مُہر لگ جاتی تھی۔ وہ گہرے خیال میں ڈوب جاتا اور دل ہی دل کہنے لگتا۔ "کیا یہ حُسن پرست لونڈا میری ساری زندگی کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دے گا! میں یہ خوب جانتا ہوں کہ اُس کے دل میں لیلی کی محبت نہیں ہے۔ اُس میں اب عشق کی قابلیت ہی نہیں۔ وہ صرف لیلی کی دولت کا عاشق ہے مگر افسوس ہے کہ لیلی اُس کے دم میں روز بروز آتی جاتی ہے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی۔ اُسے اتنی بھی تمیز نہیں! اگر اس میں اتنا احساس نہیں ہے تو وہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر جان دوں۔ مگر اب میں جلد تصفیہ کر لوں گا۔ اب یہ آئے دن کی کوفت مجھ سے نہیں سہی جاتی۔ ہربرٹ کی چالوں کا ایک بار میں اُس سے ضرور ذکر کروں گا۔ لیلی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ یہ حضرت فاقہ مست ہیں۔ جو کچھ ریاست اور دولت ہے وہ لسانی ہے۔ وہ اُس کی چکنی چپڑی باتوں، ملمع اور نمائشی حرکتوں پر فریفتہ ہو گئی ہے۔ میں اب اس طلسم کو کھولے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

(۲)

ایک روز بارٹن اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ مس کیلی کا خانساماں دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا "مسٹر بارٹن ذرا باہر آیئے آپ کو ایک تماشا دکھاؤں۔ لارڈ ہربرٹ کی صورت اس وقت دیکھنے کے قابل ہے۔"

بارٹن "کیوں؟ بات کیا ہے؟ ہربرٹ کو کیا ہو گیا؟"

خانساماں (ہنس کر) "آپ کے پیارے کتّے نے اُن کا قافیہ تنگ کر رکھا ہے۔ یہ حضرت کتّوں سے ڈرتے بہت ہیں۔ میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں۔ کتّوں کی صورت دیکھی اور لرزہ آگیا۔ اس وقت آپ کا روبن چپ چاپ چلا آتا تھا۔ لارڈ صاحب اُسے دیکھتے ہی بھاگے۔ بھاگنا تھا کہ روبن نے دیکھ لیا اور پیچھے پڑ گیا۔ ایک گھڑ دوڑ سی ہو گئی۔ آگے آگے ذات شریف پریشان، چہرہ فق، بدحواس، ہانپتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے کتا غُرّاتا ہوا تیزی سے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ ڈر کے مارے اب گرے جب گرے۔ خیریت ہوئی کہ سامنے ایک درخت مل گیا۔ پھر کیا تھا۔ آپ بڑی پھرتی سے اس درخت پر چڑھ گئے۔ چلکو ذرا آپ اُن کی قطع تو دیکھیے۔"

بارٹن کو اس وقت وہی خوشی ہوئی جو اپنے رقیب کی ذلت پر انسان کے دل میں ہوا کرتی ہے۔ باہر آئے اور لپکے ہوئے باغ میں جا پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ لارڈ ہربرٹ دونوں ہاتھوں سے ایک ٹھونٹھ پکڑے درخت سے چمٹے بیٹھے ہیں اور روبن اوپر سر اُٹھائے انھیں نیچے للکار للکار کر اشارہ کر رہا ہے۔ "یہ کیا کہ آسمان پر جا بیٹھے، دم خم ہو تو آ جاؤ نیچے" اپنی پرخروش آوازوں میں روبن انھیں خیالات کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ بارٹن کو دیکھتا تھا کہ لارڈ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر بولے "بارٹن! اس موذی کو کسی طرح یہاں سے دُور کرو۔ تم نے اچھا جانور پال رکھا ہے۔ اگر میں اس درخت پر نہ چڑھ جاتا تو اس نے میری ٹانگ پکڑ لی ہوتی۔ اسے جلد یہاں سے دفع کرو۔ خدا کے لئے مجھ پر یہ کرم کرو۔"

بارٹن (ہنس کر) "آپ ناحق اس سے ڈرتے ہیں۔ یہ غریب کبھی کسی کو نہیں کاٹتا۔ بچے تو اس سے کھیلا کرتے ہیں۔"

ہربرٹ (لجاجت سے) "بھائی جان باتیں نہ بناؤ

میری روح فنا ہوئی جاتی ہے (دبی زبان سے) اور تمہیں دل لگی سوجھی ہوئی ہے۔"

روبن نے اپنے آقا کو دیکھا تو دم ہلاتا ہوا اُس کے پاس آگیا۔ بارٹن نے اُس کے گلے کا تسمہ پکڑ کر اُسے وہاں سے ہٹایا اور ہربرٹ کی اس درگت کا قصہ سنانے کے لئے مس لیلی کے پاس جانا چاہتا تھا کہ تار والے نے آکر اُس کے ہاتھوں میں ایک لفافہ رکھدیا۔ بارٹن نے اُسے کھول کر پڑھا تو چہرہ زرد ہو گیا۔ لکھا تھا کہ "جلد آؤ تمہارے والد سخت بیمار ہیں۔"

بارٹن اپنے کمرہ میں آیا۔ اور اپنا سامان سفر تیار کر کے مس لیلی سے رخصت ہونے گیا۔ موٹر کار دروازہ پر کھڑا تھا۔ لیلی نے یہ خبر سنی تو ملول ہو کر بولی "اب کب تک آؤ گے؟"

بارٹن (غمگین لہجہ میں) "غالباً دو ہفتہ میں آجاؤں گا۔"

لیلی "مگر روبن کو نہ لے جاؤ۔ اُسے یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ اس پیارے رفیق کے بغیر مجھے لمحہ بھر چین نہ آئے گا۔ مطمئن رہو میں اس کو بہت آرام سے رکھوں گی۔ ایسا پیارا کتا میں نے نہیں دیکھا۔"

بارٹن خوشی سے پھول گیا اور دل ہی دل کہنے لگا۔ "اگر تمہاری مرضی پاؤں تو تمہارے قدموں پر میں خود قربان ہو جاؤں۔ یہ کتا کیا چیز ہے۔ کاش مجھے بھی روبن کی سی قسمت ملی ہوتی۔ پیارے روبن! مجھے تجھ پر رشک آتا ہے" (لیلی سے مخاطب ہو کر) "مجھے اُس کے چھوڑ جانے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ میرے لئے عین خوشی کا باعث ہے۔"

لیلی "مسٹر بارٹن! میں تمہاری اس عنایت کا کافی شکریہ نہیں ادا کر سکتی۔"

موٹر کار تیار تھا۔ بارٹن اُس پر بیٹھ گیا۔ اس کی جھجھک نے اُسے اس وقت پھر دھوکا دیا۔ اور اظہار محبت کا ایک نادر موقعہ پھر اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر اُس وقت اپنی پریشانیوں میں اسے ان باتوں کے سوچنے کی کہاں فرصت تھی۔

(۳)

لارڈ ہربرٹ کو جب جان بارٹن کے رخصت ہو جانے کی خبر ملی تو اُس کے دل پر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ روبن کو وہ اپنے ساتھ لیتا گیا ہوگا۔ یہ دو ہفتے عافیت سے گذریں گے قسمت نے یاوری کی تو اسی عرصہ میں میں اپنے دل کے ارمان نکال لوں گا اور پھر کمبخت روبن کی صورت دیکھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے آپ مس لیلی کے کمرہ میں آئے اور چہرہ کو رنجیدہ بنا کر بولے۔ "مس لیلی۔ مجھے سنکر کمال افسوس ہوا کہ جان بارٹن کے والد سخت بیمار ہیں، میں نے ابھی انھیں موٹر کار......"

یہ کہتے کہتے لارڈ ہربرٹ چونک پڑا۔ کیونکہ اُس نے روبن کو باہر سے آتے دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا اور اِدھر اُدھر بغلیں جھانکنے لگا۔ مگر مس لیلی نے "کتے" کو گود میں لے لیا اور بولی "تو اب تک کہاں تھا؟ یہ ناک میں مٹی کہاں لگائی؟ آ تیری ناک صاف کر دوں۔" یہ کہکر اُس نے اپنا ریشمی رومال نکال لیا اور اس سے روبن کے نتھنے صاف کرنے لگی۔ پھر لارڈ ہربرٹ سے بولی "کیوں آپ اس کتے کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ بارٹن اسے لئے جاتے تھے مگر میں نے روک لیا۔ دیکھئے کیسی پیاری صورت ہے۔ آپ اس سے خوش ہیں؟"

ہربرٹ (خوف زدگی کو ضبط کرتے ہوئے) "جی ہاں بیشک۔ بیشک جی ہاں۔ آپ صحیح کہتی ہیں۔"

لیلی "آپ اس خیال کو کہاں تک صحیح سمجھتے ہیں کہ ہر ایک

انسان کی شرافت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ کتے اس سے کس قدر مانوس ہو جاتے ہیں؟"

ہربرٹ۔ (سابق کی طرح ضبط کرتے ہوئے) "آپ کا خیال صحیح ہے۔ بیشک۔ یہ کتا آپ بارٹن کے آنے تک یہیں رہے گا۔ غالباً اصطبل اس کے لئے بہت اچھی جگہ ہوگی"؟

لیلی۔ (چیں بہ جبیں ہوکر) "یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ میرا پیارا روبن اصطبل کے کتوں میں نہیں ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی۔ کیوں آپ کا چہرہ اُداس کیوں ہو گیا؟"

ہربرٹ۔ "کچھ نہیں مجھے مکان پر ایک ضروری کام کرنا ہے۔ ابھی ابھی خیال آ گیا۔ معاف کیجئے گا۔ میں پھر جلد حاضر خدمت ہوں گا۔"

یہ کہکر لارڈ صاحب اُٹھے۔ روبن اُن کی طرف گھور کر غوں[1] غوں کرنے لگا۔ اس غرّاہٹ کو سنتے ہی ہربرٹ کے ہوش اُڑ گئے۔ اپنی قسمت کو اور اس منحوس کتے کو کوستے ہوئے آپ فوراً باہر نکل آئے۔ احاطہ میں لیلی کے خانساماں سے ملاقات ہو گئی۔ ان کا بشرہ دیکھتے ہی وہ تاڑ گیا کہ اس وقت حضرت کے ہوش اُڑے ہوئے ہیں کتے سے یقینی پالا پڑا ہے۔ ہمدردی بنکر لگا کہنے "لارڈ ہربرٹ صاحب! آپ اس وقت کہاں تشریف لئے جاتے ہیں۔ آج کمبخت روبن نے آپ کو بہت دق کیا۔ اگر تھوتھنہ پر نہ جا بیٹھیں تو وہ ضرور آپ کو کاٹ لیتا۔"

ہربرٹ "مسٹر کاک سچ کہتے ہو! تم تو میرے پرانے رفیق ہو۔"

کاک۔ "جی ہاں میں آپ کا نمکخوار ہوں۔ آپ مجھے اپنا غلام سمجھیں۔ میرے لائق جو کام ہو وہ بے تکلف فرمائیں۔"

ہربرٹ۔ "تم تو جانتے ہو مجھے کتوں کی صورت سے نفرت ہے۔"

کاک "جی ہاں، میں خوب جانتا ہوں۔ انھیں دیکھتے ہی آپ کی روح کانپنے لگتی ہے۔"

ہربرٹ "خیر یوں ہی سہی۔ اس شیطان روبن نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اسے کسی طرح یہاں سے دفان کر دو۔"

کاک "یہ کیونکر ہو سکتا ہے"؟

ہربرٹ "بس زہر دیدو۔"

کاک۔ "ارے یہ حضور کیا فرماتے ہیں"؟

ہربرٹ۔ "میں دس پونڈ دوں گا۔ سمجھے۔"

کاک۔ "حضور......"

ہربرٹ۔ "اچھا بیس پونڈ سہی۔"

کاک۔ "حضور بہت مشکل کام ہے۔"

ہربرٹ۔ "انکار مت کرو پچیس پونڈ مل جائیں گے۔"

اتنے میں ادھر سے مس لیلی کے چچا کو آتے دیکھ کر ہربرٹ جلدی سے باہر چلا گیا۔

(۴)

اس کے دو دن بعد کاک لارڈ ہربرٹ کے پاس گیا۔ لارڈ صاحب بہت افسردہ خاطر نظر آتے تھے۔ کسی فلسفی کا قول ہے کہ بعض اوقات بہت خفیف واقعات انسان کی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیاں کر دیتے ہیں۔ لارڈ ہربرٹ کی زندگی کی آرزوئیں، حوصلے اور خوشیاں سب ایک منحوس کتے کے ہاتھوں تباہ ہوئی جاتی تھیں۔ انھیں اپنی کامیابی میں کوئی شک باقی نہ رہا تھا لیلی اس کی باتوں سے کیسی محظوظ ہوتی تھی۔ مگر اس روبن نے سارا خواب پریشان کر دیا۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اس خوفناک کتے کی تیز چمکیلی آنکھوں کے سامنے ان کی روانی تقریر جاری رہتی۔ ایسی حالت میں گفتگو کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ کاک نے

[1] غوں غوں کرنا۔ غرانا۔ کھیسیں کرنا۔

لارڈ صاحب کا رویہ بہت تعظیم سے سر جھکا لیا اور کہنے لگا۔ حضور نے ایک کام کے لئے مجھے پچیس پونڈ دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔" لارڈ ہربرٹ کا چہرہ کھل گیا۔ مقصد براری کی صورت نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بے صبری کے ساتھ بولے "ہاں ہاں مجھے یاد ہے۔ کہو"

کاک: "میں نے اس مسئلہ پر بہت غور کیا۔ مگر اسے خطروں سے بھرا ہوا پاتا ہوں۔ خدا جانے بعد کو کیا ہو۔ کہیں معاملہ کھل جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اس لئے میں نے ایک دوسری ترکیب سوچی ہے کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میرا ایک دوست ہے رابرٹ۔ وہ ایسا کاریگر ہے کہ جس جانور کی صورت چاہتا ہے تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسے رنگ روغن لگاتا ہے کہ بڑے بڑے مبصر بھی نہیں بھانپ سکتے۔ اس کے پاس روبن کے قد و قامت کا ایک خوبصورت کتا ہے، بہت سیدھا۔ لڑکے اس سے کھیلا کرتے ہیں۔ اس کا رنگ اس وقت سفید ہے۔ مگر رابرٹ کہتا ہے کہ میں اسے بالکل روبن سے ملا دوں گا۔ کوئی تمیز نہ کر سکے گا۔ بس جب دوسرا روبن تیار ہو جائے گا تو اصلی روبن کو زنجیر میں باندھ کر رابرٹ کے گھر میں قید کر دوں گا۔ اور نقلی روبن مس لیلی کو دے دیا جائے گا۔"

ہربرٹ نے سوچ کر جواب دیا "کیا ایسا ممکن ہے؟"

کاک: "حضور میں نے خود انھیں آنکھوں سے رابرٹ کو گھوڑوں کی صورت تبدیل کرتے دیکھا ہے۔"

ہربرٹ: "مگر لیلی پہچان گئی تو؟"

کاک: "یہ غیر ممکن ہے۔ رابرٹ نہایت ہوشیار آدمی ہے۔ بس صرف معاوضہ طے ہو جانا چاہئے۔"

ہربرٹ: "اگر میرے خاطر خواہ کام ہو گیا تو تم دونوں کو چار چار پونڈ دوں گا۔"

کاک (ہنس کر) "حضور دل لگی کرتے ہیں۔ پچیس پونڈ تو محض زہر کھلانے کے لئے دیتے تھے جو بالکل سیدھا سا آسان کام ہے۔ قلب ہیئت نہایت مشکل کام ہے۔ سو پونڈ سے کم میں نہ ہو سکے گا۔"

ہربرٹ: "اوہ! سو پونڈ اور اتنے سے کام کے لئے۔"

کاک: "حضور پچیس پونڈ تو صرف روغن اور مسالہ میں لگ جائیں گے۔"

ہربرٹ: "نہیں بھئی اس قدر میں نہیں دے سکتا۔ سودا نہ پٹے گا۔"

کاک: "اچھا تو رہنے دیجئے۔ بندہ اب جاتا ہے۔"

ہربرٹ (گھبرا کر) "نہیں نہیں جاؤ مت۔ ٹھہرو۔ پچاس پونڈ میں طے کر لو۔"

کاک: "نہ نہ۔ سو سے کوڑی کم نہیں۔"

ہربرٹ: "اچھا پچھتر...... اسی...... لے لو تمہارا ہی کہنا سہی۔ مگر پہلے میں اس کتے کو دیکھ لوں گا۔"

کاک (خوش ہو کر) "حضور خوب غور سے دیکھ لیجئے گا۔ کیا مجال کہ ذرا بھی کوئی پہچان سکے۔"

ہربرٹ: "اور وہ رابرٹ والا کتا سیدھا ہے نہ؟"

کاک: "حضور ایسا سیدھا اور نیک جیسے گائے۔ اس کے منہ میں انگلی ڈال دیجئے تو بھی نہ کاٹے۔ اور غرانا تو سیکھا ہی نہیں۔ لا کر دکھاؤں حضور کو؟"

ہربرٹ: "ہاں ہاں ضرور لاؤ۔ پہلے ذرا میں بھی اسے جانچ لوں۔"

تھوڑی دیر میں چالاک کاک ایک سفید رنگ کا میلا کچیلا کتا لیکر حاضر ہوا۔ ہربرٹ نے کہا "یہ کتا روبن نہیں بن سکتا۔"

کاک: "اے حضور روغن تو رنگ بدلنے دیں۔ بہت کیل ہارتے ہیں عاشقی میں تو ہمت ہی درکار ہے۔"

ہربرٹ۔ "اچھا اُس کے سر پر ہاتھ تو رکھو۔"

کاک: "حضور خود ہی رکھ لیں۔ ذرا بھی نہ بولے گا۔"

یہ کہکر اس نے ڈرتے ڈرتے اس کُتّے کا پہلے ایک کان پکڑ لیا پھر ذرا ڈھیٹ ہو کر اُٹھا لیا۔ مگر کُتّے کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ تب لارڈ صاحب کو اور جرأت ہوئی۔ آپ نے ڈرتے ڈرتے (گویا شیر کا بچہ ہے) آہستہ سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ کُتّے نے خائف اور دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا دُم ہلا کر رہ گیا۔ ہربرٹ مارے خوشی کے اُچھل پڑے اور کہا "آج شام تک کام بن جائے۔ ورنہ پھر ایک پونڈ بھی نہ دوں گا۔"

کاک: "بس آج ہی شام کو لیجئے۔"

(۵)

ایک دن کے بجائے دو دن گذر گئے اور کاک آتا ہی نہیں ہے۔ یہ ۴۸ گھنٹے لارڈ ہربرٹ نے بڑی امید و بیم میں کاٹے۔ کبھی تو بالکل یقین نہ آتا اور وہ سوچتے کہ کاک نے مجھ سے شرارت کی ہے اور کبھی امید زیادہ خوشگوار صورت اختیار کر لیتی۔ آخر تیسرے دن کاک آدھمکا تو آپ کہنے لگے "سناہی بھلا تمہارا وعدہ ایک دن کا تھا۔ آج تیسرا دن ہے۔ اب میں ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔ سمجھے۔"

کاک: "حضور کام مکمل ہو گیا۔"

ہربرٹ (اُچھل کر) "سچ۔ ظاہر تو نہیں ہوتا۔"

کاک: "اب حضور خود اس کا فیصلہ کر لیں۔"

دونوں آدمی مس لیلی کے احاطہ میں آئے۔ روبن کی شکل و صورت اور رنگ کا ایک کُتا پڑا سو رہا تھا۔ ہربرٹ نے دیکھ کر بولے "بخدا یہ تو روبن ہے۔ تو مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

کاک: "حضور دھوکا کیا دوں گا یہ کاریگر کی استادی ہے۔ اسی سے تو دو دن لگ گئے۔ ذرا اس کے سر پر ہاتھ تو رکھئے۔"

ہربرٹ: "تم خود رکھو۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

کاک نے نقلی روبن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پڑے پڑے ایک بار آنکھ کھولی اور پھر بند کر لی۔ اب لارڈ صاحب نے بھی جرأت کر کے اس کی گردن تھپتھپائی۔ کُتّے نے بجز اس کے دُم ہلانے کے اور کوئی بیجا حرکت نہیں کی۔ لارڈ صاحب کا چہرہ خوشی سے پھول گیا۔ بولے "بیشک کمال کیا ہے! کمال!"

کاک: "تو حضور اب انعام ملے کہ حضور کی جان و مال کو دعا دوں۔"

ہربرٹ۔ "ایسی کیا جلدی ہے۔"

کاک: "حضور رابرٹ سخت تقاضا کر رہا ہے۔ مجھے تو ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

لارڈ ہربرٹ نے بڑی فراخدلی سے سو پونڈ کا ایک چک نکال کر کاک کے حوالے کر دیا، اور تھوڑی دیر کے بعد غیر معمولی سج دھج کے ساتھ، اکڑتے جھومتے آپ مس لیلی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ لیلی نے انھیں دیکھتے ہی شکایت کی "لارڈ ہربرٹ! میرے کُتّے کو آج خدا جانے کیا ہو گیا ہے۔ نہ میرے بُلانے سے آتا ہے۔ نہ میرے پاس بیٹھتا ہے۔ بس برآمدے میں چپ چاپ پڑا ہوا ہے۔"

لارڈ ہربرٹ (نہایت ہمدردانہ لہجہ میں دل ہی دل میں خوش ہو کر) "بدہضمی ہو گئی ہوگی۔ دو ایک دن میں اچھا ہو جائے گا۔"

یہ کہکر آپ نے جا کر روبن کے سر پر ہاتھ رکھا اور بہت ملنساری کے ساتھ بولے "بیچارہ بہت بدحال ہو گیا ہے۔ ورنہ

کیا ہوم کمیتا رہتا تھا۔ مگر آپ گھبرائیں نہیں، دو ایک دن میں اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔"

آج آپ شام تک مس لیلی کے ساتھ رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی زبان بند نہیں کی۔ کبھی اپنی جوانمردی کا، کبھی اپنی سیر و سفر کا، کبھی عجیب و غریب مناظر کا تذکرہ کرتے رہے۔ اور لیلی بھی کوئی رفیق نہ رہنے کے سبب سے، یا اُن کی سج دھج کی کشش کے باعث آج اُن سے غیر معمولی اخلاق سے پیش آئی۔

دوسرے دن آپ علی الصباح' فرط مسرت سے ہیٹ ہلاتے ہوئے مس لیلی کے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ باغیچہ کی طرف خراماں جا رہی ہے۔ اور روبن اس کے پیچھے چلا جاتا ہے۔ آپ فوراً باغیچہ کی طرف چلے اور لپک کر لیلی کے سامنے جا پہنچے، گڈ مارننگ کے بعد پہلا سوال آپ نے یہی کیا "روبن کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

لیلی: "کچھ اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ رات بھر بہت سست رہا۔"

ہربرٹ: "واقعی!"

لیلی: "جی ہاں۔ نہیں معلوم کیا کھا گیا ہے، یا خدا جانے کیا بیماری پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو میں مسٹر بارٹن کو کیا جواب دوں گی۔"

ہربرٹ نے دردمند نگاہوں سے روبن کو دیکھا، اور نزدیک آکر دلیری کے ساتھ اس کا کان پکڑ کر کھینچا۔ گویا نیند سے جگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک بہت معمولی بات تھی مگر اس کا ایک نہایت غیر معمولی نتیجہ نکلا۔ ایک بم کا گولا پھٹ گیا، اور ہوا عجیب و غریب آوازوں سے گونج اٹھی۔ روبن ایک ربڑ کے گیند کی طرح اچھل پڑا اور لارڈ ہربرٹ کی طرف لپکا۔ لارڈ ہربرٹ کو اب بجز چاروں شانے چت گر پڑنے کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ آپ گرے۔ نیچے آپ، اوپر کرسی، اور جب اس بم کے گولے کے صدمہ کے بعد ہوش آیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ روبن شعلہ بار آنکھوں سے ان کی طرف گھور گھور کر غرا رہا ہے، اور لیلی زور سے اس کے گردن کا تسمہ پکڑ کر روکے ہوئے ہے۔ آپ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مس لیلی نے بگڑ کر کہا: "آپ نے کیوں اُس کا کان کھینچا۔ میں نے کہا نہیں تھا کہ وہ بیمار ہے؟"

لارڈ ہربرٹ (بدحواسی میں): "مجھے۔ مجھے خیال....."

لیلی نے ہانپ کر کہا: "بھاگو۔ دوڑو۔ میں چھوڑے دیتی ہوں، اب مجھ سے نہیں سنبھل سکتا۔ اور تیز بھاگو۔ تیز نکل جاؤ۔"

لارڈ ہربرٹ بگٹٹ بھاگے۔ پسینہ میں شور بور۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اور دل دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل کہتے جاتے ہیں "آج سخت خفیف ہوئے۔ اب میرا رنگ جمنا محال ہے۔ اب بازی ہاتھ سے جاتی رہی۔ یہ سب اسی بدمعاش حرامخور کاک کی شرارت ہے۔"

یہ خیال کرتے ہوئے آپ دور نکل آئے، سگرٹ جلایا اور کاک کے مکان کی طرف چلے تو کیا دیکھا کہ وہ سفید کتا جسے کاک نے کل دکھایا تھا آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا جا رہا ہے۔ پورا یقین ہو گیا کہ ظالم کاک نے بڑی بازی کی مگر قہر درویش بر جان درویش، پھر بھی وہ کاک کے پاس گئے، جھلائے، چلائے، لعنت و ملامت کی، دھمکایا، دغاباز، حرامخور سب کچھ کہا۔ مگر یہ سب ہارے ہوئے جواری کا غصہ تھا۔ کاک نے پروا تک نہ کی۔ بولا "حضور! میں نے رنگ تبدیل کرانے کے لئے روپے لئے تھے۔ مزاج کا تبدیل کرنا انسان کے اختیار سے باہر ہے۔ خدا جانے مس صاحب کتوں کو کیا سکھا دیتی ہیں کر

کیسا ہی بید حا کُتا کیوں نہ ہو ان کے ساتھ رہتے ہی شیر ہو جاتا ہے۔

(۹)

دو بجے کے بعد ایک موٹر کار مس لیلی کے دروازہ پر آکر رکا اور جان بارٹن اُتر پڑا۔ خانساماں نے آکر تعظیم سے سلام کیا۔ بارٹن نے پوچھا "کمو میاں کا کیا حال ہے؟"

کالن: "حضور سب خیریت ہے مس صاحبہ جھیل کے کنارے ٹہلنے گئی ہیں۔ روبن بھی اُن کے ساتھ ہے۔ آپ تو خیریت سے ہیں؟"

بارٹن: "اور لارڈ ہربرٹ کہاں ہیں؟"

کالن۔ (مسکرا کر) "اُن کا حال کچھ نہ پوچھئے۔ روبن نے اُن کا مورچہ ہٹا دیا"

بارٹن: "کیا اب وہ یہاں نہیں ہیں؟"

کالن: "جی اُنہیں گئے تو آج آٹھواں دن ہے"

بارٹن کے جان میں جان آئی۔ اُس نے جھیل تک جا کر مس لیلی سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا اور جھجکتا ہوا جا پہنچا۔ مس لیلی جھیل کے کنارے کھڑی روبن کو لہروں پر دوڑنے کے لئے اشارہ کر رہی تھی۔ بارٹن کو دیکھ کر اُس نے اس سرد مہری کے ساتھ جو بارٹن کے حوصلوں کو خاک میں ملا دیا کرتی تھی اس کے سلام کا جواب دیا۔ مگر روبن دوڑا اور دم ہلا کر بڑی سرگرمی سے اظہار مسرت کرنے لگا۔ لیلی کی بے مشانت بے رُکھائی بارٹن کو سرد کر دیا کرتی تھی۔

مس لیلی نے کہا "کہئے مسٹر بارٹن۔ مزاج کیسا ہے؟ میں نے آپ کے کُتے کو بڑے آرام سے رکھا ہے"

لازم تھا کہ اس کے جواب میں بارٹن کوئی پُر معنی پُر مذاق جملہ کہتا۔ مگر ایسا نہ پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ اس وقت ہو سکا۔

مس لیلی نے روبن کو پیار کر کے کہا "اب تم مسٹر بارٹن کے پاس نہ جانے پاؤ گے۔ کیوں میرے پاس رہے گا؟ تجھے بڑے آرام سے رکھوں گی"

یہ الفاظ بہت سادہ اور بے رنگ تھے اور بلا کسی خاص منشا کے کہے گئے تھے۔ مگر انھوں نے جان بارٹن پر غضب کا اثر پیدا کیا۔ انھوں نے اس روکھی متانت کا خیال دور کر دیا جو اس کی ہمتوں کو توڑ دیا کرتی تھی۔ ان الفاظ میں اُسے ایک خوشگوار اشارہ، ایک مہر انگیز تحریک کا اثر محسوس ہوا جس نے اس کی جھجک اور شرمیلے پن کو غائب کر دیا۔ خوف کے بجائے اس کو امید کی طاقت محسوس ہوئی۔ اس نے جلدی سے جھک کر مس لیلی کو پیار کیا اور نشۂ محبت سے مخمور ہو کر بولا "روبن اکیلا نہیں رہے گا میں بھی اس کے ساتھ ہوں"

لیلی نے شرمیلی ادا سے سر جھکا کر جواب دیا "خیر شکایت تو ثابت ہوا"

نواب رائے

بڑی بہن

(۱)

ایک دن موضع شیو گنج میں شام کے وقت کئی عورتیں ایک نیم کے نیچے باتیں کر رہی تھیں۔ تارا نے ایک ایسے خاوند کا ذکر کرتے ہوئے جس نے اپنی بیوی کو محض اس لئے ڈنڈوں سے مارا تھا کہ وہ بلا اس کی اجازت کے گنگا نہانے چلی گئی تھی غصہ کے ساتھ کہا "ایسے آدمی کے منہ میں آگ لگ جائے"!

یہ سن کر عورتیں سناٹے میں آگئیں۔ کسی نے ہاتھ سینہ پر رکھ لیا۔ کسی نے دانتوں سے زبان دبائی۔ تارا کو یہ کہنا مناسب نہیں تھا۔ کندن نے تیوری بدل کر کہا۔ "تارا بہن! تم زبان سنبھال کر بات نہیں کرتیں۔ اپنا شوہر تھا۔ مار ہی بیٹھا تو کیا ہوا۔"

کندن، جے گوپال چودھری کی بیوی تھی۔ بابو جے گوپال دنیا کے اُن چند خوش قسمت آدمیوں میں تھے جنہیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے دونوں وقت لقمۂ تر کھانے کو مل جاتا ہے۔ وہ سال بھر میں ایک بار لگان وصول کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے تھے۔ باقی سال بھر وہ اپنے دالان میں بیٹھے گپ شپ کیا کرتے۔ مگر یہ گاؤں اُن کی موروثی ملکیت نہیں تھی۔ موروثی جائداد تو بابو من گوپال مرحوم کے زمانہ ہی میں خورد بُرد ہو چکی تھی۔ جے گوپال کے خُسر نے اُنہیں تکلیف میں دیکھ کر یہ گاؤں گذارہ کے لئے دے دیا تھا۔ وہ اس کے علاوہ ہر مہینہ میں اپنے داماد کی امداد کرتا رہتا تھا۔ جے گوپال کی خوب آرام سے کٹتی تھی اور آئندہ کے لئے اُنہیں کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ بوڑھا خُسر لاولد تھا اس کے آنکھ مُوندتے ہی بیس ہزار سالانہ نفع کی جائداد ہاتھ لگے گی۔ ایسے خوش نصیب آدمی دنیا میں کتنے ہوتے ہیں؟ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جے گوپال اپنے خُسر کی مبارک موت کے خواستگار تھے۔ مگر سال میں دو تین بار وہ اس روزِ سعید کی آرزو میں ستیہ نارائن کا پاٹ ضرور کرواتے تھے۔

خیر، جے گوپال کے دس سال بڑے آرام سے گذرے۔ تین بچے ہوئے، پیٹ نے گنبد نما صورت اختیار کی۔ چاندی کے بال جھڑنے لگے۔ خوش قسمتی کے آنے کا راستہ صاف ہونے لگا مگر آنا کسے تھا۔ ادھر آئی کوا نہ! جو بات نہ ہونی چاہئے تھی وہ ہو گئی اور اس نے جے گوپال کا مستقبل بیکار کر دیا۔ ساٹھ برس کے سن میں بوڑھے خسر کے ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ جے گوپال نے سُنا اور سر پیٹ کر رہ گئے۔ کندن نے بوڑھے باپ کو خوب جی بھر کر کوسا اور اس طفلِ نوزائیدہ کی لاش دیکھنے کی تمنا ظاہر کی۔ کہنے لگی بوڑھا ساٹھ برس کا ہوا مگر ابھی ہوس نہیں گئی۔ اب اسے گلے سے باندھیں۔ یہ سعادت مند

بیٹی تھی! خود غرضی! وائے خود غرضی!

اس بچّے نے جے گوپال کی بے فکریوں اور عیش پرستیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اپنی ننھی سی مٹھی سے اس نے جے گوپال کی ساری امیدیں اور آرزوئیں۔ حوصلے اور ارمان مسل ڈالے۔ سسرال سے نوید آیا مگر وہ شریک نہ ہو سکے۔ انہیں اب اپنی روزی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ آسام چلے گئے اور ایک چائے کے کارخانے میں ملازمت کر لی۔ زندگی میں پہلی بار اتنا دور دراز سفر کرنا پڑا۔ وہ اب تک کبھی تنہا نہیں رہے تھے۔ بیوی اور بچے ان کی زندگی کا جزو بن گئے تھے۔ کئی ماہ تک ان کی طبیعت نہ جمی۔ مگر جوں جوں دن گذرتے گئے، توں توں گھر کا خیال کمزور ہوتا گیا۔ سال بھر مشکل سے گذرا ہوگا کہ جے گوپال کے دل میں ایک نیا جوش پیدا ہوا اور وہ یہ تھا کہ اب گھر کی حالت سدھارنی چاہیئے۔ محبت کی جگہ ارادوں نے چھین لی۔ پہلے ہفتہ وار خطوط جاتے تھے، پھر پندرھویں دن جانے لگے۔ یہاں تک کہ دوسرا سال گذرتے گذرتے یہ نوبت ہو گئی کہ مہینے میں ایک خط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملتی تھی۔

مگر کندن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس تھی۔ جے گوپال سے اُسے وہی محبت تھی، جو عام طور پر بیویوں کو ہوتی ہے۔ یعنی شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ وہ محبت جو دل کو بےچین کرتی ہے، جو آنکھوں کو رُلاتی اور جگر کو تڑپاتی ہے۔ وہ پُرجوش جذبہ جو دل کے کل احساسات پر حاوی ہو جاتا ہے کندن کو نہیں تھا۔ وہ کبھی اپنے شوہر سے الگ نہیں ہوئی تھی اور اس لئے اُن احساسات سے، اُن حسرتوں سے جو کچھ فراق ہی میں اپنا زور دکھاتے ہیں وہ مانوس نہیں تھی۔ رشتۂ محبت میں گانٹھ تھی مگر ڈھیلی۔ لیکن جدائی کے اس جھٹکے نے اس گانٹھ کو مضبوط کر دیا۔ محبت کی آگ۔ جو دبی ہوئی پڑی تھی جدائی کی ہوا پا کر بھڑک اٹھی۔ کندن کے دل میں ایک نئی اور پُرجوش محبت نے عود کیا۔ وہ اکثر خاموش اور اداس رہنے لگی۔ تنہائی سے اس کی طبیعت مانوس ہونے لگی۔ کبھی کبھی اکیلے میں رویا کرتی۔ خطوط زیادہ پُرشوق ہونے لگے۔ وہ سوچتی بلا سے مجھے موٹے کپڑے پہننے پڑیں گے، میں گاڑھا پہنوں گی۔ بلا سے مجھے تکلیف ہوگی، میں تکلیف سہوں گی۔ کندن اگرچہ کئی بچوں کی ماں تھی۔ مگر اس وقت اس کے دل میں ایک نشۂ شباب کی متوالی نازنین کا جوش محبت اُمڈنے لگا۔ اُس کو کتنی ہی ایسی باتیں یاد آتی تھیں، جو اس نے جے گوپال کا دل دکھانے کے لئے کہی تھیں۔ کتنی بار وہ ان سے روٹھی تھی کتنی بار اُن سے لڑی تھی۔ ان باتوں کو یاد کر کے وہ روتی تھی۔ اس نے سچّے معصومانہ جوش کے ساتھ اپنے دل میں عہد کیا کہ اب میں انہیں کچھ نہ کہوں گی، وہ جیسے رکھیں گے ویسے ہی رہوں گی۔

(۲)

بڑھاپے کی اولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ اس نوزائیدہ بچّے نے جس کا نام لونی چند رکھا گیا تھا

اپنے بوڑھے ماں باپ کی قسمت جگا دی۔ اُن کی محبت چاروں طرف سے سمٹ کر اس پر جم گئی۔ وہ لڑکا نہیں تھا، ان کی مدت العمر کی دعاؤں اور آرزوؤں نے انسانی شکل اختیار کر لی تھی۔

مگر بوڑھے ماں باپ کی تقدیر میں بچے کا سُکھ دیکھنا نہیں بدا تھا۔ تیسرے سال اس کی ماں بیمار پڑی۔ اُسے معلوم ہوا کہ اب میں نہ بچوں گی۔ تب اُس نے کندن کو بلوایا۔ کندن جانے سے ضرور انکار کر دیتی۔ کیونکہ اُسے اب اپنے ماں باپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ مگر اُن دنوں شیو گنج میں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ کندن کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔

کندن کی ماں اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور خوب روئی۔ باپ نے ہزاروں دعائیں دیں۔ مگر مکان کی مہریاں اور لونڈیاں اس مہمان کو دیکھ کر جل گئیں اور اس کی طرف طنز آمیز نگاہوں سے دیکھتیں۔ اکثر اُس سے بے ادبی کر بیٹھتیں۔ مہری کہتی اب کوئی کہاں تک پانی بھرے۔ دن بھر پانی ڈھوتے ڈھوتے کو لھا رہ جاتا ہے۔ مہراجن کہتیں یہ لڑکے جانے کہاں کے مربھوکے ہیں۔ چولھا جلا نہیں کہ سب آکے گھیر لیتے ہیں۔ کندن یہ سب سُنتی اور دب جاتی۔ اپنی ماں کی تکلیف دیکھ کر اس کا دل کچھ کچھ پگھل گیا تھا۔ آخر ایک روز بوڑھی عورت کی حالت بہت نازک ہو گئی۔ اس نے نونی چند کا ہاتھ پکڑ کر کندن کے ہاتھ میں دیا اور روتی ہوئی دنیا سے سدھار گئی۔

ماں کے مرتے ہی کندن کے مزاج میں ایک خوش آئند تبدیلی ہوئی۔ نونی چندر سے جو اسے نفرت تھی وہ جاتی رہی۔ اس مرجھائے ہوئے یتیم بچہ کو دیکھ کر اسے اس پر ترس آتا۔ جب اُس کے اپنے لڑکے نونی کو مارتے اور وہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے آتا اور "جی جی" کا آنچل پکڑ کر فریاد کرتا تو کندن کا کلیجہ مسوس اٹھتا تھا، وہ نونی کو مادرانہ جوش کے ساتھ گود میں اٹھا لیتی۔ اور کلیجہ سے چپٹا کر پیار کرتی۔ کندن کے مزاج میں یہ تبدیلی کیوں واقع ہوئی۔ شائد اس لئے کہ بوڑھی ماں نے بچے کو اس کے سپرد کیا تھا یا ممکن ہے۔ بیکسی کے خیال نے نفرت پر فتح پائی ہو۔ بہرحال کندن اب اپنے بھائی کو اپنے بچے سے زیادہ چاہنے لگی۔ نونی کی فریادیں اب اکارت نہ جاتیں۔ اگر کبھی طفلانہ مناقشات میں نونی ہی جسارت کرتا تو بھی کندن اسے سزا نہ دیتی۔ نونی کو روتے دیکھ کر اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا اور بچہ بھی اُس سے کچھ ایسا ہلا کہ اپنی ماں کو بھول گیا۔

تین مہینے کے بعد کندن کا باپ بھی مر گیا۔ اُس نے اپنی وصیت میں بے گوپال کو نونی کا سرپرست قرار دیا اور گذارہ کے لئے اُسے ایک گاؤں بھی دیا۔ کندن اب اُس گھر کی مالک ہوئی اور نونی اُس کے دل کا۔

بے گوپال خبر پاتے ہی آسام سے چلے آئے اور زمینداری کا انتظام کرنے لگے۔

(۳)

جے گوپال اب پہلے کا سا بے فکر، آزاد منش آدمی نہ تھا۔ اب وہ شاطر، معاملہ فہم، دنیادار بابو بن گیا تھا۔ اسے روپیہ کی چاٹ پڑ گئی تھی اور ہر دم اسی دھن میں رہتا۔ پردیس میں اس نے خوب کمایا اور خوب خرچ کیا۔ چائے کے باغوں میں ناجائز نفس پرستیوں کے بے شمار موقعے ہیں۔ ان سے اس نے خوب دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ خلاصہ یہ کہ اس کے مزاج میں اب چھچھورا پن آ گیا تھا اور کندن جیسی بھولی عورت جس کی نگاہوں نے سامنے تاکنا نہیں سیکھا تھا اب اس کے دل کو قابو میں نہ رکھ سکتی تھی۔ اس نے ایک عرصہ دراز کے بعد اپنے شوہر کو پھر پایا تھا اور اس کی دل جوئی و خاطرداری میں پہلے سے بھی سرگرم ہو گئی تھی۔ مگر جوں جوں وہ نزدیک آنے کی کوشش کرتی۔ توں توں جے گوپال اُس سے دُور بھاگتا تھا۔

جے گوپال نے پہلے ہی دن سے نوتی چندر کے ساتھ مغائرت کا برتاؤ کرنا شروع کیا۔ اس کی طرف دیکھتا تو نفرت کے ساتھ۔ بات کرتا تو ترش لہجہ میں۔ کندن بھائی کی محبت میں شوہر کو اپنا شریک بنانا چاہتی۔ لیکن اگر وہ کبھی اسے گود میں لیکر جے گوپال کے پاس چلی جاتی، تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا۔ کچھ دنوں تک تو غریب کندن نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح جے گوپال کے دل میں صفائی ہو جائے، مگر آخرکار اسے معلوم ہو گیا کہ اس نے نوتی کا قصور اب تک نہیں معاف کیا اور نہ اب اس کی توقع تھی۔ اور وہ قصور کیا تھا؟ پیدا ہونا!

پہلے جب کبھی نوتی اور اس کے بھانجوں میں جنگ ہوتی، تو کندن ہمیشہ اپنے یتیم بھائی کی طرف رہا کرتی۔ اس لئے ان کو نوتی کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مگر اب حالت کا رخ پلٹ گیا تھا۔ نئے منصف نے آکر نیا قانون جاری کیا تھا، جو فریاد کرتا تھا، اسی کی سزا ہوتی تھی۔ جب کبھی جے گوپال نوتی کو مارتے اور وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھرے آہستہ آہستہ کندن کے پاس آتا تو وہ اسے گود میں اٹھا لیتی اور مکان کے کسی گوشہ میں جا کر خوب روتی اور جبتک نوتی اُسے چُپ نہ کرا تا ر دیا کرتی۔ جوں جوں جے گوپال نوتی کے ساتھ زیادہ بے رحمی کرتے، توں توں کندن کے دل میں اس کی محبت زیادہ ہوتی۔

جے گوپال کو نوتی کا رونا اور بولنا سنکر بخار سا چڑھ آتا تھا اور جس وقت وہ نیند میں ہوتے اس وقت تو نوتی کی زبان کا کھلنا گویا شامت کا آنا تھا۔ جب وہ سوتے تو کندن بھائی کو گود میں لیکر سب سے اُونچی منڈیر پر لے جاتی اور اسے تھپک تھپک کر لوریاں سناتی اور سلاتی۔ اسی بنا پر کبھی کبھی جے گوپال کندن کو بھی سخت سُست کہہ بیٹھتا تھا۔ دُرگا پوجا میں اس نے اپنے لڑکوں کے لئے ریشمی کپڑے بنوائے۔ مگر نوتی کے لئے معمولی کپڑے بھی نہ بنوا سکا۔ کندن اپنے بیکس بھائی پر یہ ظلم دیکھتی اور دل ہی میں بل کھا کر رہ جاتی۔ نوتی اس سے اس قدر ہل گیا تھا کہ دونوں وجودوں میں اب

کوئی فرق نہ باقی رہا تھا۔ کندن کے دل میں اب جے گوپال کی عزت روز بروز کم ہوتی جاتی تھی۔ وہ اُسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی، وہ کبھی نونی کو اُس کے پاس تنہا نہ رہنے دیتی۔ اس قدر بدگمان ہوگئی تھی! وہ اس معاملہ میں باوجود دلی کوشش کے جے گوپال کے ساتھ وفاداری کا برتاؤ نہیں کرسکتی تھی۔

جے گوپال بھی کندن کی جانب سے حد درجہ بدظن ہوگیا تھا۔ پہلے وہ نونی کو اپنی خواب زندگی کا پریشان کرنے والا سمجھتا تھا۔ اب کندن کو۔ کندن ہی اس راستہ میں ایک رکاوٹ تھی، جو اسے دولت و ثروت کی طرف لئے جا رہا تھا۔ لے اپنی بیوی سے اب مطلق ہمدردی نہ تھی۔ کندن کے دل میں بھی ایک معمّا تھا، جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

(۴)

بھیّا دوج کی تقریب آئی، کندن نے آج برت رکھا۔ آج کے لئے اُس نے پہلے ہی سے تیاریاں کر رکھی تھیں۔ نونی کے لئے اُس نے گلابی رنگ کا ریشمی کوٹ۔ نیلے کنارے کی دھوتی۔ سنہرا ریشمی دوپٹہ منگا رکھا تھا۔ صبح اُس نے نونی کو اُبٹن سے مَلا، نہلایا، کپڑے پہنائے اور دستور کے موافق اُس کے ماتھے پر دہی اور چاول کا ٹیکہ لگا دیا۔

نونی خوش رنگ کپڑے پہنے گاؤں میں کھیلتا پھرتا تھا۔ صاف گو تارا بھی کسی کام سے اس گاؤں میں آگئی تھی۔ یہاں طرح طرح کے چرچے ہو رہے تھے۔ تارا نے سُنا اور غصہ میں بھری ہوئی کندن کے پاس آکر بولی "بہن! یہ کیا سوانگ رچتی ہو۔ دکھاوے کے لئے تو نونی کا ایسا لاڈ پیار ہے۔ مگر گھر بھر اُس کی جان کا گاہک ہو رہا ہے۔ سونے کے کورے میں زہر ملا کر دے رہی ہو۔"

کندن نے غصہ سے کہا "تارا، برس برس کے دن ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو۔"

تارا نے جواب دیا "جی کوئی بات اپنے من سے بنا کر تھوڑے ہی کہتی ہوں۔ گاؤں میں جو کچھ سُنا ہے وہ تم سے آکر کہہ دیا جس کی بدولت تمہیں ساری دنیا کا سُکھ مل رہا ہے، اسی کے لئے اب کانٹے بوئے جا رہے ہیں۔ شیخوپورہ میں ۸ رپے تمہارے بھانجے کھر گوپال کا نام چڑھا دیا گیا ہے اور کئی علاقوں میں ایسی ہی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ مگر یاد رکھو ایسی دولت کبھی ہضم نہیں ہوتی۔ ایشور سب دیکھتا ہے۔"

کندن رونے لگی، جب جے گوپال گھر میں آئے، تو اس نے یہ ذکر چھیڑا۔ جے گوپال بولے "میں تو چاہتا تھا کہ یہ بات تمہارے کان تک نہ پہنچے۔ مجھے خود بڑا دھوکہ ہوا۔ بات یوں ہے کہ میں نے شیخوپورہ کا انتظام کھردد کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر کھردد نے سرکاری لگان باقی ڈال دی اور جب وہ گاؤں نیلام پر چڑھا، تو اُسے اپنے نام سے خرید لیا، مجھے بھی تو کل معلوم ہوا ہے۔"

کندن: "تو تم عذر داری کیوں نہیں کرتے؟"

جے گوپال: "عذر داری سے اب کوئی کام نہ چلے گا۔ علاوہ اس کے اپنے بھانجے سے مقدمہ بازی کرنا بدنامی کی بات ہے۔ لوگ ہنسی اڑائیں گے۔"

کندن کو اطمینان نہیں ہوا، وہ سمجھ گئی کہ یہ سب چالیں نونی کے تباہ کرنے کے لئے چلی جا رہی ہیں۔ اس کی عقل اب کچھ کام نہ کرتی تھی، عورت ان معاملات کو کیا سمجھے۔ میں کیسے نونی کو بچاؤں۔ کیا بیکسوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ کیا دنیا میں کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ کوئی مجھے کلکٹر صاحب کے پاس لے چلتا، تو میں اُن سے سب حال کہہ سناتی، مجھے خود جانا چاہئے، میں بڑے لاٹ تک فریاد لے جاؤں گی، مگر نونی پر ظلم نہ ہونے دوں گی۔

(۵)

اس کے کچھ دنوں بعد نونی بیمار پڑا۔ برسات کے دن تھے، چاروں طرف ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ نونی بھی اس کا شکار ہوا، تین دن بخار نہ اترا اور نہ بچے نے آنکھیں کھولیں۔ گاؤں میں ایک بیدجی تھے، وہ دونوں وقت آتے اور دوا دیتے مگر اُن کی دواؤں سے مطلق افاقہ نہ ہوا۔ چوتھے دن کندن نے جے گوپال سے کہا "جا کر شہر سے سارداباپو کو لے آتے تو اچھا ہوتا، نونی کا بخار اب تک نہیں اُترا۔"

جے گوپال نے لاپروائی سے کہا "سارداباپو جانے شہر میں ہیں یا نہیں۔ ابھی دو چار روز اور بیدجی کی دوا کھلاؤ۔"

کندن: "بیدجی کی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور اُس کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔"

جے گوپال: "ابھی کل تین ہی دن تو بخار آیا ہے۔"

کندن: "تم ذرا چل کے اُسے دیکھو تو، کیسا پیلا ہو گیا ہے۔"

جے گوپال: "اچھا کل میں ڈاکٹر بابو کے پاس جاؤں گا۔"

جے گوپال سویرے اٹھے اور دن بھر غائب رہنے کے بعد شام کو خبر لائے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں، کہیں مفصل میں گئے ہیں۔ کندن کو شوہر کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ رات کو جب سب سو گئے تو اس نے نونی کو گود میں لیا، گاؤں سے ملی ہوئی سارد ندی بہتی تھی۔ گھاٹ پر آ کر ایک کشتی کرایہ کی اور بارہ بجے وہ ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچی۔ ساردا بابو اس کے فیملی ڈاکٹر تھے۔ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ کندن کو اس حالت میں دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوا۔ صورت حال سمجھ گئے اور کندن کے لئے دو کمرے خالی کر دیئے۔ ایک مہری کا انتظام کیا اور نونی کے معالجے میں مصروف ہوئے۔

رات گذری۔ علی الصباح جے گوپال حمام سے باہر غصّے سے کانپتے ہوئے پہنچے اور کندن سے کہا "خیریت چاہتی ہو تو اسی وقت میرے ساتھ گھر چلو۔"

کندن نے جواب دیا "تم اس وقت میرا گلا بھی کاٹ ڈالو تو میں نہ جاؤں گی۔"

جے گوپال "اچھا تو اب میرے گھر مت آنا سمجھیں!"

کندن نے اکڑ تن کر جواب دیا "تمہارا گھر! وہ گھر تو میرے بھائی کا ہے۔"

جے گوپال گھونسا تان کر رہ گیا۔ اُسی وقت وہاں سے آکر رہنے کا مکان اور باغ اپنے بڑے لڑکے کے نام لکھوا لیا اور دوسرے دن اس کی رجسٹری بھی ہو گئی۔

کندن ہفتہ بھر ڈاکٹر صاحب کے یہاں رہی۔ نونی کو صحت ہو چلی تھی۔ اس کا ارادہ ابھی اور ایک ہفتہ بھر رہنے کا تھا۔ مگر گھر اور باغ کے بیع ہونے کی خبر نے اُسے وہاں نہ ٹھہرنے دیا۔ ڈیڑھ دو ہزار کی جائداد ہاتھ سے نکلی جاتی ہے! اپنے بیٹے کو کندن اس وقت غیر سمجھ رہی تھی۔ بھائی بیٹے سے بھی پیارا ہو گیا تھا۔

(۶)

کلکٹر صاحب موسم سرما کا دورہ کر رہے تھے۔ شیخوپورہ میں قیام کیا۔ صبح کے وقت وہ اپنے خیمہ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس کے مواضعات سے زمیندار اور رؤسا سلام کرنے کو حاضر ہوئے تھے۔ بابو جے گوپال بھی سیاہ الپاکے کی چکن پہنے، سفید پگڑی باندھے سلام کو حاضر ہوئے۔ صاحب بہادر نے اُنکی غیر معمولی طور پر عزت کی اور اُن کے لئے کرسی منگائی۔ جے گوپال کو ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔ ایسا خوش نصیب کون ہوگا۔ گیان پور کے چکرورتی اور شاد گنج کے چودھری بھی ارمان لئے بیکنٹھ سدھار گئے۔ جے گوپال نے چاروں طرف تفاخرانہ انداز سے دیکھا۔ گاؤں کے بنئے اور مزدوران کی یہ عزت دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ افسوس سام گنج کے ٹھرا بو یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ دیکھتے کہ میری کیسی عزت ہے!

یکایک ایک عورت سر سے پیر تک چادر اوڑھے ایک پانچ سالہ لڑکے کی اُنگلی پکڑے آئی اور کھڑی ہو گئی۔ صاحب نے پوچھا تم کون ہو۔ کندن بولی "حضور میں اسی گاؤں کی ایک دُکھیاری عورت ہوں۔ آپ کے پاس فریاد لے کر آئی ہوں۔"

صاحب "اچھا۔ اجلاس کے کمرے میں چلو۔ ہم ابھی آتا ہے۔"
کُندن "نہیں حضور۔ میری عرض یہیں سُن لی جائے۔"

جے گوپال کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ کھسیائے ہوئے بندر کی طرح کندن کی طرف گھور رہا تھا۔ اگر صاحب کا خوف نہ ہوتا تو وہ ضرور اُس پر حملہ کر بیٹھتا۔

کندن کہنے لگی "حضور۔ یہ لڑکا میرا بھائی ہے۔ میں بابو مادھو سودن کی لڑکی ہوں، جن کا دو سال ہوئے

انتقال ہوگیا۔ یہ بابو صاحب جو آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں میرے شوہر ہیں۔ میرے باپ کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے ان بابو صاحب کو اپنے نابالغ بچے کا ولی قرار دیا اور اپنی زمینداری کا ۲/۳ ان کے گزارے کے لئے وصیت میں لکھ گئے۔ مگر ان بابو صاحب کی اب نیت بدلی ہوئی ہے۔ یہ میرے غریب بھائی کی ساری جائداد اپنے اور اپنے لڑکوں کے نام کرتے جاتے ہیں۔ کوئی ان کا ہاتھ روکنے والا نہیں۔ میں ان کی بیوی ہوں۔ ان کے قابو میں ہوں۔ کچھ بول نہیں سکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حضور کے راج میں ایک یتیم پر قہر ٹوٹ جائے گا اور اُس کی جائداد دوسروں کے تصرف میں آجائیگی۔ اسی لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں کہ یہ لڑکا آپ کو سونپ دوں۔ اب اس کے ساتھ انصاف کرنا آپ کا دھرم ہے۔ آپ جو مناسب سمجھیں کیا کریں۔"

یہ کہکر کندن خاموش ہوگئی۔ جے گوپال نے فرط غیظ سے بیچ میں کئی بار چیخنے کی جرأت کی۔ مگر صاحب کے تیور دیکھکر خاموش ہوگئے۔ آخر صاحب نے اُن سے پوچھا "یہ سب سچ ہے؟"

جے گوپال بولے "حضور میں حضور کیا عرض کروں۔ بابو مادھوسدن قرض چھوڑ گئے تھے، سو حضور کچھ زمین مکفول کرکے قرض ادا کیا گیا۔"

صاحب۔ "اچھا آج کُل کاغذات ہمارے سامنے پیش کرو۔"

جے گوپال۔ "بہت اچھا حضور۔"

صاحب نے تب کندن سے کہا "اچھا اب تم جاؤ۔ ہم اس معاملہ میں خوب کوشش کریں گے۔ تمہارے بھائی کی جائداد کوئی لے نہیں سکتا۔ تمہاری نیکی اور مستقل مزاجی سے ہم بہت خوش ہوا۔"

کندن نے جھک کر زمین چومی اور نوتی کو گود سے اُتار کر صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ نوتی رونے لگا مگر صاحب نے اُسے چمکارا اور ایک ٹینس کا گیند دیکر اُسے بہلایا۔ جب کندن چلنے لگی تو صاحب نے پوچھا "اس لڑکے کو اپنے ساتھ لیتی جاؤ۔ کیا کوئی خوف ہے۔"

کندن۔ "حضور اب میں اسے آپکے سپرد کر چکی ہوں۔ میرے ساتھ وہ نہیں رہ سکتا۔"

صاحب۔ "اور تم کہاں جاؤگی؟"

کندن۔ "میں اپنے شوہر کے ساتھ جاؤں گی۔"

کندن نے نوتی کو گلے لگا کر پیار کیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے رخصت ہوگئی۔

ایک ہفتہ میں علاقہ کورٹ آف وارڈس کے زیر تحت آگیا اور نوتی کو پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر رکھ دیا گیا۔ جے گوپال آسام چلے گئے۔ مگر کندن کو پھر کسی نے نہ دیکھا۔ وہ جس دن صاحب کے یہاں سے لوٹی اُسی دن اُسے ہیضہ ہوگیا۔ مگر گاؤں والے اب بھی اسے تسلیم نہیں کرتے اور صاف گو تارا اب بھی کہتی ہے کہ کندن کو ہیضہ نہیں ہوا تھا۔

(ادیب جولائی ۱۹۱۱ء) (د۔ ر)

سبحان اللہ سارے ملک کبھی کا کسو وقت میں اتفاق
ہوا ہے کہ میں تمہارا چند روز کا مہمان ہوں مہینا بھر سے
غذا بالکل مفقود صرف گوشت پانی پر مدار ہے
اوٹھنا دشوار اگر اوٹھوں تو دوران سر سے گر پڑوں

۲ سید محمد زکریا خان نسب میں سید امیر زادہ عالی
دودمان انکے بزرگ وزارت کا منصب پا چکے ہیں
جاگیر ایک تھی پھر بعوض جاگیر پنسن مقرر ہوا
یہ شخص بذات خود نیک اور صاحب علم اور متواضع
اور دانشمند اور نیک طینت اور رنگین طبع سخن سے
طبیعت کو علاقہ اچھا ہے شعر کہتے ہیں اور خوب
کہتے ہیں اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں ——
اسد اللہ خاں غالب



سند غالب بنام ذکی مع مہر دستخط

عظمتِ ہند

رونقِ انجمنِ عالمِ امکاں ہم تھے
وصف تھے جن میں فرشتوں کے وہ انساں ہم تھے

شمع تھے راہِ ہدایت کی زمانہ کے لئے
روشنیٔ نگہہِ گبر و مسلماں ہم تھے

مرکزِ علم تھے ہم دائرۂ عالم میں
شمع افروزِ رہِ منزلِ عرفاں ہم تھے

دین و دنیا کے مسائل کے تھے ہم عقدہ کشا
بابِ تحقیق تھے ہم قبلۂ ایماں ہم تھے

خطۂ ہند میں تھا خطۂ یوناں کا اثر
علم ارسطو کا تھا حکمت میں بھی لقماں ہم تھے

طبع روشن سے تھے ہم فیض رسانِ عالم
صورتِ ذرّہ تھے سب مہرِ درخشاں ہم تھے

بزم عالم میں یہ صورت تھی صفائے دل سے
مثلِ پروانہ تھے سب شمعِ شبستاں ہم تھے

گلشنِ دہر میں ہم سا نہ تھا آزاد کوئی
پا بہ گل سب تھے مگر سروِ خراماں ہم تھے

غنچۂ خاطرِ عالم تھا شگفتہ ہم سے
مایۂ نازِ بہارِ چمنستاں ہم تھے

ہوسِ تاجِ شہی ہمتِ عالی کو نہ تھی
دیکھتے کب طرفِ قیصر و خاقاں ہم تھے

نکتہ آموزِ قدیم و ادب آموزِ جدید
طفلِ مکتب تھے سب استادِ دبستاں ہم تھے

شرک سے کفر سے مذہب کو بچانا تھا ذہن
یہی دولت تھی فقط جس کے نگہباں ہم تھے

نہ تو محتاج کسی کے تھے نہ ہم دست نگر
اپنے خالق کے فقط بندۂ احساں ہم تھے

رحم و ہمدردی و دلجوئی سرشت اپنی تھی
چارہ سازِ غم و اندوہِ غریباں ہم تھے

باغ و بستانِ وطن کوہ و بیابانِ وطن
سب یہ قالب تھے کہ جن میں صفتِ جاں ہم تھے

بلبلِ زار تھے ہم قمریِ ناشاد تھے ہم
گلِ گلزار تھے ہم سروِ گلستاں ہم تھے

لالہ و یاسمن و نرگس و نسرینِ چمن
سوسن و سرو و گل و سنبل و ریحاں ہم تھے

قدِ دلجو و رخِ روشن و خالِ مشکیں
چشمِ مخمور و خمِ زلفِ پریشاں ہم تھے

وہ جفاکاریِ حسن اور وہ وفاداریِ عشق
تیغِ ابروئے صنم زخمِ شہیداں ہم تھے

گوہرِ سرِّ حقیقت کی تھی ہر سمت تلاش
ہر خرابے میں اُسی گنج کے جویاں ہم تھے

رہتے تھے جن و پری تابعِ فرماں اپنے
مُہرِ انگشتریِ دستِ سلیماں ہم تھے

تھا مقام اس کا سرِ شاخِ درختِ لاہوت
یہ چمن دہر میں جس گل کے کہ جویاں ہم تھے

کیا کہیں اپنا فروغ انجمنِ عالم میں
حلقۂ نجم میں مثلِ مہِ تاباں ہم تھے

دینِ زرتشت ہمارے ہی اثر سے چمکا
آتش افروزِ صنم خانۂ ایراں ہم تھے

ہم مقدم تھے خبر ہم کو مؤخر کی تھی
جبکہ قرآں نہ تھا، حافظِ قرآں ہم تھے

طمع و حرص کا دھبّہ کبھی لگنے نہ دیا
لوٹ دنیا سے بچائے ہوئے داماں ہم تھے

مرہمِ زخمِ غریباں تھا سدا دستِ سلوک
دوست بیکس کے تھے ہمدردِ یتیماں ہم تھے

جب نہ سلماں تھا نہ سحباں تھا نہ حافظ نہ ظہیر
نکتہ پرداز و سخن سنج و سخنداں ہم تھے

نام لکھا تھا سرِ دفترِ عالم اپنا
علم و اخلاق کے مضمون کے عنواں ہم تھے

اپنے خالق کے حبیب اس کی خلائق کے ادیب
معرفت کیش تھے، ہم ہادیِ ایماں ہم تھے

ہفت اقلیم میں ہر سکّہ پہ نقش اپنا تھا
کوئی فرماں ہو مُہرِ سرِ فرماں ہم تھے

مست ہم سا کوئی خمخانۂ عالم میں نہ تھا
آبرو وہ جرعہ کشِ بادۂ عرفاں ہم تھے

سب کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں اب ہم صورتِ خار
یاد ایام کہ جب نازِ گلستاں ہم تھے

اب تو شبنم کی طرح رہتے ہیں گریاں ہر دم
اسی گلزار میں اک دن گلِ خنداں ہم تھے

پا بہ زنجیر ہیں جس طرح طلائق سے اب
اس طرح سے نہ کبھی قیدیِ زنداں ہم تھے

آنکھ ہر ایک سے اب رہتی ہے نیچی اپنی
شرم سے یوں نہ کبھی سر بگریباں ہم تھے

اب علاج اپنے مرض کا ہو تو اک بات بھی ہے
اس سے حاصل کہ کبھی عیسیِ دوراں ہم تھے

—— بشن نرائن در (اگست ۱۹۱۱ء)

کشمیر

اے کاشمیر تو چمنِ بے نظیر ہے　　شیدا ترا جوان کی صورت سے پیر ہے
تجھ پر ازل سے فضلِ خدائے کبیر ہے　　جس کو لگی ہے لو تری روشن ضمیر ہے
ہے آرزوئے دل کہ تری آرزو کریں
جب تک زبان تر ہے تری گفتگو کریں

جو ہے ہزار جان سے تجھ پر نثار ہے　　گُل سے عزیز ہم کو ترا خار خار ہے
سرتاجِ دہر، ہند کا تو افتخار ہے　　رنگین تجھ سے یہ چمنِ روزگار ہے
مدت سے اشتیاق ہے اک بار دیکھ لیں
بلبل ہیں چشمِ شوق سے گلزار دیکھ لیں

سب کرتے آئے ہیں تری توصیف اور ثنا　　تیری زمیں ہے زیرِ فلک شانِ کبریا
دیکھا نہیں ہے آنکھ سے کانوں سے ہے سُنا　　ہے یہ شنید دید سے بھی معتبر سوا
اب کچھ ہو پہلے تو چمنِ بے مثال تھا
کیا حال سے غرض ہے یہ ماضی کا حال تھا

فرشِ زمیں کا عرش سے پایا بلند تھا　　ہر قصر شکلِ بامِ مسیحا بلند تھا
شمشاد باغ شاہدِ بالا بلند تھا　　ذرّوں کا مہر سے بھی ستارا بلند تھا
آب و ہوا کو حکم جو تھا زمہریر کا
بازار سرد رہتا تھا مہرِ منیر کا

ہر نخل شکلِ نخلِ تمنا ہرا بھرا　　ہر گل، گُلِ مراد سے بھی بڑھ کے جانفزا
ہر غنچہ غنچۂ دلِ احباب باوفا　　ہر خار خارِ دیدۂ بد بیں پُر دغا
ہر کوہ کاشمیر کا کوہِ وقار تھا
ہر چشمہ چشمۂ کرمِ کردگار تھا

چشمِ وفا کا نرگسِ بیمار پر گماں　　سادہ رخوں کی پھولوں میں رنگیں مزاجیاں
بحرِ عطا کی طرح ہر اک نہر تھی رواں　　آزادیٔ وطن تھی ہر اک سرو سے عیاں
کس جوش سے پہاڑ کے چشمے اُبلتے تھے
اہلِ وطن کے ولولے دل سے نکلتے تھے

ہر مرد میں بلندیِ ہمت اُنہیں کی تھی — ہر نہر میں صفائے طبیعت انہیں کی تھی
ہر گُل میں رنگ و بوئے محبت انہیں کی تھی — ہر غنچہ کی زباں پہ حکایت انہیں کی تھی
موجِ صبا مسیح نفس اُن کے دم سے تھی
کشتِ امید سبز انہیں کے کرم سے تھی

ہے سیرِ پربت کی وہی بالائے کوہسار — جاری ہیں ہر طرف سے وہی اب بھی آبشار
کوسوں تلک وہی ہیں شجرہائے میوہ دار — گلزار میں وہی گل و نسریں کی ہے بہار
بلبل وہی ہیں گُل وہی ہیں بوستاں وہی
نہریں وہی ہیں سرو وہی قمریاں وہی

دریا وہی ہیں دشت وہی ہیں جبل وہی — سبزہ کنارِ جو ہے وہی سیرِ ڈل وہی
گردوں پہ مہر و ماہ و شہاب و زحل وہی — روئے زمیں پہ شہر و مکان و محل وہی
آب و ہوا وہی ہے مرے کاشمیر کی
سردی وہی ہے خطۂ جنت نظیر کی

سب کچھ وہی ہے حیف مگر وہ بشر نہیں — وہ اہلِ دل نہیں ہیں وہ اہلِ نظر نہیں
کان و صدف وہی ہیں پہ لعل و گہر نہیں — باغ و چمن وہی ہیں پہ گلہائے تر نہیں
قالب ہے دیکھنے کو پہ قالب میں جاں نہیں
نام وطن ہے حُبِ وطن کا نشاں نہیں

کیا آج کل وطن کی ہے حالت نہ پوچھئے — کیا کیا پڑے ہیں رنج و مصیبت نہ پوچھئے
جہل و نفاق و کبر کی حالت نہ پوچھئے — کشمیریوں کی گردشِ قسمت نہ پوچھئے
جنت میں بھی عذابِ جہنم اٹھاتے ہیں
اعمالِ بد کئے ہیں سزا اُس کی پاتے ہیں

گلزار میں بھی دشت کی وحشت کا رنگ ہے — صبحِ وطن میں شامِ غریبی کا ڈھنگ ہے
جو ہے وہ جورِ دستِ زمانہ سے تنگ ہے — کشتِ امید موردِ بارانِ سنگ ہے
آوارہ آرزوئیں ہیں مانندِ گردِ راہ
کشتیِ قوم موجِ تلاطم میں ہے تباہ

—— بشن نرائن در (مارچ ۱۹۱۰ء)

تصوّرِ جاناں

اک ایسی بزم چاہتے ہیں ہم سے دلفگار
کوئی نہ ہو جہاں پہ کہ ہو حال آشکار

دنیا کی فکر ہوئے نہ عقبیٰ کی زینہار
اور محو ہوں اسی کی طرف اس کے جاں نثار

تنہائی بھی نہیں ہے کچھ اس طرح کی پسند
شرمائے جس کو دیکھ کے تنہائیٔ مزار

واں پر کوئی مخل نہ ہو، جس سے حجاب ہو
پہلو میں داغِ دل ہو کہ ہے اس کی یادگار

جُز یاس و بیکسی نہ ہو کوئی شریکِ حال
دل کو کسی طرح کا نہ ہو رنج و انتشار

دل میں رہے نہ دامنِ وحشت کی آرزو
اور ہو جدا نہ اپنے گریبان کا کوئی تار

فرقت کی ہو گھڑی نہ ہو ساعت وصال کی
دل پر بھی تھوڑی دیر کو ہو کاش اختیار

قمری کی طرح ہو نہ گلوگیر طوقِ عشق
نرگس کی طرح ہو نہ ان آنکھوں کو انتظار

فصلِ خزاں نہ ہو، نہ امیدِ بہار ہو
کھٹکے نہ بلبلوں کی طرح دل میں نوکِ خار

مانندِ سروِ باغ میں آزاد ہم رہیں
لالے کی طرح ہو نہ جگر اپنا داغدار

پروانے کی طرح سے نہ جلنا نصیب ہو
ہونا پڑے نہ شمع کے مانند اشکبار

بھولے سے بھی نہ شکوۂ جور و جفا کریں
جاری رہے زباں پہ فقط شکرِ کردگار

کچھ اور دُھن بندھی نہ ہو اس کے سوا ہمیں
دل ہم سے باتیں کرتا ہو، ہم دل سے بار بار

تاکیدِ ضبط ہو کہ بھرے غم سے دل مگر
آنسو رواں نہ ہوں صفتِ ابرِ نوبہار

کچھ ضبط سے بھی کام محبت میں چاہیے
لب پر نہ آہ و نالہ رہے اپنے بار بار

لیکن کہاں نصیب ہمارے کہ ہو نصیب
تنہائی اپنے پاس فقط اور خیالِ یار

جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن[1]
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

— ماہنامہ علیم آباد (مارچ ۱۹۱۲ء)

[1] غالب کے دیوان اسی طرح ہے

غزل

نہیں معلوم کیسا سحر تھا اس بُت کی چتون میں
چلی جاتی ہیں اب تک چشمکیں شیخ و برہمن میں

چھپیں گے کیا اسیرانِ بلا صحرا کے دامن میں
محبت دام کی پھر کھینچ کر لائے گی گلشن میں

کنارِ آبجو بیٹھے ہیں مستِ نکہتِ ساغر
نظر سوئے فلک اور ہاتھ ہے مینا کی گردن میں

حباب اٹھا زمیں سے آسماں تک چاندنی چھٹکی
گہن میں چاند تھا جب تک چھپے بیٹھے تھے چلمن میں

کنکھیوں سے جو ہم کو بزم میں تم دیکھ لیتے ہو
کھٹک جاتے ہیں کانٹے کی طرح ہم چشمِ دشمن میں

یہ سب کشتِ ہوس مٹی ہے سرسبزی سے کیا حاصل
گری برقِ فنا جس دم، لگی بس آگ خرمن میں

ملا دے خاک میں اے چرخ اس اجڑے ہوئے گھر کو
کہ اپنی روح تک بے چین ہے اب خانۂ تن میں

جو ہر دم جھانکتے تھے روزنِ دیوارِ زنداں سے
انھیں پھر چین آیا کس طرح تاریک مدفن میں

تھکے ماندے سفر کے سو رہے ہیں پاؤں پھیلائے
یہ سب مر مر کے پہنچے ہیں بڑی مشکل سے مدفن میں

کسے معلوم داغِ آتشیں سے دل پہ کیا گزری
سدھارے ٹھنڈے ٹھنڈے سونپ کر سب کو مدفن میں

بہت دستِ جنوں نے گدگدایا جب تو کیا کرتے
اُتاریں بیڑیاں اور پہنے دو دو طوق گردن میں

گلا گھٹنے لگا اب تنگ آیا ہوں گریباں سے
جنوں نے واہ کیا پھانسی لگائی میری گردن میں

بتاؤ سیرِ صحرا کی کوئی تدبیر وحشی کو
گریباں میں تو ہاتھ اُلجھا پھنسا ہے پاؤں دامن میں

فرشتوں کے بھی تیور جلتے ہیں یاں شعلۂ دل سے
حرارت آفتابِ حشر کی ہے داغِ روشن میں

کجا موسیٰ کجا مقصودِ سبحان الذی اسریٰ
رگڑ کر ایڑیاں بس رہ گئے وادیٔ ایمن میں

حجابِ ناز بیجا یاسؔ جس دن بیچ میں آیا
اُسی دن سے لڑائی ٹھن گئی شیخ و برہمن میں

—— مرزا واجد حسین صاحب یاسؔ عظیم آبادی (مئی ۱۹۱۲ء)

غالب

غالبِ گل فشاں کے گل، جن سے ہے آب آبِ ورد — ننگِ کلام دیکھ کر، رنگِ رُخِ شباب زرد
نثر کی گرمیِ بیاں جس سے ہے آفتاب سرد — نظم میں کثرتِ سرور، جس سے شرابِ ناب گرد

حسنِ کلام اس قدر، جس سے ورق ورق حسیں
نُورِ بیاض اس قدر، جس سے عرق عرق جبیں

معنی و الفاظ کی یہ شکل، بو ہو سمن میں جس طرح — نور نظر میں جس طرح، لطف سخن میں جس طرح
نغمہ ہو نَے میں جس طرح، حرف دہن میں جس طرح — نشہ ہو مَے میں جس طرح، روح بدن میں جس طرح

شوخِ ادا سے ہو خجل، دیدۂ ناز آفریں
جوشِ صفا پہ کہہ اٹھے۔ "آئینہ ساز آفریں"

خامے میں بانکپن کی نوک، موے مژہ ہے جس سے خم — فکرِ رسا وہ تیز رَو، جس سے ہے سرنگوں قلم
طبعِ لطیف رنگ سے، رشکِ گلشنِ ارم — طرزِ خیال تا فلک، ظرفِ دماغ جامِ جم

صوفیِ صاف دل کو وجد، مسلکِ صوفیانہ پر
مو خیالِ نغمہ سنج، خوبیِ ہر ترانہ پر!

حسنِ بیاں کو غالب "آج" فخر ہے تیرے نام پر — نطق ہے جو کلیم کو وجد ترے کلام پر
تیرے سوادِ نظم کو فوق اودھ کی شام پر — تیزیِ خامہ، تیزِ دست، خنجرِ بے نیام پر

شاہِ قلمروِ سخن، ترا قلم جہان میں
نام ترا بلند ہے، مثلِ عَلَم، جہان میں

رونقِ بزمِ علم و فن، ہے تو تری رقم سے ہے — تختۂ گل، زمینِ شعر، ہے تو ترے قلم سے ہے
دامنِ بحر، پُر گہر، تیرے یمِ کرم سے ہے — پیکرِ معنوی میں جان، تیری زباں کے دم سے ہے

قوتِ سحرِ سامری، آئی تری زبان میں
بول اٹھا کلام خود، جان پڑی بیان میں

عنبرِ نظمِ عنصری، تیری زباں کے ساتھ ہے — نورِ بیانِ انوری، تیرے بیاں کے ساتھ ہے
بحرِ سخن، برنگِ موج، طبعِ رواں کے ساتھ ہے — حُسنِ کلام، مثلِ لب، تیرے دہاں کے ساتھ ہے

قوتِ ناطقہ کی شان نطق سے تیرے بڑھ گئی
اوج سے سرزمینِ شعر عرشِ بریں پہ چڑھ گئی

گم اسدی کی نظمِ رزم تیرے کلامِ نظم میں — نظمِ نظامیہ کی شان تیرے نظامِ نظم میں
حوتِ فلک سمک کی طرح ہے ترے دامِ نظم میں — مستیٔ فہم کے لیے مے ترے جامِ نظم میں

لوحِ جبینِ عشق و حُسن، تیری کارقم کے بس میں ہے
طائرِ سدرہ کی زباں، تیرے قلم کے بس میں ہے

معنیٔ نو بہ نو ہے، تو نظم میں جدت آفریں — صورِ صریرِ کلک ہے، ہاتھ، قیامت آفریں
قدرتِ طبع قدرتِ قادرِ قدرت آفریں — معرکۂ سخن میں تو، غالب نصرت آفریں

قوتِ جاذبہ میں آج تیرا کلام فرد ہے
شمس کشش میں گھٹ گیا، رنگ اسی سے زرد ہے

زور ترے دماغ کا، زورِ خدا سے صرف کم — شور ترے کلام کا حشر کے شور سے بہم
لفظ میں صورتِ دماغ، قوتِ جوششِ عشق ضم — حرف میں مثلِ مردمک، حسن کی شکل مرتسم

زیر ہے زورِ ضربِ برق، تیری خرد کے زور سے
راز کو کھولے تیری فکر، پردۂ چشمِ مور سے

گرچہ ترے خیال میں بال و پرِ ملک نہیں — سرعتِ سیر میں مگر، زک ہو ملک کو شک نہیں
نورِ بیاں کے سامنے برق میں کچھ چمک نہیں — بحرِ سخن میں مد تو ہے، جزر کا نام تک نہیں

اوجِ سخن پہ داغ داغ رشک سے سینۂ افلاک
بحرِ سخن میں ہوگیا غرق "سفینۂ" فلک

گردِ جہاں ہے کس لیے گردشِ تیز تیز چرخ — پائی زک اوجِ طبع سے، تجھ سے ہے یہ گریزِ چرخ
ترے فروغ سے ہے داغ خسروِ صبح خیزِ چرخ — رنگِ سخن سے فق ہوا چہرۂ رنگ ریزِ چرخ

تیری بلند نظم کو پیش اگر کرے قلم
فہمِ دبیرِ چرخ کو زیر و زبر کرے قلم

بحثِ معانی و بیاں، تجھ سے مطوّل اس قدر — جس کی رقم کو دو جہاں مثل دو ورقہ مختصر
شمس ہے دو حدوں میں قید، نور اُسی پہ منحصر — نور ترے خیال کا کون و مکاں میں جلوہ گر

ارض و سما کی صورتیں یوں ہیں ترے خیال میں
جیسے پھنسے ہوئے طیور جمع ہوں ایک جال میں

تیرے قلم کا ٹھیک وصف ہے، تو زباں دراز ہے — تیری رقم کا دائرہ، دیدۂ نیم باز ہے
تیرا بیانِ عشق و حسن باعثِ فخر و ناز ہے — عشق کا دل گداز ہے، حسن کا دلنواز ہے

قلتِ سستیِ سخن، جس سے نہ ہو کلام سُست
کثرتِ چُستیِ سخن، جس سے سخن تمام چُست

اپنی شکست سے نجوم، جو میں ہیں شرر فشاں — سوزشِ دل کے ساتھ ہیں شمس زمیں پہ زرفشاں
کھا کے تپانچہ، ہوا شاخِ شجر ثمر فشاں — دامنِ صفحہ پر مگر ہنس کے ہے تو گہرفشاں

نثر پہ چل رہے ہیں لب، نظم پہ چل رہے ہیں لب
پھول کھلا رہے ہیں لب، لعل اُگل رہے ہیں لب

تیرا تصورِ سریع، سیر پہ کچھ پھڑک گیا — رخ جو کیا زمیں کے رُخ، سطح سے تا سمک گیا
سوئے فلک چلا تو کیا، صرف سرِ فلک گیا — بلکہ خدائے پاک کے پردۂ راز تک گیا

قلب میں آئے جو رموز، قلب کے زورِ طلب سے
صفحہ کو سب وہ دے دیے، کلک نے لے کے قلب سے

بہرِ ثبوتِ نورِ حسن، خط ترا خود گواہ ہے — صفحے پہ ہے سوادِ خط یا شبِ نیم ماہ ہے
نقطۂ نوں ہے داغِ ماہ، نون بہ شکلِ ماہ ہے — نقطۂ نوں ہے یوسف، اور نون کا حلقہ چاہ ہے

تیرا قلم ادا شناس، حسن کی ہر سرشت کا
زائچہ کھینچتا ہے وہ عشق کی سرنوشت کا

فطرت اگر ہے قفل، تو، کلک ترا کلید ہے — عشق نگاہ کے لیے حسنِ رقم نوید ہے
رنگ ترے کلام کا، رنگِ رخِ امید ہے — نور تری بیاض کا، خندۂ صبحِ عید ہے

آنکھ میں تیرا لفظ لفظ، مردمکِ سیاہِ شوق
شوق سے جوشِ شوق پوچھ، شوق ہے خود گواہِ شوق

— احمد علی شوق قدوائی
(جولائی ۱۹۱۲ء)

مرزا غالبؔ دہلوی

اُن لوازمات میں جو کسی متمدن ملک یا مہذب قوم کی عظمت و شان میں چار چاند بن کر چمکتے ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم اور کوئی ملک تہذیب و تمدن میں حصہ دار بننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، لٹریچر کو صفِ اوّل میں جگہ دی گئی ہے اور اس زمانہ میں تو، جبکہ ترقی کا معیار بہت اُونچا ہو گیا ہے، اس کی اہمیت کا احساس بدرجۂ غایت کیا جاتا ہے۔ لٹریچر یا علم ادب آج کل ایک آئینہ ہے جس میں انسانی سوسائٹی کی تصویر اور معاشرت و مدنیت کے اصلی خط و خال بلاکم و کاست نظر آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے اور سچ کہا ہے، کہ جو قوم علم ادب میں اوروں سے پیچھے ہو اُسے ہر بات میں پھسڈّی سمجھ لو۔ گویا قومی اعزاز اور کامیاب زندگی ایک ترقی یافتہ لٹریچر کے بغیر حاصل ہونا بعید از امکان ہے۔ مبارک ہیں وہ اقوام جو اس صنفِ خاص میں دوسروں کے لئے سرمایۂ رشک بنی ہوئی ہیں، اور جن کے ہزاروں اور لاکھوں افراد اپنے چمنستانِ ادب میں ہمہ تن معروف اور اس کی بقا کا سامان مہیا کرنے پر ہر طرح جد و جہد کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں! اور قابلِ رحم ہیں ہم، ہماری قوم، اور ہمارا ملک، جہاں قومی ادب کی خدمت کرنے کا خیال تو ایک طرف رہا، اُن بزرگوں کی مساعی جمیلہ کی داد بھی عملی طور سے دینا امر محال سمجھا جاتا ہے جنہوں نے کسی ذاتی طمع کے بغیر، بے غرضی کے ساتھ، اپنی ہمدردانہ کارگزاریوں سے ہمارے لٹریچر کو درست کرنے میں، اپنی جانب سے، کوئی بات نہیں اُٹھا رکھی۔ ہم کاہل و مجہول ہونے کے ساتھ ہی ناشکرگزار بھی ہیں، اور ہماری یہ افسوسناک حالت اُس وقت سے قائم ہے جب سے ہم اپنی ادبی و لسانی ضروریات سے غافل ہوئے۔ سوداؔ ہوں یا میرؔ، ذوقؔ ہوں یا غالبؔ، یہ علم و ادب کے حقیقی بہی خواہ اور خادم تھے۔ لیکن ہماری حق ناشناسی اُن بزرگوں کا نام بھی عزت کے ساتھ لینے میں تامّل کرتی ہے۔ جو قومیں آج علم و فن میں ہم سے بہت آگے ہیں، ان کو دیکھئے کہ وہ اپنے مشاہیر کے لافانی کارناموں کی شہرت و بقا کے لئے کیا کچھ نہیں کر رہی ہیں۔ ان کے سپوت ہونے کی شہادت، اگر واقعاتِ عالم نہیں دے سکتے، تو کیا ویسٹ منسٹر ایبے کی شاندار عمارت کے مجسمے بھی نہ دیں گے، جن کے دلوں میں عالمِ سکوت میں بھی اپنے اخلاف کے سعادت مندانہ جذبات کو دیکھ کر مسرت و اطمینان کی کیا کچھ کیفیت نہ پیدا ہوتی ہو گی۔ اگر روح کا دنیا میں آ کر اپنے گھر بار اور آل اولاد کی

حالت کو دیکھنا صحیح ہے، تو معلوم نہیں کہ ہمارے اسلاف ہماری نالائقی سے کیا کیا متاثر ہوتے ہوں گے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے زندگی ہی میں ہم سے کیا پایا، جو اب مرنے کے بعد کوئی توقع کریں گے! سودا اور اسی قسم کے دو چار شعرا سے قطع نظر کس کو فراغبالی نصیب ہوئی ؟ اور ملکی قدر دانی کے ہاتھوں کس کی الم انگیز پریشانیوں کا خاتمہ ہوا ؟ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب ایسا یکتا اور نامور شخص، جو نظم و نثر پر پورے طور پر قابو رکھنے کے ماسوا قوتِ متخیلہ کی سحر آفرینیوں کی ایک زبردست مثال بھی تھا، اربابِ زمانہ کی بے وفائی اور ناقدردانی اور ابنائے جنس کی فیر مآل اندیشی سے ہمیشہ مفلوک و محتاج رہا اور افکارِ دنیوی اور ترددات معاش سے اُسے بمشکل کسی دن اطمینان حاصل ہوا، تو ہمیں اپنے ایک مُردہ اور اندھی قوم ہونے کا خیال پختہ ہو جاتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غالب کے عہد میں اسلامی حکومت عالمِ نزع میں تھی اور اسلامی سوسائٹی پر بالعموم ادبار و فلاکت کی گھٹا چھا رہی تھی، لیکن اُن حکمرانوں کے لئے، جن کی فضول خرچی اور عیش پسندی نے بالآخر سلطنت کا دیوالہ نکال دیا، یہ ناممکن تھا کہ غالب کو کم از کم شکم پروری کی فکر سے آزاد کر دیتے۔

یہ بات ضرور ہے کہ "قدرِ مردم بعد از مردن"۔ اور شاید اس عہد میں جبکہ کمی تعلیم اور خیالات اور ارادوں میں نقص اور کوتاہ نظری پیدا ہو جانے سے، غالب کی رفعتِ شان کو لوگوں نے نہ سمجھا ہو، لیکن مغربی تعلیم کے فیضان سے مستفید ہونے کے بعد، جبکہ ہم میں اصلی و نقلی کی تمیز آ گئی ہے، ہم کون سا علمی قدردانی کا دریا بہا رہے ہیں۔ بےشک، مغربی لٹریچر کے رموز آشنا ہونے کے بعد ہم میں سے اکثر غالب کی عظمت کو جان گئے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ جبتک غالب کا دیوان اور ان کی قبر اس مبتذل حالت میں رہے گی کہ اس ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے اس وقت تک ہم اسلاف پرستی کے دربار میں نمایاں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غالب کیا تھے ؟ اور ان کی شاعری کس درجہ کی ہے ؟ اس کا جواب، جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جائے گا اور ہمارے خیالات و جذبات میں صلاحیت پیدا ہوتی جائے گی، ووں ووں ان کی ذاتی منزلت اور ان کی شاعری کے مدارج پر روشنی پڑتی جائے گی۔ ولی سے لے کر آج تک اُردو شاعری نے کئی دَور طے کئے ہیں۔ لیکن درجہ بدرجہ اصلاح و ترقی کے اسباب و نتائج پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ غالب ایسا فطرت شناس سخنگو آج تک پیدا نہیں ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی ایک صنفِ کلام میں ان کا درجہ کسی سے کم ہو، لیکن اُردو شاعری پر لکیر کا فقیر بننے کا جو الزام عائد ہو رہا تھا اگر اس کا کچھ ازالہ ہوا ہے، تو غالب کے دماغ و قلم سے۔ خیالات کی جدت اور مضامین کی تازگی کی جو روح افزا کیفیت غالب کے کلام میں موجود

ہے، وہ کہیں اور بمشکل ملے گی۔

یہ بات مسلّم ہے کہ شاعری بغیر مقامی رنگ کے ارباب نظر کے سامنے کبھی وقار نہیں حاصل کر سکتی۔ اُردو اس بارے میں سب سے زیادہ بدقسمت ہے۔ ایک تو ہندوستان میں قدرتی طور پر وہ سامان مفقود ہیں، جو ایک شاعر کے دل میں سچے جذبات موجزن کر سکیں، دوسرے ہمارے شعرا نے آنکھ بند کر کے فارسی کا تتبع کیا اور اس میں اسی وجہ سے ہوا کہ:

> بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا حالانکہ وہ بھیم و ارجن کا حق تھا.... حسن و جمال کے شبستان میں لیلیٰ و شیریں آ گئیں اور جب وہ آئیں، تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیوں نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی گنگا و جمنا نہ بہہ سکیں مجبوراً جیحوں و سیحوں ہندوستان میں آ گئے۔ ہمالہ اور بندھیاچل کو چھوڑ کر بیستون و قصر شیریں یا کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں۔

مناظر قدرت کی تصویریں، تو اُردو میں نام تک کو نہیں۔ اس کی کمی ایک حد تک ہندی شاعری میں بھی ہے، لیکن اس کی تلافی دوسری صورت میں ہو گئی ہے۔ اُردو میں اگر عشق و محبت ہی کے جذبات ہندی کی طرح نیچرل اور صحیح ہوتے تو اس میں تاثیر کا کوئی اور ہی عالم ہوتا۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے اسلاف نے فارسی کی تقلید میں بھی ایجاد کا لطف پیدا کر دیا ہے، اور جس چیز کو انہوں نے مستعار حاصل کیا اُسے بالآخر اپنا جا لیا۔ یہ صفت عقلا کی ذہنی و دماغی قابلیت کی دلیل ہے، لیکن کاش وہ ذرا دُور بینی سے کام لیتے، تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ جس چیز کو وہ ایران سے لائے ہیں وہ خود ان کے پہلو میں موجود تھی۔ الفت و دوستی کی صبر شکن تصویریں جو ہندی میں کھینچی ہوئی ہیں، اُن کی طرف ہمارے شعرا نے نگاہ تک نہیں اٹھائی، ورنہ عیب چینوں کے لئے گرفت کا اتنا موقع نہ ہوتا اور اس کے اکثر نقائص دُور ہو جاتے۔

غالب کی نظر وسیع اور بلند تھی۔ ممکن نہ تھا کہ اُن کی آنکھ اُردو کی پست حالت پر نہ پڑتی۔ وہ ایک جدت پسند تھے۔ تقلید سے وہ اس قدر متنفر تھے کہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ کوئی اور شخص بھی اسدؔ تخلص کرتا ہے تو آپ نے اپنا تخلص اسدؔ سے بدل کر غالبؔ رکھ لیا۔ اس حالت میں کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی اُن غیر معمولی قوتوں سے کام نہ لیتے جو فطرت سے ودیعت ہوئی تھیں، اور جن کے ذریعہ سے اُردو شاعری میں انقلاب آنا مقدر تھا۔ بےشک وہ پرانے ڈھرے سے جدا نہیں چلے، لیکن انہوں نے اپنے اچھوتے تخیل کے زور سے ثابت کر دیا کہ اُردو شاعری میں ابھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے۔

قدرت کے کرشمے عجیب ہوتے ہیں۔ غالب، جو آگرہ میں پیدا ہوئے اور جن کی ابتدائی تعلیم و تربیت بھی اصولاً نہ ہوئی تھی، جنہیں پانچ برس کی عمر میں باپ، اور نو برس کی عمر میں شفیق چچا کی افسوسناک موت کا داغ اٹھانا پڑا، اور جن میں ابتدا ہی سے وارستہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی، اُن کو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک دن کاملین الرحمٰن کے شہ نشیں پر صدر کی حیثیت سے متمکن ہوں گے۔

خاندانی عظمت اور نسبی فضیلت کے لحاظ سے غالب کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ ایبک قوم کے تُرک تھے اور اُن کا سلسلہ تورابن فریدوں تک پہنچتا ہے۔ سلجوقیوں کے انتزاع کے بعد ان کے جدِّ بزرگوار ہندوستان آئے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا۔ اس وقت سلطنت کا صرف ڈھانچہ باقی تھا۔ تاہم اُن کو فوج میں ایک عہدہ مل گیا۔ شاہ عالم کے بعد شطرنجِ حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور مُہرے اِدھر اُدھر ہو گئے۔ غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ کو تلاشِ معاش کی ضرورت ہوئی۔ اس وقت لکھنؤ متلاشیانِ روزگار کے خیال میں منزلِ مقصود تھا۔ نجف داتا آصف الدولہ کے خوانِ کرم سے انہیں بھی کچھ عرصہ تک ریزہ چینی کا موقع ملا۔ پھر وہاں سے نواب نظام علی خاں کے عہد میں حیدرآباد وارد ہوئے، جہاں اُنہیں ایک فوجی خدمت مل گئی۔ لیکن آب و دانہ وہاں کا بھی نہ تھا۔ بعض خانہ جنگیوں کی بدولت اُنہیں حیدرآباد کو بھی خیرباد کہنا پڑا۔ واپس آکر چندے آگرہ میں ٹھہرے اور پھر راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور کے یہاں ملازمت پا گئے اور وہیں ایک معرکہ میں کام آئے۔ راجگڑھ میں مدفون ہیں۔

باپ کے انتقال کے بعد غالب کی غور و پرداخت ان کے چچا نصراللہ بیگ نے اپنے ذمہ لی۔ یہ بزمانۂ لارڈ لیک، جن کی ملکی فتوحات تاریخِ ہند میں جلی قلم سے لکھی رہیں گی، سرکاری فوج میں رسالداری پر ممتاز تھے۔ پگلدو سے خدمات انہیں ضلع آگرہ میں دو پرگنے مرحمت ہوئے تھے، جن کے محاصل سے وہ اپنی مدتِ حیات تک فائدہ اٹھاتے رہے۔ سنِ شعور تک غالب آگرہ میں رہے۔ ۱۲۲۵ھ میں جب یہ ۱۳ برس کے تھے، ان کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش معروف کی لڑکی کے ساتھ ہو گئی اور اس طرح تعلقات قائم ہونے کے بعد دہلی کی آمد و رفت جاری ہو گئی اور بالآخر مستقل طور سے یہیں آرہے۔

غالب کی بیوی نہایت وفاکیش اور نیک بخت خاتون تھیں۔ ان کی خدمت میں وہ دل و جان سے ساعی رہتیں۔ مذہبی احتیاط اس درجہ تھی کہ غالب کے رندانہ طور و طریق کے خیال سے وہ اپنے کھانے پینے کے ظروف جُدا رکھتی تھیں۔ غالب کو بھی ان سے محبت تھی اور ان کا پاس کرتے تھے۔ غالب نے متاہلانہ زندگی کا تمسخر اکثر جگہ اپنے رقعات میں اُڑایا ہے، لیکن ان کی اصلیت ذرا بھی نہیں۔ مولانا حالی یادگارِ غالب

میں تحریر فرماتے ہیں:

"مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے، مگر ان کے کھانے اور دوا، ٹھنڈائی اور جوڑا اول وغیرہ کا انتظام سب گھر سے ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی صلاحیت رہی، ہمیشہ وقت متعین پر ایک بار وہ گھر میں ضرور جاتے تھے اور بی بی اور اُن کے رشتہ داروں کے ساتھ نہایت عمدہ برتاؤ رکھتے اور اپنی جان سے بڑھ کر ان کی ضروریات اور اخراجات کا خیال رہتا تھا۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت اُن کی گھٹی میں پڑی تھی، ان کی زبان وقلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔ ص ۹۶"

دہلی گو اس وقت مٹ چکی تھی، پھر بھی وہ دہلی تھی۔ اور کوئی بات تو رہی ہو گی جس نے غالب کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ سسرال کی دلچسپیوں اور نئے رشتہ داروں کی کشش محبت کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی جو انہیں دہلی کھینچ لائی اور یہ اُن ستودہ صفات بزرگوں کا مجمع تھا، جو حکومت میں ضعف آجانے اور علوم وفنون کا چرچا تقریباً مفقود ہو جانے کے باوجود اپنے دم سے فضل وکمال کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کا عہد ملکی حیثیت سے خواہ کتنا ہی پُرخطر وتشویشناک رہا ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ اسی زمانہ میں شعر وسخن کا وہ چرچا تھا کہ دہلی کا لڑکا لڑکا بزعم خود میرؔ وسوداؔ کا جانشین تھا۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ حکمران کا رجحان جس طرف ہو گا عوام بھی اسی طرف جھکیں گے۔ حضور نظام خلد مقام میر محبوب علی خاں مرحوم کو جو دلچسپی فن شعر گوئی سے تھی، اس نے نہ صرف اطراف واکناف ہند سے اچھے اچھے شاعروں کو اُن کے دار الخلافہ میں اکٹھا کر دیا تھا، بلکہ وہاں عام طور پر شعر وسخن کا وہ چرچا تھا کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعرے روز مرہ منعقد ہوتے تھے، جن میں سے بعض میں خود اعلیٰ حضرت مغفور کا کلام بھی آتا تھا۔ مشاعروں کی یہ کثرت ہوئی کہ رات کے آٹھ بجے مشاعرہ کا آغاز ہوتا اور سلسلہ صبح کے دس بجے تک ہوتا رہتا۔ یہی حال دہلی کا رہا ہو گا اور چونکہ اس وقت شاعری لڑکوں کا کھیل نہیں سمجھی جاتی تھی اور اساتذہ کے سامنے دریدہ دہنی سے یاوہ گوئی کی جرأت بھی ہر کس وناکس کو نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے یہ خیال بجا ہے کہ غالب کو برگزیدہ اصحاب کی صحبت میں خصوصیت کے ساتھ دلبستگی ہوئی ہو گی۔ جب تک ذوقؔ زندہ تھے، ظفر کے کلام کی اصلاح دیتے رہے۔ ان کے انتقال کے بعد یہ مشورۂ سخن کی عزت غالب کے حصہ میں آئی۔ اس سرفرازی سے پیشتر ہی غالب کی رسائی دربار معلیٰ میں ہو چکی تھی۔ سہرے کا قضیہ بھی اسی زمانہ کی بات ہے جب ذوقؔ مرحوم بقید حیات

تھے۔ بادشاہ سلامت بھی غالب پر خاص طور سے مہربان تھے اور انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ سہرے کے معاملہ میں البتہ غالب سے کسی قدر کشیدہ خاطری ہو گئی تھی لیکن ان کی "معذرت" کے بعد شاید معاملہ بالکل رفع دفع ہو گیا تھا۔ ۱۲۶۶ھ میں بادشاہ نے انہیں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب اور چھ پارچہ خلعت سے ممتاز فرمایا۔ خاندان تیموریہ کی تاریخ مرتب کرنے کا کام بھی ان کے سپرد کیا گیا، اور اس کے عوض ۵۰ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ غالب کے قطعات و رباعیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے مقربان شاہی کی طرح ان کے یہاں بھی بادشاہ کی جانب سے ہدایا اور تحفے آیا کرتے تھے۔ ایک قطعہ میں "بیسنی روٹی" کا شکریہ ہے؛ ایک رباعی میں "شاہ پسند دال" کا اور ایک دوسری میں "سیم کے بیجوں" کی رسید ہے۔ اس التفات آمیز توجہ کے باوجود غالب کی وہ قدر نہیں کی گئی، جس کا مستحق ایسے اعلیٰ پایہ کا اہل کمال قدرتی طور پر ہو سکتا ہے۔ تاہم غالب ایسے آزاد منش اور بے فکرے آدمی کے لئے جو کچھ تھا بہت تھا۔ وہ اسی کو بڑی قدر دانی سمجھتے تھے کہ حضور نے قصیدہ سن کر یہ تو فرمایا کہ "مرزا! تم پڑھتے خوب ہو!"

حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اس وقت کی سوسائٹی کا رنگ خوب بھانپ لیا تھا۔ پھر وہ ناقدروں سے حوصلہ افزائی کی کیا امید کر سکتے تھے؟ اس کے علاوہ بادشاہ کو بھی جانتے تھے کہ اس کی وقعت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں۔ وہ بہت بڑے ظرف کے آدمی تھے، لیکن انسان سب تکالیف برداشت کر سکتا ہے، مگر پیٹ کی آگ نہیں بجھا سکتا۔ اس سے وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا جو تھوڑا بہت وظیفہ مقرر تھا، وہ بھی سلطنت کی بے انتظامیوں اور عمال کی غفلت کاریوں سے انہیں وقت پر نہیں ملتا تھا۔ ورنہ یہ کہنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی:

میری تنخواہ جو مقرر ہے — اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقید حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار

. . . .

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

انسان کا فطری خاصہ ہے کہ وہ اپنے کاموں کی داد طلب کرے، شہرت پسندی اور نمائش سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ غالب نے بھی باوصف زمانہ کا حال پورے طور پر جاننے کے، بہادر شاہ سے اس بات

کی تمنا کی تھی کہ شاہجہاں نے کلیم کو سیم و زر سے وزن کیا تھا، آپ میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیں! اللہ اللہ! کیا حسرت بھری خواہش ہے۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ زمانہ کی ناقدری نے اس شاعرِ بے بدل کے دل پر یاس اور حرماں نصیبی کا کس قدر گہرا نقش بٹھا دیا تھا۔ اپنی چیز کو کون بُرا سمجھتا ہے، اور کون اپنی سبکی چاہتا ہے اور پھر غالب ایسا خوددار شخص! وہ اپنے آگے، کلیم کیا معنی، کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھ لیا کہ ان کی دماغ سوزی اور جگر کاوی کی داد عملاً ملنا محال ہے، تو یہی تمنا کی کہ کاش ان کا کلام ہی کلیم کے کلام کے مقابل میں لایا جا سکے!

شاہی تقرب گو حقیقی معنوں میں برائے نام ہی کیوں نہ رہا ہو، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس کے سبب سے غالب کو ایک طرح کی بے فکری تھی۔ پر غدر کے ہنگامہ کے بعد یہ تعلق قطع ہو جانے پر وہ سچ مچ فلاکت و عُسرت کا شکار بن گئے۔ ادھر بادشاہ کی طرف سے جو وظیفہ مقرر تھا وہ بند ہو گیا، اُدھر برٹش گورنمنٹ سے جو پنشن ملتی تھی وہ بھی بعض لوگوں کی بنا پر مسدود ہو گئی۔ باپ دادا کی کمائی اور ننہال کی دولت پہلے ہی پھونکی جا چکی تھی۔ اب کیا تھا، نام اللہ کا! ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

"اس ناداری کے زمانہ میں جس قدر کپڑا، اوڑھنا بچھونا، گھر میں تھا سب بیچ بیچ کر کھا گیا۔ گویا اور لوگ روٹی کھاتے تھے اور میں کپڑا کھاتا تھا۔"

دو سال تک اپنے ہی قول کے مطابق کپڑے کھا کھا کر بسر کی۔ لیکن پھر رامپور کے شریف پرور اور علم دوست نواب یوسف علی خاں مرحوم نے، جو فنِ شعر گوئی میں بھی مہارتِ تامہ رکھتے تھے اور غالب کے شاگرد بھی تھے، ان کا سو روپے ماہانہ کا استمراری وظیفہ مقرر کر دیا، جو اُن کے آخر دم تک جاری رہا۔ غالب بھی نواب رام پور کے استاد تھے، اس لئے گرامی قدر شاگرد انہیں بہت عزت کی نظر سے دیکھتا تھا، اور دونوں میں نہایت بے تکلفانہ روابط قائم تھے۔ اور چونکہ معارف پرور اور شرفا نواز بھی تھے، اس لئے غالب کی توقیر بدرجۂ کمال ملحوظ خاطر رہتی تھی۔ میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس باب میں وہ خود روشنی ڈالتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے، سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور میں ہوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلی میں رہوں تو سو روپے۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھے۔ ملاقات

بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم، جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے۔"

نواب یوسف علی خاں مغفور کے انتقال پر غالب بتقریب ادائے تعزیت رامپور گئے۔ اس وقت مسند حکومت پر نواب کلب علی خاں ایسا فراخ حوصلہ اور قدرشناس امیر متمکن تھا۔ انہوں نے بھی ان پر خاص الطاف و عنایات فرمائے اور جو تنخواہ ان کے لئے عہد سلف میں معین تھی، وہ جاری رکھی جو زندگی بھر انہیں ملتی رہی۔

رامپور کا وظیفہ اور سرکاری پنشن بقدر ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کے جو ان کے چچا کی خدمات کے صلہ میں ان کو اور دوسرے ورثاء کو ملتی تھی اور جو تین سال تک بند رہنے کے بعد رفع شبہات ہونے پر بدستور پھر جاری ہو گئی تھی، یہ دونوں رقمیں اس مقدار میں تھیں کہ غالب متوسط زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن ان کے خیالات بلند اور ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ ہمیشہ تنگدستی کی مصیبت میں مبتلا رہے اور عسرت نے کبھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اس کے ساتھ وہ شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے، ان تکالیف کو خیال میں نہ لاتے تھے اور اس عالی ظرفی سے انہیں جھیلتے تھے کہ پیشانی تک میلی نہ ہوتی تھی۔

غالب کے ہندو دوستوں اور شاگردوں کی معقول تعداد تھی، اور یہ اُن کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے۔ غدر کے بعد جب انہیں فاقہ کشی کی نوبت آ چکی تھی، تو جن لوگوں نے ان کی خبر گیری کا بار اپنے سر لیا، وہ ان کے ہندو احباب تھے۔ مسلمان اُس ہنگام کے بعد ایسے کھوئے گئے تھے کہ خود اپنی خبر نہ رکھتے تھے۔ اور ایک طرح سے دہلی مسلمانوں سے بالکل خالی تھی۔ اگر ہندوؤں نے غالب سے ہمدردی نہ کی ہوتی، تو معلوم نہیں انہیں کیا دقت پیش آتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کس درجہ خوشگوار تھے۔

ہندو شاگردوں نے اپنے اُستاد کی خدمت کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان میں سے اکثر انہیں مستقل امداد دیتے تھے، جیسا کہ "اردوئے معلیٰ" کے اکثر خطوط سے ثابت ہوتا ہے۔ غالب بھی ان کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھتے تھے۔ وہ حریص و طامع نہ تھے، لیکن ان کی تحریروں سے ظاہر ہے کہ شاگردوں کے پیشکش کو وہ کس بے تکلفی سے قبول کرتے تھے، گویا وہ خود انہیں کا تھا۔ دیکھئے، منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں کس اسلوب سے لکھتے ہیں:

"سَو روپیہ کی ہنڈی وصول کر لی۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت اٹھے تھے، ۵۰ دیے، ۵۰ روپیہ محل میں بھیج دیے۔ ۲۶ باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لئے۔ ۔۔۔۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔"

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی زندگی گونا گوں آلام و تکالیف کا مجموعہ تھی، اور زمانہ کی بیوفائی اور ناقدری کے ساتھ اُن کی فضول خرچی وسے پرستی سونے پر سہاگے کا کام دیتی۔ اوائل سن میں باپ کا سایہ سر سے

اٹھا۔ شعور کے درجہ پر پہنچنے نہ پائے تھے کہ چچا مفارقت کر گئے۔ دہلی میں آ کر رہے۔ بادشاہ نے مدِ معاش کے طور پر تاریخ نویسی کا کام ان کے ذمے کیا اور ۵۰ روپے ماہوار پانے لگے، لیکن بہت جلد انہیں اس سے ہاتھ دھونا پڑا۔ غدر میں منجملہ اور مصائب کے چھوٹے بھائی کی وفات کا حادثہ بھی عالم میں واقع ہوا کہ جب نفسی نفسی کا عالم تھا۔ مرزا یوسف ان کا نام تھا اور ۳۰ برس کی عمر سے وہ مجنون ہو گئے تھے۔ جب غالب دہلی آئے تو انہیں بھی ہمراہ لیتے آئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں یہ ایک جداگانہ مکان میں رہتے تھے، وہیں انتقال کیا۔ اس وقت نہ کفن کا کپڑا مل سکتا تھا، نہ غسال دگورکن تھے۔ انہیں کے ہمسایوں نے جیسے تیسے تجہیز و تکفین کی رسم ادا کی۔ غالب کو اُن سے بجد محبت تھی اور بہت چاہتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی ـــ میرزا یوسف ہے، غالب! یوسفِ ثانی مجھے

بھائی کے انتقال کی تاریخ "دریغ دیوانہ" نکالی ہے اور اس میں سے "آہ" کے اعداد کا تخرجہ کیا ہے۔ اس حادثہ کا اثر غالب پر ناگفتہ بہ پڑا۔ انہیں اس کس مپرسی اور بیکسی کی موت کا اور بھی قلق تھا۔

اولاد کی جانب سے بھی غالب بہت بدقسمت تھے۔ سات بچے ہوئے لیکن زندگی کسی نے نہ پائی۔ زین العابدین خاں عارف (جو ان کی بیوی کے بھانجے تھے) کے دونوں لڑکوں کو جنہیں صغرسنی ہی میں یتیمی کا داغ اٹھانا پڑا تھا، آغوش میں لے لیا تھا اور ان کے ساتھ غایت الفت کرتے تھے۔ یہ دونوں ہونہار اور صاحب اقبال تھے۔ لیکن غالب کی وفات کے بعد ہی، یہ دونوں بھی عین عنفوانِ شباب میں گزر گئے۔

زین العابدین خاں عارف، جن کا مرثیہ دیوان غالب کے بہترین نشتروں میں نہایت دردانگیز چیز ہے، نہایت خوش فکر و نازک خیال سخن گو تھے۔ غالب ان کو بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کا حسرت ناک نوحہ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اُن کی جوانا مرگی غالب کے لئے فی الواقع غیر متوقع مصیبت ثابت ہوئی ہو گی۔ غور کیجئے یہ اشعار کس الم آگیں کیفیت اور قیامت آفریں حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور ـــ تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ـــ کیا خوب! قیامت کا ہے، گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف ـــ کیا تیرا بگڑتا، جو نہ مرتا کوئی دن اور؟

تم ایسے کہاں کے تھے کھرے داد و ستد کے ـــ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی ـــ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

نادان ہو، جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ان ناگزیر صدموں اور دنیوی افکار اور اُن کی بے اعتدالی نے، وقت سے پہلے، غالب کے دل و دماغ کو ضعیف اور قوی کو معطل کر دیا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ مردان خانہ سے بمشکل گھر میں جا سکتے تھے۔ چلنا پھرنا بہت کم کر دیا تھا۔ ثقل سماعت کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ان سختیوں کے مقابلہ میں اگر وہ اپنی موت کے ہر وقت متمنی رہتے تھے، تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی، جو اس وقت اپنی عام شہرت اور اجتہادی قابلیت کی بدولت، فارسی کے بہترین شاعر کی حیثیت سے مستغنی عن التوصیف ہیں، غالب مرحوم سے اپنی ملاقات کا حال یوں بیان فرماتے ہیں۔ چونکہ ان واقعات سے غالب کی آخر عمر کے حالات پر صحیح اور سچی روشنی پڑتی ہے، اس لئے یہ خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ جناب عزیز فرماتے ہیں:

"ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے۔ اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دہلی اتر پڑے۔ سرائے میں قیام کیا، پھر اسٹیشن پر جانے کے لئے اڈّہ گاڑی سے بگھی منگوائی۔ ابھی بگھی آئی تھی کہ یکایک ہم کو خیال ہوا کہ حسن اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے، تو میرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیئے۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوئے۔ کچھ دور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا۔ اس میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے، خیریت پوچھنے کے بعد کہنے لگے، چلئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں۔ مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا۔ ایک بڑا سا چھا سک تھا جس کی بغل میں ایک کمرا، اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک نحیف الجثہ آدمی، گندمی رنگ، اسی بیاسی برس کا ضعیف العمر لیٹا ہوا ایک مجلد کتاب سینے پر رکھے آنکھیں گڑائے ہوئے پڑھ رہے تھے۔ یہ مرزا غالب دہلوی ہیں، جو بگمان غالب دیوان قاآنی ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

ہم نے سلام کیا، لیکن بہرے اس قدر تھے کہ ان کے کان تک آواز نہ گئی۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے سلام کیا۔ بمشکل چارپائی سے اتر کر فرش پر بیٹھے۔ ہم کو بھی اپنے پاس بٹھایا۔ قلمدان اور کاغذ سامنے رکھ دیا اور کہا "آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن

کانوں سے بالکل سُنائی نہیں دیتا۔ جو کچھ میں پوچھوں، اس کا جواب لکھ دو۔" نام و نشان پوچھا۔ ہمارے ساتھ جو صاحب گئے تھے، ہر چند انہوں نے تعارف کرانے کی کوشش کی مگر بیسود ہوئی۔ جب ہم نے نام و پتہ لکھا تو کہا "مجھ سے ملنے کے لئے آئے ہو، تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام بھی سناؤ۔" ہم نے کہا "ہم تو آپ کا کلام مبارک زبان سے سننے کی غرض سے آئے تھے۔ بہت دیر تک اپنا کلام سناتے رہے۔ پھر اصرار کیا کہ تم بھی کچھ سُناؤ۔ ہم نے یہ مطلع سنایا:

ہمہ عمرا ست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دارم

زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع کو دہرایا اور بڑے تعریف کی پھر آدمی سے کہا "کھانا لاؤ۔" ہم سمجھے یہ بہ خیال مہمان نوازی تکلیف کر رہے ہیں۔ لکھ دیا کہ ہم صرف تھوڑی دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت بالکل قریب ہے اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے، اسباب بندھا ہوا رکھا ہے۔ یہاں صرف آپ سے ملنے آئے تھے، اب اجازت چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہی تھی کہ میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف کی حالت دیکھی کہ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔ بلادت کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ سماعت کی کیفیت ملاحظہ کی کہ کوئی کتنا چیخے مجھ کو خبر نہیں ہوتی۔ غزل پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا، کلام سُنا۔ اب ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں۔ اس کو بھی ملاحظہ کرتے جایئے۔" اتنے میں کھانا آیا، دو پھلکے اور ایک طشتری میں بُھنا ہوا گوشت، جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا۔ پُھلکے کا باریک پرت لے کر، دو چار نوالے بمشکل کھائے اور کھانا بڑھا دیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مقدار غذا پر کیونکر بسر کرتے ہیں......[1]

"مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ سات سات دن میں اجابت ہوتی تھی۔ طشت چوکی پلنگ کے پاس ہی کسی قدر اوجھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت معلوم ہوتی تھی، تو پردہ ہو جاتا تھا۔ آپ بغیر استعانت کسی نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے کھسکتے ہوئے چوکی پر پہنچتے تھے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا، چوکی پر چڑھنا، چوکی پر دیر تک

---

[1] یہ حالات ہمیں خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی اعانت سے دستیاب ہوئے ہیں۔

بیٹھنا اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا ایک بڑی منزل طے کرنے کے برابر تھا۔"[1]

اس عالم میں بھی خطوط نویسی کا سلسلہ قائم تھا" جس روز انتقال ہوگا اس سے شاید ایک دن پہلے ...... نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوایا تھا۔ انہوں نے لوہارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر، جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا۔ میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا"[2] مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر وردِ زبان رہتا تھا۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

اس افسوسناک اور پُر صعب حالت کا اندازہ کیجیے اور پھر ان کا یہ شعر پڑھیے، تو عبرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے اور اس عالم بے بسی کے مصائب کا نقش دل پر گہرا جم جاتا ہے۔ اللہ اللہ! کس مایوسی اور ارمان کے ساتھ کہتے ہیں :

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد رکھیں گے کہ خدا رکھتے تھے

آخر ان مصیبتوں کے خاتمے کا وقت آ گیا اور ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اس جہان فانی سے رگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ غالب کی ولادت شب ہشتم ماہ رجب المرجب ۱۲۱۲ھ کو ہوئی تھی۔ اس حساب سے ۷۳ برس اور چار مہینے کی عمر پائی۔ حضرت سلطان نظام الدین قدس سرہٗ العزیز کی درگاہ میں مدفون ہوئے۔ "آہ غالب بمرد" مادۂ تاریخ وفات ہے۔

غالب ذاتی عادات و خصائل کے لحاظ سے ان تمام اوصاف کا دلپذیر مجموعہ تھے، جو ایک شریف اور وضعدار آدمی کی زندگی کا جزو لاینفک ہو سکتی ہیں۔ اخلاق، مروت، فراخدلی، انکسار، حفظ وضع، نیک مزاجی یہ صفات ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ ان تمام باتوں کے ساتھ وہ انتہا درجہ کے خود دار تھے۔ ان کی زندگی خواہ کیسی ہی گذری ہو، لیکن انہوں نے کسی سے دب کر بات نہیں کی۔ خاندانی عزت کو آخر وقت تک نباہا۔ وہ اپنے ملنے والوں سے ٹوٹ کر ملتے تھے۔ کسی کا تمردانہ برتاؤ گردن کو کبھی جھکا نہیں سکتا تھا۔ اپنی آن کو وہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے اور کبھی کوئی بات ایسی نہ کرتے تھے جس سے اُن کی وقعت میں کمی آنے کا احتمال ہو۔

سفر کلکتہ کے اثنا میں انہیں چند روز لکھنؤ بھی رہنا پڑا تھا۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ تھا۔ دربار و عوام بہت خاطر سے پیش آئے۔ روشن الدولہ سے بھی، جو نائب سلطنت تھے، ملاقات کی صورت نکل

[1] و [2] ملاحظہ ہو "یادگار غالب" ص ۹۹-۱۰۰

آئی تھی۔ لیکن محض اس وجہ سے عملاً ظہور پذیر نہ ہوئی کہ غالب نے اس کے متعلق یہ دو شرطیں پیش کی تھیں کہ :

(۱) نائب میری تعظیم دیں، اور (۲) میں نذر سے معاف رکھا جاؤں۔

اسی طرح دہلی کالج کی پروفیسری کا واقعہ ہے۔ کالج کے لئے ایک فارسی پروفیسر کی نئی جگہ قائم ہوئی تھی اور کسی قابل شخص کا انتخاب ہونا تھا۔ مسٹر ٹامسن، سکریٹری گورنمنٹ ہند، اس کام پر مامور تھے۔ انہوں نے غالب کو طلب کیا۔ یہ پالکی پر سوار ہو کر ان کی فرودگاہ پر پہنچے اور اس انتظار میں کھڑے رہے کہ صاحب سکریٹری اُن کی پیشوائی کریں گے۔ مسٹر ٹامسن کو جب یہ معلوم ہوا، تو وہ باہر آئے اور اُن سے کہا "جب آپ دربار گورنری میں تشریف لائیں گے تو آپ کا اُسی طرح استقبال کیا جائے گا لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس موقع پر وہ برتاؤ نہیں ہو سکتا۔" انہوں نے کہا کہ "گورنمنٹ کی ملازمت کا ارادہ اس لئے کیا ہے کہ اعزاز کچھ زیادہ ہو، نہ اس لئے کہ موجودہ اعزاز میں بھی فرق آئے۔" صاحب نے جواب دیا کہ "ہم قاعدے سے مجبور ہیں۔" غالب یہ کہکر چلے آئے کہ مجھ کو اس ملازمت سے معاف رکھا جائے۔"[1]

مروت کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے انکار کا لفظ اُن کی زبان سے نکلتا۔ جو شخص غزل بغرض اصلاح لاتا اسے کبھی مایوس نہ کرتے۔ آخر عمر میں بھی جبکہ آنکھوں سے بینائی بھی رخصت ہو چلی تھی خط و کتابت اور اصلاح کلام کا سلسلہ جاری تھا۔

دوستوں کے حفظ مراتب کا انہیں بہت خیال رہتا تھا اور چونکہ وہ بہت فراخ مشرب واقع ہوئے تھے، اس لئے ہر کس و ناکس سے بلا تفریق عقاید ملتے تھے۔ شاگردوں سے انہیں پدرانہ اُنسیت تھی۔ اہل وعیال کے حقوق کا بھی کماحقہ خیال رکھتے تھے۔

شراب نوشی کی مذموم عادت انہیں ضرور تھی۔ لیکن اس کے نقصانات کے وہ خود قائل تھے۔ اُن کے بعض خیالات میں الحاد کی جھلک، بادی النظر میں موجود ہے۔ لیکن وہ صوفی منش اور صاف دل شخص تھے۔ ظرافت کا مادّہ اُن میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اکثر اُن کے تمسخر و استہزا کو لوگ امر واقعی سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔

طبیعت میں آزادی اس قدر تھی کہ دہلی میں متواتر پچاس سال کے قریب قیام پذیر رہنے کے باوجود اپنا ذاتی مکان کوئی نہیں بنوایا۔ کرایہ کے مکانات لے کر رہا کرتے تھے۔

ظریف ایسے تھے کہ بمشکل کوئی بات ظرافت کی چاشنی سے خالی ہوتی تھی۔ انہیں شطرنج اور چوسر

[1] آب حیات صفحہ ۵۰۴

کھیلنے کی عادت تھی، اور کبھی کبھی بازی لگا کر کھیلتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوتوالِ شہر کو جو ان سے عداوت رکھتا تھا، بدلہ لینے کا موقع مل گیا اور انہیں ۳ ماہ تک قید میں رہنا پڑا۔ رہائی کے بعد میاں کالے صاحب[1] کے مکان میں رہتے تھے۔ یہ واقعہ مرزا غالب ایسے وضعدار آدمی کے لئے موت سے کم نہ تھا، اور اس کا ملال واقعی انہیں ایک عرصہ تک رہا۔ لیکن اس کے باوجود بھی فطری ظرافت بدستور قائم تھی۔ ایک صاحب نے آکر رہائی کی مبارک باد عرض کی۔ آپ نے فرمایا "کون بھڑوا قید سے چھوٹا ہے۔ پہلے گورے کی قید میں تھا" اب کالے کی قید میں ہوں۔"

مختصر یہ کہ عجیب خوبی کے آدمی تھے۔ ایسے پاک نفس لوگ روز بروز نہیں پیدا ہوتے۔ غالب کی موت سے جہاں ہندوستان کو ایک نامور شاعر کھونا پڑا، وہاں اُردو شاعری کو ایک بے غرض محسن اور حقیقی سرپرست سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اگر غالب کو کچھ چین، زندگی میں حاصل ہوا ہوتا اور چند روز باطمینان کٹے ہوتے، تو معلوم نہیں کہ اُن کی دماغی سحر آفرینیاں، اُردو ادب میں کن کن جواہر ریزوں کا اضافہ کرتیں۔ بیشک ایک طرف ہم بدنصیب ہیں اور دوسری طرف ہماری شاعری، جسے سہاگ ہی میں سوگ کے کپڑے زیب تن کرنے پڑے۔

غالب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ پورے طور پر کر سکتے ہیں جنہیں مبدء فیاض سے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کا معتد بہ حصہ ملا ہے۔ ایسے بابرکت نفوس میں فطرتی طریقے سے وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی کوششوں کو کار آمد اور ضروریات کے عین مطابق بنا سکتے ہیں۔ غالب کے زمانہ تک اردو شاعری ایک ڈھرے پر چلی آرہی تھی، اور اُس میں جدت کا پہلو تقریباً مفقود ہو چکا تھا۔ جو راگ صدیوں سے الاپے جا رہے تھے، انہیں سنتے سنتے سامعین کی بے لطفی بیزاری تک پہنچ چکی تھی۔ ایک ہی لقمہ تھا کہ ہزاروں منہ میں چبایا جا چکا تھا۔ اس میں وہ ذائقہ مطلق نہ باقی تھا جس سے دماغ اور روح کو کوئی مسرت پہنچ سکے۔ غالب کی دُور بین نظروں نے اس نقص کو شاید پہلے ہی دریافت کر لیا تھا اور انہیں عامیانہ طرزِ سخن کی تقلید کی زنجیر توڑ ڈالنے کی ضرورت ابتدا ہی میں محسوس ہو چکی تھی۔ اس لئے اُنہیں اپنے لئے ایک جداگانہ راستہ تلاش کرنا پڑا۔ پرانی لیک کا چھوڑنا کوئی آسان بات نہ تھی اور اس کام میں انہیں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ اُن کی معنی آفرین طبیعت اور ذہن رسا نے ان کے لئے بالآخر ایک ایسی شاہراہ پیدا کر دی، جسے مولانا حالی تو پرانے راستہ کے متوازی سمجھتے ہیں، لیکن ہم اپنی ناچیز رائے کے مطابق اسے صراطِ مستقیم خیال کرتے ہیں۔

اصلاح کے معنی، ہماری سمجھ کے مطابق یہ ہیں کہ کسی چیز کے نقائص و عیوب کو دُور کر کے اُس کی ضرورت

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۳۱۔ حضرت محمد نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب شیخ فرید الدین قدس سرہ کے پوتے تھے

کے مطابق خوبیوں کو جمع کر دیا جائے، اس کہ چیز کی اصلی ہیئت ہی نہ باقی رہے۔ آخر الذکر صورت اصلاح نہیں بلکہ ایجاد کہی جا سکتی ہے۔ ہم غالب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مصلح یا ریفارمر، اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قائم رکھنے کے ساتھ ہی اس میں وہ تغیرات پیدا کر دیے ہیں، جو کسی شے کی درستی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لابدی ہیں۔

غالب کو سب سے بڑی دقت جو اپنے مشن کی کامیابی میں پیش آئی ہوگی، وہ عوام الناس کی مخالفت ہوگی۔ لوگوں کا مذاق شروع سے بگڑا ہوا تھا اور وہ حسن و عشق کے ان سوقیانہ جذبات سے لذت پذیر ہونے کے عادی بنے ہوئے تھے جنہوں نے اردو شاعری کی بدنامی میں آج تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہماری رائے میں عاشقانہ شاعری بشرطیکہ طرز ادا اور مطالب میں اعتدال مد نظر رہے، کوئی بری چیز نہیں، بلکہ اس سے وہ سچی اور قدرتی کیفیتیں مترشح ہوتی ہیں، جن سے متاثر ہونے سے قلوب انسانی کو چارہ نہیں؛ لیکن شریفانہ طرز بیان کی جگہ جب بازاری زبان میں عشق و محبت کی تصویر کھینچی جاتی ہے، تو وہ نہایت ذلیل و مکروہ چیز ہو جاتی ہے۔ مثنوی مولانا روم میں آپ عشق کی موثر شبیہ دیکھ کر ذرا جان صاحب کے دیوان پر نظر ڈالئے تو پاک جذبات اور ناپاک ترین خواہشات کا فرق بین دریافت ہو سکتا ہے، نیز موخر الذکر سے ہمارے خیالات کی پستی اور ہماری معاشرتی خرابی کا صحیح اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

غالب نے جب آنکھ کھول کر دیکھا ہوگا تو انہیں اپنا ہم خیال شاید ہی کوئی نظر آیا ہو۔ اور پھر جب بے یار و مددگار انہوں نے اپنا کام شروع کیا ہوگا تو نہ معلوم کس کس قسم کی مخالفت کے طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ بعض تذکروں میں اب تک ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریقے سے غالب کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کی فکریں کی ہیں۔ لیکن مشاہیر کا خاصہ طبیعت ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادہ میں سد راہ نہیں سمجھتے اور جس بات کو وہ غور و فکر کے بعد اچھا سمجھ لیتے ہیں۔ اس کی دھن سے پھر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ غالب بھی دھن کے پکے تھے، ورنہ ان کی کوششیں عام مذاق کی خرابی کا انسداد بدقت کر سکتیں۔ بہر کیف غالب کامیاب رہے اور عزم و استقلال کے ہاتھوں انہوں نے تاریخ اردو میں عظمت و شہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ اپنی ضوفشانی سے ان کا نام چمکاتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کو ان کے زریں کاموں سے باخبر کرتے رہیں گے۔ کامیابی کی یہ مثالیں اور اولوالعزمی کی یہ نظیریں صرف انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن کو قدرت کی طرف سے اعلیٰ اوصاف دماغی و ذہنی ودیعت کیے جاتے ہیں اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کے دماغ و ذہن میں بھی فطرتاً وہ باتیں موجود تھیں جن کے بغیر انسان کے لئے مقصد کی

کی منزل پر پہنچنا مشکل اور امر محال ہوتا ہے۔

جب ہم غالب کی ابتدائی اور بے اصول تعلیم کا خیال کرتے ہیں اور پھر اُن کی طبع رسا کی جودت اور فکرِ عالی کی رفعت کا اندازہ کرتے ہیں، تو کامل یقین ہو جاتا ہے کہ بلاشبہ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے۔ "گیارہ برس کی عمر ہی سے وہ شعر کہنے لگے تھے اور اس کا اعتراف اس نامور شاعر نے، خود اپنے فارسی دیوان کے خاتمہ پر کیا ہے۔ بلکہ اگر غالب کے ایک ہم عمر لالہ کنہیا لال صاحب کے بیان پر اعتماد کیا جائے، تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کا سلسلہ آٹھ نو برس کی عمر ہی سے شروع ہو گیا تھا، جبکہ غالب نے ایک مثنوی "پتنگ بازی" کے متعلق لکھی تھی، اور اُسے اس شعر پر ختم کیا تھا:۔

رشتہ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

غالب کے بچپن میں تعلیم کا جو معیار مقرر تھا وہ آج کل رائج نہیں۔ وہ خواہ مکمل رہا ہو یا نہیں، لیکن اس کے کارآمد و مفید ہونے میں شک نہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو قدیم طریقے کی پابندی کے باوجود بھی عربی کی تعلیم نہیں دلائی گئی۔ صرف و نحو کی معمولی ابتدائی کتابیں البتہ نظر سے گزر گئی تھیں۔ فارسی تعلیم خواہ کسی درجہ تک ہوئی ہو، لیکن اس میں کلام نہیں کہ غالب کی فارسی زبان کی لیاقت اجتہادی رُتبہ کی تھی اور ہندوستان میں فارسی کا ماہر لسان امیر خسرو اور فیضی کے بعد غالب کے پایہ کا شاید ہی نظر آئے۔ فارسی النسل ہونے کی وجہ سے انہیں اس کا اکتساب یوں بھی آسان تھا لیکن حسن اتفاق سے انہیں اُستاد بھی ایک پارسی نژاد ملا جس کی تاثیرِ تربیت نے غالب کو کچھ کا کچھ کر دیا۔ انہیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اس کا ایک شمہ ان کے فارسی کلام سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زباندانی، وغیرہ امور کے لحاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جا سکتے ہیں، اور اسی دستگاہ کی جھلک اُن کے اُردو کلام میں بھی موجود ہے خصوصاً اُن کا ابتدائی اُردو کلام، جسے دیکھ کر اکثر مخالفین نے مہمل کہدینے میں بھی تامل نہیں کیا۔

غالب کا مروجہ دیوان ریختہ اصلاح شدہ حالت میں ہے۔ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی کی رائے سے اس میں سے ادق اور بعید از فہم اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں۔ اس وجہ سے اُن کے وہ اشعار اس میں شاذ و نادر ملتے ہیں، جنہیں ظریف طبع اشخاص بے معنی خیال کرتے تھے۔ تاہم نمونۃً دو چار شعر موجود ہیں، جو دقت پسندی کا بجائے خود کامل ثبوت ہیں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یک قدم وحشت سے دریِ دفترِ امکاں کھلا — جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے — یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

پہلا شعر جو اردو دیوان کا سر مطلع بھی ہے، معنی کے اعتبار سے علمی حلقوں میں آج تک مابہ النزاع ہے۔

اسی قسم کے ادبی کلام کو دیکھ کر کسی نے یہ طعن آمیز شعر کہا ہے:

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں، یا خدا سمجھے

مخالفوں کے طعن و تشنیع کا جواب اگرچہ غالب نے اس شعر میں نہایت خوبی سے دیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اہلِ کمال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس استغنا کے باوجود بھی انہیں اپنی روش کی اصلاح کرنی پڑی؛ کسی مجبوری سے نہیں، بلکہ بطیبِ خاطر۔ چنانچہ درمیانی عمر کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقیل الفاظ کی کثرت اور مطلب کی پیچیدگی تقریباً مفقود ہو گئی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور محاورات چونکہ زبان پر چڑھے ہوئے تھے، اس لئے ان کا ترک یکایک فی الجملہ دشوار تھا۔ لیکن اس باب میں جب وہ اعتدال سے کام لے کر کچھ کہتے ہیں، تو نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے اور جب یہ ترکیبیں اضافاتِ مسلسل کے ساتھ آتی ہیں، تو عجب مزیدار چیز ہو جاتی ہیں۔ سادہ و پُر کار یہ رنگ خاص غالب کا ہے۔ اور اگرچہ اس زمانہ میں اُس کے مقلد کئی پیدا ہو گئے ہیں، لیکن اس کی نظیر ازمنۂ گذشتہ میں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں:

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے — دلِ بیدست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق — ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد — کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں — پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

حسرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ — عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا   لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

نظر بندی کے مضامین سے، جو زیادہ تر فارسی کے مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کی تقلید کا نتیجہ ہیں، اگر قطع نظر کر کے دیکھیے، تو ان کے دیوان کے صفحے ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں، جو طرزِ بیان، اسلوب بندش، صفائی مضمون، اور پاکیزگی خیال کا بہترین مرقع ہیں۔ اس قسم کے اشعار سے اُن کی طبیعت کا اصلی رنگ معلوم ہوتا ہے اور آمد کی شان ظاہر ہوتی ہے:

ہم رشک کو بھی اپنے گوارا نہیں کرتے   مرتے ہیں، ولے، اُس کی تمنا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے   غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہیے   ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہیے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے   قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

مرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی   لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
وائے، واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا   لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے   حورانِ خُلد میں تری صورت مگر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں   خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اسکی ہیں   تیری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہوگئیں
واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب   یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

تصوف کا رنگ، جو مشرقی شاعری کا جزوِ اعظم ہے، غالب کے کلام میں بھی بہت چوکھا ہے۔ مذہبی حیثیت سے چونکہ وہ بہت وسیع نظر رکھتے تھے اور خود اپنے ہی بیان کے اعتبار سے موحد بھی تھے اس لئے اس میدان میں بھی ان کا سمندِ فکر کوسوں دور نکل جاتا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا   ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے   بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا   یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

صفائی زبان پر رجحان پیدا کرنے کے بعد سلاست پسندی کا ملکہ بھی بڑھتا گیا۔ بعض بعض غزلیں ایسی صاف و شستہ زبان میں کہی گئی ہیں کہ باید و شاید۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ کمال ہر چیز کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ سارے اردو شعرا میں سادہ گوئی کی مثال میر کے کلام سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی، لیکن اُن کے بعد غالب کا نمبر ہے۔ اور سلاستِ زبان و روانیِ مطالب کے ساتھ اگر ان کی نازک خیالی کو بھی شریک کر لیا جائے تو میر سے غالب کی درجہ بڑھ جاتے ہیں۔ دیکھئے کس انداز سے فرماتے ہیں، اور کلام کے ربط و تسلسل میں سرِ مو فرق نہیں آتا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہیں کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا، گلہ نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے، لیکن خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غمہائے نہانی اور ہے
دیکے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ — دیکھ خونابہ فشانی میری

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے — یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے
محو عمر سنے یہ جو جینے کی امید — نا اُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

بعض غزلوں میں قطعہ بند کی صورت پیدا ہو گئی ہے، اور وہ مجموعی حیثیت سے دلکشی و دلفریبی میں بجائے خود، عدیم النظیر ہیں۔ پاکیزگی خیالات اور طرزِ بیان کی خوبی نے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اِس قبیل کی غزلیں اردو میں رائج نہیں اور غالب کے دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہیں۔ ایک غزل مسلسل ہے:

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا! کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اسی طرح ایک دوسری غزل:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق — سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اس کو حسنِ عقیدت کہو یا امرِ واقعی، کلامِ غالب کے مطالعہ سے دماغ اور روح کو تقویت اور مسرت کا سامان بہم پہنچتا ہے اور اس کا صحیح اندازہ کسی انتخاب سے نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ غالب ایسا قادر الکلام اور

رنگیں بیان شاعر، جو مجز نگاری میں بھی فرد ہو، ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور گو غالب کے پیشروؤں اور ہمعصروں میں بہت سے مشاہیر بعض بعض خصوصیات میں اُن سے کسی طرح کم نہ تھے، لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کا کوئی مدمقابل آج تک نہیں ہو سکا۔

ذوق مرحوم بھی اساتذۂ اُردو میں بہت جلیل القدر سمجھے جاتے ہیں اور وہ غالب کے ہمعصر بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا اُستاد ہونے کی حیثیت سے، بظاہر، اُن کی عزت اور وقعت غالب سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ ذوق کے پختہ کار اور نازک خیال شاعر ہونے میں شبہ نہیں، لیکن غالب کو وہ کسی طرح نہیں پہنچے۔ انہوں نے جو سہرا غالب کے سہرے کے جواب میں، بایماے بہادر شاہ، لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ہے، لیکن انصاف پسند طبیعتیں اُسے غالب کے سہرے پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتیں۔ اسی طرح غالب اور ذوق کی اکثر غزلیں ہم طرح ہیں اور ان کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ہو سکتا ہے۔ ذوق کا مطلع ہے:

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے — ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

شعر بہت اچھا ہے، لیکن اسی قافیہ اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالب نے نہایت نازک کہا ہے:

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ذوق: نہ دل رہا نہ جگر، دونوں جل کے خاک ہوئے — رہا ہے سینہ میں کیا چشم خوں فشاں کے لئے

غالب: بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

غالب کے شعر میں ایک قسم کی جدت ہے اور ذوق نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ہے۔

لکھنؤ کے اُستادوں میں آتش کا مرتبہ بہت بلند ہے اور صفائی کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ہمعصر ناسخ سے بہت آگے ہیں، لیکن غالب کی بات اُن میں بھی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ غالب چونکہ عامیانہ تقلید سے قطعی متنفر تھے، اس لئے اُن کا ہر شعر جدت کا پہلو لئے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ آتش کہتے ہیں:

جب اشتیاق لکھا ہے خونخوار یار کو — قاصد کا گشتہ آیا ہے خط کے جواب میں

اگرچہ اشتیاق کی تعریف خونخوار زیادہ موزوں نہیں، تاہم شعر صاف ہے، لیکن غالب نے "جواب" کا قافیہ نرالا باندھا ہے۔ لکھتے ہیں:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے باوجود کس قدر بلیغ ہے۔ محبوب کی مزاج شناسی کی تمثیل اس سے زیادہ دلچسپ ہو نہیں سکتی۔ اس زمین میں غالب نے دو غزلہ کہا ہے اور بعض قافیے تو نہایت ندرت کے ساتھ نظم کیے ہیں دیکھیے:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

میں اور حظِ وصل! خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار معقول تعداد میں نکل سکتے ہیں۔ جو بلاغت اور وسعتِ معنی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں۔ انصاف پسند صائب نے غنی کشمیری کا یہ شعر:

سبز خطے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہم رنگِ زمیں بود گرفتار شدیم

سن کر اپنا سارا کلام اس کے عوض میں دے دینا منظور کیا تھا اسی طرح حقیقت بیں شعرا کے لئے اپنے دیوان کے دیوان غالب کے ایک ایک شعر پر نثار کر دینا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ دو چار شعر ہم یہاں اس قبیل کے لکھتے ہیں جن سے مصنف کے ذہن کی بلندی اور طبیعت کا معنوی عمق معلوم ہو جائے گا۔

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے — تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

شاذ و نادر مثالیں غالب کے کلام میں ایسی مل سکتی ہیں، جو مذاقِ سلیم کے خلاف ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

پینس میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے
دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

لیکن شکر ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان کا کلام بداخلاقی کے الزام سے بری ہے۔

غالب کا اُردو کلام بہت مختصر ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا تھا، اور نظری اشعار خارج کر دینے کے بعد جو قائم رہا، اُس میں بھی عجیب تفرقہ پڑا ہے۔ اب بھی اکثر اُن کا غیر مطبوعہ کلام کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مقامات کے قدیمی کتب خانوں میں دیوان غالب کے ایسے نسخے موجود ہیں، جن میں سے اکثر خود مصنف کی نظر سے گذر چکے ہیں، مروجہ دیوان سے جب ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے، تو اوّل الذکر میں کلام کا ایک حصہ بالکل موجود نہیں۔ عرصہ ہوا رسالہ مخزن میں ایک نظم "طائرِ دل" کے عنوان سے نکلی تھی، جو حسب ذیل ہے:

تھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں — پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا، دل بیاباں سے
نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ — ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماجرا کیا ہے — پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا — تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں — پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے
اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو — نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جب دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے

میجر سید حسن بلگرامی کو یہ قطعہ اُن کے والد بزرگوار سے پہنچا ہے اور موخر الذکر کے بیان کے مطابق اس کے مصنف غالب دہلوی ہیں۔ میجر صاحب اور ان کے والد ماجد کے بیان کی تردید ہمیں منظور نہیں، لیکن غالب کا قدرتی رنگ

اس میں مطلق نظر نہیں آتا اور اس لحاظ سے بھی اس کے غالب کی تصنیف ہونے میں ضرور کلام ہے۔

شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کو غالب کی اور بھی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں دستیاب ہو چکی ہیں۔ اسی طرح اگر کوشش کی جائے، تو شاید کچھ اور کلام بھی فراہم ہو سکے اور اس کے بعد غالب کا دیوان مکمل صورت میں شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ سکتا ہے۔

غزلوں کے علاوہ قصاید اردو بھی غالب کی یادگار ہیں لیکن ان پر بسیط بحث کی ضرورت نہیں۔ ان کے فارسی کے قصاید بےشک قاآنی کے قصیدوں سے کسی طرح کم نہیں سمجھے جا سکتے۔ لیکن اردو میں ان کے قصیدے ایسے نہیں جو سودا اور ذوق کے مقابلہ میں لائے جا سکیں۔ تاہم اس کا انصافاً اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس صنف میں بھی انہوں نے جو کچھ کہا، اپنے رنگ میں بے مثل کہا ہے اور بعض مقامات پر تو اپنی سحرگوئی کا پورا پورا ثبوت دیا ہے۔ ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

ہاں مہِ نو ہنیں ہے اُس کا نام　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

اس قصیدے نے مولوی علی حیدر صاحب طباطبائی ایسے نقادِ سخن سے بھی، جنہوں نے "شرح دیوان غالب" میں نہایت بیباکی سے اُن کے عیوب شاعری کو ظاہر کرنے میں تامل نہیں کیا، اس کا اقرار کرا لیا ہے کہ تخیل کی جدت اور مضامین کی تازگی کے اعتبار سے یہ بے مثل چیز ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ غالب جو کچھ کہتے تھے، سب سے جدا کہتے تھے اور اس التزام کو انہوں نے اپنے مدحیہ قصاید میں بھی بہت خوبی سے ملحوظ رکھا ہے۔ دیکھیے ممدوح کی توصیف کا پہلو کتنا پیارا اور خیالات کس قدر نادر ہیں:

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہرِ ذوالجلالِ والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف　　نوبہارِ حدیقۂ اسلام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ　　وحش اللہ عارفانہ کلام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے　　ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے　　گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا! موشگافیِ ناوک　　آفریں! آبداریِ صمصام

ایک دوسرے قصیدے میں بھی مدحیہ مضامین کے نظم کرنے میں قوتِ متخیلہ کی حدیں کھینچ دی ہیں:

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب علوِّ پایۂ ممبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا

غزلیات و قصاید کے علاوہ بہت سے قطعات و رباعیات دیوان ریختہ کا ایک جزو ہیں اور ان کے دیکھنے سے بھی غالب کی طباعی اور بذلہ سنجی کا تہ دل سے معترف ہونا پڑتا ہے۔

غزل گوئی کی ایک جدید روش نکالنے کا سہرا غالب کے سر ہے اور اسی کے ساتھ نثر اُردو بھی اُن کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ انگریزی طرز کے صاف و سادہ خطوط کی ابتدا، اُردو میں، غالب سے ہوئی ہے اور انہیں کی تقلید کے تصدق میں آج اُردو نثر اس قدر صاف اور سُلجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ قلم برداشتہ اور رواں انشاپردازی کا لطف اگر اٹھانا ہے، تو ان کے رقعات کے دو مجموعوں 'عود ہندی' اور 'اُردوئے معلی' کا مطالعہ کرو۔ اس سے نہ صرف تمہیں ان کے قلم کا زور معلوم ہوگا، بلکہ ان کی زندگی کی تصویر بھی ہو بہو نظر آئے گی۔ ہم اس جگہ ایک خط کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے مجموعی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"...... یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا کیا ذکر؟ کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب! ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا...... ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، دوسرا بھوگ سُنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت! نواب صاحب! نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو: بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام، قرض لیے جاتا ہے؛ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا......"

اسی طرح اور خطوط میں بھی اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں سے مزے لے لیکر باتیں کرتے ہیں کہ سننے والوں کو بھی مزا آجاتا ہے۔

غالب نے اُردو نظم و نثر پر جو احسانات کئے ہیں اُن سے اہل یورپ کو روشناس کرانے کی اشد ضرورت تھی، خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ وہاں مشرقی علوم کے ساتھ خصوصیت سے اعتنا ظاہر کیا جارہا ہے۔ ہمیں مسٹر صلاح الدین خدا بخش ایم اے، بی سی ایل کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انہوں نے انگریزی میں ایک کتاب غالب کے متعلق شائع کرکے ایک بڑی علمی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ولایت میں چھپی ہے اور اس میں غالب کی اُردو فارسی شاعری پر مبسوط بحث کے علاوہ اُن کے سوانح کا بھی ذکر نہایت دلچسپی کی چیز ہے۔

غالب کی شاعری کی کیفیت اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی۔ تاوقتیکہ اُن کے فارسی کلام کی عظمت و شان کے چہرے سے پردہ نہ ہٹایا جائے۔ اس کے علاوہ ان کے سفر کلکتہ کی دلچسپ کیفیت، برہان و قاطع برہان کے قضیہ کی طوالت، اور اُن تمام علمی مذاکروں اور مباحثوں کے افسوس ناک نتائج پر بھی بحث کرنا ضروری تھا، لیکن یہ تمام باتیں ہمارے دائرۂ تنقید سے باہر ہیں، اور اس لئے ہمیں ان امور پر قلم اٹھانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

— پیارے لال شاکر (جلائی و اگست ۱۹۱۲ء)

مزار غالب اُردو لٹریچر کو جس قدر ترقی غالب مرحوم کی بدولت ہوئی ہے وہ شاید کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوئی ہوگی۔ زمانۂ حال میں جو سلاست نویسی اور خیال بندی کا رنگ انشاپردازی کا خاص جزو معلوم ہوتا ہے، یہ فیضان غالب کے سوا کسی اور سے ممکن ہی نہیں۔ مرزا نوشہ کا جو احسان اردو زبان پر ہے، اس کو نہ صرف دلّی کا اکول آف لٹریچر تسلیم کرتا ہے، بلکہ لکھنؤ، اور لکھنؤ کا بھی خاص شیش محل۔ وہی غالب جس نے بلند پردازی اور رفعِ خیالی کے ساتھ روزمرہ اور محاورہ بندی میں ایسا نام پایا کہ سند الوقت رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب آشوب، شمس العلماء حالی، مرزا مجروح، مرزا تفتہ وغیرہ نے خاقانیٔ ہند استاد شاہ حضرت ذوق کی شاگردی کے بجائے اُسی کے آگے زانوے ادب تہ کرنا مایۂ ناز سمجھا۔ ہائے! اسی غالب کا مزار اب ایسی کس مپرسی کی حالت میں ہو کہ اُسے دیکھ کر غیر ملک کے رہنے والوں کو حسرت ہوتی ہے، چنانچہ پایونیر کے ایک نامہ نگار ڈاکٹر مارٹن نے ایک مراسلہ میں لکھا تھا:

"اب کے جو میرا دہلی جانا ہوا تو شاہ نظام الدین اولیاء کے احاطہ کے باہر ایک خادم نے مجھے ایک قبر دکھائی، پھر اس کے پاس سے جاکر کہنے لگا کہ یہ غالب کی قبر ہے۔ (آہ! وہی غالب جس کا یہ شعر ہے

غالبؔ نام آورم نام و نشانم مپرس ؎ ہم اسد اللہ ام و ہم اسد اللہیم)

ٹوٹی ہوئی قبر جس کے سرہانے سنگ مرمر پر کتبہ اور اس کی بھی وہ حالت کہ عیاذاً باللہ یہی معلوم دیتا تھا کہ وہ ایک برساتوں کے بعد یہ بھی قبر کے ساتھ مل کے تہ خاک ہو جائے گا، اور اس کے ساتھ زبان اُردو کا ایک سر بلند عَلَم سرنگوں ہو کر مٹی میں ایسا مل جائے گا کہ اس کا نشان تک نظر نہ آئے گا، تو کیا مجھے اس امر کا حق ہے کہ کلام غالب کے دلدادگان پر استغاثہ کروں ؟ مورخ، مصنف، شاعر، جس قوم میں ہوں، وہ اس قوم کے بیش بہا جواہر ہوتے ہیں۔ یہ مال ضائع نہیں کرتے بلکہ جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی قبریں نہیں بلکہ بیش قیمت خزانوں کے دفینے ہیں۔ ان تبرکات کی کچھ قیمت نہیں، یہ انمول رتن ہیں۔ ان مقدس تربتوں کو برباد ہونے دینا گناہ ہے اور گناہ کے ساتھ وہ تقصیر جو آنے والی نسلیں کبھی بھی معاف نہ کریں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ تربت برباد نہ ہونے پائے۔ میری یہ تمنا ہے کہ یہ مرقد باقی رہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ یہ ڈھیر قائم رہے۔ اس لئے میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو ایک ایک روپیہ کا عام چندہ ہو، اور پھر دو تین ہزار میں ایک مضبوط چھوٹی سی عمارت بنا کر مرنے والے کا زندہ نشان قائم کیا جائے۔"

مندرجہ بالا سطور کو ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ایک یورپین ڈاکٹر کے الفاظ ہیں، جو ٹیس کھائے ہوئے دل پر نیز و نشتر کا کام کرتے ہیں، وہ غالبؔ کو قوم کا بیش قیمت مال بتاتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ اس قبر کو برباد ہونے دینا ایسا گناہ اور تقصیر ہے کہ آنیوالی نسلیں اس کو معاف نہ کریں گی۔ اس کے یہی معنی ہیں کہ آئندہ نسلیں اس مقدس تربت کو ترکہ میں پانے والی ہیں۔ اس ترکہ میں اسراف کرنے کا موجودہ نسلوں کو کوئی حق نہیں۔ یہ امانت ہے، اور امانت بھی ایسی جو ایک نسل سے دوسری نسل کو پہنچنی چاہیے۔ آنے والی نسلیں جب غالبؔ مرحوم کے مزار کی جستجو کریں گی اور اس کا پتہ یا نشان پانے کے لئے اس قسم کی تکلیف کا سامنا ہوا، جو آج کل کے ماہران علم آثار الصنادید کو تابوت سکینہ کے دریافت کرنے میں ہوئی، تو کیا کہیں گی ؟ یاد رکھو، کہ یہ جرم نہ معافی کے قابل ہوگا، نہ ضمانت کے لائق۔ آہ! مرنے والے نے اپنی زندگی ہی میں کہہ دیا تھا :

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا ؎ نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

وہ دن ابھی دور ہے کہ ہمارے ہندوستان میں کوئی غالب کلب یا غالب ہال قائم کیا جائے، مگر کیا ہم اس درجہ پست ہمت اور ایسی نمایاں ملی غفلت میں مبتلا رہیں گے کہ غالبؔ ایسے زندۂ جاوید شاعر کی مٹی

مثالی قبر کو بربادی سے نہ بچائیں اور اس کے بیش بہا نشان کو ابدالآباد تک قائم رکھنے میں دریغ نہ کریں۔ افسوس:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ　　تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

غالب مرحوم کا زیادہ ترحق باقیات الصالحات نوابانِ لوہارو، شمس العلماء حالی، بابو امانشنکر صاحب مصنف آئینہ اسکندری اور رلالہ سری رام صاحب ایم اے وغیرہ بزرگانِ دہلی پر ہے۔ اگر وہ خاموش ہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ "ادیب" کے اجراء کا سب سے بڑا مقصد ملک میں لٹریری مذاق پیدا کرنا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہماری کوشش سے غالب کی قبر بربادی سے بچ جائے تو یہ ہماری سب سے اعلیٰ خدمت ہوگی۔ لہٰذا ہم اس مہینے سے غالب میموریل فنڈ (چندہ یادگارِ غالب) کھولتے ہیں اور شیدایانِ کلام غالب سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس مفید تحریک میں حصہ لیں۔ اور اپنے احباب کو بھی اس طرح رجوع کریں۔ جو کچھ بھی ارسال ہوگا، شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا، ہاں! یہ بتا دینا بھی ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ "غالب میموریل فنڈ" میں جو روپیہ فراہم ہوگا، اس کا بیجا استعمال نہ کیا جائے گا۔ کامریڈ کے قابل ایڈیٹر مسٹر محمد علی بی اے تخمینۂ اخراجات تیار کر رہے ہیں اور انہوں نے بھی اپنے اخبار میں فنڈ کھولا ہے۔ کافی روپیہ فراہم ہونے پر ایک مستقل یادگاری روضہ تعمیر کیا جائے گا۔ ممکن ہے کہ روپیہ کی فراہمی تک جناب مولوی حسن نظامی صاحب بلادِ اسلامیہ کی سیاحت سے واپس آجائیں اور روضۂ غالب کی تعمیر انہیں کی نگرانی میں ہو۔

آخر میں اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ جب یہ روضہ تیار ہو جائے گا، تو موجودہ زمانے کے دلدادگانِ کلام غالب کے سر سے بڑا بھاری بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کیونکہ غالب مرحوم کے حل طلب اشعار کو حضرت استادی مولانا شوکت مدظلہم اور مولانا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی لکھنوی نے اپنے اپنے "حل کلیات غالب" میں صاف کر دیا ہے جس سے اُردو لٹریچر پر بڑا بھاری احسان ہوا ہے۔ تیسری بات جس سے زمانۂ حال میں یادگارِ غالب قائم رہ سکتی ہے وہ دیوان غالب کے نہایت ہی خوش خط اور اعلیٰ قسم کے کاغذ پر چھپنے سے پوری ہوگی۔ ممکن ہوا تو ادیب ہی اس کمی کو پورا کرے گا۔ اور جس طرح زمانۂ حال میں شکسپیر، ملٹن، اور دیگر صدر نشینانِ انجمن علم و ادب انگریزی کی تصانیف اُردو پیرایہ میں انگلستان سے نکلتی ہیں۔ یا مولوی محمد رحمت اللہ صاحب رعد کے ہاں سے "دیوانِ حافظ" اور "مسدس حالی" وغیرہ شائع ہوئے ہیں۔ اسی طرح نئے پیرایہ میں کلیاتِ غالب مع تصویر و ضمیمہ سوانح عمری مصنف بھی شائع کی جائے۔

ایڈیٹر (اگست ۱۹۱۲ء)

شیکسپیرِ ہند نظیرؔ اکبر آبادی

گزشتہ نمبر میں "بسنت رُت" پر بحث کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ "ہندوستان کے شیکسپیر شیخ ولی محمد نظیر اکبر آبادی نے اُردو میں سب سے پہلے بسنت پر نظمیں لکھیں" اس پر ایک روشن خیال قدردانِ سخن نے تحریر فرمایا ہے کہ "میں حضرت نظیر کے کلام کی جو چاہ رکھتا ہوں اور ان کے کلام سے جو حظ مجھے نصیب ہوتا ہے شاید ہی کوئی حاصل کرتا ہو۔ مگر اس بات کے لئے میں ضرور کہوں گا کہ وہ ہندوستان کے شیکسپیر نہیں تھے اور ہو بھی کیسے سکتے ہیں جب انہوں نے ایک عدد ڈراما[1] بھی تحریر نہیں فرمایا ہے۔ شیکسپیر تو ہمیشہ سے ڈراما نویس مشہور ہے۔ وہ کبھی بطور شاعر کے مشہور ہی نہیں ہوا۔ پھر بھلا اُس کو ایک شاعر کے ساتھ کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ استاد نظیر ضرور اپنے وقت کے پوئٹ لارئیٹ[2] تھے اور اس میں کلام بھی نہیں۔ بس اگر آپ کے خاطر پر بار نہ گزرے تو اس پر ذرا روشنی ڈالیں اور اگر میں غلطی پر ہوں تو مجھے درست کر دیں۔"

بار خاطر کیسا۔ ہمیں تو اس کی مسرت ہے کہ ہماری زبان کے خوش خیال حامی ایسی بحثوں کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ بہرحال اس نکتہ کے جواب کی اجمالی صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم وہ سندات گنوا دیں جن کی بنا پر نظیر کو شیکسپیرِ ہند مانا جا چکا ہے اور تفصیلی صورت یہ ہوگی کہ آپ کی ایک ایک بات کا ہم جواب دیں۔ دونوں صورتیں اپنی اپنی حیثیت سے ناگزیر ہیں اور خوفِ طوالت مزید براں۔ چونکہ آپ کے سوال میں ایک خاص اہمیت ہے اس لئے آخرالذکر طریقہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہوگا اور وقت بھی غالباً آ گیا ہے کہ نظیر کے شیکسپیرِ ہند ہونے کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے۔ موقع موقع سے اس موضوع پر ہم اُس وقت تک کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے رہیں گے جب تک کہ آپ کو پورا اطمینان نہ ہو جائے۔

آپ فرماتے ہیں کہ "نظیر ہندوستان کے شیکسپیر نہیں تھے"۔ قاعدہ کلیہ کے اعتبار سے نظیر کی زندگی میں اُن کی ہرگز قدر نہ ہوئی۔ جس کے جی میں آیا ایک نئی رائے قائم کرتا گیا۔ یہاں تک کہ مرثیہ گو تک کا خطاب دینے سے لوگ باز نہ آئے اور ایسے باکمالوں نے یہ خطاب گڑھا جو سخن فہم اور ہمہ داں کہے جاتے ہیں۔ لیکن

---

[1] ناٹک Drama   [2] ملک الشعرا Poet laureate

جوں جوں تعصب دور ہوتا گیا رنگ بدلنے لگا۔ جہاں نظیر کے اشعار بارگاہ شاعری سے مردود کر دیے گئے تھے، وہاں اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ فیصلہ مسترد کیا گیا اور نظر ثانی کی بدولت آخر نظیر ایسے اُستاد وقت بھی مانے گئے کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کے کلام کو ترجمہ قرآن میں جگہ دی۔ کسی نے لغات میں ان کے اشعار بطور سند بھی لائے۔ نصاب اُردو میں بھی ان کے کلام بار یاب ہوئے۔ جب ایشیائی شاعری کو یورپ کی شاعری سے متحد کرنے کا دور آیا تو وسعت معلومات اور تحقیقات کے ذریعہ سے یہی ثابت ہوا کہ سب سے بیشتر میاں نظیر اُردو شاعری کو یورپ کے راستہ پر لے آئے ہیں۔ ہوتے ہوتے ایک زمانہ[1] ایسا بھی آیا جبکہ یورپیوں نے اس بحث کو چھیڑا کہ "اُردو کے شاعروں میں شیکسپیر کا ہم پلّہ بھی کوئی ہے؟" جواب ملا کہ "ہماری زبان میں ڈراما کا رواج نہ تھا اس واسطے واقع میں تو کوئی بھی شیکسپیر کے مقابلہ میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا" لیکن باعتبار قوت کسی نے سودا[2] کو نامزد کیا۔ اور کسی نے میر کو۔ مگر سودا میں صرف کامیڈی[3] (ڈراما جس کا خاتمہ مسرت انگیز ہو) کا مادہ پایا گیا۔ اور میر صاحب سراسر ٹریجڈی[4] (ڈراما جس کا نتیجہ پُرحسرت ہو) نگار قرار دیے گئے۔ ان دونوں خوبیوں کا مجموعہ کسی نے انشا کو بتایا اور شیکسپیر کی ہمسری کے لئے کھڑا کر دیا واقعی انشا میں اخذ زبان کا مادّہ قدرت نے بہت کچھ ودیعت رکھا تھا۔ لیکن اس سے مستفید ہو کر اردو کو فیضیاب کرنے کی جگہ سارا زور انہوں نے نواب سعادت علی خاں کے لئے دل خوش کُن لطائف و ظرائف ترتیب دینے میں صرف کر دیا۔ جس کی تفصیل کے لئے آبحیات کافی ہے۔

یہ سچ ہے کہ ڈرامہ نویسی میں اخذ زبان کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور نظیر نے اپنی ایک نظم میں سات زبانوں کے نمونے دکھا دیے ہیں۔ لیکن ڈراما میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ انسان کے اخلاق و اطوار ٹھیک ٹھیک دکھا دیے جائیں اور جس کو مختلف طبائع انسانی کا زیادہ علم ہو گا وہی اُن اشخاص کی بہترین تصویر بھی کھینچ سکتا ہے۔ نظیر کو اپنی زبان کے جیسے نکات معلوم تھے اور جیسی موزونیت سے اُس نے ان کو استعمال کیا ہے شیکسپیر نے بھی اپنی زبان میں شاید اس سے سوا نہ کیا ہو گا۔ آزادوں کے لہجے اس سے سُن لو، جوگیوں کے اصطلاحات یہ بتاتا ہے۔ اپنے ملک کی دوسری اقوام کے جذبات و خیالات اور عادات و اخلاق کی جیسی تصویر اس نے کھینچی ہے اب تک تو کسی نے اس تصرف سے کام نہ لیا۔

---

[1] اب سے تقریباً ۴۰ سال بیشتر کا یہ واقعہ ہے۔ [2] شمس العلماء نواب حکیم سید امداد امام خان بہادر اثر نے ان کو نامزد کیا تھا [3] comedy طرب انگیز ناٹک [4] Tragedy حسرتناک ناٹک

گنواریوں کے روزمرے کی صفائی دکھانے کی بدولت غریب پر گنوار کا الزام لگایا گیا۔" نظیر کے خیالات اور تجربوں کا ذخیرہ کسی طرح شکسپیر سے کم نہ تھا۔ ظرافت اور شوخ طبعی بھی اس میں اسی درجے میں تھی۔ ذہانت کا حصہ بھی اسی قدر ملا تھا۔ دل میں ہمدردی کا بھی ویسا ہی جوش تھا۔ ہر چند اس نے ڈرا نہیں لکھا تو کیا اس کی اکثر نظمیں ڈرامے کا کام دیتی ہیں۔ جس نظم کو دیکھیے معلوم ہوتا ہے کہ ڈرامے کا کوئی خاص سین ہے۔"

ہاں قسام ازل نے یہ قصور ضرور کیا تھا کہ نظیر کو اس سرزمین میں پیدا نہ کیا جہاں شیکسپیر کی پیدائش سے پیشتر بھی ڈرا کا چرچا تھا اور اس کے معاصرین میں کِڈ، لاج، مارلو، ناشس، اور پیل جیسے مجتہد العصر ڈرا نویس البتہ نہ تھے کہ شیکسپیر کی طرح نظیر میں بھی معرکہ آرائی اور مقابلہ کا جوش پیدا ہوتا۔ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی اگر بکثرت تھیٹر ہوتے اور شیکسپیر کی طرح نظیر بھی ان میں ایکٹر ہوتا تو یقینی نظیر کے ڈرامے بھی آج وہ ہوتے کہ گیٹی کی جگہ نظیر ہی خاتم ڈرا نویساں مانا جاتا۔ علاوہ اس کے ہمارے دعوے سے یہ کیونکر سمجھا گیا کہ نظیر انگلستان کا شیکسپیر تھا۔ میر انیس نے تو کوئی شاہنامہ نہیں لکھا اور نہ فردوسی نے ان کے سے مرثیے لکھے تھے۔ پھر میر انیس کو فردوسی ہند کیوں کہا جاتا ہے۔ اسی پر نظیر کی تشبیہہ کو بھی قیاس کر لینا چاہیے۔

کون کہتا ہے کہ شیکسپیر نے ڈراموں کے سوا اور نظمیں نہیں لکھی ہیں۔ ہرن کی چوری کی علت میں سر ٹامس لوسی نے جو شیکسپیر کو سزا دی تھی اس رنج میں ہجوگوئی کس نے کی تھی؟ سونٹ[1] کس نے لکھے ہیں؟ کلیات شیکسپیر میں ابتدائی زمانہ کی نظمیں جو ڈرا نہیں ہیں وہ کس کی ہیں؟ بہت سے متعصب اہل الرائے یہ کہہ کر نظیر کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے (چند) غیر مہذب نظمیں لکھی ہیں تو شیکسپیر کی معصومیت کی شہادت کے لئے "ریپ آف لیوکریشیا" کافی ہے۔ جس کے نام سے ہر مہذب کو نفرت ہوتی ہے۔ ڈرامہ کی تعریف یہ کہاں ہے کہ جو کچھ شیکسپیر یا اس کے مقلدین نے لکھا ہے وہی ڈرا ہے؟ قدیم یونانیوں کے ہاں تو شیکسپیر کا ڈرا قبل ولادت مسیح نہ تھا۔ ڈرا کے لغوی معنی یہی ہیں کہ "وہ نظم یا نثر جو عمل میں لانے اور انسانی زندگی کی تصویر دکھانے کی غرض سے لکھی گئی ہو یا جس کا مطلب ان مسلسل سنجیدہ یا دل خوش کن کاموں کا بیان کرنا ہو جس کے فوائد معمول سے سوا ہوں اور جس سے دل نشین کرنے والے نتائج پیدا ہوں۔" ہاں بالعموم ڈرامے چند ایکٹروں کی زبانی یا ان کی قائم مقامیت سے اسٹیج پر ادا کیے جاتے ہیں۔ ملٹن تو حضرت سلیمان کے گیتوں کو بھی ایک قسم کا ڈرا بتاتا ہے۔ اس تعریف کے بعد کون کہے گا کہ نظیر کی نظمیں ڈرا نہیں ہو سکتیں۔

۱۔ Sonnets ۱۴ مصرعوں کی ایک چھوٹی نظم

امریکہ کے مشہور اخبار نیویارک ہیرلڈ نے ۱۸۸۸ء میں ایک مضمون شائع کیا تھا، جس میں دکھایا تھا کہ رزمیہ نظموں اور ڈراموں میں فرق کیا ہے۔ لکھا تھا کہ "رزمیہ نظموں میں متکلم شاعر بذات خاص ہوتا ہے۔ واقعہ گذشتہ زمانہ کا ہوتا ہے اور مناظر جو بیان کئے جاتے ہیں دکھائے نہیں جاتے۔ جن لوگوں کا تذکرہ ہوتا ہے وہ غائب ہوتے ہیں۔ اس میں صرف دو شخص ہوتے ہیں۔ شاعر متکلم اور پڑھنے والا مخاطب اور ڈرامہ میں سرگذشت بزمانہ حال اور مناظر پیش نظر ہوتے ہیں۔ لوگ جو متعلق ہوتے ہیں وہی خود گفتگو کرتے ہیں۔ خیالات اور جذبات اصلی ہوتے ہیں"۔ جن لوگوں نے دونوں اصناف پر بخوبی غور کیا ہے وہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ڈرامہ میں بھی زمانہ ماضی کی سرگذشت کی زمانہ حال میں صرف نقل کی جاتی ہے۔ مناظر جو چند پردوں کے ذریعہ سے پیش نظر کئے جاتے ہیں وہ ڈرامہ نویس کے خیالات و تصورات کے نتیجے ہوتے ہیں نہ کہ وہ جو اُس سرگذشت کے وقت ہوں گے۔ ڈرامہ کرنے والے دوسروں (یعنی اصلی اشخاص) بلکہ ڈرامہ نویس کی ساختہ و پرداختہ گفتگو کو صرف اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں ورنہ وہی لوگ بولنے نہیں آتے جن سے وہ واقعہ متعلق ہے۔ خیالات و جذبات، حرکات و سکنات سب کے سب یا تو خود گفتگو کرنے والے کے ہوتے ہیں یا عاریۃً لئے ہوئے یا ڈرامہ نویس سے اخذ کئے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ سرگذشت انسانی کو جو شعراء رزمیہ خواہ بزمیہ نظموں میں باندھتے ہیں وہ بھی ڈرامہ نویس ہی کی طرح اوروں کے واقعات کو اپنے اپنے خیال کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ پس لازمی ہے کہ ع "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلسل رزمیہ یا بزمیہ نظمیں بھی ذرا سی تبدیلی سے ڈرامہ کی صورت اختیار کر سکتی ہیں جس کی مثال کسی اور موقع پر کبھی ہم دکھائیں گے۔

سچ پوچھو تو ڈرامہ کی بنیاد کیریکٹر (عادات و خصائل) نویسی پر ہے اور غرض کیرکٹر کا مطالعہ یا مشاہدہ کرانا۔ اس کلیہ کو مد نظر رکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ نظیر کی نظمیں ڈرامہ نہیں پیدا کر سکتیں۔ ہم طرفداری نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظیر کیا نظیر کے سے جتنے شعراء گذرے ہیں ایک حیثیت سے ان کے کلام ڈراموں سے زیادہ اعلیٰ و افضل ہیں۔ مطالعہ کرنے والے طبع سلیم اور دل اثر پذیر رکھتے ہوں تو اس کا بخوبی اندازہ ہو سکے۔ جہاں ہملٹ کو شیکسپیر جو اس کے باپ کی روح سے ہمکلام کراتا ہے کیا ویسا ہی اثر کسی صاحب نظر کے دل پر نظیر کی اُس نظم سے پیدا نہیں ہوتا جس کا نام ہے "کاسۂ سر کی زبان اور انجام انسان"؟ اگر شیکسپیر نے میکبتھ میں چڑیلوں یا ڈائنوں کو اسٹیج پر لاکر ٹمپسٹ میں جادو کا کھیل اور پریوں کا ناچ

دکھا کر اور مڈسمر نائٹس ڈریم میں جنوں اور پریوں پرانسانوں کے ساتھ عشق و عاشقی کا الزام لگا کر غیر معمولی قوتوں اور خلاف قیاس باتوں کا ثبوت دیا ہے اور اس سے نتیجہ مفید نکالا ہے۔ تو میاں نظیر نے بھی ایک پگچے دنیادار کی عبرت و تنبیہ کے لئے چوہوں کے آچار تیار کئے ہیں اور اس کے مصالح کے لئے دنیا کے سارے لغویات کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ ایسی ہی بہت سی نظمیں ہیں جن کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے لاینحل معمے حل کئے ہیں۔

ان کے علاوہ نظیر کی دو نظمیں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ایک تو وہ جس میں خیال کے اسٹیج پر "میاں قلندر اپنا ریچھ کا بچہ لے کر تشریف لاتے ہیں۔ وہی سوامن کا سونٹا جس پر لوہے کی کڑوی کھڑکتی ہوئی، وہی کاندھے پر جھونٹنا[1]، وہی ہاتھ میں پیالہ، وہی ڈھپلی[2]، وہی لڑکوں کا ہجوم، وہی کشتی کے داؤ پیچ، وہی کہروا ناچ وغیرہ وغیرہ" دوسری نظم وہ ہے جس میں مہادیو جی کے بیاہ کا لطف دکھایا ہے۔ ان کی یہ نظم تکلفات سے مالامال اور رنگ سرتاپا ہندوانہ ہے۔ زبان کی لطافت اور باریکی دونوں قابل داد ہیں۔ اس ڈراما کے ہیرو مہادیو جی اور ہیروئن راجکماری ہماچل۔ اور راستہ میں مہاراجہ ہماچل، ان کی رانی، ان کے پردھان، پروہت وغیرہ ہیں۔ محاورات بھی خاص خاص لائے گئے ہیں۔ کمال یہ کیا ہے کہ کمیڈی کو پُرلطف کرنے کے لئے کہیں کہیں تفریح کے مضامین بھی داخل کر دیئے ہیں کہ پڑھنے والا گھبرا نہ جائے اور سب پر بالا ہے نظم کی خاص بحر جس سے شادی کی دھوم دھام صاف صاف ظاہر ہوتی ہے اور ہر سین کی بندش نئی ہے۔ ان دونوں نظموں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ فطرتاً اس کی طبیعت ڈراما کے لئے کیسی مناسب واقع ہوئی تھی اور اگر یورپ کے طریقہ پر وہ ڈراما لکھتا تو کمیڈی اور ٹریجڈی دونوں میں کمال کر دکھاتا بس بقول پروفیسر شہباز مرحوم "پورے شیکسپیر ہونے کی صلاحیت اگر کسی میں تھی تو وہ میاں نظیر علیہ الرحمۃ تھے"

وہ کیا کہیں گے۔ ایک زمانہ نظیر کو یہی کہہ رہا ہے۔ اردو کے جانسن یعنی مؤلف فرہنگ آصفیہ مولانا سید احمد دہلوی نظیر کو ہندوستان کا شیکسپیر مانتے ہیں۔ شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی نے نظیر کو ریلسٹک[3] پوئٹ کیا ہے۔ اس بارہ میں فرانسیسی اہل الرائے بھی ان کے ہم آہنگ ہیں اور ڈاکٹر فیلن تو سب سے بڑھ گئے کہ اپنی اردو لغت میں کلام نظیر کو جا بجا سند میں لانے کے علاوہ دیباچہ کے چند صفحات اس کی تعریف میں سیاہ کر ڈالے ہیں اس پر بھی نہ رہا گیا تو لکھ دیا کہ "نظیر نے مادری زبان کے خزانوں پر سکہ بٹھا دیا۔ اس نے اس خصوص میں وہ کام کیا ہے جو صرف سلاطین اقلیم سخن مثلاً چوسر و شیکسپیر کر سکے ہیں۔ اس نے ہندی الفاظ کو تمام ان

---

[1] فقروں کی نقلی   [2] ڈفلی   [3] Realistic poet وہ شاعر جو حقیقت حال کی تصویر دکھاتا ہے

خوشنما ترکیبوں میں ظاہر کیا ہے، جن میں وہ ظاہر ہو سکتے ہیں۔"

آپ فرماتے ہیں کہ "استاد نظیر ضرور اپنے وقت کے پوئٹ لاریٹ تھے اور اس میں کلام بھی نہیں جو لوگ اپنے حسن ظن سے اس کو تسلیم کر لے سکتے ہیں لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اُن مستحق شعرا کی مقدس ارواح سے ہمیں شرمندہ نہ ہونا پڑے جن کو اسی کے برابر خطابات دربار شاہی سے مل چکے تھے اور یہ خطاب تو انگریزی یونیورسٹیوں کے اُن معزز سند یافتوں کا جوا کرتا تھا، جو قواعد، شاعری اور انشا میں مستند تصور کئے جاتے تھے اور گلے میں لارِیل[1] کے پتوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ عہد اڈورڈ چہارم میں اس عزت سے وہ درباری شعرا ممتاز کئے جانے لگے، جن کو ہمارے یہاں ملک الشعرا کہا کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے اہل الرائے ان دونوں سندات میں سے ایک بھی میاں نظیر کو دینا نہیں چاہتے اس لئے ہماری رائے میں اس معذور کو شیکسپیر ہند مانا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ وضاحت کافی ہوگی۔ بحالت دیگر کبھی دیکھا جائے گا۔

حسیر عظیم آبادی (مارچ ۱۹۱۲ء)

اکبر الٰہ آبادی

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب اکبر کو جن کے دریائے کمال سے اُردو کے ادبی رسالے سیراب ہوتے رہتے ہیں اور جو ادیب کے خاص محسن و سرپرست ہیں حال میں اپنی اہلیۂ محترمہ کے دفعۃً انتقال کا صبر آزما اور جانگداز صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے جس سے آپ کی طمانیت خاطر کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا۔ مرحومہ نہایت قابل، منتظم اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں جن کی موجودگی حضرت اکبر کو خانگی معاملات سے بے فکر بنائے ہوئے تھی اور جن کے انتقال سے حضرت کی خانگی مصروفیت (جس میں اُن کے نو عمر صاحبزادے کی خورد و پرداخت بھی شامل ہے) اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب وہ شاعرانہ فرصت مشکل سے مل سکتی ہے جس میں "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے"۔ ہم اس نمبر میں حضرت کے چند نو تصنیف اشعار شائع کرتے ہیں جن سے آپ کے دلی حزن و ملال کا پتہ لگتا ہے اور جن میں وہ زندہ دلی نہیں پائی جاتی جو کلام اکبر کی خصوصیات میں داخل ہے۔ آپ کے اس عمیق رنج و الم میں ہم اپنی ناچیز ہمدردی پیش کر کے امید کرتے ہیں کہ دنیائے ادب مرحومہ کے اس حزن و ملال میں کافی حصہ لے گی۔

پیارے لال شاکر (نومبر ۱۹۱۰ء)

---

[1] Laurel ایک قسم کا درخت جو ہمیشہ شاداب رہتا ہے۔

اکبر الہ آبادی

خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج پنشنر الہ آباد ... عرصے سے ضعفِ بصارت کے سبب تصنیف و تالیف کے شوق کو خاطر خواہ پورا نہ کر سکتے تھے۔ اسی حالت میں آپ کا تازہ فوٹو یکم دسمبر گذشتہ کو ادیب کے لئے لیا گیا تھا ... انہیں ایام میں آپ بغرض علاجِ چشم کلکتہ تشریف لے گئے تھے، جہاں سرلیا عمل جراحی میں کامیابی ہوئی اور یہ خبر بہت مسرت انگیز ہے کہ آپ صحت یاب ہو کر واپس آگئے ہیں۔ (۱/۱)

شوق قدوائی

جنوری کے "الناظر" میں "عالم خیال" کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی ہے جس پر قابل ایڈیٹر نے نوٹ دیتے ہوئے ادیب کی اُس تصویر کا حوالہ دیا ہے، جو اکتوبر ۱۹۱۰ء کے پرچے میں اسی عنوان سے شائع ہوئی تھی اور جس کے متعلق ہم نے ایک نوٹ میں یہ لکھا تھا کہ اس تصویر کے لئے جو نظم حاصل کی گئی تھی وہ اُردو شاعری کے عام مذاق کے مطابق عاشقانہ ہو گئی۔ ایڈیٹر صاحب الناظر کے خیال میں ہمارے نوٹ کا یہ مطلب تھا کہ اُردو زبان زن و شوہر کے جذبات ادا کرنے سے قاصر ہے اور اس پر اتنا اضافہ اور بھی کر بھاشا میں یہ جذبات بکثرت موجود ہیں۔ حالانکہ ہمارے نوٹ کو زبان کی بحث سے ادنیٰ تعلق بھی نہ تھا اور ہم خود اس کے مدعی ہیں کہ اردو ہر قسم کے خیال ادا کرنے پر قادر ہے۔ ہمارا روئے سخن صرف اردو شاعری کے عام مذاق کی طرف تھا جو نفس پرستی کے جذبات سے مملو ہے۔ ورنہ اُردو کے بارہ ماسوں میں زن و شوہر کے جذبات اس کثرت سے موجود ہیں کہ الناظر کی شائع کردہ نظم بھی ان میں کچھ اضافہ نہ کر سکی۔

ہمیں اس تصویر کے متعلق ایسی نظم کی ضرورت تھی جو شریفانہ جذبات پر مبنی ہو اور جو عالم خیال کی فلسفیانہ کیفیت پیش کر سکے۔ شریف عورتوں کو اپنے حسن کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن الناظر کی شائع کردہ نظم کی ہیروئن کو سب سے پہلے یہی شکایت ہے کہ:

"یہ شباب کی اُمنگ اب کسے دکھاؤں میں — رخ کا لال لال رنگ اب کسے دکھاؤں میں"

نظم مذکور کے پچاس ساٹھ شعر سب اسی قسم کے جذبات سے لبریز ہیں۔ یہ جذبات خواہ اردو میں ہوں یا ہندی میں شریفانہ جذبات نہیں کہے جا سکتے۔ شریف عورتوں کے لئے حیا لازمی ہے جس کی تصریح ذیل کے اشعار میں موجود ہے:

تاروں سے حیا آتی ہے، پردہ ہے قمر سے — ڈرتی ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے روزنِ در سے
چادر کبھی خلوت میں سرکتی نہیں سر سے — بیگانہ نظر رہتی ہے، شوہر کی نظر سے
خلوت میں نگاہوں سے نگاہیں نہیں ملتیں
دل ملتے ہیں دل ملنے کی راہیں نہیں ملتیں

سرور جہان آبادی
(ایڈیٹر، جنوری ۱۹۱۱ء)

سرورِ مبرور

یہ خبر نہایت رنج و قلق کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۳ دسمبر سنہ حال کو اُردو کا وہ خوش نوا شاعر جس کی دلکش شاعری نے نظم اُردو میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا جس کے درد بھرے اشعار میں سوز و گداز کی روح پھونک دی گئی تھی اور جس کی نازک خیالی، نغز گوئی اور حاضر طبعی کے افسانے بالکل تازہ ہیں، ۴۷ سال کی عمر میں دفعتہً اُس دارالسرور کی طرف روانہ ہو گیا جہاں دنیوی رنج و حالات اور عیش و مصیبت کی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کی جوانمرگی کا روح فرسا سانحہ ہے، جو دنیائے ادب کے لئے کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے۔ مرحوم قصبۂ جہان آباد ضلع پیلی بھیت کے ایک معتمد خاندان کے ہونہار رکن تھے اور اپنی تھوڑی سی عمر میں شہرت و ناموری کے آسمان پر اس قدر بلند ہو چکے کہ ساری دنیائے شاعری جگمگا اٹھی۔

مرحوم کو شاعری کے علاوہ فن حکمت میں بھی دستگاہ حاصل تھی اور یہ اُن کا آبائی پیشہ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اُن کے خلقی اوصاف تھے جن میں نیک نفسی، منکسر مزاجی اور راستبازی کو مرحوم کی طبیعت میں حیرت انگیز درجے تک دخل تھا۔ مرحوم کی نہایت زبردست آرزو اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت تھی جو افسوس کہ موت نے ایسے وقت میں معدوم کر دی جبکہ اُس کے پورا ہونے میں صرف چند ہفتے باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے نہایت شوق سے اپنا مجموعۂ کلام بالحاظ حق تصنیف انڈین پریس کو دیا تھا جو قریب قریب تیار ہے اور جس کے پروف دیکھنے کے شوق میں مرحوم الٰہ آباد آئے تھے کہ دفعتہً سلسلۂ حیات منقطع ہو گیا۔ مرتے مرتے وہ اسکی اشاعت کا پیام ہمیں دے گئے ہیں اور ہم اُن کی وصیت کو اسی ماہ میں پورا کر دیں گے۔ کلیات سرور کا اشتہار بہت جلد شائقین کے ہاتھوں تک پہنچنے والا ہے جس میں مرحوم کی تمام نظموں کے علاوہ سوانحی حالات اور تنقید کلام بھی شامل ہیں۔ مرحوم کو ادیب کے ساتھ جو خاص الفت تھی وہ ان کی رباعیات مطبوعہ فروری نمبر اور دیگر نظموں سے واضح ہے لیکن افسوس کہ آج سے ادیب ان کے دلکش کلام سے محروم ہوتا ہے اور یہ ایسا سخت ماتم ہے جس میں ہمارے ساتھ ناظرین ادیب بھی شریک ہوں گے۔ ایسے نغز گو شاعر کے سوگ میں صفحات سیاہ پوش ہیں، چشم دوات اشک بھر لائی ہے اور قلم نے سرنگوں ہو کر آنسوؤں کا تار باندھ دیا ہے۔ ہم مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور اس مصرع پر اس ماتم کو ختم کرتے ہیں۔ ؎

دے اے خدا سرور کو دارالسرورِ خُلد

خدائے عزوجل مرحوم کے ضعیف والد، نوجوان بھائیوں اور دیگر اعزہ و احباب کے ساتھ اس سانحۂ درد انگیز میں ہمیں بھی صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

— ایڈیٹر (دسمبر ۱۹۱۰ء)

میر بادشاہ علی بقا

خلف الرشید میر وزیر علی صبا لکھنوی، آپ مرزا دبیر مرحوم کے داماد اور خاندانی شاعر تھے۔ ۰ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ فن سخن کا کافی شوق تھا، مگر اپنے والد کے رتبہ کو نہ پہنچے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔ (تصویر میں) جناب بقا کے پہلو میں آغا حاتم صاحب قزلباش اختر کھڑے ہیں، جو آغا سخاوت علی بیگ ضیا (خلف مرزا حاتم علی بیگ مہر) کے فرزند رشید اور مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔

کمال لکھنوی

ہم نے یہ خبر نہایت رنج و قلق کے ساتھ سنی کہ ہمارے دیرینہ دوست حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال، خلف علامہ جلال مرحوم نے ۲ فروری گزشتہ کو بمقام رام پور بعارضہ طاعون انتقال فرمایا۔ مرحوم حضرت جلال کے فرزند اصغر اور نہایت ہونہار جوان تھے۔ شاعری اور حکمت دونوں میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ رسالہ دستور الفصحا اور ایک دیوان آپ کی یادگار ہے۔ باقی کلام اور کئی رسالے جو فن عروض وغیرہ پہ لکھے تھے۔ غیر مطبوعہ رہ گئے، جن کے چھپنے کی اب امید نہیں۔ بلکہ خاندان جلال ہی کا خاتمہ ہو گیا جس میں اب کوئی شاعر اور ادبی شوق رکھنے والا باقی نہیں رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون

ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۱ء)

جوالا پرشاد کی وفات

منشی جوالا پرشاد صاحب برق بی اے، بی۔ ایل جج خفیفہ لکھنؤ کی افسوسناک وفات اردو زبان کے لئے ایک سخت ماتم ہے۔ جن لوگوں نے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اردو نظم و نثر میں آپ کی فصاحت اور شیوا بیانی کیا درجہ رکھتی تھی۔ بنکم چندر اور شیکسپیر کی تصنیفات کو فصیح اردو کا لباس دینا مرحوم پر ختم تھا۔ ان یگانۂ آفاق مصنفوں کی اصلی فصاحت منشی صاحب کے اردو ترجموں میں اس طرح جلوہ گر ہے جس طرح آئینے میں عکس۔ آخر میں شیکسپیر کی تمام تصنیفات کا ترجمہ کر رہے تھے کہ پیام اجل آ گیا۔ ظرافت میں بھی آپ کو خاص دستگاہ حاصل تھی اور اودھ پنچ کے صفحات آپ کے فیضان قلم سے ہمیشہ سیراب ہوتے تھے۔ قانون کے لئے بھی آپ نے خاص دماغ پایا تھا اور آپ کی بے نظیر جوڈیشل خدمات کا سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا ہے۔

مرحوم کی وفات سے نہ صرف اُردو کا ایک فصیح البیان مصنف، ایک زندہ دل اور ظریف الطبع شاعر، ایک بے نظیر جج اور لکھنؤ کی سوسائٹی کا ایک اعلیٰ ممبر اٹھ گیا ہے بلکہ قوم کایستھ کا ایک رکن رکین اور مایۂ ناز فرد کم ہو گیا، جو ہمارے لئے ایک صبر آزما قومی سانحہ ہے۔

آپ کے اوصاف کی تفصیل مولانا صفی لکھنوی کے قطعۂ تاریخ میں درج ہے جو ۶ اپریل سنہ حال کو قیصر باغ لکھنؤ کی تعزیتی مجلس میں پڑھا گیا تھا اور جس کی بے حد تعریف ہوئی۔ حضرت صفی لکھنوی کے نامور اساتذہ میں ہیں اور مرحوم کے سررشتہ دار ہیں۔ آپ کے مختصر حالات جو آپ کے برادر معظم منشی جانکی پرشاد صاحب گورنمنٹ پلیڈر رائے بریلی نے مع فوٹو ارسال فرمائے ہیں حسب ذیل ہیں:

"منشی جوالا پرشاد صاحب بتاریخ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۳ء یوم دسہرہ ماہ کنوار بمقام قصبہ محمدی ضلع کھیری پیدا ہوئے تھے۔ بزرگان منشی صاحب مرحوم قصبہ شاہ آباد ضلع ہردوئی کے باشندے تھے۔ جد امجد منشی نین سکھ عہدۂ جلیلہ پر بعہد شاہی ممتاز تھے اور اسی سلسلہ سے قیام محمدی ہو گیا۔ والد ماجد منشی شیو دیال صاحب بھی عہد شاہی میں ممتاز رہے۔ منشی صاحب بچپن سے خاموش، محنتی اور شائق تحصیل علم رہے۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں مڈل پاس کر کے انٹرنس۔ ایف اے۔ اور بی اے میں برابر اوّل درجہ میں پاس ہوتے گئے۔ بی اے پاس کر کے آپ اسسٹنٹ انگلش پروفیسر کیننگ کالج میں مقرر ہوئے اور اسی زمانہ میں قانون بمشورہ منشی کالی پرشاد صاحب مرحوم کل بھاسکر بانی کایستھ پاٹھ شالہ الٰہ آباد کے حاصل کیا۔ بی اے کے امتحان کے ایک سال کے بعد ہائیکورٹ کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ تخمیناً ایک سال وکالت عدالت العالیہ صاحب جوڈیشل کمشنر بہادر میں کر کے منصف ۱۸۸۵ء میں مقرر ہوئے۔ منصفی سے ترقی کر کے سب جج اور کئی دفعہ قائم مقام سشن جج مقرر ہوئے۔ بالآخر ۲۶ مارچ ۱۹۱۱ء کو بوقت ۳ بجے ۲۰ منٹ پر اس دار فانی سے کوچ کیا۔"

منشی جوالا پرشاد صاحب کی وفات ایک سخت ملکی و قومی نقصان ہے۔ آپ کا فوٹو ادبی دنیا میں اول اول شائع ہوتا ہے۔ اپنی حیات میں آپ نے اپنی تصویر چھپوانا پسند نہیں کیا۔ حالانکہ اس کے لئے ہر طرف سے مانگ آتی رہی۔

— ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۱ء)

جمال اختر

[ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید ٭ ز جام دہر مے کل من علیہا فان

جس طرح مرنا برحق ہے، اسی طرح مرنے والے کا غم کرنا تقاضائے بشریت ہے۔ ان دونوں کے ساتھ صبر بھی ایک حالت ہے، جو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور دنیا کی روش یہی ہے کہ ؎

کل جو اٹھے تھے بٹھانے کیلئے ٭ آج بیٹھے ہیں اٹھانے کے لئے

مرنے والی کی قبر پر لوگ پھولوں کی چادر چڑھا کر اپنی محبت اور عالم کی بے ثباتی کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن وہ باکمال جو بقائے دوام کے سامان فراہم کر گیا ہے اس کا مزار ایسی چادر گل کا محتاج نہیں جو تیز ہوا کی تاب نہ لا سکے۔ اس کے مزار پر خیالات اور ذکر خیر کے الفاظ کا ایسا تر و تازہ گلدستہ چڑھایا جاتا ہے کہ ہر موسم میں ادھر جذبات کی کلی سی کھل گئی اور ادھر وہ شگفتہ ہو گیا۔ ایسے ہی پھولوں کی ردا ہمارے دوست پرست مکرم جناب سید محمد اسد علی صاحب ام۔ آر۔ اے۔ ایس حضرت اختر کی پُر حسرت تربت پر چڑھا کر حق دوستی ادا کرتے ہیں۔ مرحوم اختر کی قبل از وقت موت پر اہل سخن جس قدر ماتم کریں بجا ہے اور منشی دیبی پرشاد صاحب بشاش اپنے اکلوتے بیٹے کے غم میں اگر یوں چلا اٹھیں جب بھی کم ہے ؎

در فراق تو جہانے پُر اسلوب کنم ٭ صبر ایوب کنم دیدۂ یعقوب کنم

لیکن دلی ہمدردی کے ساتھ ہم یہی کہیں گے کہ صبر کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے۔ تعجب ہے کہ خمخانۂ جاوید میں اختر مرحوم جیسے خوش فکر شاعر کا تذکرہ نہیں۔ بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ قدردانِ ادیب، کلام اختر سے محروم نہ رہیں۔ سردست مرحوم کی تصویر شائع کی جاتی ہے۔ اڈیٹر]

بنی آدم کو عہد سے لے کر آخر وقت تک حوادث دنیا سے اگر کہیں پناہ ہے، تو کنج لحد میں؛ اور مسافر ہستی کی منزل راحت اگر ہے، تو آغوش گور۔ خدا جانے اس تودۂ خاک میں کیا دھرا ہے کہ جو گیا وہیں کا ہو رہا۔

تغیراتِ عالم کے دیکھنے کے لئے چشمِ بینا اور دلِ دانا درکار ہیں۔ جب تک انسان غور و خوض، فکر و تعمق اور نظرِ غائر سے کام نہ لے، تب تک اصل بات کا انکشاف ناممکن ہے۔

ایامِ طفلی، آغازِ شباب، صبحِ پیری، یہ زندگی کے مقامات ہیں۔ اس میں مقامِ آرزو اور حصولِ کمال وہ منزلِ مقصود ہیں، جن کے لئے انسان سب کچھ کر گذرتا ہے۔ یہ ایک مسلم امر ہے کہ انسان جب کسی ملک یا شہر کی سیر کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو پہلے ٹائم ٹیبل کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس وقت یہاں سے ریل چلتی ہے اور کب اسٹیشن پر پہنچے گی۔ اس کے ساتھ ایک گائڈ بک بھی چاہیے کہ کون کون سے مشہور مقامات راہ میں آتے ہیں اور دیکھنے کے لائق ہیں۔ سفرِ زیست کے لئے بھی ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح مختلف اوقات سے واقف کاری ضرور ہے کہ لڑکپن کا وقت اور ہے، جوانی کا اور اور صبحِ پیری کا اور، یعنی بے فکری کا زمانہ اور ہے، اور کمانے کھانے کا زمانہ اور۔ اسی مقام سے گذر جانے پر کفِ افسوس ملا جاتا ہے، ورنہ عمر پاکر تو سب ہی یکے بعد دیگرے جاتے ہیں اور جائیں گے ؎

حسرت پر اس مسافرِ بیکس کے روئیے　　جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

دنیا، دنیا! یہی دنیا، جس میں ہم تم رہتے سہتے، چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اسی کی نسبت بزرگانِ دین فرماتے ہیں:

حضرت علیؓ: "اس گھر کی حالت کیا بتاؤں، جس کا شروع ذلّت ہے اور خاتمہ فنا۔ جو اس میں غنی ہوا، فتنہ میں مبتلا رہا اور جو محتاج ہوا غم زدہ رہا۔"

حضرت ابوبکرؓ: "اس کا جو حصّہ گذر گیا خواب تھا اور جو باقی ہے وہ محض ہوس۔"

حضرت عمرؓ: "جس نے دنیا سے دل لگایا اور اس کی چیزوں کو عزیز سمجھا، اسی کو سب سے بڑا صدمہ ہوا۔"

اسی بے ثباتیِ عالم کی تصویر ان اشعار میں کھینچی گئی ہے:

"حقیقت میں جگہ دنیا نہیں ہے دل لگانے کی　　وفا کرتی نہیں ہے دفا سارے زمانے کی
نہیں ٹلتی مقرر ہے جو ساعت موت آنے کی　　جگہ اس میں نہیں دم مارنے کی لب ہلانے کی
نہیں خوفِ خزاں کب تک بہار زندگانی میں؟　　کہاں تک شمعِ ہستی کی جلے گی بزمِ فانی میں
غلط ہر دعویٰ الفت سراسر عاشقی جھوٹی　　ثبوت یک دلی جھوٹا، دلیلِ دوستی جھوٹی
عزیزوں کی ہے تقریرِ خلوص باطنی جھوٹی　　غرض جھوٹی ہے دنیا، اور جھوٹی بھی بڑی جھوٹی

بھروسا اپنے دم ہی کا نہیں ہے غیر کا کیا ہو — بچا جاتا ہے گولی وقت پر کیسا ہی اپنا ہو"

دنیا کا ہر فلسفی، ہر حکیم اور ہر منطقی آخر اسی نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہاں تک ان کے اقوال دہرائے جائیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ ایک دن اس عالم سے گذرنا ہے لیکن جب کسی کا کوئی دوست گذر جاتا ہے، تو اس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ اس کلیہ کو تسلیم کرے۔ مرنے والا تو مر جاتا ہے مگر اپنی یاد چھوڑ جاتا ہے کہ احباب اس پر ماتم کریں اور واقعی یہ اس کا آخری تعلق اس سوسائٹی سے ہوتا ہے جس کو چھوڑ کر وہ چل بستا ہے۔ سچ پوچھو تو ماتم میں دھرا ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ مرنے والے کا ذکر خیر کیا جائے۔

یہی آخری حق قدر دانان اُردو پر حضرت اختر کا ہے۔ وہی اختر جو مرنے سے صرف اٹھارہ مہینے پیشتر ذیل کا قطعہ حالیہ لکھ کر اپنی شاعری کے ساتھ اپنی زندگی کے دن بھی پورے کر گیا اور حق تو یہ ہے کہ حضرت اختر کا جس قدر ذکر خیر کیا جائے بجا ہے۔ قطعہ حالیہ:

"پڑا جب ہاتھ گلچیں کا گل تر پر تو بلبل نے — کہا رو رو کے اے سفاک یہ کیا ظلم کرتا ہے
ابھی تو رونق گلزار ہے اس کا رخ روشن — ابھی تو بوئے خوش آتی ہے رنگ رخ نکھرتا ہے
ابھی تو اس کے جلوے کا ہے اک عالم تماشائی — ابھی تو اک زمانہ اس کی رعنائی پہ مرتا ہے
ابھی تو ہر عنادل جان و دل سے ہے فدا اس پر — ہر اک مرغ خوش الحان عشق کا دم اس کے بھرتا ہے
ابھی دیکھی ہے کیا اس نے فضائے گلشن ہستی — ابھی کیوں توڑتا ہے کچھ خدا سے بھی تو ڈرتا ہے
کہا گلچیں نے سچ ہے، مگر وقت قضا ہرگز — نہیں ٹلتا نہیں ٹلتا جو سر پر آ گذرتا ہے"
یہی روز ازل سے ہے جہاں میں شغل اختر کا — بتوں کے ظلم سہتا ہے، خدا کو یاد کرتا ہے۔

ایک پُرگو اور مشاق شاعر ہونے کی حیثیت سے حضرت اختر کا نام ایسا نہیں ہے جس سے ناظرین آشنا نہ ہوں۔ تین پشت سے مرحوم کے یہاں شاعری چلی آتی ہے۔ چنانچہ آنجہانی مہاراجہ سردار سنگھ صاحب کی مدح سرائی کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

ہمت و بخشش واختر ہر سہ پشت — مدح خوان تست از راہ وفاق
کم کسے را این چنین مدحت گران — بود و ہست ز تست حسن اتفاق

منشی بیسر پرشاد اختر قوم کے کائستھ تھے اور ان کے بزرگ بھوپال کے رہنے والے تھے۔ ان کے دادا منشی کھن لال ولد لالہ کشن چند ۱۸۰۳ء بمقام سرونج (مالوہ) پیدا ہوئے۔ ٹونک میں تعلیم پائی، نہایت

خوش فکر شاعر تھے۔ بہجت تخلص کرتے تھے۔ نواب عبدالکریم خان بہادر کی سرکار میں ملازمت کی، نواب کا انتقال ہو گیا، تو ان کو پنشن مل گئی اور خواجہ اجمیری کے آستانہ کے متولی کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء میں بمقام جودھپور انتقال کئے۔ بڑے نیک مزاج، غیر متعصب، کارداں اور دیانت دار بزرگ تھے۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ خداداد ذہانت اور کہنہ مشقی کی بدولت اردو فارسی کے صاحب دیوان ہو گئے۔ ان کی تالیف و تصانیف کی ایک اچھی فہرست ہو سکتی ہے۔ بھگت[1] مال کو فارسی نظم کا جامہ پہلے پہلے انہیں نے پہنایا۔

اختر مرحوم کے والد بزرگوار منشی دیبی پرشاد صاحب بھی ایک باکمال بزرگ ہیں۔ تقریباً ۶۴، ۶۵ سال کی عمر ہوگی۔ بشاش تخلص کرتے ہیں۔ خاندانی مراسم کے باعث ابتدا میں نوابان ٹونک کی سرکار میں برسرکار رہے۔ پھر ریاست جودھپور میں ملازم ہوئے اور منصفی کے عہدہ پر ممتاز ہیں۔ آپ کا کلام پاکیزہ اور تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ منشی صاحب کی تصانیف نظم و نثر، کتب درسیہ اور تواریخ کی تعداد ممدوح کی عمر سے بھی سوا ہے۔ لطائف ہندی، افسانۂ خرد افروز، گلدستۂ ادب، وقایع راجپوتانہ، احکام نوشیروانی، تاریخ تزک ہند، تذکرۂ شعرائے ہنود وغیرہ۔ آپ کے کلام کو مقبولیت بھی بڑی ہوئی اور حق پوچھو تو یہ ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ جسے چاہتا ہے خدا دیتا ہے۔ آپ کی کتابوں کے صلے میں بارہا گورنمنٹ بورڈز سے بڑی بڑی رقوم بطور انعام عطا ہوتی رہیں۔ ممدوح کی بہتری کتابیں سررشتۂ تعلیم کی طرف سے داخل نصاب ہو گئی ہیں۔ تواریخ راجستان و مارواڑ سے متعلق آپ کی تحقیقی معلومات کو لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے حد درجہ مستند قرار دیا ہے۔ اسی سوسائٹی کے آپ ممبر بھی ہیں۔ منشی صاحب ایک بلند پایہ مصنف ہیں اور راجپوتانہ کے علاوہ ہندوستان سے ولایت تک اپنے وسیع تجربے اور تاریخی معلومات کے باعث مشہور و معروف ہیں۔ آپ کے تاریخی مضامین رسالہ سرسوتی میں اکثر شائع ہوتے رہے ہیں۔ مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت اختر منشی صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ انکی پیدائش ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔ ہونہار بیٹے نے لائق باپ کے قدم بقدم چلنے کی ایسی کوشش کی کہ خاندان کے لئے مایۂ ناز ہو گیا اور تھوڑے ہی زمانہ میں اوصاف حمیدہ سے مالامال ہو گیا اور کیوں نہ ہو، قدرت سے ساری خاندانی خصوصیات بدرجہ احسن ملی تھیں۔ ذہانت و متانت سب میں برابر کا حصہ عطا ہوا تھا۔ علوم مروجہ میں اچھی مہارت حاصل کی۔ نجوم، جفر اور موسیقی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔

---

[1] بعض سنگیت مال لکھتے ہیں (اڈیٹر)

قاعدہ ہے کہ اثر پذیر طبیعتیں بہت جلد رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ علمی مذاق خاندانی مشغلہ شعر و شاعری کا چرچا اور تالیف و تصنیف کا شوق ایسی صحبتوں سے فیض یاب ہو کر رفتہ رفتہ اختر کے مذاق سلیم نے بھی رنگ دکھانا شروع کیا۔ ادھر یکسوئی ہوئی اُدھر آمد نے آورد پر غلبہ پایا۔ شاعری کا رنگ جما۔ قادر الکلامی کا یہ عالم ہوا کہ اُردو، فارسی اور ہندی زبانوں سے تو خیر طبیعت کو ایک گونہ مناسبت تھی ہی انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے اور اچھے اچھے اشعار نکالے۔

حضرت اختر ریاست جودھپور میں انسپکٹری کے عہدہ پر ممتاز تھے۔ اس سن و سال میں صاحب تصانیف ہونا کچھ آسان نہیں ہے۔ ایک دیوان، اور چند مثنویاں لکھیں، جن کے نام یہ ہیں: مخزن الفصاحت، منظوم دل آرام، اور مخزن تدابیر اور ایک مکمل تضمین بے بہائے اختر۔ بھی یادگار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عمر اگر وفا کرتی، تو اُردو کے لئے کافی سرمایہ چھوڑ جاتے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ ایسے باکمال کم عمر پاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جودھپور میں اس پایہ کے دوسرے شاعر کمیاب ہیں۔ چنانچہ اُن کے کلام سے خود ظاہر ہوگا۔

مخزن تدابیر کا دیباچہ منشی دیبی پرشاد صاحب نے خود لکھا تھا۔ ہونہار بیٹے کی نسبت آپ فرماتے ہیں:

"الحمد للہ آج زمانہ بکام ہوا۔ شاہد مدعا آغوش میں آیا۔ مراد پوری ہوئی۔ ناکامی کا کھٹکا مٹا۔ دل کی گرہ کھلی۔ جی کا ارمان نکلا۔ امید نے مبارکباد دی۔ تمنا نے خوشخبری سنائی کہ اختر نے کمال کیا۔ سحر حلال کیا۔ ہلال کو بدر بنایا، ناقص کو کامل کر دکھایا ع "آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو"۔ اختر کون؟ میرا نور نظر، میرے گھر کا اُجالا، میری آنکھوں کا تارا ...... میراث پدر کا وارث، علم آبا کا حامل، ادھورے کاموں کا پورا کرنے والا، اپنے بزرگوں کا جانشین مکان رشد کا مکین[۱]۔"

باکمال باپ کے یہ برجستہ اور نپے تلے ہوئے فقرات صاف بتا رہے ہیں کہ باپ کے دل میں بیٹے کی کیسی وقعت تھی۔

یہ قاعدہ ہے کہ علمی دنیا میں نقادان فن یگانگت و رشتہ داری کے باعث اپنے عزیزوں کی نسبت ایسی رائے قائم کرتے ہیں جس سے اس عزیز کے مراتب کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ ہم نے اس خیال سے کہ پاسداری

۱؎ جس وقت راقم نے یہ دیباچہ دیکھا تھا اسی وقت کھٹکا ہوا تھا کہ خدا خیر کرے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جو چیز زیادہ پسند ہوئی ہے وہ دلپسند ہی مہلک ثابت ہو جاتی ہے۔ منشی صاحب کی یہ رائے نہ تھی بلکہ فال بد اور شگون ہے۔ ع "مزن فال بد کآورد حال بد"

کا بدنما دھبہ ان کے دامنِ نقادی پر لگ جائے۔ اس بنا پر منشی صاحب کی مذکورہ بالا رائے سے اگر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ حضرت اختر کی لیاقت اس سے سوا مستحقِ داد تھی، تو اس میں تو کلام ہی نہیں کہ منشی صاحب کی رائے حق بجانب اور بے لوث ہے۔

حضرت اختر کی فارسی اور اردو نظم و نثر کی بابت حضرت داغ دہلوی کے مایۂ ناز تلمیذ مولانا مولوی عبدالحی صاحب تجود بدایونی مجسٹریٹ جودھپور کی تقریظ کے چند الفاظ تو کافی ہوں گے، جو ممدوح نے اختر کے مخزنِ تدابیر پر ریویو کرتے وقت لکھے تھے:

"اس سے قطع نظر یہ بات کیا کم قابل ثنا ہے کہ اختر خندہ گوہر نے اپنی طبیعت کی جودت سے جو مشق سخن کے واسطے بہت موزوں واقع ہوئی ہے، شعر گوئی میں ملکہ پیدا کر کے، پہلے ایک قومی مسدس مسمیٰ بہ مخزن الفصاحت مرتب کیا اور پھر افسانہ شمع دل افروز کو خلعت نظم پہنا کر جلوۂ ترتیب دیا، جس کا تاریخی نام مثنوی منظوم الآلام ہے۔ پھر ہزاروں شعر دہ بھی بقید ترجمہ نظم فرمائے اور ترجمہ بھی کس کا، چیل، کوؤں، طوطی، مینا، کی کہانیوں کا۔ کہانیاں بھی کیسی پند آمیز و عبرت خیز اور پھر بھی صفائی کلام، چستی بندش، برجستگی محاورات، خوبی مصطلحات، فصاحت زبان، سلاست بیان سے تمام مثنوی مخزن تدابیر مالامال ہے اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ کہیں تعقید کا نام ہے نہ گنجلک کا نشان، بے تکلف ترکیبیں ہیں اور بے تصنع بیان۔"

راقم نے بھی مرحوم کی مثنوی پر اپنی منظوم رائے ظاہر کی تھی جس کے چند اشعار یہاں پر اس لئے نقل کئے جاتے ہیں کہ کلام اختر کی خصوصیات کی اجمالی کیفیت کا اندازہ ہو جائے:

"وہ ہر شعر بے ساختہ بے تکلف — مسلسل بیاں، مثل گیسوئے دلبر
وہ ہر قافیہ چست، بندش نرالی — وہ ترکیب نادر، وہ ترتیب خوشتر
وہ لطف زباں، اصطلاحوں کی خوبی — وہ تشبیہ، وہ استعارات بہتر
زباں شستہ ہے، صاف ہے روزمرہ — سخن میں ہے رنگینی رشک گل تر
نہیں نام کو نام آورد اس میں — کلام است معمور آمد سراسر
کہیں بزم میں رنگ دلکش دکھائے — کہیں رزم میں تیغ خامہ کے جوہر
کہیں انقلاب زماں کا ہے فوٹو — کہیں کوئی نیرنگ قدرت کا پیکر

دکھائے کہیں سین فرح و خوشی کے بتائے کہیں عشق و وحشت کے منظر

حضرت اختر کی آخری تصنیف تضمین بے بہا ایک نایاب کتاب ہے۔ طباع شاعر نے مشق فن کے ایسے اچھے نمونے دکھائے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اس لطف ناؤ نوش کے چکھو گے تم مزے یہ نشۂ و سرور وہاں رنگ لائیں گے
ہولو گے غضب مصیبت و آفت کے سامنے میں نے کہا کہ یہ تو ہیں ہم خوب جانتے
پر کیا کریں کہ ہے ابھی عالم شباب کا

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

غرض کیا کیا نہ دفع درد کی تدبیر کی اختر دعا مانگی، دوا کی اور رکھا پرہیز بھی اکثر
دیئے تعویذ عامل نے کئے سیانوں نے کچھ منتر مگر یہ دل نہ بدلا، اس کی مت بدلی رہی مضطر
وہ کیا بدلے کہ جس نے یار سے شرط وفا بدلی

تضمین میں بعض اشعار ایسے اچھے نکالے ہیں کہ شاید و باید۔ ان کا دیوان جس میں جملہ اصناف سخن پر طبع آزمائی کی ہے، عنقریب چھپ کر شائع ہونے والا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ جودت طبع کے باعث معنی آفرینی پر قادر ہو گئے تھے۔ بعض بعض مضامین تو ایسے پُر معنی ہیں کہ ان کی دقت نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ معنی آفرینی، نازک خیالی اور صفائی بیان کے حد درجہ پابند تھے۔ زیادہ تر ان کا کلام ایسا نکھرا ہوا ہے کہ آمد کا صاف صاف پتہ چلتا ہے۔ رنگینئ بیان کے نمونے بھی اکثر پائے جاتے ہیں۔ اخلاقی مضامین سے ان کو طبعی انس تھا۔ زور طبیعت کے سبب سے کبھی الفاظ اس طرح بھی ترکیب دیے جاتے ہیں کہ بول چال میں اُس طرح نہیں بولتے۔ لیکن جو شعر دیوان میں صاف صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ ظریف بھی تھے۔ اثنائے گفتگو میں کبھی ایسے فقرے بھی برجستہ نکل جایا کرتے تھے کہ خواہ مخواہ لوگ ہنس پڑیں۔

بے تعصبی میں بھی اپنے بزرگوں سے حصہ پایا تھا۔ ان کا کلام اس اخلاقی لغزش سے بالکل پاک و صاف ہے۔ تصوف کے بعض نکات بھی بڑی خوش اسلوبی سے حل کئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ رباعیات،

ہر شے میں خدایا ہے تجمّل تیرا ہر چیز میں موجود تسلسل تیرا
گلشن میں گل اور گلوں میں رنگ و بو ہے تو ہی ہے جز و کل کا، جز و کل تیرا

سودا ہے مرے دل میں سمایا تیرا　　آنکھوں میں بھی ہے نور خدایا تیرا
کعبہ میں، خرابات میں، بت خانہ میں　　ہر جا مجھے جلوہ نظر آیا تیرا

غایت بے تعصبی ملاحظہ ہو:

کس منہ سے کروں مدح محمد اختر　　کیا صل علیٰ نام یہ آیا لب پر
وہ ظل الٰہی ہے وہ نور اسلام　　کام اس کا شفاعت ہے بروز محشر

بعض انگریزی نظموں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ترجمہ میں بھی اپنی جدت اور صفائی بیان کو جانے نہیں دیا ہے۔ ایک نظم کا انگریزی سے ترجمہ کیا ہے جس کا عنوان ہے "پتنگ" ۱۸ شعر کی مسلسل نظم ہے۔ آخر میں نتیجہ بہت اچھا نکالا ہے:

یوں ہی سب کی ڈور ہے اختر خدا کے ہاتھ میں　　حکم بن پتا بھی ہل جائے ذرا مقدور کیا

ان کی اخلاقی نظمیں اور بھی ہیں جو موقع موقع سے ہدیۂ ناظرین کی جائیں گی۔ فارسی کے چند قطعات ملاحظہ ہوں:-

ببیں بے ثباتی عالم نظر کن　　خیال شب و روز شام و سحر کن
نگاہے بدوران شمس و قمر کن　　برنج و خوشی ہر چہ آید بسر کن

ببیں بے ثباتی عالم نظر کن　　ز دنیا و از اہل دنیا حذر کن
اجل در کمین غفلت از سر بدر کن　　خدا را ز دل یاد شام و سحر کن

بس اے اختر اکنوں سخن مختصر کن　　تو بر گفتۂ خود عمل بیشتر کن
ز کردار بیہودہ اکنوں حذر کن　　ز حسن عمل زاد راہ سفر کن

غزلوں کے متفرق اشعار دیکھئے:

نہ پوچھ لے داور محشر، جو کچھ گذری مرے دل پر　　کہ مجھ سے دوست کا، غیروں میں شکوہ ہو نہیں سکتا
امید مہر ناحق ہے بت بے مہر سے اختر　　تم اس کے ہو رہے ہو، وہ تمہارا ہو نہیں سکتا

آنکھ کو حسرت دیدار ہے کس کی؟ تیری　　دل مرا شیفتہ، ناز ہے کس کا؟ تیرا

اس غزل میں اسی طرح سوال و جواب مسلسل ہیں:

مانگتے ہیں غمزہ و ناز و ادا، کس کس کو دوں　　میرے پہلو میں فقط لے دے کے اک دل رہ گیا

رک گیا یوں دل میں آکر ناوکِ مژگانِ یار — راہرو جس طرح تھم جاتا ہے منزل دیکھ کر

تقاضا ہے یہ اُن پر اُن کے شوقِ خود نمائی کا — کوئی اب چاہنے والا، ترے قربان پیدا کر

حضرت اختر چلے دورِ شراب — خاک ڈالو گردشِ ایام پر

اوپر کے شعر کا آخری مصرعہ حافظ کے اس مصرعہ کا سلیس ترجمہ ہے کہ ؎ "خاک بر سر کن غمِ ایام را"

جور بے جا کون سہتا ہے مگر — ہم کو اُلفت ہے تمہاری کیا کریں

غضب کی بدظنی صیاد ہے تجکو اسیروں سے — قفس میں بند کر کے بھی ہمالے پر کترتا ہے

ہماری داستانِ درد سُن کر یوں کہا اُس نے — یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کسی پر کون مرتا ہے

دلِ مشتاق سا دیکھا نہ کوئی سادہ دل ہم نے — جو اس کو بھول جاتا ہے اسی کو یاد کرتا ہے

غرضکہ ایسا باکمال عمر کے صرف ۲۷ مرحلے طے کر کے ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو یاس و حسرت کے ساتھ اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گیا اور اپنے قدر دانوں کو اس نوحہ خوانی کے لئے چھوڑ گیا کہ:

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے — حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بے کھلے مرجھا گئے

اکلوتے لائق جوان بیٹے کی قبل از وقت موت پر باپ جس قدر ماتم کرے بجا ہے۔ اگر خون کے آنسو بہائے جب بھی کم ہے۔ منشی دیبی پرشاد صاحب بشاش کو اس عالمِ ضعیفی میں کئی روحانی صدمے ایسے ناقابلِ برداشت ہوئے جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی اور دل و دماغ کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ مزید براں: ؎ دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے پسر کا داغ ؛ سب سے بُرا یہ ہوتا ہے لختِ جگر کا داغ لیکن جس قدر یہ صدمہ جانکاہ ہے، اسی قدر آپ کا ضبط و استقلال بھی حیرت انگیز اور غیر معمولی ہے۔ خدا ان کو صبر عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت۔

مرحوم اختر کے تعلقات راقم کے ساتھ جیسے گہرے تھے اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک جان اور دو قالب تھے۔ اظہارِ اسمِ یگانگت کا اعادہ گویا رنج و غم کا اعادہ کرنا ہے۔ مرحوم کے اخلاص و محبت، یکجہتی و یک دلی، دوست نوازی و دوست پروری، حلم و بردباری اور سراپا مرنجاں و مرنج ہونے کو جوں جوں یاد کرتے ہیں دل بھر آتا ہے اور بیساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:

وعدہ خلافِ یار سے کہیو پیام بر — آنکھوں کو روگ دے گئے ہو انتظار کا

مرثیہ گوئی کے لئے تو عمر بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ پھر اس سے حاصل؟ مرحوم کے راقم پر جتنے حقوق ہیں وہ کسی طرح اگر ایک حد تک ادا ہو سکتے ہیں تو یوں کہ اُن کے سچے حالات نذرِ ناظرین کر دیئے تاکہ قدر دانانِ زبان بھی اپنا حق اس طرح ادا کریں کہ

؎ گویند ذکرِ خیرش در خیلِ عشق بازاں — ہرجا کہ نامِ حافظ در انجمن بر آید

سطورِ بالا کے پڑھنے سے ناظرین پر بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ راقم نے اصلی حالات پیش کر دیئے ہیں اور مبالغہ یا بے جا ستائش سے کام نہیں لیا ہے۔ ع خدا لگتی کہیں گے ہم بھی اک دن مرنے والے ہیں

—— ک۔ محمد اسد علی (مارچ ۱۹۱۳ء)

مرزا سرور مغفور

[اس میں کوئی شک نہیں کہ نثر اُردو کے ساتھ مرزا رجب علی بیگ سرور کا نام ہمیشہ عظمت سے لیا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ بدل گیا اور مذاق میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی۔ اُردو نے اب وہ سادگی اختیار کی ہے کہ مسجع عبارت طبیعت کو ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن جس طرح آج پروفیسر آزاد اور ڈاکٹر نذیر احمد کی سلیس اُردو نے دلوں کو مسخر کر لیا ہے، ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ سرور مغفور کا رنگ اُردو کی دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ متقدمین کے ایجادات سے فائدہ اٹھا کر متاخرین ان ایجادات کو اور چمکا دیتے ہیں۔ تغیرات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پرانے خیالات کی جگہ نئے خیالات دخل پاتے ہیں۔ اُردو ترقی کرے گی اور بہت کچھ ترقی کرے گی۔ یہ سب ہو گا لیکن یہ نہ ہو گا کہ اردو نثر مسجع کا موجد سرور مغفور کو قرار نہ دیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ جملہ اصناف سخن میں اس طرز خاص کو خوش اسلوبی کے ساتھ قائم رکھنا سرور ہی کی جدت پسند طبیعت کا کام تھا۔ ذیل کے مضمون میں سرور مغفور کے سوانح بڑی تحقیق سے قلمبند کئے گئے ہیں جس کے لئے ہمیں منشی نوبت رائے صاحب نظر لکھنوی کا بیحد مشکور ہونا چاہیے۔ موصوف اپنی انشا پردازی کا ثبوت صفحات ادیب میں دے چکے ہیں اور ممدوح کے اس پاس وضع کی داد دیے بغیر ہم نہیں رہ سکتے کہ ادیب کی جگہ اب تک اپنے دل میں رکھتے ہیں۔ (اڈیٹر)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

علم ادب کی عالیشان بارگاہ میں فسانہ نگاری کی سامعہ نواز صنف ایک غیر معمولی منزلت رکھتی ہے اور دُنیا کی ہر زبان میں اس کا پایہ ہمیشہ بلند رہا ہے۔ خصوصاً ہندوستان قصص و حکایات کا مخزن ہے۔ حتی کہ یہاں کی قدیم تاریخیں بھی قصوں ہی کے پیرایہ میں نظر آتی ہیں۔ لیکن اُردو صدیوں تک اس دولت سے محروم رہی۔

اس کی ابتدا محض بازاری ضروریات سے ہوئی تھی اور کئی صدی بعد تفنن طبع کے طور پر اس میں شاعری کا رواج ہوا حتیٰ کہ شاعری کے ترانے بھی صدیوں تک گونجتے رہے مگر نثر کو اس کے دربار میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی رفتہ رفتہ جب شاعری اپنی تمام منزلیں طے کر چکی اور اس میں قصوں کا رواج مثنویوں کی صورت میں ہونے لگا تو لوگوں کو نثر میں بھی قصے لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

نثر اُردو کی سب سے پہلی تصنیف "دہ مجلس" ہے۔ جو ۱۱۴۵ھ میں لکھی گئی تھی۔ اس کے ۱۷ برس بعد "نوطرز مرصع" تصنیف ہوئی، جو فارسی کے چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ اس کے بعد نثر اُردو کو ترقی دینے کی ایک خاص کوشش ہوئی اور فورٹ ولیم کلکتہ سے جان گلکرسٹ صاحب کی سرپرستی میں اُردو کی چند کتابیں اور شائع ہوئیں، جن میں باغ اُردو آرائش محفل باغ و بہار طوطا کہانی پریم ساگر اور بیتال پچیسی زیادہ مشہور ہیں۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سید انشاء نے "دریائے لطافت" میں فارسی و اُردو کی کھچڑی سے ظرافت پسند طبائع کی مہمانی کی۔ لیکن اس وقت تک اُردو اپنی مقررہ حد سے بہت آگے بڑھ آئی تھی اور اب نظم کی طرح اس کی نثر میں بھی رنگینی اور زور تحریر کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی حتیٰ کہ تقریباً چہارم صدی بعد "فسانۂ عجائب" تصنیف ہوا جو اپنے امثال و اقران میں سب سے نرالا اور ایک خاص طرز تحریر پر مبنی تھا۔ اس کے مصنف مرزا رجب علی بیگ سرور تھے جن کے حالات اس مضمون میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ بہرکیف یہ چند سیڑھیاں ہیں جنہیں طے کر کے آج ہم اردو انشا پردازی کے بام ترقی تک پہنچے ہیں اور فضائے ادب کی موجودہ بلندی پر پہنچ کے ہمیں ان ابتدائی زینوں کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔

فسانۂ عجائب سے پہلے جن کتابوں کا ذکر ہوا وہ سب قریب قریب غیر زبانوں کا ترجمہ ہیں جن میں جدت کو مطلق دخل نہیں۔ مذکورۂ بالا کتب کے علاوہ بستان حکمت کلیلہ دمنہ، گل بکاؤلی (نثر)، گلشن نوبہار، گل و صنوبر اور انشائے بہار بے خزاں وغیرہ بھی اُسی زمانہ کی تصنیفات ہیں جو فورٹ ولیم سے باہر ہندوستان کے دوسرے شہروں میں لکھی گئیں۔ ان میں زیادہ تر ایسی کتابیں ہیں جو لکھنؤ میں تصنیف ہوئیں۔ اس وقت سارے ہندوستان میں لکھنؤ ہی ایسا شہر تھا جو مرجع علم و ہنر ہو رہا تھا اور گرد و پیش کے تمام اہل کمال وہیں سمٹ آئے تھے۔ اس صورت میں جدت پسند طبیعتوں کی فراوانی ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن ایجاد کے ساتھ اس میں کمال حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔

مرزا سرور نے بدو فطرت سے جدت پسند طبیعت پائی تھی اور نثر اُردو کی جس صنف کو انہوں نے ایجاد

کیا تھا وہ انہیں پر ختم ہو گئی۔ فسانۂ عجائب اُن کی پہلی تصنیف ہے جس میں نہ صرف اُردو طرزِ انشا میں رنگینی اور زور ہی پیدا کیا گیا ہے بلکہ فارسی نثر مسجع کا پورا نمونہ دکھایا گیا ہے، جو اس وقت اردو میں موجود نہ تھی۔ فسانہ کے علاوہ اُن کی اور بھی متعدد تصنیفات ہیں اور سب میں یہی التزام قائم ہے۔ اس بحث کو آسانی کے ساتھ ذہن نشین کرنے کے لیے ہم نثر مسجع کی مختصر تشریح ضروری سمجھتے ہیں۔ فارسی میں نثر مسجع کی تین قسمیں ہیں: (۱) متوازی (۲) مطرف (۳) متوازن۔ اصطلاح سجع میں متوازی اس عبارت کو کہتے ہیں جس کے فقرے مقفّی ہوں اور ہر قافیہ وزن اور حرف رَدی کے اعتبار سے مساوی ہو جیسے: گُل و مُل، خنجر و نشتر، مخموری و مہجوری وغیرہ۔ مطرف کے فقروں میں بھی قافیوں کی قید ہے، لیکن قافیوں میں وزن کی قید نہیں ہے۔ صرف رَدی کی قید ضروری ہے۔ مثلاً: وقار، اطوار، دور و دیجور، مال و منال وغیرہ۔ متوازن کے قافیوں میں وزن کے ساتھ حروف کے شمار کی بھی قید ہے۔ لیکن ردی کی قید نہیں۔ جس طرح "اعمار و افعال" "وجود و خضور" وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان قیود کے ساتھ نثر مسجع کس قدر مشکل صنف ہے۔ لیکن اس مشکل پسندی کے ساتھ بھی جو اہلِ لکھنؤ نے ضرورتاً اختیار کی تھی، مرزا سرور کی انشا پردازی فصاحت و بلاغت کا سرچشمہ ہے اور یہی ان کے کمال کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ان کی تمام ضخیم تصنیفات میں فارسی کے غیر مانوس الفاظ و تراکیب کا ذکر تک نہیں۔ عبارت میں ربط و روانی کے بھی وہی موجد ہیں اور زورِ قلم بھی ان میں معمول سے زیادہ تھا۔ ان خصوصیات کے ساتھ اُن کی طبعی رنگینی نے فسانہ نگاری کے کالبد میں جان ڈال دی تھی۔

مرزا کی ولادت غالباً ۱۲۰۱ھ یا ۱۲۰۲ھ میں ہوئی تھی۔ اُن کی وفات سے تھوڑے دنوں پیشتر جن لوگوں نے انہیں دیکھا تھا وہ اس وقت اُن کی عمر ۸۰ سال سے متجاوز بتاتے ہیں اور اُن کا سال وفات ۱۲۸۴ھ ہے۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ قرینِ قیاس ہے۔ اُن کے والد کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا اور شرفائے لکھنؤ میں شمار ہوتے تھے۔ فارسی و عربی کی تعلیم سے فارغ ہو کر مرزا نے خوش نویسی کی مشق کی اور اپنے وقت کے ایک نامور خطاط ہوئے۔ جیسا کہ اس فن کے تذکروں سے واضح ہے۔ علم موسیقی میں بھی خاص کمال رکھتے تھے اور شاعری میں بھی اُن کی خاص شہرت ہے۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کمال فسانہ نگاری ہی کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ خوش نویسی میں وہ مشہور خطاط حافظ محمد ابراہیم کے شاگرد تھے جن کا ذکر فسانۂ عجائب میں موجود ہے۔ شاعری میں انہیں آغا نوازش حسین خان عرف مرزا خانی سے تلمذ حاصل تھا، جو اپنے عہد کے کامل الفن شاعر تھے۔ اب ان مرحوم کا کلام نایاب ہے اور صرف چند اشعار مرزا سرور کی سعادت مندانہ کوشش سے فسانۂ عجائب میں محفوظ ہیں۔ سرور نے فرطِ عقیدت سے ان اشعار کے پہلے لفظ استاد لکھ دیا ہے۔ شاعری کے متعلق ان کی خاص تحریروں سے، جن سے اس مضمون میں

مدون کی گئی ہے، کہیں پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اپنا دیوان جمع کیا تھا ورنہ ان کی نثر تصانیف کی طرح وہ بھی معرض طبع میں آجاتا۔ کیونکہ ان کا جس قدر کلام ان کی نثر تصنیفات میں منتشر ہے وہ سب کا سب آمد اور فطری جذبات سے لبریز ہے بلکہ شعرائے قدیم میں ہر بڑے سے بڑے شاعر کے کلام سے ٹکر کھاتا ہے۔

مرزا سرور کی ابتدا اس لکھنؤ میں ہوئی تھی جہاں مرزا سودا، میر تقی، میر سوز، خواجہ درد، میر حسن، سید انشا، میاں مصحفی، میاں جرأت، اپنی اپنی شاعری کے ترانے سنا کے یکے بعد دیگرے اٹھ گئے تھے اور شیخ ناسخ، خواجہ آتش، میاں دلگیر، میر خلیق، میر ضمیر وغیرہ اپنی نغمہ سرائی کے ڈنکے بجا رہے تھے۔ اسی طرح رند، صبا، وزیر، قلق، انیس، دبیر وغیرہ سب کی ابتدا و انتہا ان کی نظر سے گزری تھی۔ مرزا غالب مرحوم صرف ان کے ہمعصر تھے بلکہ ہم عمر بھی اور دونوں میں رشتۂ اتحاد بھی قائم تھا۔ جیسا کہ غالب کی اس تقریظ سے جو "گلزار سرور" میں درج ہے اور جس کی نقل حسب موقع کی گئی ہے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ درحقیقت مرزا سرور کی قدر مرزا غالب سے زیادہ کسی نے نہیں پہچانی جو اس عام مقولے کی مصداق ہے کہ اہل کمال کے قدردان اہل کمال ہی ہوتے ہیں اور وہی ایک دوسرے کے کمالات کی باریکیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ لطف یہ کہ مرزا غالب کو نثر معرا میں کمال حاصل تھا اور مرزا سرور کو نثر مسجع میں۔ اس لئے دونوں میں کوئی معاصرانہ لاگ بھی نہ تھی۔

مرزا سرور کی زندگی کا پہلا واقعہ ان کی لکھنؤ سے جلاوطنی ہے جو ۱۲۴۰ھ میں واقع ہوئی۔ چنانچہ کانپور پہنچ کے لکھنؤ کے فراق میں جو بےچینی ان کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے وہ ایک گلزار سے چھٹ کے کسی بلبل کو بھی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شاہ زمن مرزا غازی الدین حیدر کے حکم سے گنگا پار اتار دیئے گئے تھے۔ لیکن سرور کی کسی تصنیف سے اس کا پتہ نہیں لگتا۔ البتہ فسانۂ عجائب میں انہوں نے کانپور کی ہجو جس عنوان سے کی ہے اس کا ہر فقرہ بتا رہا ہے کہ ایک جلاوطن کسی کالے پانی کی ہجو کر رہا ہے۔ بہرکیف فسانۂ عجائب یہیں تصنیف ہوا اور جب شاہ موصوف کا انتقال ہوا، تو مرزا سرور اس کا مسودہ لے کر لکھنؤ آئے۔ اس میں شاہ غازی الدین کی مدح اس امید پر کی گئی تھی کہ انہیں لکھنؤ آنے کی اجازت مل جائے گی لیکن ابھی فسانہ تمام نہ ہوا تھا کہ وہ انتقال کر گئے۔ لاجرم مرزا سرور نے نئے بادشاہ نصیر الدین حیدر کی مدح بھی اس میں داخل کی اور "لکھنؤ" کی ردیف میں ایک پُرزور غزل بھی درج کی جس کے بعض اشعار حب الوطنی کے سچے اور پُرجوش جذبات سے مملو ہیں۔

فسانۂ عجائب کے بعد انہوں نے طولانی عمر میں (۱) سرور سلطانی (۲) شرار عشق (۳) شگوفۂ محبت (۴) گلزار سرور (۵) نثر سنرۂ نثار (۶) شبستان سرور، اور (۷) انشائے سرور، بالترتیب تصنیف کیں۔

آخر الذکر کتاب ان کے خطوط وعرائض کا مجموعہ ہے جس میں فارسی اردو دونوں زبانوں میں مکتوبات درج ہیں لیکن میں نے اسے تصانیف کے ذیل میں اس لئے شمار کیا ہے کہ اُن کے پرائیوٹ تحریروں میں بھی ان کی اصلی انشاپردازی بدرجۂ کامل موجود ہے۔ ان کی بعض عرضداشتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے فسانۂ عجائب کو اکثر شاہانِ اودھ کی خدمت میں پیش کیا، لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا حتیٰ کہ ۲۳ برس تک وہ لکھنؤ میں عسرت کی زندگی بسر کرتے رہے اور اس اثنا میں ان کی شریکِ زندگی یعنی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا۔ مرزا کے لئے یہ بہت ہی صبر آزما زمانہ تھا کیونکہ عیال داری کا بوجھ جو معمول سے زیادہ تھا انہیں سر اُٹھانے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ سرور نے ایک فارسی خط میں اس واقعہ کا دردناک الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

آخر کار ان کی مصیبت کا زمانہ ختم ہوا اور تختِ لکھنؤ پر سلطانِ عالم واجد علی شاہ رونق افروز ہوئے۔ اس موقع پر مرزا سرور نے ایک نہایت عمدہ قطعۂ تاریخ کہا جو خوش قسمتی سے قطب الدولہ مفتاح الملک محمد قطب علی خان مستقیم جنگ مصاحب خاص سلطان عالم کی وساطت سے پیش ہوگیا۔

قطعۂ تاریخ

بہار جوش یہ ہے اور نئی ہے کیفیت	سرور سب کو ہے کہتے ہیں متقی و رند
جو زیب تخت ہوا اب کو شاہ نیک اختر[1]	ہوا ہے سال جلوس اس لئے چراغ ہند

۱۲۶۳ھ

بادشاہ نے اس قطعہ تاریخ کو بہت پسند کیا اور خلعت و انعام کے علاوہ مرزا کو ملازمین خاص کے زمرے میں داخل کر کے ۵۰ روپیہ ماہوار مقرر کر دیے۔ سرور کی زندگی کا تابناک دور یہیں سے شروع ہوتا ہے، جو انتزاع سلطنت تک قائم رہا۔ لیکن واجد علی شاہی دور کی بساط ہی کیا، وہ ایک ہوا کا جھونکا یا بجلی کی چمک تھا، جو آنکھ جھپکاتے ہی غائب ہوگیا۔ بہرکیف جلوس کے دوسرے ہی سال ۱۲۶۴ھ میں فارسی کی دوسری کتاب "شمشیر خانی"[2] کے ترجمے کی فرمائش کی اور مرزا سرور نے اسے اردو میں ترجمہ کر کے "سرور سلطانی" نام رکھا۔ نام کی مناسبت حدِ تعریف سے باہر ہے۔ لطف یہ کہ وقائع نگاری کے میدان میں بھی ان کی مخصوص طرز انشا اور رنگینی عبارت نثر مسجع کی قید کے ساتھ موجود ہے۔

فسانۂ عجائب اور سرور سلطانی کی اشاعت سے مرزا سرور کی انشاپردازی کا شہرہ تمام ہندوستان میں پھیل گیا تھا، یہاں تک کہ ۱۲۷۰ھ میں نواب سکندر بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال نے بھی مرزا سے ایک واقعہ کو قصے کے طور پر لکھنے کی فرمائش کی۔ یعنی کسی جنگل میں سارس کا ایک جوڑا تھا، جس کے نر کو کسی شکاری نے نشانۂ تفنگ

---

[1] "اختر" بادشاہ کا تخلص بھی تھا جس نے خاص لطف پیدا کیا ہے۔ [2] یہ کتاب فردوسی کے شاہنامہ کا خلاصہ ہے جو نثر میں کیا گیا ہے۔

بنا دیا۔ سارس کے جوڑے کی محبت مشہور ہے۔ چنانچہ مادہ نے فرطِ غم و تعلق سے گھل گھل کر آخر کار جنگل کی لکڑیاں جمع کیں اور چتا بنا کے ستی کی طرح جل گئی۔ مرزا سرور اس فرمائش کے متعلق لکھتے ہیں :

"القصہ بارہ سے سرسٹھ سن ہجری اور اٹھارہ سے اکاون عیسوی تھے کہ اس صاحب فہم و فراست مالکِ ریاست نے اس دیر دولت سے دور مجروح دل سرور سے بذریعہ مرزا وزیر اس حکایت کی فرمائش کی کہ تحریر ہو۔ بخدائے عزوجل کہ عالم الغیب بلا ریب ہے جس دم یہ صدا گوش زد ہوئی لکھنے کی مجھکو کد ہوئی۔ سردست (قلم برداشتہ) تحریر کی۔ دم بھر نہ تاخیر کی۔ مجبوری یہ ہوئی کہ ملازمان سرکار کمر بستہ چلنے کو تیار تھے اگر پانچ چھ روز کی بھی مہلت پاتا، ساتھ کیفیت کے گھٹاتا بڑھاتا۔ رزم کا ڈھنگ بزم کا رنگ، کسی پیرایہ میں دکھاتا"

درحقیقت قصہ بہت مختصر تھا اور مہلت بھی بہت کم ملی۔ تاہم سرور نے سارس کی مادہ کے سوز و گداز کو نہایت موثر الفاظ میں ادا کیا ہے۔ اس قصے کا نام "شرارِ عشق" ہے جو مناسبت کے لحاظ سے کچھ کم معنی خیز نہیں۔ اس کے بعد زمانہ آخر واجد علی شاہی میں مرزا نے ایک اور قصہ "شگوفۂ محبت" امجد علی خاں رئیس میح آباد کی فرمائش سے لکھا، جو اس وقت عہدۂ نظامت پر ممتاز تھے۔ اس کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے فسانۂ عجائب اور سرور سلطانی کے علاوہ کئی چھوٹے بڑے قصے اور بھی لکھے تھے جن میں شرارِ عشق کے سوا اور کسی کا سراغ نہ لگ سکا۔ اسی دیباچے میں لکھتے ہیں :

"اگرچہ پڑھنے لکھنے والے کم نہ ہوں گے، تاسف اتنا ہے کہ ہم نہ ہوں گے۔ قصہ اگر پسند آئیگا تو مشہور ہوگا، ہمارا ذکر ضرور ہوگا۔ اس وقت سہو اور غلطی معاف کرکے، طبیعت کدورت سے صاف کر کے جو صاحب اوصاف کلام سرور سے مسرور ہو وہ اتنا کرم فرمائے کہ عاصی غلامانِ حسین کے ہمراہ محشور ہو"

اس تحریر کے آخری فقرے سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا رجب علی بیگ کا مذہب اثنا عشری تھا۔ قصہ بالکل پرانے مذاق سے بھرا ہوا ہے، جسے مہر چند کھتری نے لکھا تھا اور مرزا سرور نے اُسے رطب و یابس سے پاک کرکے اپنے طرز پر تحریر کیا ہے۔ اس کے آخر میں واجد علی شاہ کے معزول ہونے اور کلکتہ کی طرف روانہ ہونے کی مختصر کیفیت بھی درج ہے :

" ان دنوں کہ بارہ سے بہتر سن ہجری اور مہینہ شعبان کا ہے مجمع پریشانیوں کے سامان کا ہے۔

یعنی سریر آرائے سلطنت حائل رنج سفر غربت بعزم لندن ہے، چھوٹا بڑا مبتلائے مصیبت تختۂ مشق اندوہ و محن ہے۔ اس گلزار ہمیشہ بہار میں بہمن و دے کا سامان ہے۔ ایسا آباد ملک سراسر ویران ہو۔ دیکھنے والوں کا جگر خون ہوتا ہے، وحشت برستی ہے۔ جنون ہوتا ہے ...."

عہد شاہی تک سرور عیش و راحت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن وہ زمانہ ایک خوش آئند خواب کی طرح بہت جلد گزر گیا۔ اب وہ پھر اسی اگلی فلاکت میں گرفتار ہو گئے۔ لکھنؤ میں محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی اُن کے پرانے دوست تھے، جن کا چھاپہ خانہ عہد شاہی سے قائم تھا۔ مرزا کی زیادہ تصنیفات اسی مطبع میں چھپی تھیں۔ انہیں کی وساطت سے شروع انگریزی میں مرزا کی رسائی کارنیگی صاحب سٹی مجسٹریٹ کے سررشتہ دار میر قربان علی تک ہو گئی اور وہ ان کے کفیل ہوئے۔ اسی سلسلے میں منشی شیو نرائن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، جو ان کے نمایاں مداح اور سچے قدرداں تھے۔ منشی صاحب محکمۂ کمسریٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرور نے ان دونوں حضرات کی بندہ پروری اور قدردانی کی تعریف کی ہے۔ خصوصاً منشی شیو نراین ان کی بہت کچھ مالی امداد کرتے رہے اور جب ان کی تبدیلی بنارس کو ہو گئی، تو مرزا کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ لیکن اس وقت وہ بوجوہ نہ جا سکے۔

تھوڑے دنوں بعد کارنیگی صاحب بھی ولایت چلے گئے اور ان کے سررشتہ دار میر قربان علی بھی اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ اب سرور پھر بے یار و مددگار ہو گئے۔ اس پر طرہ یہ کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر برپا ہو گیا جس نے سارا شہر خاک سیاہ کر دیا۔ مرزا سرور اس طوفان عظیم میں تنکے کی طرح اُڑتے پھرے اور جب انگریزی تسلط پر اپنے وطن میں واپس آئے تو اس جنت میں خاک اُڑ رہی تھی جس کی سرسبزی و شادابی پہ ان کو ناز تھا۔ خوش قسمتی سے میجر کارنیگی پھر ولایت سے آ گئے اور بعد فتح پھر لکھنؤ میں اپنے عہدے پر مامور ہوئے۔ ساتھ ہی میر قربان علی بھی آ گئے، مرزا سرور کو اتنا سہارا غنیمت تھا۔ میجر کارنیگی اور میر قربان علی تاریخی لوگ ہیں، جن کا ذکر تاریخ اودھ میں موجود ہے۔ ان دونوں نے لاکھوں پر ہاتھ صاف کیا اور شہنشاہی کے مزے لوٹے۔ دولت و حشمت کے علاوہ "طاؤس بیگم" بھی میر صاحب کے ساتھ ہو گئیں۔ بالآخر دونوں پر مقدمات قائم ہوئے اور آخرالذکر کو ۱۰ برس کا جیل خانہ ہوا۔ بہرکیف یہ صحبت زیادہ عرصے تک نہ رہی اور مرزا پھر مفلسی کا شکار ہو گئے۔

لیکن اس مرتبہ انہیں زیادہ عرصہ تک سختی نہیں جھیلنا پڑی اور ایک سال کے اندر ہی مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر کاشی نریش نے اپنا شقۂ خاص بھیج کر انہیں بنارس بلایا۔ ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو مرزا

بنارس روانہ ہوئے اور مہاراجہ نے انہیں نہایت اعزاز کے ساتھ قلعۂ خاص میں فروکش کیا۔ سرور کی زندگی کے آخری آٹھ نو سال یہیں بسر ہوئے اور یہیں ان کی مہتم بالشان تصنیفات "گلزار سرور" اور "شبستان سرور" معرض وجود میں آئیں اور بعض متفرق نثر و نظم بھی۔ اسی اثنا میں مہاراج شیو دین سنگھ بہادر والیٔ الور نے بھی انہیں طلب کیا تھا اور منشی یوسف علی خاں مصاحب راجہ صاحب ممدوح نے میر حسن علی کی معرفت ان کی طلبی کا خط بھیجا تھا۔ لیکن سرور چاہتے تھے کہ خود مہاراج کا شقہ آئے اور اسی وجہ سے الور جانا نہیں ہوا۔ لیکن جب مہاراجہ الور بنارس تشریف لے گئے تھے، تو مرزا نے باریابی حاصل کی تھی اور اپنے بڑے صاحبزادے کو جو کانپور میں مقیم تھے تحریر کیا تھا کہ مہاراجہ صاحب اسی راستے سے الور جائیں گے۔ تم خط گلزار میں " گل بھیجتے ہیں اور دل کی طرف بلکہ نثر بھی الخ" لکھ رکھنا اور ملاقات کر کے دیدینا۔ تمہارا ذکر آچکا ہے۔ غالباً اس وقت انہیں ضعف بصارت کی شکایت پیدا ہو چکی تھی، ورنہ ان خطوط کے وہ خود بہت بڑے استاد تھے۔ ایک مرتبہ مہاراجہ پٹیالہ نے بھی انہیں ازراہ قدردانی مرصع کردے کی جوڑی عنایت کی تھی۔ مرزا سرور کی ایک تحریر سے اُن کا دہلی جانا بھی ثابت ہوتا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

> "ایک ہفتہ میرٹھ میں قیام کر کے صبح کو شام کر کے مجبور کانپور روانہ ہوا۔ طپش دل کو بہانہ ہوا۔ راہ کی تنہائی، غیر جنس کی صحبت، ہر دم عالم حیرت کہ کل کیا تھا آج کیا ہوا۔ یا شاہجہان آباد کی گر وہ خانقاہ اور دیر یا جنگل کا راستہ تھا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں، گھر پہنچنے کی دُھن میں، کانپور نظر آیا۔ اختلاف آب و ہوا کا پانی جا بجا کا، ناک میں دم لایا۔ چندے وہاں رہا، جی نہ لگا۔ آخر شہر جمادی الاول (سنہ مذکورہ) میں وہاں سے چل نکلا۔ تین دن میں لکھنؤ پہنچا۔ ابھی گھر سے تا در قدم نہ آیا تھا، کسی سے ملنے نہ پایا تھا دفعتہً اس شدت سے تپ آگئی کہ حکیم صاحب کی نبض ساقط ہوئی، طبیعت گھبرا گئی۔ بر دست مسہل کی صلاح ٹھہری۔ پانچواں منضج تھا کہ جناب قبلہ و کعبہ مرزا خانی نوازش بندے کے استاد اس خراب آباد سے تشریف لے گئے۔ عجیب صدمۂ جانکاہ دے گئے۔ ...."

—— نوبت رائے نظر (جون ۱۹۱۳ء)

شبلی

فضیلت پناہ شمس العلماء مولانا شبلی صاحب نعمانی اپنے ایک نوازش نامہ میں "ادیب" اور اس کے ذریعہ سے اُردو علم ادب کی ترقی کے متعلق حسب ذیل تحریر فرماتے ہیں، جو اُردو اہل قلم کی خاص توجہ کے قابل ہے:

"ادیب کے حُسن ظاہری میں کیا شک، اور حسن معنوی میں بھی اُردو کے کسی رسالہ سے کم نہیں۔ یا یوں کہیئے کہ کوئی رسالہ اس سے بڑھ کر نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب ایک محدود دائرہ سے آگے قدم بڑھانا چاہیئے۔ اب تک جو کچھ ہو رہا ہے، یا اپنی داستانیں ہیں، یا یورپ کی نہایت سرسری معلومات۔ اس سے زبان کی ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کوشش کی جائے کہ ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کا فلسفہ اُردو زبان میں آئے۔ انگریزی سے اُردو میں جو کچھ منتقل ہو رہا ہے ادنےٰ اور ادنےٰ درجہ کے معلومات ہیں۔ ان کو کہاں تک بار بار پڑھیے۔ یورپین معلومات کے لحاظ سے آج سے دس برس پہلے ہم لوگ جہاں تھے، اب بھی وہیں ہیں۔"

— ایڈیٹر (اگست ۱۹۱۰ء)

محمد حسین آزاد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (مصنف آبحیات، دربار اکبری وغیرہ) کی وفات جو ۲۱ جنوری سنہ حال کو واقع ہوئی ہے، اُردو ادب کے لئے ایک سخت ماتم ہے۔ آپ زبان اردو کے سب سے پہلے محسن اور ہندوستان میں سب سے پہلے شمس العلماء تھے۔ موجودہ علم ادب کی داغ بیل اسی فاضل اور یگانۂ آفاق ادیب کے قلم نے ڈالی تھی اور اپنے زور علم اور بلندی خیال کی بدولت فضلائے ادب کی اس بلندی پر پہنچے جہاں جاتے ہوئے طائر خیال کے پَر جلتے ہیں۔ وہ اپنی وفات سے پہلے ہی بہشت میں پہنچ گئے تھے، جہاں رنج و راحت، تنگی و بدی اور دنیا کے شور و شر سے فراغت حاصل ہو جاتی ہے اور جہاں دائمی مسرت اور سرور ابدی کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ ہم حضرت مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

— ایڈیٹر (فروری ۱۹۱۰ء)

سید علی بلگرامی

ملک میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ پڑھی گئی ہے کہ شمس العلما ڈاکٹر مولوی سید علی صاحب بلگرامی بالقابہ ایم اے، ڈی لٹ - پی ایچ - ڈی، بیرسٹر ایٹ لا، ۳ مئی کو یکایک ہردوئی میں انتقال فرما گئے۔ شمس العلما موصوف قوم کے ایک برگزیدہ ممبر اور اپنی بیش بہا علمی قابلیتوں کے لحاظ سے فرد فرید تھے۔ ہندوستان وانگلستان اور دیگر بلاد یورپ بلکہ دنیا میں ان کی علمی شہرت تھی اور یقین ہے کہ ان کی وفات کی خبر ہر جگہ نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی۔ ہم مرحوم کے اہل خاندان کے ساتھ اُن کے رنج وغم میں شریک ہیں اور ان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں : ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

آئندہ نمبر میں ہم مرحوم کے حالات وتصویر ہدیۂ ناظرین کریں گے۔ — ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۱ء)

مولوی عزیز مرزا مرحوم

"افسوس ہے کہ ہندوستان کا ایک اور اہل قلم اور محب قوم شخص دنیا سے گذر گیا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ نے دو تین روز کی علالت کے بعد بعارضہ درد گردہ ۲۶ فروری ۱۹۱۲ء کو دن کے ۱۱ بجے لکھنؤ میں انتقال فرمایا۔

"مرحوم کا وطن پہاسو، ضلع بلند شہر تھا۔ ان کی ولادت ۱۲۸۰ھ میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد وزیر بیگ صاحب نواب پہاسو کے ہاں منتظم تھے۔ انہوں نے ابتدا سے آخر تک علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی اور ۱۳۰۴ھ میں بی اے کی سند حاصل کی۔ زمانۂ تعلیم میں وہ اپنی ذہانت اور حسن تقریر کے سبب تمام طلبا سے کالج میں ممتاز خیال کیے جاتے تھے۔ انگریزی زباندانی اور تاریخ دانی میں انہوں نے انعامات حاصل کیے۔

"سر آسمان جاہ مرحوم کے عہد وزارت میں وہ حیدر آباد دکن میں بلا لیے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مولوی مشتاق حسین صاحب حیدر آباد کے نظم ونسق پر حاوی تھے۔ انہوں نے مرحوم کو سرکار عالی کے سلسلۂ ملازمت میں داخل کرایا۔ ۱۳۰۸ھ میں وہ ہوم سکریٹری کے دوم مددگار مقرر ہوئے۔ ۱۳۱۰ھ میں مجلس وضع قوانین کے سکریٹری قرار پائے۔ ۱۳۱۲ھ میں جوڈیشل سکریٹری کے اول مددگار کر دیے گئے۔ ۱۳۱۴ھ میں کورٹ آف وارڈس کے سپرنٹنڈنٹ ہوئے۔ قابل تعریف امر یہ تھا کہ انہوں نے یتیموں کے مال سے حق الخدمت لینا پسند نہیں کیا۔ ۱۳۱۵ھ میں وہ منصرم متعلقہ عدالت وکوتوالی وامور عامہ کی خدمت پر مامور رہے۔ ۱۳۱۹ھ میں وہ چند روز کے لیے تعلقہ داری بیڑ پر روانہ کیے گئے مگر اس سے چار سال بعد ۱۳۲۳ھ میں وہ پھر حیدر آباد بلائے گئے اور دکن کی عدالت عالیہ کے مقرر ہوئے۔ آخر زمانۂ ملازمت میں وہ ہوم سکریٹری کے عہدہ پر ممتاز تھے، مگر ایک غلط سازش کی وجہ سے جس میں ان کے نام سے جعلی تحریر جاری کی گئی تھی کہ وہ نظام مرحوم کو تخت سے جدا کرنے

کے درپے میں، وہ حیدرآباد سے علحدہ کئے گئے، تاہم قدیم خدمات کے لحاظ سے اُن کی تنخواہ کی نصف پنشن ان کے لئے منظور کی گئی۔

"زمانۂ ملازمت حیدرآباد میں بڑے بڑے عہدہ داروں نے ان کی لیاقت اور قابلیت کو تسلیم کیا اور انہوں نے ذمہ داری کی بہت سی خدمات کو نہایت عمدگی اور خوبی سے انجام دیا۔ کوئی سرکاری کمیٹی حیدرآباد میں ایسی نہیں تھی جس کے وہ ممبر نہ ہوئے ہوں۔ آخر زمانۂ ملازمت میں انہوں نے ایک تجویز پیش کی تھی کہ حیدرآباد میں مشرقی علوم کی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ اس کی اسکیم تیار کرنے کے لئے شمس العلماء مولانا شبلی حیدرآباد بلائے گئے تھے۔ اسکیم تیار ہو چکی تھی اور سرکار نے بھی اس کو منظور کر لیا تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی علحدگی کی وجہ سے یہ عمدہ اور مفید تجویز التوا میں آ گئی۔ اگر موجودہ نظام عالی مقام اس تجویز کو از سر نو زندہ کریں اور مجوزہ یونیورسٹی قائم کرنے کا حکم دیں تو نہایت مناسب ہے اور یہ اُن کے عہد حکومت کی عمدہ یادگار ہوگی۔ ایام ملازمت حیدرآباد میں مرحوم کی سب سے نمایاں خصلت یہ تھی کہ وہ لوگوں کی نفع رسانی میں دل سے کوشش کرتے تھے۔ دوست تو دوست کوئی دشمن بھی اس بات کا شاکی نہ تھا کہ ان کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچا ہو۔

" حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں جبکہ "آل انڈیا مسلم لیگ" کا اجلاس دہلی میں ہو رہا تھا، وہ لیگ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ جب لکھنؤ میں لیگ کا دفتر قائم کیا گیا، تو انہوں نے دفتر مذکور کو خاص طور پر وسعت دی۔ تعلیمی معاملات سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی اور یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی اور سنڈیکیٹ کمیٹی علی گڑھ کالج کے ممبر تھے۔ ندوہ کے کاموں میں بھی وہ اکثر دلچسپی لیا کرتے تھے۔

" تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آخری دم تک وہ مضمون نگاری اور انشا پردازی میں مشغول رہے۔ بہت سے رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کا مجموعہ ایڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور کے اہتمام سے آج کل زیر طبع ہے اور اس کے ساتھ مرحوم کی سوانح عمری بھی شامل ہونے والی ہے۔ گلگشت فرنگ جو یورپ کا ایک دلچسپ سفرنامہ ہے اور جس میں نواب مہدی حسن مرحوم کے سفر کے حالات ہیں انہیں کا مرتب کیا ہوا ہے۔ سیرت محمود گاواں ایک اور کتاب ہے جس میں انہوں نے تاریخی تحقیقات کی داد دی ہے۔ آخر میں ان کے قلم سے "وکرم اروسی" کے نام سے سنسکرت کے ایک دلچسپ ڈرامہ کا ترجمہ شائع کیا گیا ہے جس کے دیباچے میں انہوں نے مشرق اور مغرب کی ڈرامہ نویسی کا مقابلہ کیا ہے۔ اس کتاب سے ان کے پاکیزہ مذاق انشاپردازی کا اندازہ اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے ان کو اپنا ممبر بنایا تھا اور اس سبب سے وہ انگلستان کے علمی حلقہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کو قدیم سکوں کے جمع کرنے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ مرحوم

نے نادر سکوں کا ایک بڑا ذخیرہ بطور یادگار کے چھوڑا ہے۔ انجمن ترقی اردو (جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ ہے) کے بھی وہ سکریٹری قرار پائے تھے مگر افسوس کہ ان کو کام کرنے کی مہلت نہ ملی۔

"مرحوم کی یہ خصوصیت بھی قابل فخر تھی کہ وہ باوجود اعلیٰ انگریزی داں ہونے کے صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ ایام ملازمت میں جانماز عدالت میں ساتھ جاتی تھی۔ ایک دفعہ وہ کسی دوست کے ساتھ موٹر کار پر سوار جا رہے تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ نماز کے لئے وہ اتنے بیتاب ہوئے کہ موٹر کار سے کودنے کا ارادہ کر دیا۔ خیر یہ ہوئی کہ موٹر کار فوراً ٹھہرا دی گئی اور انہوں نے اتر کر نماز ادا کی۔

"چھ صاحبزادے مرحوم سے یادگار ہیں۔ جن میں سے مسٹر احمد مرزا حال ہی میں انگریزی میں پاس ہو کر ولایت سے آئے ہیں۔ ابو سعید مرزا ابھی ولایت میں ہیں اور عنقریب بیرسٹری کے امتحان سے فارغ ہو کر آنے والے ہیں۔ باقی چار صاحبزادے سجاد مرزا، بابر مرزا، عابد مرزا اور محمد مرزا جو کمسن ہیں ہندوستان ہی میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر مرحوم کی دیرینہ خدمات کے لحاظ حضور نظام عالی مقام ان کے صاحبزادوں کے لئے وظائف مقرر فرمائیں، تو یہ ایک نہایت مناسب تجویز ہوگی۔ علاوہ ان چھ صاحبزادوں کے ایک صاحبزادی بھی تھیں جن کی شادی ہو چکی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا اور ان سے ایک لڑکی یادگار ہے۔ مرحوم کو نواسی سے خاص محبت تھی اور مرتے دم تک یہ محبت قائم رہی۔" خداوند عالم سے ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" (مسلم گزٹ) (ادیب: مارچ ۱۹۱۲ء)

جسٹس کرامت حسین

یقیناً یہ خبر مسرت کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ ہمارے صوبہ کے روشن خیال اور ہمدرد قوم اور ہائیکورٹ کے نامور جج مولانا سید کرامت حسین بالقابہ نے تعلیم نسواں کی حقیقی ضرورت سے متاثر ہو کر یعنی بلا کسی خارجی تحریک کے ایک لاکھ ۸۰ ہزار کا گرانقدر عطیہ تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے وقف کیا ہے۔ اس عطیہ کا نام "کرامت فنڈ" ہوگا اور تاحیات وہ خود اس کے متولی رہینگے، بعدہٗ قوم اس کی مالک مختار ہوگی۔ فی الحقیقت ایسے وقت میں جبکہ تعلیم نسواں ہماری ترقی کا جزو لاینفک قرار دیدی گئی ہو اس بیش بہا عطیہ سے مولانا ممدوح نے اس تحریک میں نئی روح پھونک دی ہے اور آئندہ نسلیں کسی طرح ان کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتیں۔ یوں تو وہ عرصہ سے اس تحریک کے حامی ہیں، بلکہ الٰہ آباد کا کراستھویٹ گرلز ہائی اسکول بھی آپ ہی کی فیاضیوں کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے، مگر اس عطیہ سے انہوں نے بھی فیاضی اور بے لوث خیرات کی ایک صحیح نظیر قائم کی ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خدا ایسے مخلص علمی اور بار یافیاض کو مدت تک سلامت با کرامت رکھے۔ آمین — ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۲ء)

دربار نواب میر نظام علی خان بہادر

[ادب کے اس نمبر میں نواب میر نظام علی خان بہادر آصفجاہ ثانی کے دربار کی ایک تصویر شائع ہوتی ہے، جس کے لئے ہم بابو ہمنت راؤ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آپ نے تصویر کے ساتھ جملہ اصحاب کے متعلق نوٹ بھی ارسال فرمائے ہیں، جن کو ہم اس جگہ درج کرتے ہیں:-]

نواب میر نظام علی خاں بہادر آصفجاہ ثانی۔ آپ نواب میر قمر الدین خان نظام الملک آصفجاہ اول کے چوتھے فرزند تھے۔ ۱۱۴۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۶۷ھ میں برار کے صوبہ دار بنائے گئے۔ ۱۱۷۱ھ میں امیر الممالک نواب صلابت جنگ (جو اُن کے بھائی تھے) نے انہیں آصفجاہ ثانی کا خطاب دیکر اپنا ولیعہد مقرر کیا۔ ولی عہد ہوتے ہی انہوں نے ریاست کا کام انجام دینا شروع کیا اور پانچ سال تک نہایت اطاعت و فرماں برداری کے ساتھ اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ ۱۱۷۶ھ میں جب اراکین ریاست کے مشورہ سے امیر الممالک قلعہ میں نظر بند کیے گئے، تو نواب صاحب مو مستقل رئیس ہوئے۔ سن تمیز ہی سے ان کو بزد آزمائی کا شوق رہا۔ کوئی لڑائی ایسی نہ تھی جس میں انہوں نے داد مردانگی نہ دی ہو۔ انہوں نے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ۴۲ برس حکومت کرکے، ۷۰ سال ۶ ماہ ۱۷یوم کی عمر میں، ۷ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ کو انتقال کیا۔

ابو الخیر خان تیغ جنگ بہادر آپ کا سلسلۂ نسب شیخ فرید شکر گنج تک پہنچتا ہے۔ پدر بزرگوار کا نام شیخ بہار الدین تھا۔ جب حضرت آصفجاہ اول عازم دکن ہوئے اس وقت یہ بھی ان کے ساتھ آئے۔ حضرت موصوف نے انہیں دو ہزار منصب پانچسو سوار اور ۳۰ ہزار پیادہ کی جاگیر مرحمت فرمائی۔ ۸ ہزار سواروں کے ساتھ بابو نائک کا مقابلہ کرکے فتح پائی۔ جس وقت ناصر جنگ شہید اپنے والد ماجد آصفجاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے انہوں نے انہیں طرفدار بنانا چاہا، مگر انہوں نے انکار کردیا۔ تخت نشینی کے بعد ناصر جنگ نے ان کو شمشیر جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا۔ صلابت جنگ نے پالکی جھالردار اور امام جنگ کے خطاب سے ممتاز کیا۔ ۲۶ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو فالج سے انتقال فرمایا۔

سکندر جاہ آصفجاہ ثالث آپ نواب میر نظام علی خان بہادر آصفجاہ ثانی کے

* تصویر اس انتخاب میں شامل ہے۔

سب سے بڑے فرزند تھے۔ آپ کا نام میر اکبر علیخاں تھا۔ ۱۱۸۲ھ میں پیدا ہوئے۔ آصفجاہ ثانی کے انتقال کے بعد اعیان دولت و ارکان سلطنت نے انہیں ۲۲ ربیع الثانی ۱۲۱۸ھ کو تخت نشیں کیا۔ تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد آپ نے نواب ارسطو جاہ کو بدستور خدمت مدار المہامی پر بحال کیا اور اپنے گورنمنٹ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے درمیان سابق کے معاہدوں کی تصدیق کر کے اتحاد قائم رکھا۔ ۱۸ صفر ۱۲۲۱ھ کو راجہ چندو لال کو خدمت پیشکاری سے اور ۱۵ رجب ۱۲۲۴ھ کو نواب میر الملک کو مدار المہامی سے سرفراز فرمایا۔ نواب صاحب نہایت تنومند اور بہادر تھے۔ طب سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ کو ۲۶ سال سلطنت کر کے ۶۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور مکہ مسجد میں دفن ہوئے۔

راجہ چندو لال آپ رائے نرائن داس کے فرزند تھے۔ ۱۱۷۷ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی آپ بمشکل دس سال کے ہوں گے کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ چچا نے آپ کی پرورش کی۔ آپ کی ہوشیاری و کارپردازی دیکھ کر نواب شمشیر جنگ نے اپنے تعلقہ کا کارپرداز مقرر کیا۔ نواب ارسطو جاہ مدار المہام نے ۱۲۱۲ھ میں اخباری، خطاب راجگی و بہادری پیشگاہ حضوری سے سرفراز کرا کر چار ہزار سوار اور چار ہزار پیادے ان کے ماتحت کیے۔ نواب شمس الامراء بہادر کے جمعیت کے پیشکار بھی تھے۔ بعد میں آپ کو خدمت کروڑگیری ملی۔ نواب سکندر جاہ کے عہد میں جب میر عالم بہادر دیوان ہوئے، تو ۱۸ صفر ۱۲۲۱ھ کو آپ خدمت پیشکاری پر مقرر کئے گئے۔ ۱۲۳۵ھ میں نواب ممدوح نے آپ کو خطاب مہاراجگی، پالکی جھالردار اور نوبت سے سرفراز فرمایا۔ ۱۲۴۶ھ میں نواب ناصر الدولہ نے راجایان راجہ مہاراجہ راجہ چندو لال بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ بعد انتقال میر الملک بہادر راجہ موصوف ہی کل ملکی و مالی انتظامات فرماتے رہے۔ آپ کی فیاضی اور خیرات مشہور عام ہے۔ آپ میں علاوہ فیاضی کے جوہر شناسی کا بھی مادہ تھا۔ صاحب علم اور ذی کمال لوگوں کے قدردان اور غریب الوطن سازوں پر خاص طور پر عنایتیں فرمایا کرتے تھے۔ آپ کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ شاداں تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان فارسی اور ایک دیوان اردو کا یادگار ہے۔ آپ نے اپنے خاندانی حالات کے متعلق عشرت کدۂ آفاق کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی ہے۔ ۸ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ کو ۸۶ سال کی عمر میں قضا کی۔

فریدون جاہ آپ میر نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے پانچویں فرزند تھے۔ آپ کا نام میر سبحان علی خاں تھا۔ عشرۂ اول ربیع الاول ۱۲۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

غنی یار خاں یہ صاحب آصفجاہ ثانی کے عہد میں خانساماں کی خدمت رکھتے تھے۔ غنی محل

انہیں کے اہتمام سے تعمیر ہوا تھا۔

موسیٰ رحموں یہ پہلے پانڈیچری میں ملازم تھے۔ بعد میں سرکار نظام کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ آصفجاہ ثانی کے ساتھ کھرولہ کی مشہور جنگ میں شریک تھے۔ انہیں سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب عطا ہوا تھا۔ پانچہزار فوج ان کی ماتحتی میں تھی۔

اسد نواز جنگ ان کا نام میر حسین تھا۔ یہ اور ان کے بھائی جعفر یار جنگ بہادر میر مہدی کے فرزند تھے۔ حضرت غفران مآب میر نظام علی خاں کے وقت میں نوکر ہوئے۔ اور اپنے اہیرکو رضاعت کی خدمت پر مامور کیا۔ سکندر جاہ جس وقت مسند نشیں ہوئے انہوں نے ان کو اسی طرح اپنا مصاحب رکھا جیسا کہ صاحبزادگی کے زمانہ میں تھے۔

ارسطو جاہ ان کا نام غلام سید خاں تھا۔ قوم کے منڈل کیانی اور نوشیرواں عادل کی نسل سے تھے۔ ان کی ولادت ایلچپور میں ہوئی تھی۔ ابتداءً یہ حضور باشی تھے۔ رکن الدولہ نے اورنگ آباد کی صوبہ داری پر مامور کرکے ان کو حضور باشی سے موقوف کرادیا۔ بعد چار سال کے صوبہ داری سے بھی موقوف کرکے قلعہ اودسہ میں رکھے گئے۔ رکن الدولہ کے انتقال کے بعد بر بنائے سفارش شمس الامراء مرحوم قلعہ اودسہ سے طلب کرکے خدمت وکالت پر مامور کیے گئے۔ اس کے بعد قلمدان وزارت سے سرفراز ہوئے۔ ۱۲۱۵ھ سے منجانب آنریبل کمپنی انگریز بہادر ایک لاکھ روپیہ سالانہ مقرر ہوا۔ ۱۲۱۹ھ میں فوت ہوئے۔

احتشام جنگ ان کا نام مرزا ابراہیم بیگ اور خطاب ظفر الدولہ مبارز الملک تھا۔ ترچناپلی کے جنگ میں جو نمایاں بہادری انہوں نے کی اس کو دیکھ کر رکن الدولہ نے والاجاہ سے انہیں مانگا۔ والاجاہ نے بمقتضائے وقت ان کا ہاتھ رکن الدولہ کے ہاتھ میں دیکر ان کے حوالہ کردیا اور رکن الدولہ نے بغرض نگہداشت جمعیت محالات نرمل، یلگندل، بال کنڈہ، ورنگل و تعلقہ اشوارا وغیرہ دے کر خطاب مرقوم الصدر سے سرفراز کیا۔ حضرت غفران مآب کے عہد میں انتقال ہوا۔

میر عالم نواب ابوالقاسم میر عالم ۱۱۶۶ھ میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ ربیع الثانی ۱۲۱۹ھ کو خدمت دیوانی سے سرفراز کیے گئے۔ جب ارسطو جاہ دو سال تک مرہٹوں کی کفالت میں تھے اس وقت میر عالم ہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ آپ سرکار انگریزی کے بھی خیرخواہ تھے۔ وہاں سے انہیں دو ہزار روپیہ ماہوار پنشن ملا کرتی تھی۔ تالاب میر عالم آپ ہی کی یادگار ہے۔ ۳۰ شوال ۱۲۲۲ھ کو بحالت مدار المہامی قضا کی۔

گھانسی میاں المخاطب بہ سرفراز الدولہ سردار الملک بہادر شمس الامرا بہادر کے ہمزلف تھے۔ انہیں کی اعانت سے بہ خطاب وجمعیت سرفراز ہوئے۔ افغانان مہدوی نے بباعث بغض وعداوت قلبی ان کو مار ڈالا تھا۔

منیر الملک یہ صاحب غیور جنگ ابن شیر جنگ بہادر کے بیٹے تھے۔ بعد انتقال میر عالم حضرت غفران مآب کے عہد میں خدمتِ دیوانی سے سرفراز ہوئے۔

طاہر علی خاں مردمہ یہ محمد ہاشم کے بیٹے تھے، ———————— جو ناصر جنگ شہید کی عملداری میں چوبداروں کی چوکی سے سرفراز ہوئے تھے۔ اپنے باپ کے انتقال کے بعد چوبداروں کے تین چوکیوں سے سرفراز ہوکر حضرت غفران مآب کے دربار میں بڑی عزت وتوقیر حاصل کی تھی۔

رائے جگجیون داس: رائے لعل چند متصدی کے فرزند تھے، جو اپنے والد کے انتقال کے بعد بعہدہ وکالت محمد علیخاں والاجاہ حاکم پٹن حیدرآباد میں مامور تھے۔

رفعت الممالک جب حضرت مغفرت مآب نے شاہجہاں آباد سے دکن کا ارادہ کیا اس وقت لشکر خان کو اپنے ہمراہ لاکر برار و اورنگ آباد وغیرہ کی جاگیر اور ۵ ہزار سوار کی جمعیت سے سرفراز فرمایا۔ خان مذکور مقربان حضور سے تھے۔ ناصر جنگ شہید کے جلوس فرماہوتے وقت اورنگ آباد کے صوبہ داری سے اور بزمانۂ تسلط صلابت جنگ خدمت دیوانی پر مامور تھے۔

اسد علی خاں المخاطب بہ شمس الملک دربار حضرت میر نظام علی خاں کے معزز وسربرآوردہ امرا میں سے تھے اور حضرت ممدوح کے عہد میں بڑے بڑے سرکوں میں بھیجے گئے تھے۔

غلام سید خاں المخاطب بہ سہراب جنگ معین الدولہ، صوبہ برار کے ناظم تھے۔

امجد علی خاں المخاطب بہ امجد الملک، ان کا تعلق امرائے پائیگاہ سے تھا۔ ۳ صفر ۱۲۲۷ھ کو فوت ہوئے۔

شرف الدولہ یہ صاحب رکن الدولہ کے بھائی تھے۔ دربار آصف جاہی میں ان کو بہت بڑی عزت حاصل تھی۔

منو میاں یہ آصف جاہ ثانی کے مصاحبوں میں سے تھے۔ ظریف طبع ہونے کی وجہ سے آصفجاہ ان کو بہت چاہتے تھے۔

— ایڈیٹر (نومبر ۱۹۱۲ء)

نواب سالار جنگ ثالث

جس طرح ہندوستان کا پایۂ تخت دہلی میں منتقل ہونے سے تمام ملک سے یہ صدا بلند ہوئی کہ "حق بحقدار رسید" اسی طرح نواب سالار جنگ ثالث کے وزارت حیدرآباد پر سرفراز ہونے سے تمام ملک سے یہ صدائیں آ رہی ہیں : ع "مقدار کو شہ نے دی وزارت" تمام ملک سے اس خیر مقدم کا ہونا نہایت مبارک فال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد میں سالار جنگ اول کا عہد "عہد زریں" کے نام سے مشہور ہے اور آپ کے کارنامے تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے۔ وزارت اس خاندان کا خاصہ اور حق ہے۔ چنانچہ میر عالم اور میر جملہ ایسے مدبر اسی خاندان میں گذرے ہیں جن کا تاریخ ہند میں خاص درجہ ہے۔ موجودہ سالار جنگ ثالث سر سالار جنگ اول کے پوتے اور نواب لائق علی خاں عماد السلطنت سالار جنگ ثانی کے اکلوتے فرزند رشید ہیں۔ آپکا نام میر یوسف علی خاں ہے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۵ واسطوں سے مشہور بزرگ حضرت اویس قرنیؓ کے ساتھ ملتا ہے۔ آپ کے آباء و اجداد کا ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچنے کے بعد ابتداً بیجاپور کی حکومت عادل شاہیہ اور پھر دہلی کی سلطنت مغلیہ سے تعلق رہا۔ شہنشاہ مغلیہ کے دربار ہی سے نظام الملک آصف جاہ اوّل کے ہمراہ رکاب آپ کے جد اعلیٰ حیدرآباد پہنچے اور مختلف خدمات انجام دیں۔

نواب سالار جنگ ثالث ۱۴ شوال المکرم ۱۳۰۶ھ کو بمقام پونہ (جہاں اس زمانہ میں میر لائق علی خاں سالار جنگ ثانی تفریحاً مقیم تھے) پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر ۴۲ ہی دن کی تھی کہ آپ کے والد ماجد کا سایہ آپکے سر سے اٹھ گیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد آپ کے چچا نواب میر سعادت علی خاں منیر الملک بہادر کا بھی آپ کے والد کی طرح عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا اور آپ کی وسیع جاگیرات کا انتظام اور آپ کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ مگر حضور نظام غفران مکان نے مراحم خسروانہ سے آپ کی جاگیرات اور آپ کی تعلیم و تربیت کا بہت اعلیٰ پیمانہ پر معقول انتظام فرما دیا۔ حضور خلد مکان بنفس نفیس آپ کی تعلیم و تربیت میں بہت کچھ دلچسپی لیتے تھے۔ کچھ دنوں خانگی تعلیم پانے کے بعد آپ نظام کالج میں شریک کئے گئے۔ ۱۹۰۲ء میں مڈل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ قریباً ۱۶ سال تک آپ نے نظام کالج میں باقاعدہ تعلیم پائی۔ ۱۷ جمادی الاوّل ۱۳۱۶ھ کو دربار سالگرہ میں حضور نظام مرحوم نے آپ کو خطابات خان بہادر و سالار جنگ سے ممتاز فرمایا۔ سات آٹھ ماہ ہوئے کہ آپ کی جاگیرات پر سے سرکاری نگرانی اٹھالی گئی۔ اب آپ خود اپنے علاقہ کا انتظام فرماتے ہیں۔

آپ کی جاگیرات چھ تعلقات میں منقسم ہیں جن کا مجموعی رقبہ ایک ہزار چار سو اسی مربع میل ہے۔ جاگیرات کی آمدنی قریباً ۱۰ لاکھ ہے اور مردم شماری ۲ لاکھ۔

نواب سالار جنگ ثالث کے اخلاق و اطوار کے متعلق ہر طبقہ میں بہت اطمینان بخش خیالات پائے جاتے ہیں۔ جس روز آپ منصب وزارت پر فائز ہوئے اسی روز شب کو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کی سالگرہ مبارک کی تقریب میں ایوان شاہی میں ڈنر تھا۔ اس موقع پر کرنل پنجے (ریذیڈنٹ) نے حضور نظام کا جام صحت تجویز کرتے ہوئے تبدیلی وزارت کے ذکر میں نواب سالار جنگ ثالث کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے تھے ان میں "بے داغ چال چلن" کے خاص الفاظ ثابت کرتے تھے کہ آپ کی اخلاقی خوبیوں اور ذاتی قابلیتوں کا کتنا اچھا اثر ہے۔ نظام کالج کے پرنسپل مسٹر اسٹرج کا بیان ہے کہ "مدرسے کے لڑکوں کے لئے جو خوبیاں ضروری ہیں مثلاً باقاعدہ حاضری، اپنے کام پر توجہ، استادوں اور اپنے ہم سبق طلباء کے ساتھ متواضعانہ برتاؤ، ان سب باتوں میں وہ دوسرے طلباء کے لئے ایک بیش بہا نمونہ تھے۔ اس کی تقلید دوسرے لڑکوں نے کی مگر وہ اس میں عہدہ برآ نہ ہو سکے۔"

ابتدا ہی سے آپ کی روشن خیالی اور علمی قابلیتوں کے قابل قدر ثبوت ملتے رہے ہیں۔ آپ کو اپنے ملک اور اپنی قوم کی بہبودی کی تحریکوں سے بھی کچھ کم دلچسپی نہیں ہے۔ حال ہی میں مسلم یونیورسٹی کو جو ایک لاکھ روپیہ کی گراں قدر رقم آپ نے عطا فرمائی ہے، وہ اس کی ایک روشن مثال ہے۔ غرض آپ کے عادات و خصائل قابل تعریف ہیں اور اس بات کی قوی امید ہے کہ اپنی خاندانی اور موروثی خصوصیات، دماغی قابلیتوں، اعلیٰ تعلیم اور اخلاقی اوصاف کی بدولت آپ اپنے نامور باپ اور فرزند روزگار دادا کے مایۂ ناز جانشین ثابت ہوں گے اور اس بڑے نام کی وقعت و عظمت کو نہایت عمدگی کے ساتھ برقرار رکھیں گے جس سے آپ منسوب ہیں۔ آپ کی ذات سے حیدرآباد کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں اور سب کی یہی دلی دعا ہے کہ آپ کو اپنے اس عظیم الشان عہدہ کے فرائض کی انجام دہی میں ہر طرح کی کامیابی اور نیک نامی حاصل ہو۔

آپ کے منصب وزارت پر سرفراز ہونے کی بہت سی تاریخیں کہی گئی ہیں، جن میں سے حضرت جلیل کا قطعہ ہدیۂ ناظرین ہے:

خدائے آصف ہفتم کو دی ہے وہ توقیر
کہ نام لینے سے ہوں ہفت آسماں تسخیر

جہاں پناہ سلیماں شکوہ ظل اللہ
نگاہ میں وہ اثر ہے کہ خاک ہو اکسیر

وہی نظر پے احباب موجِ رحمت ہے — وہی نظر پے دشمن ہے خنجر و شمشیر
ہر ایک حکم ہے ناطق شہِ فلک فر کا — ابھی کریں جو اشارہ تو بول اٹھے تصویر
کیا حضور نے سالار جنگ کو دیوان — وہ سرفراز ہوئے، ملک کی کھلی تقدیر
اس انتخاب سے خوش ہو کے سب یہ کہتے ہیں — شہِ دکن پہ ہمیشہ ہو فضلِ ربِّ قدیر

مری زبان پہ آیا یہ مصرعۂ تاریخ
جلیل شہ نے کیا مستحق کو آج وزیر

۱۹۱۲ء

دائے بالا جی سہائے صاحب عاقلؔ نے خوب تاریخ کہی ہے:

مرے آقا کو شہ نے کی عطا خدمت جو آبائی — اسی لائق تھا یہ، کی خوب اس کی قدر افزائی
کہو تاریخ یہ فرطِ خوشی سے تم بھی اب عاقلؔ — زلیخا بن کے دیوانی مرے یوسف کے گھر آئی

۱۳ ف ۳۱

— ایڈیٹر (ستمبر ۱۹۱۲ء)

سالار جنگ ثالث

عماد الملک

امورِ سیاسی کا ایک اصول یہ ہے کہ حالاتِ متغیرہ کے ساتھ وقتاً فوقتاً تغیرات دقوع میں لائے جائیں۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق گذشتہ چند سال سے برٹش انڈیا کے اصولِ نظم و نسق میں تدریجی تغیرات کا آغاز ہوا ہے۔ حیدرآباد میں کچھ عرصہ سے عام فیلنگ انقلاب وزارت کے لئے بے چین تھی اور اس کی خبریں اڑ رہی تھیں۔ آخر کار ۱۱ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ہز ایکسلنسی یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ اب آپ صرف اپنے قدیم منصب 'پیشکاری' پر فائز رہیں گے۔ حضور نظام نے وزارت کے منصب جلیلہ پر سر سالار جنگ اعظم کے پوتے کو سرفراز فرمایا ہے۔ نوجوان صدر اعظم نواب سالار جنگ ثالث کو ایک نہایت بیش بہا ورثہ عطا ہوا ہے اور کوئی شک نہیں کہ جس طرح سر سالار جنگ اول نے حیدرآباد میں تمدنی و اخلاقی اور انتظامی اصلاحیں شروع کی تھیں، نواب سالار جنگ ثالث ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔

حیدرآباد کی خوش قسمتی ہے کہ نواب عماد الملک ایسا دیرینہ سال و زمانہ دیدہ اور مشاق مدبر و مشیر

وہاں موجود ہے۔ آپ نوجوان وزیر اعظم کے مشیر بنائے گئے ہیں۔ آپ کے اعلیٰ کیرکٹر، حسن تدبیر، راستبازی و بے غرضی اور بے لوثی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جس طرح آپ پر حضور نظام غفران مکان کو پورا اعتماد تھا اسی طرح برٹش گورنمنٹ بھی آپ کا پاس کرتی ہے۔ حیدر آباد میں سرسالار جنگ اول سے لے کر اب تک پانچ وزارتیں بدلیں، بڑے بڑے انقلاب ہوئے، بڑی بڑی پارٹیاں پیدا ہوئیں اور مٹ گئیں، مگر تمام وزرا کو آپ پر اعتماد رہا اور تمام پارٹیاں آپ کا پاس ادب کرتی رہیں، اور کسی انقلاب کا کوئی اثر آپ پر نہ ہوا، بلکہ بمصداق دور زمانہ آپ آج بھی اسی جگہ پر سرفراز ہیں جہاں ۴۰ سال قبل تھے۔

—ایڈیٹر (اگست ۱۹۰۳ء)

مسٹر بی ایم مالاباری

مسٹر مالاباری کی وفات (شملہ ۱۲ جولائی) سے جو سنسنی تمام ہندوستان میں پیدا ہو گئی ہے، وہ مرحوم کی ہر دلعزیزی کا ایک بین ثبوت ہے۔ آپ کا وجود انسانی ہمدردی اور اصلاحی کاموں کے لئے نہایت بیش بہا تھا۔ سیوا سادھن اور دھرم پورسینی ٹوریم آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہیں۔ آپ سوشل ریفارم کے زبردست حامی تھے۔ چنانچہ صغر سنی کی شادی کے خلاف اور بیوگان کی حمایت میں آپ نے نہایت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔

مسٹر مالاباری ۱۸۵۳ء میں بمقام بڑودہ پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد بزرگوار یہاں ایک معمولی کلرک تھے۔ آپ ابھی کمسن ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ محترمہ کے قریبی رشتہ داروں میں ایک شخص میروان جی تھا۔ اس نے انہیں متبنیٰ بنا لیا۔ ۱۵ سال کی عمر میں آپ بمبئی تشریف لائے اور مدرس کی حیثیت سے معاش پیدا کرنے لگے۔ انہیں ایام میں آپ نے چند کتب گجراتی اور انگریزی میں تصنیف کیں اور پروفیسر میکسمولر کے لکچروں کو ہندوستان کی کئی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۸۴ء میں مختلف اصلاحوں کے متعلق نوٹ لکھے اور ۱۸۸۵ء میں مجلسی اصلاح کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ مستورات کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے آپ نے مختلف مقامات پر لکچر دیے۔ قریب ۲۰ سال تک آپ انڈین اسپکٹیٹر کے ایڈیٹر رہے۔ ایسٹ اینڈ ویسٹ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ بھی انگریزی زبان میں جاری کیا۔ غرض مسٹر مالاباری نے جو احسن خدمات انجام دی ہیں اُن کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند اُن کے پسماندگان کو صبر و اطمینان بخشے۔

—ایڈیٹر (اگست ۱۹۱۲ء)

مسٹر حیدری، بی۔ اے

(ہوم سکریٹری دولت آصفیہ، حیدرآباد دکن)

[مطالعۂ سیرت کا بہترین باب کسی زندہ مثال کا مطالعہ ہے جس کی صداقت کا ذہن نشین ہونا اسی طرح لازمی اور آسان ہے جیسے ایک بچے کو صرف یہ کہدیا جائے کہ دو اعداد چار ہوتے ہیں، اور پھر مشق کر کے اسے دکھا بھی دیں کہ ایک میں ایک ملا دینے سے دو، اور دو میں دو جوڑ دینے سے چار ہو جاتے ہیں۔ اگلے مشاہیر کے کارنامے ہمیں کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن ہمارے دل پر اس کا اثر عارضی طور پر ہوتا ہے اور زندہ مشاہیر کے حالات چشم دید واقعات ہوتے ہیں، جن کو ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کیا دیکھا نہیں ہے کہ عالم نزع کی کیفیت جس نے نہیں دیکھی، وہ سکرات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جس نے کسی کو جان دیتے دیکھا ہے وہ برجستہ کہے گا کہ : ؎

جان دینے سے تو انکار نہیں ہے لیکن ؎ مرنے سے پہلے جو اعضا شکنی ہوتی ہے

یہ سچ ہے کہ انسان جب تک خود گرفتار مصیبت نہیں ہوتا، دوسروں کی تکلیف کو نہیں سمجھ سکتا۔ لیکن انسان ہی میں یہ مادہ بھی ودیعت رکھا گیا ہے کہ دوسروں کی مثال سے وہ سبق حاصل کرتا ہے۔ بالطبع انسان بُرا نہیں ہوتا۔ تقلید اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جیسی صحبت ہوگی ویسا اثر ہوگا۔ بہرحال مسٹر حیدری کی کاردانی اور اس پر انکسار، مزید براں بنی نوع کے ساتھ ان کی سچی ہمدردی یہ سارے انسانیت کے اعلیٰ خصائل ہیں۔ موصوف کو ہم جانتے ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ، ان کے پاکیزہ عادات، ان کا عزم راسخ، ان کا استقلال، ان کی جفاکشی اور ان کا ظاہر و باطن میں یکساں ہونا اس قدر دل آویز و نتیجہ خیز ہے کہ ممکن نہیں کوئی شخص دو گھڑی ان کے پاس بیٹھ جائے اور ان کے طرز عمل یا گفتگو سے فائدہ اٹھائے بغیر اٹھ جائے۔ موصوف کے مختصر دلچسپ حالات جو ہماری فرمائش سے مسٹر حافظی نے قلمبند فرمائے ہیں۔ درج ذیل کئے جاتے ہیں]

مشاہیر عالم کے حالات میں سب سے دلچسپ اور مفید امر ان اسباب و اثرات کا دریافت

کرنا ہے، جن کی بدولت مخصوص افراد تماشاگاہ عالم کے اسٹیج پر اکثر ممتاز و نامور بنتے ہیں۔ تقدیر کے قائل تو تدبیر و اسباب کو بھی نتیجۂ تقدیر سے تعبیر کرتے ہیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس میں اتفاق کوئی چیز نہیں۔ یہ کل کائنات ادنیٰ سے اعلیٰ تک سلسلۂ علل و معلول میں مربوط ہے۔ دنیا میں جن افراد یا اقوام نے ترقی کی ہے، وہ محض اتفاقی نہیں بلکہ درحقیقت اس سخت جد و جہد و باقاعدہ سعی و کوشش کا نتیجہ ہے جو وہ باقتضائے زمانہ و بمصالح ماحول یعنی حالات گرد و پیش عمل میں لائے۔ جس طرح اس دنیا میں قیام ہستی کا انحصار سخت کشمکش اور اپنے کو حالات گرد و پیش کے مطابق و موافق بنانے پر ہے اسی طرح انفرادی یا قومی ترقی بھی ان شرائط کی تعمیل پر موقوف ہے، جو ہر زمانہ میں بلحاظ ماحول بدلتے رہتے ہیں۔

اہل ہند گو اس وقت یورپ کی ایک بہترین قوم کے تابع ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لیے اب زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کے وسائل و شرائط محدود اور بہت سخت ہو گئے ہیں۔ زمانۂ حال میں ہندوستان میں کسی قسم کی ترقی کرنا آسان کام نہیں ہے۔ باایں ہمہ مشکل حالات و مزاحمات و سخت شرائط کے ہندوستان کے جن افراد نے بہ امتیاز حالات جدید و شرائط ترقی سرکاری ملازمت یا تجارت یا علوم و فنون میں کچھ ترقی و نام آوری حاصل کی ہے وہ نہایت ہی عزت اور قدر کے لائق ہیں۔ ایسے اشخاص کے حالات و کیریکٹر و راز ترقی کا مطالعہ کرنا اور ان سے سبق لینا نوجوانان ملک کے لئے ازحد مفید ہے۔

عظمت و شہرت کا معیار بمقتضائے زمانہ و اختلاف ماحول مختلف ہوا کرتا ہے۔ وحشی اقوام میں عظمت و شہرت کا معیار پہلیتن، قوی الجثہ و فولادی اعصاب رکھنے والوں پر ہے۔ سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں سب سے بڑا وہ شخص سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ قوی الجثہ ہو۔ متمدن اقوام میں دولت معیار عظمت و شہرت ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ دولت جماعت متمدنہ میں بہت بڑی قوت شمار کی جاتی ہے۔ جو شہری جس قدر دولت کا مالک ہوتا ہے اسی قدر اس کی وقعت و عظمت و شہرت زیادہ ہوتی ہے۔ تمدن کے اعلیٰ و انتہائی مدارج میں علم کا شرف سب سے بڑا معیار فضیلت خیال کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ افراد یا قوم کی بھی عظمت و شہرت کا صحیح معیار خدمت بنی نوع ہے۔ جو افراد جس قدر زیادہ بنی نوع انسان کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں اسی قدر وہ ممتاز و قابل عظمت و پرستش ہوتے ہیں۔ یہ افراد عالیہ سب سے پہلے اپنے زمانے و حالات گرد و پیش کا بغور و فکر مطالعہ کرتے ہیں۔

مقتضیات زمانہ و شرائط زندگی و ترقی کو دریافت کرتے ہیں بہترین ذرائع ترقی مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بتدریج اپنے خاندان و قوم و ملک کو صحیح راستہ ترقی پر لے آتے ہیں اور آخر کار اپنے زبردست اثر سے اپنے خاندان و قوم کو درجہ عظمت پر پہنچانے کا باعث ہوتے ہیں۔ صحابۂ اسلام و جاپان کے موجودہ مشاہیر اسی معنی میں بزرگ سمجھے جاتے ہیں کہ انہوں نے بمقتضاء زمانہ و بمصالح ماحول یعنی حالات گردوپیش صحیح اسباب ترقی کو معلوم کرکے اپنی قوم کو شاہراہ ترقی پر لگایا۔

ہر زمانہ و ہر ملک کا اقتضا و حالات مختلف ہوتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان کی ملکی و اقتصادی و تمدنی و انتظامی حالتیں بدل گئیں۔ نئے و سخت شرائط ہستی و ذرائع ترقی ہمارے سامنے پیش کئے گئے۔ آزادی و حکومت کے عوض ہمیں تابعداری و ماتحتی قبول کرنا پڑی۔ ملازمت سرکاری کے لئے بجائے اپنی مادری زبان کے حاکم وقت کی زبان کی تحصیل و تکمیل مشروط ہوگئی۔ صنعت و حرفت کا خاتمہ ہوگیا اور تجارت صرف مبادلۂ اشیاء خام با مصنوعات یورپ کا نام رہ گیا۔ کشمکش حیات کی روزانہ سختیوں اور اغراض و فوائد کے اختلافات سے ملک میں نزاع و فساد بڑھنے لگا۔ ہندوستان چونکہ زمانہ ہائے دراز سے بادشاہ پرستی کا عادی رہا ہے۔ یہاں کوئی قومی یا ملکی ترقی بلا تائید حکومت مشکل ہے۔ یہاں سرکاری ملازمت قوم و ملک کی نظروں میں بڑے رسوخ و اثر کا ذریعہ ہے اور چونکہ ہندوستان تمدن کے اعلیٰ مدارج سے تنزل کرکے اب تمدن کے اس متوسط درجہ میں آگیا ہے جس میں سے اس وقت یورپ گذر رہا ہے اس لئے دولت بہت بڑا ذریعۂ امتیاز و عظمت و شہرت سمجھی جاتی ہے۔ پس اگر موجودہ زمانہ میں ہمارے مشاہیر ہند نے باستثناء معدودے چند باقتضاء زمانہ و مصالح حالات گردوپیش ماحول جدید سے مطابقت کرکے ملازمت سرکاری یا تجارت کے ذریعہ سے شہرت و عظمت حاصل کی ہے تو یہ اُن کی عین فراست و دانشمندی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں لائق اور اہل کمال یوسفوں کے نصیبے عموماً اسی وقت جاگے ہیں، جب ان کا تعلق کسی دولت یا حکومت کی دیوی سے ہوا ہے۔ بے شمار نظائر اس کی تائید میں قدیم و جدید تاریخ سے مل سکتے ہیں۔

دنیا میں کامیابی و امتیاز و عظمت حاصل کرنے کے لئے چند باتیں ضروریات سے ہیں اول فطری مادہ اور ذہن و ذکا کا بالقوۃ موجود ہونا۔ دوم اقتضائے زمانہ و حالات گردوپیش کا صحیح اندازہ کرکے اپنی کوششوں کو اُن کے مطابق و موافق بنانا۔ سوم علم و دولت۔ چہارم مفید خلائق بننا۔ فطری مادہ کم و بیش ہر انسان میں موجود ہے۔ مگر سب سے زیادہ دانائی و دوراندیشی اپنے زمانہ کو پہچاننے اور ماحول یعنی گردوپیش کے حالات کا صحیح

اندازہ کرنے میں درکار ہے۔ انبیا و مصلحین کا درجہ اسی لئے بہت اعلیٰ و ارفع مانا گیا ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی نبض اچھی طرح پہچان کر مناسب علاج و رہنمائی تجویز کرتے ہیں اور بیمار قوم کو تندرست و قوی بنا دیتے ہیں۔ ہندوستان کے جن افراد یا اقوام نے سب سے پہلے زمانہ شناسی و اقتضاء حالات گردوپیش کا لحاظ کر کے اپنی کوششوں کو ان حالات و شرائط کے موافق و مطابق بنایا آج وہ افراد و اقوام بہتر حالت میں ہیں اور ترقی کر رہی ہیں باقی جنہوں نے اپنی حالت کو ان تبدیل شدہ حالات کے مطابق نہ بنایا وہ قانون زوال کے تحت میں آکر فنا ہوتی جا رہی ہیں۔ یہی اصول ہے جس پر ترقی پذیر افراد و اقوام یورپ و ایشیا کا عملدرآمد ہے۔ اور یہی اصول ہے جس پر بجبر و اکراہ انگریز حکمرانان ہند عمل کر رہے ہیں۔ شمالی ہند میں سب سے پہلے بنگالی قوم و ہندو افراد نے ترقی کے اس راز کو پہچانا۔ مسلمانوں میں سر سید احمد خاں نے بجز اس کے کچھ چارہ نہ دیکھا کہ جدید حالات گردوپیش کے لحاظ سے جدید شرائط زندگی و بقا کی تعمیل کی جائے۔ غربی ہند یعنی بمبئی کے مسلمانوں میں سب سے پہلا شخص جس نے اس زمانہ شناسی سے کام لیا وہ بزرگ طیب جی صاحب مرحوم مغفور والد ماجد مشہور بدرالدین طیب جی مرحوم تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے بیٹے قمرالدین طیب جی کو اس وقت یورپ روانہ کیا جبکہ نہر سویز کا وجود بھی نہ تھا مسلمانوں میں قمرالدین طیب جی غالباً پہلے شخص تھے، جنہوں نے انگلینڈ سے بارسٹری کی سند حاصل کی اور اپنے خاندان کو جدید دنیا اور زمانۂ حال کے راز ترقی سے آگاہ کیا۔ تجارت کے ذریعہ سے ۵۰ یا ۶۰ لاکھ روپیہ پیدا کیا اور اس قدر ترقی کی کہ ڈیوک یعنی ملک التجار میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ انہوں نے بمبئی میں انجمن حمایت اسلام کی بنیاد ڈالی مسلمانان بمبئی کو علوم جدیدہ حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اُن کے اُفقِ نظر کو وسیع کیا اور ۴۰ یا ۵۰ سال قبل ہی انہوں نے مسلمانوں کو یہ سب سے اعلیٰ اور مفید سبق دیا کہ مسلمانانِ ہند بلحاظ قومیت اپنے کو برادران وطن ہنود سے جدا نہ کریں۔ مذہبی امتیاز ضرور قائم رکھیں مگر ملکی ترقی و فوائد عامہ و مشترکہ کی کوششوں میں ہندو بھائیوں کا ساتھ دیں اور ان کو اپنا شریک بنائیں۔ کاش کہ ۳۰ یا ۴۰ سال قبل ہی اگر اس اصول پر عمل ہوتا، تو آج غالباً ہندو مسلمانوں میں جدائی کا غار اتنا عمیق نہ ہوتا اور ہندوستان کی حالت آج بہت بہتر ہوتی۔

عالی جناب مسٹر حیدری جن کی تصویر سے اس ماہ کا ادیب مزین ہے بدرالدین طیب جی مرحوم کی جماعت و خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ غربی ہند کے مسلمان ۴ فرقوں پر منقسم ہیں۔ اول میمن، دوم خوجے، سوم بوہرے، چہارم دکھنی مسلمان۔ ان میں سے پہلے ۳ فریقوں کی خصوصیت بخلاف شمال ہند کے جنگی و حکمران نسل مسلمانوں کی یہ ہے کہ یہ صدہا سال سے نہایت پُرامن تجارت پیشہ چلے آتے ہیں۔ مسٹر حیدری سلیمانی بوہرہ فریق سے ہیں۔ بوہرہ جماعت

کی تاریخ اور ان کے خصائص پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فی الواقع عربی و ایرانی الاصل ہیں اور اس میں شک نہیں کہ غربی ہند کے ساحلی مسلمانوں میں بخلاف شمالی ہند کے آریں خلط کے عربی و ایرانی اثرات زیادہ ہیں۔ مذہباً ان کا سلسلہ پُراسرار مشہور اسماعیلی شیعہ فرقے سے ہے۔

مسٹر حیدری کے والد نذر علی صاحب کھمبائت و بمبئی کے ممتاز تاجروں میں سے تھے۔ آپ کی تجارتی کوٹھیاں ملک چین و یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں اس لئے آپ کو اکثر سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ مسٹر حیدری ۱۸۶۹ء میں بمقام بمبئی پیدا ہوئے اور آپ کا نام محمد اکبر نذر علی حیدری رکھا گیا۔ چونکہ والد ماجد بیشتر سفر میں رہتے تھے اس لئے آپ کی ابتدائی تربیت زیادہ تر آپ کی والدہ ماجدہ کے آغوش مادری میں ہوئی جو بدرالدین طیب جی مرحوم کی حقیقی بھانجی تھیں۔ آج جو مسٹر حیدری کے خیالات و عادات میں باوجود یورپی تعلیم و تہذیب کے اسلامی سادگی، اتقاء، نرمی، تحمل، کنبہ پروری کے اوصاف کی جھلک نظر آتی ہے اس کا بڑا باعث وہ ورثہ وانر ہے جو آپ کو اپنی مہربان والدہ ماجدہ سے حاصل ہوا ہے۔ بوہرہ جماعت کو جہاں تجارتی خصوصیات کا ورثہ ملا ہے اُسی کے ساتھ ان میں اتقا بھی بدرجہ اعلیٰ ہے۔ طہارت و نماز کی پابندی بشدت ہے۔ داڑھی منڈانا و تمباکو پینا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عورتوں کی حرمت و ناموس کا بڑا خیال ہے۔ مگر ان میں بخیال شمال ہند کے عام مسلمانوں کے صرف شرعی پردہ پر اکتفا کی جاتی ہے اور عورتوں کو تازہ ہوا اور روشنی و تعلیم و تربیت سے محروم نہیں کیا جاتا۔

مسٹر حیدری نے ۷ سال کی عمر میں اپنی والدہ صاحبہ کے ذریعہ سے معمولی دینی فرائض سے بخوبی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ چونکہ مسٹر حیدری بدرالدین طیب جی ایسے روشن خیال و صلح دیا اخلاق خاندان کے ذیرا شہ تھے اور اس دور میں زمانہ شناس خاندان نے زمانۂ حال کی کشمکش میں بقائے ذات و قوم کے شرائط و اسباب کو بخوبی معلوم کر لیا تھا، اس لئے یہ خاندان ان تعصبات و اوہام سے آزاد ہو چکا تھا جو اس وقت انگریزی زبان و علوم و فنون کی تحصیل کے متعلق عموماً کل ہند کے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ چنانچہ مسٹر حیدری ۷ سال ہی کی عمر میں انگریزی مدرسہ میں داخل کئے گئے۔ ذہانت و احساس فرض کی بدولت ۱۲ ویں سال میں میٹرکیولیشن کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد الفنسٹن کالج میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہوئے اور ۱۷ ویں سال میں سینٹ زیویر کالج بمبئی سے آپ نے بی۔ اے کی ڈگری آنرز کے ساتھ حاصل کی اور اسی سال ایل، ایل، بی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ ایام طالب علمی میں آپ کو بجز انہماک علمی، سلامت روی، و پابندی صوم و صلوٰۃ اور کوئی شوق نہ تھا۔ اہل بمبئی عموماً رقیق القلبی و انسانی ہمدردی، خیرات و صدقات میں ہندوستان کی سب اقوام سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مسٹر حیدری کی زمانۂ طالب علمی

میں بھی یہ بڑی خصوصیت تھی کہ آپ بنی نوع کی تکلیف و درد کو دیکھ کر بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ ممدوح و ممدوحہ کی ہمدردی و نیک دلی و خلق مجسم بیگم صاحبہ کی ان خصوصیات کا علم و تجربہ اہلِ حیدر آباد کو بزمانہ طغیانی رودِ موسیٰ پورے طور پر ہو چکا ہے کہ کس طرح ان دونوں افرادِ عالیہ نے ہزاروں بھوکے پیاسے بے خانماں بندگانِ خدا کی دستگیری کی ہے۔

مسٹر حیدری کا ۱۷ ویں سال میں بی۔اے کا امتحان آنرز کے ساتھ پاس کرنا نہ صرف آپ کے خاندان بلکہ کل مسلمانانِ بمبئی کے لئے اس وقت ایک قابلِ فخر بات تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں بعہد لارڈ ڈفرن ویسرائے و گورنر جنرل ہند گورنمنٹ آف انڈیا نے آپ کو صیغۂ حساب میں ایک خدمت عطا فرمائی اور آپ ناگپور میں متعین کئے گئے۔ احساسِ فرض، جفاکشی و دیانتداری کی بدولت عہدہ دارانِ بالادست بہت جلد آپ کی قدر کرنے لگے۔

چونکہ اسلام کی محبت، جدید حالات کا احساس، قومی درد اور اصلاحِ تمدن و معاشرت کا ورثہ آپ کو بچپن ہی سے ملا تھا آپ نے ناگپور کے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی اور ایک مدرسہ زیرِ حمایت انجمن اسلام ناگپور میں قائم کیا گیا جس کے آپ لائف پریزیڈنٹ ہیں اور یہ مدرسہ آج تک قائم ہے اور خوب ترقی کر رہا ہے۔

۱۸۸۹ء میں آپ کا تبادلہ ناگپور سے لاہور کو ہو گیا اور وہاں بھی آپ ہمیشہ قومی کاموں اور سوشل ریفارم میں عملی دلچسپی لیتے رہے۔

۱۸۹۰ء میں آپ کا تبادلہ بہ ترقی کلکتہ کو ہوا اور آپ وہاں ۳ سال تک رہے اور وہاں سے بہ حیثیت ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل الٰہ آباد کو تبدیل ہوئے۔

۱۸۹۳ء میں آپ کی شادی بدر الدین طیب جی مرحوم کی بھتیجی سے ہوئی۔ مسز حیدری نجم الدین طیب جی کی صاحبزادی ہیں جو نہایت عالم و علم دوست شخص تھے۔ ۴ سال تک عربستان میں رہے اور ایک نہایت معزز عرب شیخ کی لڑکی سے شادی کی۔ مسٹر حیدری کی خوش نصیبی ہے کہ آپ کو بیگم صاحبہ بھی ایسی ملیں جو بلحاظ حسن صورت و سیرت، عربی خون و خاندانی شرافت و تعلیم و تربیت فخرِ خاتونانِ مسلمانانِ بمبئی ہیں۔ بمبئی و حیدر آباد کی صدہا بیکس بیوائیں و حاجتمند اس خلق مجسم، ہمدرد، نیک دل خاتون کے لئے دست بدعا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شادی سے مسٹر حیدری کو ایک ایسا مونس زندگی، ہمدم و شریک رنج و غم مددگار مل گیا، جس کا شمار مادرِ گیتی کے منتخب و بیش بہا موتیوں میں ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۷ء میں آپ الٰہ آباد سے بمبئی کو بدل گئے اور ۱۹۰۰ء تک آپ کا قیام بمبئی میں رہا۔ آپ کو تعلیمی و سوشل ریفارم سے ہمیشہ بیحد دلچسپی رہی اور بمبئی کی تمام سوشل ریفارم یعنی اصلاح تمدنی و معاشرت تحریکوں کے

آپ زبردست حامی ہے۔ ہندو مسلمانوں کے اتحاد میں آپ نے تحریر و تقریر و عمل سے ہمیشہ کوشش کی۔ آپ کا ایک زبردست ایسے (مدلل و فصیح مضمون) انگریزی میں چھپا، جو بمبئی کے مشہور سوشل رفارم لیڈروں کے مضامین کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں چھاپا گیا ہے۔ چند دن آپ مدراس میں بھی بحیثیت ڈپٹی اکونٹنٹ جنرل تعینات رہے۔ جب آپ کو کل صوبجات ہند کے صیغہ محاسبی کے تجربہ سے ہندوستان کے مالی معاملات کے متعلق مہارت تامہ حاصل ہو گئی، تو ۱۹۰۲ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے آپ کو کل انڈیا کے سرکاری پریسوں یعنی مطابع کی جانچ و پڑتال داخراجات کے متعلق رپورٹ کرنے کے لئے مامور کیا۔ چنانچہ آپ نے کل صوبجات ہند و برما میں دورہ کیا اور کئی لاکھ کی بچت سرکار کے لئے نکالی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک ایسی کل ہندوستان کے صیغہ فنانس کی ایک شاخ پر رپورٹ لکھنے کے لئے متعین کیا گیا۔ آپ نے اس کام کو اس خوبی سے انجام دیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے اظہار خوشنودی کیا۔

ان اہم فرائض و خدمات کے ساتھ ساتھ آپ اسلامی و قومی معاملات میں ہمیشہ عملی دلچسپی لیتے رہے چنانچہ ۱۹۰۸ء میں آپ کا انتخاب علی گڑھ کے ٹرسٹی شپ کے لئے ہوا۔

حیدرآباد دکن کی ہنر پروری و قدر دانی اہل کمال کا سکہ زمانہائے دراز سے نامزد ہے۔ جہاں کہیں ہندوستان میں کوئی دیسی لائق ہونہار نظر آیا اور ذرا بھی امتیاز پیدا کیا حیدرآباد نے اس کو اپنا پیارا فرزند ہندوستان سمجھ کر اپنے سر و آنکھوں پر لیا۔ یوں سخنانِ اہل کمال کا مقر حیدرآباد ہی رہا ہے۔ ہند کے گمنام مشاہیر یہیں آکر اقلیم شہرت کے تاجدار ہوئے ہیں۔ اپنے ذاتی و کسبی جوہر کے اظہار کا موقع انہیں یہیں حاصل ہوا ہے۔ چنانچہ جب حیدرآباد میں اصلاح فنانس کا مسئلہ درپیش ہوا اور ایک دیسی شخص کی ضرورت ہوئی تو نظر انتخاب مسٹر حیدری پر پڑی اور آپ کی خدمات اولاً بحیثیت صدر محاسب سرکار عالی مستعار لی گئیں۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد آپ گورنمنٹ نظام کے فنانشل سکریٹری مقرر ہوئے۔ چونکہ ممدوح کو مختلف صوبجات ہند کے صیغہ حساب و فنانس کا قریباً سترہ یا اٹھارہ سال کا تجربہ ہو چکا تھا اس نے ممدوح سے صیغہ فنانس حیدرآباد کو بڑی مدد ملی۔ صاحب ممدوح نے اپنے حد اقتدار کے موافق جو اصلاحات کیں اور موسیٰ ندی کی ہولناک طغیانی پر جو ایثار و انسانی ہمدردی خود آپ کی و نیز آپ کی مخیر بیگم صاحبہ عالیہ کی ذات سے ظہور میں آئی اُن کی داستان دہ ہزاروں بندگانِ خدا آج حیدرآباد میں شکر دعا سناتے ہیں جن کو آپ کی ذات سے مدد پہنچی۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے اس صلہ خوشنودی میں بیگم صاحبہ مسٹر حیدری کو سنہری تمغہ قیصر ہند عطا فرمایا۔

وہ عظیم الشان تالاب عثمان ساگر جس کا سنگ بنیاد حال ہی میں سلطان ابن السلطان میر عثمان علی خان شاہ دکن نے اپنے دست مبارک سے رکھا ہے اور جس سے چند سالوں میں بلدہ و اطراف بلدہ بلحاظ آب و ہوا و باغات و جنگلات و انہار رشک فردوس ہو جانے والا ہے، اس خیال کے ابتدائی محرک مسٹر حیدری ہیں اور آپ ہی کی تحریک پر ریاست میسور کے دیسی انجنیر، مسٹر وشیشرآیار جواب ریاست میسور کی دیوانی پر ممتاز ہیں، حیدرآباد تشریف لائے اور عثمان ساگر اسکیم کی سفارش کی۔

مسٹر حیدری تعلیم نسواں و سوشل رفارم کے ہمیشہ زبردست حامی رہے ہیں۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی صیغۂ تعلیم نسواں کے آپ و آپ کی بیگم صاحبہ بڑے موید ہیں اور آپ محبوبیہ گرلز اسکول کے سکریٹری بھی ہیں۔ ہندوستان میں چند ہی خاندان مسلمانوں کے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے خاندان کی عورتوں کو زیور تعلیم و تربیت سے بہرہ مند کیا ہے ایک تو مشہور بلگرامی سرتاج خاندان ہند ہے اور دوسرے بدرالدین طیب جی کا خاندان ہے۔ ان دونوں خاندان کی خاتونیں تعلیم و تربیت و فنون لطیفہ مثل موسیقی و مصوری وغیرہ میں اچھی مہارت رکھتی ہیں اور گھر کی زیب و زینت ہیں۔

جب معتمدی فنانس کا صیغہ معین المہامی فنانس میں ضم ہو گیا، تو مسٹر حیدری گورنمنٹ نظام کے ہوم سکریٹری کی خدمت پر مامور ہوئے۔ فی الحال برٹش گورنمنٹ میں آپ کا عہدہ اکونٹنٹ جنرل یعنی صدر محاسب کا ہے، جس کی تنخواہ ڈھائی ہزار سکہ قیصری ہے۔ سرکار نظام میں آپ کو ۳ ہزار سکہ شاہی سے کچھ اوپر ملتا ہے۔ محکمہ ہوم سکریٹری کے ماتحت حسب ذیل محکمے ہیں۔ اوّل محکمہ عدالت، جس میں ہائی کورٹ بھی شامل ہے۔ دوسرے کل پولیس و جیل۔ تیسرے محکمۂ تعلیمات۔ چوتھے پوسٹل ڈپارٹمنٹ یعنی محکمہ ڈاکخانہ جات سرکار عالی۔ پانچویں محکمہ طبابت یعنی شفاخانہ جات انگریزی، چھٹے محکمہ طبابت یعنی دواخانجات یونانی۔ ساتویں محکمہ امور مذہبی۔ آٹھویں امور متفرقات۔ الخ۔ مختلف و وسیع محکمہ جات کی نگرانی و انتظامات کے لئے نہایت اعلیٰ و مختلف قابلیتوں و زبردست کیرکٹر کی ضرورت ہے اور آپ نہایت لیاقت و دانائی و دیانت داری سے ان مختلف ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں۔ پولیس و جیل کا انسپکٹر جنرل ایک نہایت باا‌ثر و زبردست انگریز ہے۔ اس کے ماتحت اور بھی انگریز ہیں۔ پوسٹل ڈپارٹمنٹ و میڈیکل ڈپارٹمنٹ کے انسپکٹر جنرل بھی انگریز صاحبان ہیں۔ محکمہ تعلیمات میں نظام کالج کے پرنسپل و وائس پرنسپل اور چند ہائی اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر صاحبان بھی انگریز صاحبان ہیں۔ اور یہ کل ہوم سکریٹری کے ماتحت ہیں۔ جن لوگوں کو علی گڈھ کالج کے یورپین اسٹاف و سکریٹری کے تعلقات کا تجربہ ہے وہ خیال کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں لائق و تجربہ کار انگریز ماتحتوں کو ان کے حدود معینہ سے متجاوز نہ ہونے دینا اور ان سے

ٹھیک طور پر کام لینا کیسا مشکل و نازک امر ہے۔ پھر ان کارروائیوں کی اس طور پر تنقیح و تنقید و ترمیم کرنا کہ ایک طرف تو نظام سرکار کی قدیم دیرینہ پالسی و روایات و اصول کے خلاف کوئی بات نہ ہونے پائے اور دوسری طرف یورپی ماتحت افسرانِ صیغہ پر نگرانی رکھی جائے معمولی کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کے ہوم سکریٹری کی خدمت بہ نسبت سرکار انگریزی کے ہوم سکریٹری کے بدرجہا زیادہ نازک و مشکل ہے۔ یہاں علاوہ انتظامی قابلیت کے ریاست کے قدیم دستورات و روایات کا علم و ان کی حفاظت کرنا بھی ضروریات سے ہے۔ دیسی و اسلامی اخلاق و تواضع بھی علی قدر مراتب ہر شخص سے برتنا پڑتی ہے۔ یہاں بہ نسبت ذہنی قابلیت و لیاقت کے عملی قوت اور موقع محل کے لحاظ سے اکثر کام نکالنا پڑتا ہے اور مسٹر حیدری اس امر میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ان نازک خدمات و معاملات کو جن کے مختلف پہلو ہوتے ہیں، خود سنبھالے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انگریز بھی تجارت پیشہ قوم ہیں اور مسٹر حیدری بھی اس لئے آپ انگریزوں کی خصوصیات کو خوب پہچانتے ہیں۔ چونکہ آپ کی انگریزی و انتظامی لیاقت خود سرکار انگریزی میں مسلم ہے اور آپ وہاں کے ایک اعلیٰ و باوجاہت عہدہ دار ہیں اور آپ کی تنخواہ بھی یورپینوں کے ہم پلہ ہے۔ اس لئے آپ کے ماتحت یورپی افسران کو خواہ مخواہ آپ کا ادب و احترام کرنا پڑتا ہے۔

خوش نصیبی سے مسٹر حیدری کے زمانہ میں مختلف محکمہ جات مثل عدالت و پولس و پوسٹ و طبابت و تعلیمات وغیرہ کی اصلاحیں عمل میں آئی ہیں۔ ان اصلاحات کے اصول پر غور کرنا پھر مالی حالات کے لحاظ سے ان کو مرتب کرنا اور ماتحت محکمہ جات کی تجویزوں کی اس طرح پر ترمیمیں کرنا کہ ان کو چنداں ناگوار نہ ہو آسان کام نہیں۔ پھر تقررات میں لیاقت و سفارش کا بھی لحاظ ضرور کرنا پڑتا ہے۔ غرض یہ تمام مراحل آپ نے نہایت خوبی سے انجام دیے ہیں اور آپ کے عہد میں صدہا نوجوان نئی خدمات پر مامور ہوئے ہیں۔ صدہا نے بتدریج ترقیاں پائی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے بے وسیلہ بندگانِ خدا بھی شامل ہیں، جو برسوں سے بسبب بے وسیلہ ہونے کے گوشۂ کس مپرسی میں پڑے تھے۔

آپ میں ایک بڑی خوبی عدل کی ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ آپ بذات خاص کام کی کل ہیں اور ماتحتوں کو بھی ویسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ لائق و محنتی ماتحتوں کے بڑے قدرداں ہیں۔ اپنے دفتر میں ادنیٰ امیدوار سے لے کر اعلیٰ مددگار تک کام پر آپ چپکے چپکے نظر رکھتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو اس کا صلہ و معاوضہ ترقیوں میں دیتے ہیں۔ چونکہ آپ موروثی تجارت پیشہ و علم حساب کے ماہر فن ہیں اور ساری عمر حساب و فنانس میں صرف کی ہے اس لئے آپ ہر معاملہ کو سخت عملی پہلو و صحت سے جانچنے کے عادی ہیں۔ جب تک آپ کسی معاملہ کی پوری تفصیل و تنقیح و تحلیل و تجزیہ نہ کر لیں آپ فیصلہ نہیں کرتے۔

حیدرآباد کی ملازمت کے بانغ عدن میں سب سے بڑی آزمائش کا شجر ممنوعہ شجر الذہب والفضہ ہے۔

حیدرآباد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف معدودے چند دیسی و یورپی افسر اس آزمائش میں پورے اُترے اس معاملہ میں مسٹر حیدری کا دامن ہر طرح کی آلائش سے پاک رہا ہے۔ ورنہ فنانس و ہوم سکریٹری کے عہدے جیسے کچھ با اقتدار ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں۔ اس کا بڑا سبب اوّل تو مسٹر حیدری کی خدا ترسی و دیانتداری ہے۔ لیکن دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ آپ خود ماشاء اللہ ایک تاجر دولت مند جماعت و خاندان کے ممبر ہیں اور غالباً آپکی تجارت کوٹھیاں بھی ہیں۔

حیدرآباد کی دوسری آزمائش پارٹی پالیٹکس ہے۔ ان پارٹیوں کی باہمی رقابت و کشمکش سے بعض اوقات بڑے آتش فشاں پولیٹکل زلزلے حیدرآباد میں ہوا کرتے ہیں۔ دکن کی تاریخ میں ہمیشہ ملکی و غیر ملکی پارٹیاں چلی آئی ہیں اور ہمیشہ نئے نئے اسباب و متغیر حالات و جدید انقلابات سے نئی نئی پارٹیاں بنتی و بگڑتی آئیں ہیں۔ انسان کی فطرت میں ذاتی منفعت کی زبردست تحریک موجود ہے اور حسد و رشک کے جذبات قوی ہوتے ہیں اور وہ کبھی ایک حالت پر قانع رہنا پسند نہیں کرتا۔ پس بدنصیب پارٹیاں ہمیشہ انقلاب در دوبدل کے لئے کوشش کرتی ہیں۔ بےچینی بڑھتی ہے۔ گہری سازشوں کے جال چپکے چپکے بچھائے جاتے ہیں۔ خفیہ ایجنسیاں بھرتی کی جاتی ہیں۔ با اقتدار اشخاص کو مختلف پارٹیاں ترغیب و تحریص و تائید و تخویف غرض ہر ذرائع سے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی حالت میں ان پارٹیوں کے زبردست اثرات و سازشوں سے الگ تھلگ رہنا نہایت زبردست و مستقل کیر یکٹر کا کام ہے۔ آہ! کتنے بدنصیب اس پارٹی کی کشمکش کا شکار ہو گئے۔ در حقیقت یہی ہے کہ یہ آزمایش پہلی آزمائش سے بھی زیادہ سخت ہے۔ حیدرآباد میں جو شخص ان پارٹی پالیٹکس و شجر الذہب والفضہ کی آزمائش سے ہمیشہ الگ تھلگ اور بالکل صاف و پاک و بے باک رہا ہے وہ نواب عماد الملک بہادر ہے جس کو آج دی گرینڈ اولڈ مین آف حیدرآباد کا معزز لقب حاصل ہے۔

مسٹر حیدری کا اصول بھی ہمیشہ باہمہ و بے ہمہ رہا ہے۔ آپ کا اصول یہ ہے کہ سب سے مقدم ریاست کی منفعت کا خیال ہے۔ باقی رہیں یہ پارٹیاں سو بھائی اپنا اصول یہ ہے کہ "باسلماں اللہ اللہ، با برہمن رام رام"۔

مسٹر حیدری حیدرآباد میں بے پارٹی شخص ہیں۔ آپ ملکی و غیر ملکی جھگڑے کو محض ایک لفظی جھگڑا سمجھتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ملکی تو درکنار اس ملک کے گونڈ بھیل دلباڑے، دوڈے مار ہیں۔ باقی فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی چار پشت کے ملکی ہیں۔ کوئی دو پشت کے۔ یہ امر کیسا افسوسناک ہے کہ لوگ اس لفظی جھگڑے کی بدولت سلطنت کو ضعف پہنچاتے ہیں۔ اس سیاسی نکتہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ تمازہ خون

ہمیشہ قوت و صحت کا باعث ہوتا ہے۔ باہر والے اگر حیدرآباد آکر کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ عین قانون قدرت کے موافق ہے اور اس میں سلطنت کا فائدہ بھی ہے۔ بات یہ ہے کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتا ہے۔ دکن کی اعلیٰ و حکمراں جماعت اور یہاں کے اُمرا کا سلسلہ بھی شمال ہند کی قوت دار آب و ہوا سے ہے۔ دکن کی آب و ہوا اپنی بے نظیر زرخیزی، نرمی و آرام پسندی کے باعث قوائے انسانی کو جلد ضعیف کر دیتی ہے۔ یہاں قیام ہستی کے لئے کشمکش کم ہونے سے مقابلہ و حوصلہ مندی کی قوت گھٹ جاتی ہے۔ انسان مستعدی و جفاکشی و ریاضت جسمانی و دماغی سے عموماً کچھ تو بسبب اثر مرز و بوم اور کچھ بسبب استغنا جی چرانے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غالب و قوی خون کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے دکن میں حکمرانانِ سابق نے اپنی سلطنت کی قوت و استحکام کے لئے عربوں و افغانوں و حبشیوں و راجپوتوں و سکھ وغیرہ جنگجو اقوام کا خیر مقدم کیا ہے اور محمود گاواں، میر جملہ، میر عالم وغیرہ مدبرین نے یہاں فروغ پایا ہے۔ چونکہ اب زمانہ سیف کا نہیں، بلکہ دماغ و قلم کا ہے۔ اس لئے اب مختلف اقوام ہند کے لائق و سربرآوردہ دیسی لوگ نظام سلطنت کی تائید کے لئے بلائے جاتے ہیں۔ اگر ملک ہی ان ضروریات کو پورا کر سکتا تو آج حیدرآباد میں ان جنگجو اقوام و میر جملہ و میر عالم و بلگرامی، و عماد جنگی و افسر جنگی و محسن الملکی و فریدون جنگی و سرور جنگی وغیرہ ایسے مدبر و لائق و روشن خیال خاندانوں کا وجود نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان بیرونی مختلف الخصائص اقوام و چیدہ لائق خاندانوں کے تازہ خون و صحبتوں کی بدولت دکن کی نسل و خون و دماغ پر عمدہ اثرات مرتب ہوئے ہیں اور یہ ملک و سلطنت کے لئے باعث قوت و زیب و زینت ہیں۔ ان کی بدولت عنقریب زمانہ میں حیدرآباد بلحاظ نسل و خون و دل و دماغ ہندوستان میں ایک بہترین مقام شمار کیا جائے گا اور خلاصۂ ہند سمجھا جائے گا اور کیا عجب ہے کہ یہیں سے ازروئے اصول ارتقائے انسانی اس جدید ترین مکمل ہندوستانی ٹائپ کا ظہور ہو جس کا وجود ہنوز تخیل میں ہے۔ اسلام ملکی و غیر ملکی سیاہ و سپید کے امتیاز و تنگدلی سے مبرا ہے۔ "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

ایک غیر ولایت کے سیاح کو سب سے زیادہ دلچسپ و عجیب و غریب منظر جو حیدرآباد کے شہر میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں تلنگے و مرہٹے و شمال کے شانہ بشانہ عرب و افغانی و ایرانی و حبشی و سکھ و جاٹ و راجپوت، وغیرہ اقوام کے مختلف الاشکال و اللباس لوگ ملے جلے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور اُن کی حالت یہ ہے کہ:

کسے را باکسے کارے نباشد

حیدرآباد کے شہر میں وحشی اقوام سے لے کر اعلیٰ یورپ و تمدن کے انسانی ٹائپ نظر آتے ہیں۔ اہل

یہ سب "زندہ باشد عثمان علی خان بادشاہ!" کا ترانہ دل و جان سے گاتے ہیں اور حیدرآباد کا نام عرب و فارس و حبش و سرحد و ہندوستان کے قریہ قریہ میں روشن کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ خلافت عباسیہ بغداد کے بعد اب اسلام کی اس اعلیٰ اخوت و عالمگیری کا تھوڑا سا زندہ نمونہ حیدرآباد ہی میں نظر آتا ہے۔ یورپ کے شاہزادے و وائسرایان ہند حیدرآباد میں آکر اس عجیب و غریب حنامنا یعنی (مظاہرۂ قدرت) کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ جمعہ کے دن مکہ مسجد نمونۂ کعبہ نظر آتا ہے۔

مسٹر حیدری ملکی و غیر ملکی کے تنگدل تعصبات سے بری ہیں۔ آپ کا نصب العین ہمیشہ نظم سلطنت و کام کی لیاقت ہے۔

یہاں تک تو ہم نے مسٹر حیدری کے کارناموں پر نظر ڈالی ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم کسی قدر اُن کے خیالات و عادات و محاسن کا بھی ذکر کریں جن کے جاننے کا عوام الناس کو بہت کم موقع ملتا ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت اور مستقبل کے متعلق آپ کا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کو بہت زیادہ عملی بننے کی ضرورت ہے۔ آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ سلطنت حیدرآباد کے وسیع رقبے میں ملازمت کے علاوہ مسلمانوں کے لئے زراعت و تجارت کا وسیع میدان موجود ہے۔ اگر مسلمان جلد اس طرف نہ مائل ہوئے تو غیر لوگ جلد اس پر قبضہ کر لیں گے۔ کاش حیدرآباد میں جہاں اور نیم ضروری محکمے موجود ہیں وہاں ایک محکمہ ڈائرکٹر جنرل ترقی صنعت و تجارت کا قائم کر کے معتمدی امور عامہ کے تحت کر دیا جاتا تو غالباً ہزاروں بے روزگاروں کے لئے ذرائع معاش کا سامان پیدا کیا جاتا۔ حیدرآباد میں بے روزگاروں کا روز بروز اضافہ ہوتا جانا ملک کے لئے ایک خوفناک بات ہے۔ اس کا تدارک بجز صنعت و تجارت کی ترغیب اور ترقی کے اور کچھ نہیں۔

مسٹر حیدری ہندو و مسلمان اتحاد کے زبردست حامی ہیں۔ آپ کا وہ اعلیٰ مضمون جو ہندوستان کے مشہور سوشل رفارمروں کے مضامین کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوا ہے، قابل مطالعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے اہم و معرکۃ الآرا مسئلہ ہندوستان کے لئے جس پر اس کی نجات منحصر ہے، ہندو مسلمان کا اتحاد ہے اور مبارک ہیں وہ افراد جو اس کے حامی و کوشاں ہیں۔

تعلیم نسواں کے متعلق مسٹر حیدری کے خیالات بہت فیاضانہ ہیں۔ ان کی پوری قدر مسلمانان ہند ایک پشت کے بعد کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کا ترقی و فلاح دیکھنا ممکن نہیں جب تک کہ مائیں قوی الجثہ و صحیح الدماغ و تربیت یافتہ نہ ہوں گی۔ دنیا میں اس وقت جتنی ترقی یافتہ قومیں ہیں سب میں عورت کا درجہ بہتر حالت میں ہے۔

اور ان کی قوتِ ارادی کو کچلا نہیں گیا ہے۔

مسٹر حیدری کا مزاج چونکہ سخت عمل پسند واقع ہے، اسلئے آپ حال پر بمقابلہ استقبال کے زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ بہ نسبت آئیڈیل (خیالی) کے پریکٹکل (عملی ہونا زیادہ مفید ہے۔ ہم کو اپنے پالیٹکس میں موجودہ حالات و شرائط کا لحاظ سب سے مقدم کرنا چاہیئے "آج کا دکھ آج کے لئے بس ہے، کل کی مشکلات کل پر چھوڑ دو"۔

مسٹر حیدری بلحاظ عادات کے سخت جفاکش و پابند اوقات واقع ہوئے ہیں۔ صداقت پسند ہیں۔ دن رات میں بمشکل آپ ۶ گھنٹہ آرام کرتے ہیں۔ دینداری و کنبہ پروری آپ کے بڑے اوصاف ہیں۔ کئی رشتہ دار بیواؤں و بہت سے عزیز یتیم و بیسیوں بچوں کا اور بہت سے غریب ذوالقربیٰ کا بار آپ پر ہے اور یتیمی، مساکین و بیکسوں کو بھی آپ فراموش نہیں کرتے۔ آپ میں کاظمین الغیظ والعافین عن النّاس کی صفت بھی ہے۔ آپ کو اپنی صاحبۃ الجمال و خلق مجسم بیگم صاحبہ اور پیارے بچوں سے بدرجۂ غایت محبت ہے۔

اس وقت آپ کی عمر کا ۴۳ واں سال ہے۔ سرکار انگریزی میں آپ کا درجہ مستقل اکونٹنٹ جنرل یعنی صدر محاسبی بمشاہرہ دو ہزار پانچسو سکہ قیصری ہے اور نظام سرکار میں آپ معتمد عدالت و پولس و امور عامہ ہیں۔ یہاں آپ کی تنخواہ قریباً تین ہزار تین سو روپیہ ماہانہ سکہ شاہی پڑتی ہے اور حال میں نظام گورنمنٹ نے ازراہ قدردانی آپ کی خدمات میں ۳ سال کی اور توسیع کی ہے اور پانسو ماہانہ کا اور اضافہ منظور فرمایا ہے۔ اس حساب سے اب آپ کو قریباً ۴ ہزار ماہانہ ملے گا جس کے آپ بہر صورت مستحق ہیں۔ اور اب آپ کی تنخواہ اعلیٰ سے اعلیٰ یوروپی عہدہ داران سرکار نظام و سرکار انگریزی کے ہم پلہ ہے۔

ایک صرف ۴۳ سالہ مسلمان شخص کے لئے ترقی کے ان مراتب و مدارج پر محض اپنی ذاتی کوشش و لیاقت کی بدولت پہنچنا کچھ کم کامیابی نہیں خصوصاً جبکہ اہل ہند کے لئے عموماً و مسلمانوں کے لئے خصوصاً ترقی کی راہیں تنگ و محدود ہیں اور شرائط بہت سخت۔ فطرت نے ہر شخص کو مختلف قابلیتیں جداگانہ طور پر عطا کی ہیں۔ ہر شخص کی استعداد و قابلیت دیگر کثیر بلحاظ اثر مرز و بوم۔ وراثت، خاندانی خصوصیات، صحبت، تعلیم و ماحول مختلف ہوتی ہے۔ مسٹر حیدری کے خاندان نے مثل پارسیوں کے تجارت و علم کے ذریعہ سے زینۂ سیاست و انتظام پر قدم رکھا ہے۔ اس وقت آپ کے خاندان میں کئی انڈین سول سروس، جج و انجینئر و ڈاکٹر و آنریبل ہیں، ملک التجار ہیں۔ والیان ریاست مثل ہز ہائنس نواب صاحب جنجیرہ جی۔ سی۔ آئی۔ ای کے ساتھ آپ کے خاندان کا ازدواجی تعلقات ہیں۔ مسٹر حیدری کے گذشتہ ۱۵ سالہ مختلف تجرباتِ ملازمت کے لحاظ سے جس طرح آپ اس وقت سلطنت

کے مالی نظم و نسق میں کافی مہارت حاصل کر چکے ہیں۔ آئندہ چند سالوں میں جبکہ آپ ایچ آف کونسل یعنی عمر شعور پر پہنچیں گے، تو آپ میں مشرقی دربارداری و سیاسی داؤ پیچ کی وہ قابلیتیں پیدا ہو جائیں گی، جو بعض افراد میں سالہا سال کی درباداریوں و سیاسی داؤ پیچوں کے اکھاڑ پچھاڑ سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ مسٹر حیدری کو اپنے بلند حوصلوں کے پورا کرنے و سیاسی اکتساب کے لئے حیدرآباد ایک عمدہ تعلیم گاہ ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ آئندہ چند سالوں میں صاحب موصوف حیدرآباد بلحاظ اپنی اعلیٰ خدمات سلطنت و فیض رسانی خلق وہ نام پیدا کریں گے، جو مدتوں یادگار رہے۔ حیدرآباد میں انہیں کا نام عرصہ تک روشن رہتا ہے جو مہمات سلطنت میں فیاضی و داد دہش میں گوے سبقت لے جاتے ہیں، با اخلاق و متواضع ہوتے ہیں اور ملکی و غیر ملکی تعصبات سے مبرا۔ یہی وہ اوصاف تھے، جن کی بدولت میر محبوب علی خاں بادشاہ آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں اور ان اوصاف کے بعض سابق اعلیٰ عہدہ داروں کے نام آج بھی حیدرآباد کی مخلوق کی زبان پر ہیں۔

—— حافظی (جون ۱۹۱۳ء)

نشی کانت چٹو پادھیا

اس ماہ کے قابل ذکر واقعات میں ڈاکٹر نشی کانت رائے چٹو پادھیا کا انتقال نہایت افسوسناک ہے۔ مرحوم ایک نہایت فاضل اور عالم متبحر تھے۔ آپ کئی مشرقی و مغربی زبانوں میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ اور سرکار نظام کی طرف سے اکثر ترجمے کا کام آپ کے سپرد رہتا تھا۔ تھوڑا عرصہ ہوا آپ نے بحکم سرکار عالی ابن رشد کا ترجمہ فرنچ سے انگریزی میں کیا تھا اور اس کے دو مضمون الٰہ آباد کے مشہور انگریزی رسالہ ہندوستان ریویو میں شائع کرائے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم نے پروفیسر ڈوزی کی تاریخ 'مسلمانانِ اسپین' کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا جسے مولوی عبدالحق بی اے سکریٹری انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن اُردو کا لباس پہنا رہے ہیں۔ غالباً مولوی صاحب ابن رشد کے اردو ترجمے کی طرف بھی توجہ فرمائیں گے۔ مرحوم اُردو زبان کے پُرجوش حامی تھے اور گذشتہ ایام میں اُردو پر ایک زبردست لکچر دیا تھا، جو نہایت مدلل اور مبسوط تھا۔ ہم مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

—— ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۰ء)

مسز سروجنی نائڈو

[ذیل کا مضمون جناب مولوی خورشید علی صاحب نے خاص ادیب کے لئے عطا فرمایا ہے۔ ممدوح سے ناظرین ادیب بخوبی واقف ہیں اور آپ کے خیالات سے اکثر مستفید ہوتے رہے ہیں مزید تعارف کی ضرورت نہیں ہے۔ اس مضمون میں مسز سروجنی نائڈو کی انگریزی شاعری کی اہمیت دکھائی گئی ہے۔ آپ کی قادر الکلامی کے خود ولایتی ادیب اور جوہر شناس معترف ہیں۔ آپ کے کلام انگریزی رسائل میں بارہا ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ زور طبع، معنی آفرینی اور آمد مضمون واقعی قابل داد ہے۔ نکتہ سنج جانتے ہیں کہ دوسرے ممالک کے خیالات و جذبات، رسم و رواج اور عادات و خصائل کو شاعری کا جامہ پہنانا کس قدر دشوار اور مشکل کام ہے مسز سروجنی نائڈو میں یہی بہت بڑا کمال ہے کہ جس حسن و خوبی سے وہ اپنے ملک کے خیالات کی بندش کرتی ہیں اسی خوش سلیقگی اور شگفتگی کے ساتھ یورپ کے جذبات کو بھی نظم کرتی ہیں۔ اور مشرق و مغرب میں ہر حیثیت سے جو بُعد ہے وہ ظاہر ہے انکی ذات پر ابنائے وطن جس قدر فخر کریں بجا ہے اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہر زمانہ میں ایک نہ ایک باکمال ہندوستان کے لئے مایۂ ناز ہوا ہے۔ انگریزی شاعری پر مس تورودت آنجہانی کے بھی جو احسانات ہیں ان کو زمانہ کبھی نہ بھولے گا اور یہ تو قاعدہ ہے کہ متقدمین سے متاخرین کو بڑھ جانے کا زیادہ موقع ملتا ہے۔ یہی کمالات ہیں جن کو یکسو کر دینے سے کسی خاص فن میں ممتاز ہو جانے کے اسباب ہو جاتے ہیں اور مثال کے لئے مسز نائڈو آنجہانی کی ذات کافی ہے۔ ایڈیٹر]

مسٹر عبداللہ یوسف علی نے اپنی مشہور کتاب لائف اینڈ لیبر آف دی پیپل آف انڈیا (اقوام ہند کی طرز زندگی اور کسب معیشت) میں کیا خوب کہا ہے کہ "یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے صرف دو شاعروں نے در حقیقت انگریزی ادب میں نام کیا ہے اور وہ دونوں خواتین ہی ہیں" اس میں شک نہیں کہ جب سے انگریزی تعلیم ہمارے ملک میں عام ہوئی ہے اہل ہند کی کثیر تعداد نے انگریزی زبان میں شعر کہنے کا شوق کیا

لیکن کسی کے کلام کو مقبولیت و شہرت میں وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو مس تورودت آنجہانی اور مسز سروجنی نائڈو کا حصہ تھا۔ قسام ازل نے اس حقیقی دولت سے اب تک مادرِ ہند کے ان ہی دو سعادت اطوار خوش نصیب بچوں کو مالامال کیا۔ مس تورودت اور مسز سروجنی نائڈو کے نام نامی انگریزی ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ ان ہر دو فخر وطن خواتین کی دلکش شاعری نے نظم انگریزی میں ایک جدید پُر لطف باب کا اضافہ کیا اور ان کے تخیل کی جدت اور مضامین کی تازگی نے انگریزی نظم کے گلزار میں عجیب و غریب رنگ و بو کے گل بوٹے لگائے۔ لیکن مسز سروجنی نائڈو نے اپنے پیشرو مس تورودت آنجہانی سے بھی گوئے سبقت لے جانے میں کامیابی حاصل کی۔ جواں مرگ مس تورودت کو بے وقت موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی خداداد سخن طرازی اور خوش فکری کے زیادہ ترقی و تربیت یافتہ نمونے دنیا کے سامنے پیش کر سکتیں۔ انگلستان کے مشہور شاعر مسٹر اڈمنڈ گاس نے ان دونوں شاعرہ خواتین کا باہمی مقابلہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ:

"تورودت کی تصانیف نہایت عمدہ اور پاکیزہ ہیں۔ لیکن مصنفہ کی کمسنی، عزلت و تنہائی اور بہت مختصر ناشاد و ناکام زندگی کے نہایت درد انگیز و جاں گداز واقعات کے باعث ان میں کچھ امور قابل معافی بھی ہیں۔ مسز نائڈو کے تازہ اور پختہ کلام میں کوئی بات میں ایسی نہیں پاتا جو سخت سے سخت تنقید میں بھی قابل گرفت معلوم ہو سکے۔"

مسز سروجنی نائڈو ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو بمقام حیدرآباد پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ماجد اگھور ناتھ چٹوپادھیائے۔ ڈی۔ ایس۔ سی (اڈنبرا) مشرقی بنگال کے ایک معزز اور موقر خاندان کے رکن رکین ہیں۔ ان کا خاندان سنسکرت میں بہت فاضل اور یوگ کے عمل میں کامل ہونے کے باعث بنگالہ میں بہت مشہور ہے۔ ڈاکٹر اگھور ناتھ ان محترم بزرگوں میں سے ہیں، جن کے ہاتھوں حیدرآباد میں انگریزی تعلیم کی داغ بیل پڑی۔ آج حیدرآباد میں بچہ بچہ اس نام سے واقف ہے اور حیدرآباد کے ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے لوگ ڈاکٹر صاحب کی عزت اور ان کے خاندان کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں کے سررشتہ تعلیمات کی مختلف خدمتیں ادا کیں۔ مدت تک وہ نظام کالج کے سائنس پروفیسر تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے وظیفہ لینے کے بعد اب سال ڈیڑھ سال سے اپنے وطن مالوف میں رہنا اختیار کیا ہے۔ لیکن ان کی ذاتی خوبیوں اور پاکیزہ اخلاق کی یاد اور ان کی سادہ طرز زندگی کا نیک اثر اب تک ویسا ہی باقی ہے۔

مسز سروجنی نائڈو ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی اولاد ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد کے مشہور

سینٹ جارجس گرامر اسکول میں ہوئی۔ بمصداق "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا" شروع ہی سے غیر معمولی قابلیت کے آثار نمودار تھے۔ بارہ برس کی عمر میں مدراس یونیورسٹی کے امتحان میں میٹریکولیشن میں کامیابی حاصل کی۔ ۱۸۹۵ء میں سرکار نظام کی جانب سے بعطائے وظیفہ انگلستان بھیجی گئیں۔ انگلستان میں ۱۸۹۸ء تک قیام رہا۔ اس زمانہ میں کچھ دنوں تو لندن کے کنگس کالج میں تعلیم پائی اور باقی ایام مشہور زنانہ درس گاہ گرٹن میں بسر کیے۔ ۱۸۹۸ء کے ستمبر میں حیدرآباد واپس ہوئیں اور اسی سال دسمبر میں ڈاکٹر ایم۔ جی۔ نائڈو کے ساتھ جو اڈنبرا یونیورسٹی کے ایم۔ بی۔ سی۔ ایم ہیں، شادی کرلی۔

مسز سروجنی نائڈو کو بہت کمسنی سے شعر کہنے کا شوق ہے، چنانچہ وہ بیان کرتی ہیں:۔

"ایک روز جبکہ میں گیارہ برس کی تھی جبر مقابلہ کا ایک سوال مجھ سے حل نہیں ہو رہا تھا میں اس کو حل کرنے کی کوشش میں بہت پریشان ہو رہی تھی اور اپنی ناکامی پر بیٹھی افسوس کر رہی تھی۔ سوال تو حل نہیں ہوا۔ لیکن اس کے عوض خود بخود ایک پوری نظم میرے ذہن میں آئی۔ میں نے فوراً اُسے قلمبند کرلیا اور اس دن سے میری شاعری کی ابتدا ہوئی"

پانچ چھ برس بعد جب وہ انگلستان پہنچیں تو انہیں شعر کہنے میں خوب کمال حاصل تھا۔ وہ کئی بہت نفیس اور پاکیزہ نظموں کی مصنف بن چکی تھیں۔ ایک آدھ دلچسپ ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ غرض وہ اُس وقت ایک بہت اچھی شاعرہ تھیں۔ مسز سروجنی نائڈو کی غیر معمولی قابلیتیں انگلستان میں بڑی حیرت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئیں۔ اس کا اندازہ مسٹر اڈمنڈ گاس کے مندرجہ ذیل بیان سے ہو سکتا ہے:

"سروجنی چٹوپادھیائے جیسا کہ وہ اُس وقت کہلاتی تھیں جب پہلے پہل لندن پہنچیں، تو وہ ایک سولہ برس کا بچہ تھیں۔ مگر اسی عمر کی انگریز لڑکی سے وہ اتنی ہی مختلف تھیں جس قدر کہ کنول یا ناگ پھنی سوسن سے الگ ہوتی ہے۔ اُن کی دماغی پختگی غضب کی تھی۔ حیرتناک طور پر مطالعہ کیا تھا اور دنیا کی معلومات میں مغربی لڑکیوں سے بدرجہا فائق تھیں"

مسز سروجنی نائڈو کی اُس وقت کی شاعری کے متعلق وہ کہتے ہیں:

"ان کا کلام تمام ظاہری امور میں بالکل مکمل، قواعد کے لحاظ سے نہایت درست اور جذبات و خیالات کی نظر سے بے عیب تھا"

مسز سروجنی نائڈو کی شاعری کی ابتدا کی طرح اس کے تغیرات کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔ مسٹر

اڈمنڈ گاس نے مسز سروجنی نائیڈو کی نظموں کے ایک تازہ ترین مجموعہ کی تمہید میں اس پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ مسز نائیڈو کے کلام کو دیکھ کر انہیں سخت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ مسز سروجنی نائیڈو کا اس وقت تک کا کلام باوجود تمام اوصاف و محاسن کے ایک بہت بڑی خامی یہ رکھتا تھا کہ کسی مابہ الامتیاز خصوصیت سے معرا تھا۔ جذبات اور تخیل میں وہ مغربی تھا۔ ٹنی سن اور شیلے کے کلام پر اس کی بنا تھی۔ یہاں تک کہ عیسائی مذہب کے مخصوص جذبات کے پرتو سے بھی وہ خالی نہ تھا۔ مسٹر اڈمنڈ گاس نے مسز نائیڈو کو اس نقص کی جانب متوجہ کیا اور سمجھایا کہ ایک انتہا درجہ کی سمجھ دار نوجوان ہندی سے جس کو نہ صرف زبان پر بلکہ مغربی عروض پر بھی پوری دستگاہ حاصل ہو اہل انگلستان اس بات کے خواہشمند نہ تھے کہ وہ خود انہی کے جذبات و احساسات کو ان کی زبان میں ان کے سامنے پیش کرے بلکہ وہ اس کے متوقع تھے کہ انہیں ہندوستان کے ٹھیٹ ہندوستانی شاعرانہ اسرار سے تعارف حاصل ہو۔ مسز سروجنی نائیڈو نے اس دانشمندانہ مشورہ کو بڑی ممنونیت کے ساتھ قبول کیا۔ اسی روز سے اپنی طرز بدل دی اور مسٹر اڈمنڈ گاس کی مشفقانہ نصیحت پر عمل کرنا شروع کیا۔ ۱۸۹۵ء سے آج تک ان کا کلام خالص ہندوستانی خیالات و جذبات کا ترجمان اور انگریزی شاعری کے خزانہ میں بالکل ایک انوکھا قابل قدر اضافہ ہے۔ اب تک مسز نائیڈو کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں (۱) "دی گولڈن تھرشولڈ" یعنی "آستانۂ زریں" یا "سنہری چوکھٹ" اور (۲) "دی برڈ آف ٹائم" یعنی "طائر العصر" بہت مشہور ہیں۔ انگریزی ادب کی دنیا مسز نائیڈو کے کلام کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتی ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے سر برآوردہ نامور علمی رسالے مسز سروجنی نائیڈو کے دل آویز کلام کو فخر اور قدر و قیمت کے ساتھ اپنے صفحات میں درج کرتے ہیں۔ بڑے بڑے نقادانِ سخن نے مسز نائیڈو کے ایک ایک مصرعہ کی داد دی ہے اور اس بات کے قائل ہو گئے ہیں کہ مسز سروجنی نائیڈو کا کلام انسان کے باطنی احساسات کو بیدار کرتا روح کو لذت و سرور بخشتا اور لطیف جذبات کو وجد میں لاتا ہے۔ غرض مسز نائیڈو کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں ہندوستان اور انگلستان والے یکساں رطب اللسان ہیں اور وہ بجا طور پر اس وقت ایک بہت اعلیٰ پایہ کی شاعرہ مانی جاتی ہیں۔

شاعری کی طرح مسز نائیڈو کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت ایسی ہے جس میں بھی وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ وہ قابلیت ان کی خداداد قوتِ بیان ہے۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی فصیح و بلیغ مقرر ہیں مبدء فیاض نے اس کے خاص جوہر ان کو عطا کیے ہیں۔ جن لوگوں کو مسز نائیڈو کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا ہے

دہی اسماہات کا پورا اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس پایہ کی مقرر ہیں۔ خصوصاً جبکہ مضمون زیر بحث ہندوستان کی دیرینہ عظمت کا اظہار کرتا ہو تو پھر مسز نائڈو کی پرجوش فصیح البیانی عجیب و غریب ہوتی ہے۔ جب وہ تقریر کرتی ہیں تو سامعین پر وجد اور محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے مبصر اُن کی جادو بیانی کے قائل اور ثناخواں ہیں۔ سوشل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی وغیرہ بڑے بڑے مجمعوں میں مسز نائڈو نے جو پاکیزہ تقریریں کی تھیں ان کی تعریف میں سارا ہندوستان گونج اٹھا تھا۔ خود انگریز مسز نائڈو کی شستہ زبان کے مداح ہیں۔ وہ اس شعر کی پوری مصداق ہیں:

اللہ رے صفائے بیانِ حدیث دوست دم بند ہے فصاحتِ اہلِ فرنگ کا

مسز نائڈو کو اپنی درماندہ ہم جنسوں کی بھلائی و بہبودی میں کوشش کرنے کا شوق ہے۔ حیدرآباد میں عورتوں کی ہمدردی اور بہتری کا جو کام ہوتا ہے اس میں مسز سروجنی نائڈو کے مبارک ہاتھ ضرور سب سے پہلے شریک رہتے ہیں۔ حیدرآباد پر پچھلے دنوں رود موسیٰ کی طغیانی کے باعث جو عام تباہی چھائی تھی اور بیچارے بے زبان فرقۂ نسواں کو جو ناگوار مصائب اس میں برداشت کرنے پڑے تھے اس کے دفعیہ کی کوششوں میں مسز نائڈو نے بے انتہا تکلیفیں گوارا کیں۔ ان دنوں اُنہوں نے اپنے اُوپر گویا خواب و خور حرام کر رکھا تھا۔ رسم و رواج اور الف و عادت کے طوق و سلاسل میں گرفتار شکستہ حال فلک زدہ پردہ کی بیٹھنے والیوں کی بروقت اعانت و دستگیری میں اس عالی حوصلہ، نیک نفس، خداترس، روشن خیال خاتون نے خالصاً للہ جو سخت کوششیں اور شدید محنتیں جس مستعدی، سرگرمی اور جفاکشی سے کیں ملک کبھی ان کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ مسز سروجنی نائڈو کی یہ جانفشانیاں ہر طبقہ میں بڑی ممنونیت کے ساتھ دیکھی گئیں۔ چنانچہ سرکار انگریزی نے اس کے متعلق اپنی پسندیدگی کے اظہار میں قیصر ہند کا اول درجہ کا تمغہ مرحمت فرمایا۔ بالمختصر یہ کہ مسز سروجنی نائڈو اپنے ملک کی واجب الرحم عورتوں کے ساتھ پوری ہمدردی رکھتی ہیں اور ان کی رفاہ و بہبودی کے ہر کام میں دل و جان سے شریک ہوتی ہیں۔

آج کل کی حالت پر نظر کرتے یہ بات خاص طور پر ذکر کرنے کے قابل ہے کہ باوجود اس کے کہ مسز سروجنی نائڈو ولایت کی تعلیم یافتہ ہیں، انگریزی کی بہت بڑی ادیب ہیں، اعلیٰ پایہ کی شاعرہ ہیں اور انگریزی زبان بمنزلہ ان کی مادری زبان کے ہے، لیکن وہ ہندوستان کے تقریباً تمام سربرآوردہ اردو رسالے برابر مطالعہ کرتی ہیں اور اُنہیں اردو سے خاص دلچسپی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم نسواں سے محرومیت اور پردہ کی سختیوں نے ہندوستان کی خواتین کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ فطری انعامات سے کام لے کر اپنے دماغی نور کی شعاعوں سے دنیا کو منور کر سکیں۔ لیکن ان تمام موانعات کے باوجود جب کسی خوش نصیب خاتون کا نام افق کمال پر اس عزت و وقعت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے، تو حقیقت میں نہایت شادمانی ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسا نام جو نہ صرف فرقہ نسواں کے لئے بلکہ سارے ملک کے لئے بجا طور پر فخر و ناز کا باعث ہو، بے انتہا مسرت بخش ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو عورتوں کی دماغی ترقیات کے منکر ہیں مسز سروجنی نائڈو کی اعلیٰ قابلیتوں سے بصیرت حاصل کر کے اپنے مفروضہ توہمات کی اصلاح کر سکتے ہیں: ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

— سید خورشید علی (مارچ ۱۹۱۳ء)

بابو رابندرناتھ ٹیگور

آپ بنگالی زبان کے مشہور اہل قلم اور قومی شاعر ہیں۔ حال میں آپ کے اہل قوم نے کلکتہ ٹاؤن ہال میں مجتمع ہو کر آپ کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے اور آپ کی علمی خدمات کا اعتراف کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ نئے تعلیم یافتہ اپنی دیسی زبان سے وحشت کرتے تھے اب وہ بات جاتی رہی ہے۔ اب وہ اس کی طرف محبت و وقعت سے بڑھتے ہیں۔ رابندر بابو نے بنگلہ زبان میں قوم اور ملک میں اتحاد اور ترقی کے خیالات پیدا کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم ان کو ممدوح اور معظم تسلیم کرتی ہے۔

آپ کی پیدائش سنہ ۱۸۶۰ء میں ہوئی تھی۔ آپ مہارشی دیویندر ناتھ ٹیگور کے خلف الرشید اور بابو دوارکا ناتھ ٹیگور کے پوتے ہیں۔ آپ کا خاندان علمی سرپرستی کے لئے ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ مبارک ہے وہ ملک اور وہ قوم جو اپنے اہل قلم کی قدر و منزلت کرتی اور اس کا عملی ثبوت دیتی ہے۔

(بذیل تصریحات تصاویر: اپریل ۱۹۱۲ء)

راجہ رام موہن رائے

تمہید

اصول راست لیے، چاہے جاں لیے نہ لیے
زمیں لیے نہ رہے، آسماں لیے نہ رہے

جس وقت کہ ہندوستان میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ صوبہ داروں کی سرکشی، مرہٹوں کی دست برد اور نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے سلطنت مغلیہ کا قریب قریب خاتمہ کر کے شاہ دہلی کو محض شاہ شطرنج بنا دیا تھا۔ ملک کے گوشے گوشے میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بنگال پر انگریز اپنا تسلط جما رہے تھے۔ سوسائٹی کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور مذہب کیا ہندوؤں کا اور کیا مسلمانوں کا محض چند رسوم مقررہ کے برتنے کا نام رہ گیا تھا۔ اس وقت جنگ پلاسی کے سترہ برس بعد ۱۷۷۴ء میں بنگال کے ضلع ہگلی کے قصبہ رادھا نگر میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے باوجود عظیم دقتوں کے اپنے گرد و پیش کی مشکلات پر فتح حاصل کر کے ہندوستان میں مذہبی، سوشل اور قومی اصلاح کی بنیاد رکھی۔ جس نے مذہب کے میدان میں بت پرستی کو چھوڑ کر خدا پرستی کی طرف اپنی قوم کو متوجہ کیا۔ ستی کی قبیح رسم کا بیخ کنی کر کے سوشل اصلاح کے پہلے مرحلہ کو طے کیا اور انگلستان میں پارلیمنٹ کی کمیٹی کے سامنے اپنا اظہار دے کر اُن پولیٹکل اصول کا خاکہ کھینچا جس میں آج تک رنگ و روغن بھرا جا رہا ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے اپنے ملکی عقاید سے کبھی گریز نہیں کیا۔ البتہ مغربی روشنی سے کسب نور کر کے اُن کو جلا دینے کی کوشش کی اور مشرق و مغرب کے باہمی اختلاط کے اُن اصول کی بنیاد رکھی جن پر ہندوستان جدید کی عمارت تیار ہو رہی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان کے مدبروں اور مصلحوں کی ساری کوششیں راجہ رام موہن رائے کی اولین سعی کی منت کش ہیں اور اگر آج ہم راجہ صاحب ممدوح کی زبان سے یہ کہیں کہ:

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری — اوّل بشگوں کرد طواف حرم ما

تو نہایت مناسب اور زیبا ہے۔

خاندان و پیدائش راجہ رام موہن رائے کے بزرگ اعلیٰ نسل کے کلین برہمن تھے۔ آپ کے پردادا کرشن چند بنرجی نے نواب مرشد آباد کے یہاں سے اپنی خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب حاصل کیا تھا

اور اس وقت سے یہ خاندان اسی نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ رام موہن رائے کے باپ کا نام رماکانت رائے تھا۔ ان کی شادی شام بھٹاچارج کی بیٹی تارنی بائی سے ہوئی تھی۔ شام بھٹاچارج شاکت مت کے پیرو تھے۔ لیکن تارنی بائی نے سسرال میں جاکر وشنو مت اختیار کر لیا تھا۔ یہ جیسی پارسا اور پاک باطن تھیں ویسی ہی پر دل عزیز اور شیریں کلام بھی اور اسی وجہ سے سب لوگ اُن کو "پھول ٹھکرانی" کہا کرتے تھے۔ رماکانت رائے کچھ روز تو مرشد آباد کی سرکار میں ملازم رہے، لیکن کچھ عرصہ بعد نوکری سے کنارہ کش ہو کر رادھا نگر میں سکونت اختیار کر لی اور بردوان کی ریاست سے کچھ گاؤں ٹھیکے پر لے کر بسر اوقات کرنے لگے۔

تعلیم و تربیت۔ توحید کی دھن رام موہن رائے، اس زمانہ کے حسب دستور پانچ برس کی عمر میں پاٹھ شالا میں بٹھلائے گئے، اور بنگالی زبان کی تعلیم سے مستفید ہو کر انہوں نے مولوی صاحب کے پاس مکتب میں پڑھنا شروع کیا۔ کیونکہ اس زمانہ میں بنگال میں بھی فارسی درباری زبان تھی اور اس کا حاصل کرنا شرفا کے لئے ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شعرائے فارس کے صوفیانہ خیالات کے وہ اسی زمانے سے شیدا تھے اور شمس تبریز اور حافظ شیراز کے تصنیفات نہایت شوق سے پڑھتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ ایشور کی بھگتی اور عشق حقیقی کی بنا مکتب ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہو۔ فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو کر رام موہن رائے عربی کی تکمیل کے واسطے پٹنہ بھیجے گئے، جو اس وقت بنگال میں عربی فارسی کا سرچشمہ خیال کیا جاتا تھا۔ عربی میں مہارت حاصل کر کے انہوں نے قرآن کا مطالعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تلقین وحدانیت نے اُن کے دل کو مروجہ بُت پرستی کے طریق سے قطعی متنفر کر دیا۔ ازاں بعد انہوں نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی اور ہندو شاستروں سے معرفت الٰہی کے سبق حاصل کئے۔ اس تعلیم و تلقین کا یہ نتیجہ ہوا کہ ۱۶ برس کی عمر میں انہوں نے بُت پرستی کے خلاف ایک کتاب لکھی۔ جب اس تصنیف کی خبر ان کے باپ کو پہنچی، تو وہ بہت برافروختہ ہوئے۔ ان کی والدہ بھی ان سے ناراض ہو گئیں۔ آخر والدین کی مخالفت سے تنگ آکر یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور چار برس تک برابر سیاحی کرتے رہے۔ اسی زمانے میں بدھ مذہب کی تحقیقات کے لئے رام موہن رائے تبت گئے، اور وہاں کی زبان سے واقفیت حاصل کر کے مذہبی تحقیقات شروع کی۔

تبت کے لوگ دلائی لاما کی پرستش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ دلائی لامہ مرتا نہیں بلکہ چولا بدلا کرتا ہے۔ چنانچہ جب دلائی لاما مرتا ہے تو کسی ایسے بچے کی تلاش کی جاتی ہے جس میں ان کے اعتقاد کے مطابق اس کی روح حلول کر گئی ہے۔ رام موہن رائے کی حق پسند طبیعت نے ان کو اس خیال کی لغویت ظاہر کرنے کے لئے مجبور کیا جس کی وجہ سے وہاں کے لوگ ان کے دشمن ہو گئے۔ آخر کار چند عورتوں کی مدد سے ان کی جان بچی اور اپنے والدین کے طلب

یہ گھر کو واپس آگئے۔ جب یہ واپس آئے، تو ان کے باپ نے کہا کہ جیسا رنج راجہ دسرتھ کو رامچندر کی جدائی سے ہوا تھا، ویسا ہی قلق مجھ کو اپنے رام کی علیحدگی سے ہوا ہے اور اب میں اس کو اپنے سے الگ کرنا نہیں چاہتا۔

لیکن باوجود ان باتوں کے رام موہن رائے اور ان کے باپ میں پھر ان بن ہو گئی۔ کیونکہ رام موہن رائے مروجہ عقائد کی مخالفت سے باز نہیں رہ سکتے تھے۔ مذہبی معاملات میں جب کبھی مباحثہ ہوتا تھا تو یہ اپنے والد کے دلائل کو نہایت متانت سے رد کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے باپ کہا کرتے تھے کہ جتنی دلیلیں میں پیش کرتا ہوں اُن سب میں تو کنتو (لیکن) لگا کر ان کو کاٹ دیتا ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے رام موہن رائے کو دوبارہ گھر چھوڑنا پڑا۔ اس مرتبہ سنسکرت کی تکمیل کی غرض سے یہ بنارس جاکر رہے اور وہاں اُپنشدوں کی تعلیم کو پورے طور سے حاصل کر لیا۔

۱۸۰۳ء میں اپنے والد کی بیماری کی خبر سُن کر یہ وطن واپس گئے اور ان کی وفات کے وقت اُن کے پاس موجود تھے۔ ایک مرتبہ پادری ایڈم صاحب سے رام موہن رائے نے بیان کیا کہ مرتے وقت میرے والد الیسی محبت سے رام رام کہتے تھے کہ باوجود اختلاف عقائد کے اُن کے عقیدہ کی مضبوطی اور مذہبی جذبے سے سُننے والے کا متاثر ہونا ناممکن تھا۔

سرکاری ملازمت اب رام موہن رائے کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ ابھی تک تو گویا ان کا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے علاوہ معمولی تحصیل علم کے اس زمانہ میں کئی زبانوں پر قدرت حاصل کر لی تھی اور مروجہ خیالات اور طریقوں سے ہٹ کر قرآن اور اُپنشدوں کی مدد سے اپنے لئے وحدانیت کا الگ راستہ نکال لیا تھا۔ لیکن اصول کے قیام و استحکام کی حد سے گذر کر ان کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ ۱۸۰۱ء میں رام موہن رائے نے سرکاری ملازمت کا ارادہ کیا اور ان کی ملازمت کا زیادہ حصہ رنگ پور کے کلکٹر مسٹر ڈگبی کی سررشتہ داری میں بسر ہوا۔ انگریزی کام کرتے کرتے اور ڈگبی صاحب کے پاس جو انگریزی اخبارات آتے تھے ان کو پڑھتے پڑھتے دو تین سال میں رام موہن رائے نے انگریزی میں معقول لیاقت پیدا کر لی۔ ڈگبی صاحب ان کی نہایت قدر کرتے تھے اور انگریزی زبان سیکھنے میں اُن کی مدد کرتے تھے۔ ان کا برتاؤ رام موہن رائے کے ساتھ حاکمانہ نہیں بلکہ دوستانہ تھا اور وہ ان کے مذہبی اصلاح کے کام میں بہت کچھ دلچسپی ظاہر کرتے تھے۔ چنانچہ جب رام موہن رائے نے ویدانت سار انگریزی میں لکھا تو ڈگبی صاحب نے اس کو ترتیب دیکر اس کا دیباچہ اپنے قلم سے لکھا۔

رام موہن رائے نے رنگ پور میں اپنے مکان پر ایک مجلس قائم کی تھی جس میں مذہب کے شوقین اکثر مذہبی معاملات پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں دیوان گوری کانت رائے جرجی نے ایک کتاب گیان منجن نامی

اُن کے خلاف لکھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رام موہن رائے نے چند رسالے بُت پرستی کی تردید میں تحریر کئے تھے۔ ان کو مذہبی اصلاح کی دُھن تھی اور اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کام وہ زمانہ ملازمت میں بھی کئے جاتے تھے۔ تاہم نوکری کی پابندی بہت کچھ ان کی آزادی میں حائل تھی۔ اسی وجہ سے ۱۳ برس نوکری کر کے ۱۸۱۴ء میں انہوں نے استعفیٰ دیدیا۔ جب وہ استعفیٰ دے کر اپنے گھر آئے تو ان کی مخالفت از سرِ نو شروع ہوئی۔ رام جی بٹ نامی ایک شخص نے بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر ان کو طرح طرح کے آزار دینا شروع کئے۔ لوگ آ کر ان کے مکان کے پیچھے چلّاتے، جانوروں کی بولیاں بولتے اور ان کے مکان میں ہڈیاں پھینکتے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ رام موہن رائے کی ماں اُن سے اس قدر بیزار ہو گئیں کہ ان کو الگ مکان بنا کر رہنا پڑا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ان کی بیوی اُمادیوی نے اُن سے پوچھا کہ کونسا دھرم سب سے اچھا ہے۔ رام موہن رائے نے جواب دیا کہ "گائیں مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں مگر سب کا دودھ یکساں ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف مہاپُرشوں کی آرا مختلف ہیں لیکن ہر مذہب کا لُبِ لباب یہ ہے کہ ست پنتھ کو اختیار کیا جائے اور ایمانداری کے ساتھ زندگی بسر کی جائے"۔ اس زمانے میں ہندوستان میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً ہندوؤں کی اونچی ذاتوں میں ستی کی رسم بڑے زور شور سے جاری تھی۔ انگریزی حکام اس کو بُرا سمجھتے تھے اور حتی الامکان عورتوں کو ستی ہونے سے منع کرتے تھے۔ لیکن جزو مذہب سمجھ کر امتناع قانونی کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں رام موہن رائے کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اور گو رام موہن رائے نے ان کی بیوی کو ستی ہونے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ان کی ایک پیش نہ گئی اور آخرکار ان کی بھاوج ستی ہو گئی۔ اسی وقت رام موہن رائے نے دل میں یہ عہد کیا کہ جب تک اس مکروہ رسم کو بند نہ کرا لوں گا، اس وقت تک چین نہ لوں گا۔

مرشد آباد۔ تحفۃ الموحدین ملازمت سرکاری سے علیحدہ ہونے کے بعد رام موہن رائے کی زندگی کا تیسرا دور شروع ہوا۔ اس زمانے میں انہوں نے وطن سے ہجرت کر کے چند روز مرشد آباد میں اور پھر مستقل طور سے کلکتہ میں سکونت اختیار کی۔ مرشد آباد کے زمانۂ قیام میں رام موہن رائے نے ایک چھوٹی سی کتاب موسوم بہ "تحفۃ الموحدین" لکھی۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اس کے ساتھ ایک عربی دیباچہ ہے۔ یہ کتاب پرانے مولویانہ ڈھنگ پر لکھی گئی ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ "خدا کی وحی ہر ایک مہاتما پر نازل ہو سکتی ہے اور یہ سلسلہ وحی و رسالت ابد تک رہے گا۔ ہر ایک مذہب کی خوبیوں کی قدر کرو۔ پرماتما کو جامع جمیع کمالات سمجھ کر اس کی عبادت کرو اور ہر ایک مذہب کے بنیادی اصول کو جو عقل کے مطابق ہوں دنیا میں رواج دو"۔ چند سال ہوئے برہمو سماج نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کرایا تھا۔

کلکتہ کی سکونت مرشد آباد کے چند روزہ قیام کے بعد رام موہن رائے نے کلکتہ میں سکونت اختیار کی اور اپنے اصول اور اشاعت کو باقاعدہ طور پر شروع کر دیا۔ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے ویدانت سوتر کو مع بنگلہ ترجمہ کے شائع کیا اور کتاب کے شروع میں بُت پرستی کی مخالفت میں ایک زبردست مقدمہ لکھا۔ ازاں بعد پانچ اُپنشدوں کا ترجمہ کر کے شائع کیا۔ اُن کے شائع کرنے سے ان کی غرض یہ تھی کہ ہندوؤں کو یہ بتایا جائے کہ ان کی مقدس کتابوں کی رُو سے بُت پرستی ناجائز ہے اور اس میں خدائے واحد کی پرستش کے احکام موجود ہیں۔ رام موہن جانتے تھے کہ مذہب کے معاملہ میں محض عقل و دلائل سے کام نہیں چلتا کیونکہ انسان کی تمام باتوں میں اور خصوصاً مذہب کے معاملہ میں عادت کو بہت کچھ دخل ہے۔ پس اگر ہندوؤں کو یہ بتایا جائے کہ وہ جن کتابوں کو الہامی سمجھتے ہیں انہیں کتابوں میں ان کے مروجہ لغویات کا رد موجود ہے تو وہ وحدانیت کی تعلیم کو زیادہ آسانی سے قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

ہندوؤں کے مذہب کی اُس زمانے میں یہ کیفیت تھی کہ عوام کا تو کیا ذکر ہے خواص بھی ویدوں اور شاستروں سے بے بہرہ محض تھے اور سارے مذہبی عقائد اور رسم و رواج کی بنیاد پُرانوں پر رکھی ہوئی تھی جو ویدوں اور شاستروں سے بہت بعد کو لکھی گئی ہیں۔ رام موہن رائے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خالص اور قدیم ہندو مذہب میں بت پرستی کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ بلکہ اس کا رواج انسانی کمزوری اور اوہام پرستی کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ اُپنشدوں کے تراجم چھاپ کر ہندوؤں کو ان کی تعلیم سے آگاہ کرنے کی یہی غرض تھی کہ خواص عوام پر یہ روشن ہو جائے کہ اصلی ہندو مذہب کیا ہے اور وہ کون کونسی بدعتیں ہیں، جو بعد کو اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔ پُرانے خیال کے پنڈتوں نے رام موہن رائے کی بہت کچھ مخالفت کی اور اُن سے عرصہ تک زبانی تحریری مباحثے ہوتے رہے۔

پادریوں سے مباحثہ ۱۸۲۱ء میں سری رام پور کے مشہور پادریوں کیری وارڈ اور مارشمین وغیرہ سے رام موہن رائے کی ملاقات ہوئی اور اس ملاقات سے ان کو مذہب عیسوی کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے انجیل کو اصلی زبان عبرانی میں پڑھنا شروع کیا۔ کیونکہ یونانی، لاطینی یا انگریزی تراجم اور تراجم در تراجم سے ان کی تسکین ناممکن تھی۔ چونکہ رام موہن رائے عربی کے ماہر تھے اس لئے ان کو عبرانی زبان سیکھنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ انجیل کے مطالعہ سے بھی انہوں نے وحدانیت کا وہی سبق اخذ کیا، جو وہ قرآن اور اُپنشدوں سے نکال چکے تھے وہ اکثر عیسائیوں سے کہا کرتے تھے کہ ہم کو تو قرآن میں تثلیث ملتی نہیں۔ ہم معلوم

تثلیث کہاں سے نکال لائے ہو۔ اس مباحثہ میں ان کے دلائل کا اس قدر اثر ہوا کہ ایک پادری صاحب ایڈم نامی جن سے رام موہن رائے یونانی زبان سیکھتے تھے اور جن کو یہ قوی امید تھی کہ رام موہن رائے جلد عیسائی ہو جائیں گے، تثلیث کے مسئلہ کو سلام کر کے یونیٹیرین (موحد) بن گئے؛ ع شکار کرنے کو آئے شکار ہو کے چلے۔

یونیٹیرین فرقہ کے لوگ انگلستان اور امریکہ میں اس وقت بھی موجود تھے اور اب بھی موجود ہیں، گو تعداد میں تھوڑے ہیں۔ یہ لوگ حضرت عیسٰی کو نہ خدا اور نہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور نہ انجیل کو مبرا از خطا سمجھتے ہیں۔ ان کے دل میں حضرت عیسٰی کی عزت محض بحیثیت ایک مذہبی پیشوا یا پیغمبر کے ہے اور انجیل کو وہ ایک مذہبی اور مقدس کتاب خیال کرتے ہیں اور بس۔

ایڈم صاحب کی اس حرکت سے عیسائی عموماً اور عیسائی پادری خصوصاً ناراض تھے اور چونکہ وہ رام موہن رائے کو اس کا باعث سمجھتے تھے اس واسطے ان سے بھی باوجود ان کی تعلیم وحدانیت کے کچھ خوش نہ تھے۔ اتفاق سے اس زمانے میں رام موہن رائے اور عیسائی پادریوں سے مباحثہ شروع ہو گیا۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ انجیل کو پڑھ کر راجہ صاحب نے ایک کتاب موسومہ "نصائح مسیح" شائع کی جس میں انہوں نے انجیل سے حضرت عیسٰی کے خاص خاص اقوال انتخاب کر کے درج کئے تھے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے مولف سے پادری صاحبان کو خوش ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ اس سے اُن کے مذہبی پیشوا کے اقوال کی اشاعت ہوتی تھی۔ لیکن اس کے بالکل برخلاف پادریوں کو یہ امر نہایت ناگوار گذرا کہ رام موہن رائے نے حضرت عیسٰی کے معجزوں اور ان کی خدائی سے قطع نظر کر کے محض ان کے اقوال ایک مذہبی پیشوا اور بزرگ کی حیثیت سے نقل کر دیے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ یورپ کے عیسائیوں میں مذہبی تنگ خیالی اور تعصب کا رواج تھا اور جو پادری لوگوں کو عیسائی کرنے کے لئے ہندوستان آتے تھے نہ تو اُن کی تعلیم و تربیت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی اور نہ وہ اپنے مروجہ مذہب کے برا بھلے اور برے کی تمیز کر سکتے تھے۔ بس اُن کا ایک اصول ہوتا تھا کہ مذہب عیسوی جس ملت کے وہ پیرو ہیں اس کے علاوہ ہر شے لغو ہے اور ہر شخص کو عیسائی بنا لینا ان کا فرض ہے۔ بہرحال ایک پادری اسمتھ صاحب نامی نے اپنے اخبار فرینڈ آف انڈیا میں رام موہن رائے کی مخالفت میں ایک مضمون لکھا جس کا جواب رام موہن رائے نے فرسٹ اپیل ٹو دی کرسچین پبلک میں دیا۔ اس کا جواب الجواب ڈاکٹر مارشمین صاحب کی طرف سے ان کے رسالے میں شائع ہوا جس کا جواب سکنڈ اپیل میں دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ رام موہن رائے جب اپنے مذہب کے توہمات سے دست بردار ہو چکے تھے، تو وہ دوسرے مذہب کے توہمات کو کب پسند کر سکتے تھے اور اس وجہ سے وہ اپنے جوابات میں ان عیسائی مسائل کی سخت مخالفت کرتے تھے۔

اس مرتبہ عیسائی مطبعوں نے ان کا جواب چھاپنے سے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے رام موہن رائے کو اپنا مطبع علیحدہ قائم کرنا پڑا اور ان کی تیسری اپیل اسی مطبع سے شائع ہوئی۔

شدہ شدہ ان تحریرات کا شہرہ انگلستان اور امریکہ تک پہنچا۔ چنانچہ ۱۸۲۴ء میں انگلستان کی یونیٹیرین سوسائٹی نے نصائح مسیح اور تینوں اپیلوں کا مجموعہ اپنے طور پر شائع کرایا۔ پھر ۱۸۲۸ء میں یہ کتابیں امریکہ میں چھپیں اور ۱۸۳۴ء میں دوبارہ لندن میں شائع ہوئیں۔ اسی زمانے میں پادریوں نے اپنے اخبار سماچار درپن میں ہندو مذہب پر سخت حملے شروع کیے جن کا جواب رام موہن رائے کی طرف سے برہمنیکل میگزین کے کئی نمبروں میں دیا گیا۔ رام موہن رائے ہندو مذہب کے توہمات کے ضرور مخالف تھے لیکن وہ اس کی خوبیوں سے بھی بخوبی ماہر تھے اور ان کو بحیثیت ایک ہندو کے یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے مذہب پر اس قسم کے حملے کیے جائیں۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد رام موہن رائے اور ایک پادری ٹائیلر نامی سے مباحثہ ہوا اور عرصہ تک دونوں اخبارات میں مضمون شائع ہوتے رہے۔ ان مباحثوں کی تفصیل سے یہ بات صاف طور سے واضح ہو گئی ہوگی کہ گو راجہ صاحب بعض مروجہ ہندو عقائد مثلاً بت پرستی اور ستی وغیرہ کے سخت مخالف تھے اور اپنے ہم مذہبوں کو ان عقائد سے جدا کر کے اپنشدوں کی خالص تعلیم وحدانیت کی طرف لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ اپنے کو ہندو مذہب سے خارج نہیں سمجھتے تھے اور نہ اخراج کو پسند کرتے تھے۔ دوسرے مذاہب کے عمدہ اصول سے تعلیم حاصل کرنا ان کے نزدیک واجب اور درست تھا۔ کیونکہ جیسا کہ ان کے اس جواب سے ظاہر ہے، جو انہوں نے اپنی بیوی اوما دیبی کو دیا تھا، وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ :

یک چراغ ست دریں خانہ و از پرتو آن هر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

اور حضرت عیسیٰ اور دیگر ہندی پیشواؤں کی عزت ان کے دل میں تھی۔ تاہم وہ کسی دوسرے مذہب کو اپنے مذہب سے اعلیٰ نہیں سمجھتے تھے اور نہ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنے پر آمادہ تھے۔ برہمو سماج پر جو عیسائیت کا ایسا چوکھا رنگ چڑھا دیا وہ زیادہ تر کیشب چندر سین کا نتیجہ تھا۔

ستی کی رسم کا انسداد ستی کی رسم ہندوستان میں پرانے زمانے سے رائج تھی۔ غالباً اس کی بنا متقدمین کے اس خیال پر تھی کہ جس طرح کسی انسان کو مختلف اشیا کی ضرورت دنیا میں ہوتی ہے اسی طرح ان کی ضرورت اس کی روح کو مرنے کے بعد بھی ہوتی ہوگی۔ آج کل ہنود میں اکثر چیزیں جو کسی شخص کے مرنے کے بعد مہاپاتر کو دان دی جاتی ہیں وہ بھی اسی خیال سے دی جاتی ہیں۔ چنانچہ یونانی اپنے سرداروں کی نعش کے ساتھ اس کی کمان وغیرہ کو بھی جلا دیا کرتے تھے اور اس کی چتا پر اس کے گھوڑے اور اس کے غلاموں کی قربانی کرتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ

راجپوت جن کو بعض مورخین سیتھین قوم کی نسل سے بتاتے ہیں اس رسم کو وسط ایشیا سے اپنے ساتھ لائے ہوں۔ بہرحال اس کی اصلیت جو کچھ ہو رفتہ رفتہ یہ رسم مرحوم کی بیوہ تک محدود رہ گئی تھی اور مجبوری اور زبردستی کی حیثیت سے گذر کر اس نے بے نظیر ایثار کی شکل اختیار کر لی تھی جس کے فسانے سن کر دنیا آج عش عش کرتی ہے۔ لیکن ہم کو نہ بھولنا چاہیے کہ جہاں چند عورتیں رنج اور محبت کے جذبوں سے سرشار ہو کر اپنے خاوند کی نعش کے ساتھ خوشی خوشی جل جانا پسند کرتی تھیں۔ وہاں بیسیوں خاندان کی بدنامی کے ڈر سے زبردستی جلا دیجاتی تھیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ عورت کو رسّوں سے جکڑ کر چتا پر ڈالا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ عورت پہلے تو لواحقین کے کہنے سُننے یا محبّت اور رنج کے جوش میں ستی ہونے پر راضی ہو جاتی تھی۔ لیکن جب چتا روشن کی جاتی تھی تو آگ کے شعلوں کی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور اُٹھ اور بھاگنے کی کوشش کرتی تھی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جب عورتیں اپنی جان بچانے کے لئے چتا سے گنگا جی میں کود پڑیں۔ ان موقع پر رشتی (؟) لوگ اردگرد بانس لیکر کھڑے رہتے تھے کہ عورت کو اُٹھنے کا موقع نہ ملے اور اکثر چتا کے گرد ڈھول اور اس قسم کے اور باجے بجائے جاتے تھے کہ جلنے والی کے چیخنے اور چلّانے کی آواز کسی کو نہ سُنائی دے۔ اکبر نے اس رسم کے انسداد کی تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، تو زندہ عورتوں کو جلتے ہوئے دیکھ کر انگریزی افسر نہایت پریشان ہوئے۔ لیکن چونکہ وہ اس کو مذہبی رسم سمجھتے تھے اور مذہب میں دخل دینا اُن کے اصول کے خلاف تھا اس لئے دم نہیں مار سکتے تھے۔ تب بھی ڈرتے ڈرتے اس وحشیانہ رسم کے خلاف کچھ احکام جاری کئے گئے تھے۔ مثلاً "یہ کہ کوئی بیوہ اپنے خاوند کی نعش سے الگ نہ جلائی جائے۔ ورنہ شوہر متوفی اور بیوہ کی کُل جائداد ضبط ہو جائے گی" تاہم اُس وقت تک کوئی معقول انسداد اس کا نہیں ہوا تھا۔

رام موہن رائے نے اپنے بھائی کی بیوہ کو جلتے ہوئے دیکھ کر اس ہولناک رواج کو کالعدم کرنے کا عہد کیا تھا۔ کلکتہ میں آکر انہوں نے اس کی مخالفت علانیہ شروع کی۔ گھاٹ پر جاکر وہ اس کے خلاف لوگوں کو سمجھایا کرتے تھے۔ انگریزی حکام سے مل کر انہوں نے اس رسم کی لغویت کو ظاہر کرنا شروع کیا۔ اخباروں میں مضامین لکھے۔ کئی کتابیں ستی کی رسم کے خلاف لکھیں اور یہ ثابت کیا کہ اس کا ذکر ویدوں میں کہیں نہیں ہے یہ محض لوگوں کی اختراع ہے۔ آخر کار اس تحریک کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک نے اس رسم کے متعلق تحقیقات شروع کی اور مذہب کے

اصلی احکام پر اس کو مبنی نہ پاکر ۱۸۲۹ء میں اس کے انسداد کے لئے قانون پاس کر دیا۔ اس قانون کے پاس ہوتے ہی کلکتہ میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ادیب کے ناظرین میں سے جن صاحبوں کو ایج آف کنسنٹ بل Age of consent bill کے زمانہ کا شور و شغب یاد ہے وہ اس زمانے کے شور و شغب کا اندازہ کچھ کر سکتے ہیں۔ بیسیوں جلسے اس سرکاری فیصلے کے خلاف منعقد ہوئے اور ہمارے بنگالی بھائیوں نے اپنے حسب عادت بہت کچھ شور مچایا۔ ایک بہت بڑی عرضداشت اس قانون کے خلاف گورنر جنرل صاحب کے حضور میں گذرانی گئی۔ جس کو رد کرنے کے لئے رام موہن رائے نے تین سو بڑے بڑے معززوں سے دستخط کرا کے ایک سپاسنامہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس پر بس نہ کر کے ایک عرضی ستی کے انسداد کے خلاف ولایت بھیجی گئی۔ مگر رام موہن رائے کی کوشش سے وہ بھی خارج ہو گئی۔

انگریزی تعلیم کی حمایت ہندوؤں اور مسلمانوں کے زمانے میں خاص خاص طبقوں میں تعلیم کا رواج تھا اور ان کے لئے مختلف پاٹھ شالاؤں، مدرسوں اور مکاتب کا انتظام تھا۔ ان پاٹھ شالاؤں اور مدرسوں کی امداد بادشاہان وقت کی طرف سے ہوتی رہتی تھی اور علوم و فنون کی قدردانی مختلف طریقوں سے کی جاتی تھی۔ لیکن تعلیم کا کوئی خاص صیغہ قائم نہیں ہوا تھا اور تعلیم کے ذرائع مہیا کرنا اور ان کی نگرانی کرنا حاکم وقت کا فرض نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ جب انگریزوں کا تسلط بنگال میں ہوا تو انہوں نے بھی پرانے طریقہ کو جاری رکھا، جو اوقاف تعلیم کے متعلق قائم تھے، وہ اسی طرح قائم رہے اور بندوبست استمراری کے موقع پر ان کا خیال رکھا گیا۔ وارن ہسٹنگز نے ایک سنسکرت کالج بنارس میں اور ایک اسلامی مدرسہ کلکتہ میں ہندو اور مسلمان مقننوں کے تعلیم کے لئے قائم کیا کہ انگریزی ججوں کو ہندو اور مسلمانوں کی جائداد کے متعلق جو فیصلے دھرم شاستر اور شرع کے مطابق کرنا پڑتے ہیں ان کے واسطے اچھے تعلیم یافتہ قانونی مشیر مل سکیں۔ لیکن عوام کی تعلیم کے لئے کسی قسم کا انتظام نہیں کیا گیا۔ ۱۸۱۳ء میں جب کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی، تو اس میں پارلیمنٹ کی طرف سے یہ شرط بھی رکھی گئی کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ تعلیم کی مد میں خرچ کیا جائے لیکن دس سال تک اس پر کوئی عملدرآمد نہیں ہوا اور یہ روپیہ محض جمع ہوتا رہا۔ آخر کار ۱۸۲۳ء میں لارڈ ایمہرسٹ نے اس شرط کو پورا کرنے کے لئے ایک سنسکرت کالج کلکتہ میں قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ رام موہن رائے کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے گورنر جنرل کے اس ارادے کی مخالفت کی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جس قسم کی دماغی اخلاقی اور سوشل ترقی کی ہندوستانیوں کو ضرورت ہے، وہ محض مشرقی علوم کی تعلیم سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ انگریزی

کی کتابیں پڑھ کر وہ یورپ کے حالات سے واقف ہو چکے تھے۔ اُن کو خوب معلوم تھا کہ جن علوم و فنون کی دنیوی ترقی کے لئے ضرورت ہے ان میں اہلِ فرنگ ہندوستانیوں سے سیکڑوں کوس آگے نکل گئے ہیں اور ہندوستانیوں کی بیداری اور ترقی اگر ممکن ہے، تو انہیں ذرائع سے ممکن ہے جنہوں نے فرنگستان کو اس معراج پر پہنچا دیا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق راجہ صاحب موصوف کے خیالات بعینہ وہی تھے جو جاپان کے مشہور و معروف مدبّر مارکوئس آئٹو اور اُن کے ساتھیوں کے دلوں میں موجزن تھے اور جس پر کاربند ہو کر انہوں نے بیس برس کے عرصہ میں جاپان کو یورپ کا مدِّ مقابل بنا دیا۔

رام موہن رائے نے جو خط تعلیم مغربی کی ضرورت کے متعلق لارڈ امہرسٹ کو لکھا تھا اس کے بعض حصص کا ترجمہ لالہ رگھوناتھ سہائے صاحب کی کتاب سے جو انہوں نے راجہ رام موہن رائے کے حالات کے متعلق لکھی ہے، اخذ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"کلکتہ میں ایک جدید سنسکرت کالج قائم کرنے سے گورنمنٹ کی اس قابلِ تعریف خواہش کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ باشندگانِ ہند کی حالت کی تعلیم کے ذریعہ سے اصلاح کرے۔ یہ ایک ایسی برکت ہے جس کے واسطے انہیں ہمیشہ شکر گزار رہنا چاہیے اور ہر ایک خیر خواہ نوعِ انسان ضرور اس بات کا خواہاں ہوگا کہ ان کی ہدایت کے واسطے نہایت مہذب اصول سے کام لیا جائے تاکہ علم کا پانی انہیں نہروں میں جاری ہو جو سب سے زیادہ فائدہ رساں ہیں۔"

"جب اس دارالعلوم کی تجویز ہوئی تھی، تو ہم لوگوں نے سمجھا تھا کہ گورنمنٹ انگلستان نے یہ حکم دیا ہے کہ ہر سال ایک بڑی رقم اس کی ہندوستانی رعایا کی تعلیم و تربیت میں صرف ہو۔ ہمارے دل امیدوں سے بھر گئے تھے کہ اس رقم کے صرف سے صاحب ذہانت اور تعلیم یافتہ یورپین فضلا نوکر رکھے جائیں گے تاکہ وہ باشندگانِ ہند کو ریاضی، فلسفہ، علم طبعی، کیمیا، تشریح الاجسام اور دیگر مفید علوم کی تعلیم دیں، جن کو باشندگانِ یورپ نے ایسے درجہ کمال تک پہنچایا ہے اور جس کے باعث وہ دنیا کے دوسرے حصوں کے باشندوں سے بالاتر ہو گئے ہیں۔"

* * * * * * * *

"لیکن ہمیں معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ اس علم کی تعلیم کے لئے جو پہلے ہی ہندوستان میں رائج ہے ہندو پنڈتوں کے تحت ایک سنسکرت اسکول قائم کرنے والی ہے۔ اس دارالعلوم سے جو اُن

مدرسوں کے مانند ہوگا جو لارڈ بیکن کے زمانے کے قبل یورپ میں پائے جاتے تھے ہم صرف اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کے دلوں کو صرف و نحو کی باریکیوں اور الٰہیات کے مسائل سے گرانبار کردے، جو عملی طور پر ان کے جاننے والوں یا سوسائٹی کے واسطے بالکل بے فائدہ ہیں اس دارالعلوم میں طلبا وہی باتیں سیکھیں گے، جو دو ہزار برس سے معلوم ہیں اور ایسی لاحاصل اور بے معنی موشگافیاں کریں گے، جو اس زمانے کے بعد صاحب فکر لوگوں نے نکالی ہیں اور جن کی ہندوستان کے تمام حصوں میں پہلے ہی سے خوب تعلیم ہو رہی ہے۔"

"یہ بخوبی روشن ہے کہ سنسکرت زبان ایسی مشکل ہے کہ اس کے لئے تقریباً ملک کا ایک معقول حصہ درکار ہے اور اس کی وجہ سے زمانہ ہائے دراز سے اشاعت کے راستہ میں ایک قابل افسوس روک پیدا ہو گئی ہے اور وہ علم جو اس پردہ کے اندر جس میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے چھپا ہوا ہے اس بات کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ اس کے حصول کے واسطے جو محنت درکار ہے اس کا صلہ دے سکے۔ لیکن اگر ان چند بیش قیمت معلومات کے واسطے جو اس زبان میں ملتے ہیں اس کو زندہ رکھنا ضروری خیال کیا جاتا ہے تو یہ مقصد بجائے اس کے کہ ایک جدید سنسکرت کالج قائم کیا جائے دوسرے وسائل سے بہت سہولت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سنسکرت کے بیشمار فاضل ملک کے مختلف حصوں میں اس زبان اور نیز علم ادب کی دوسری شاخوں کی تعلیم دینے میں ہمیشہ مصروف رہے ہیں اور اب بھی مصروف پائے جاتے ہیں اور یہی اس جدید دارالعلوم کا بھی مقصد ہے۔ پس اگر یہی مطلب ہے کہ زیادہ تندہی سے ان کی تحصیل علم عمل میں آوے تو یہ کام اس طرح انجام پا سکتا ہے کہ ان کے حسب مشہور معلموں کو جو پہلے ہی اپنی مرضی سے ان کی تعلیم دے رہے ہیں انعامات عطا کئے جائیں اور ان کے واسطے وظائف مقرر کئے جائیں۔ اس قسم کے صلے حاصل ہونے سے انہیں اور بھی زیادہ سعی کرنے کی تحریک ہو گی۔"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

"لیکن جب گورنمنٹ کا مقصود ہندوستانیوں کی اصلاح و ترقی ہے، تو اسے ایک آزاد اور مہذب طریقہ تعلیم کو جس میں ریاضی، فلسفہ، علم طبعی، کیمیا، تشریح الاجسام اور دیگر مفید علوم شامل ہوں رواج دینا چاہیئے اور یہ مقصد اس رقم سے جو تجویز ہوئی ہے اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ چند ذی علم و ذی لیاقت صاحبان کو جنہوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہو ملازم

رکھا جائے اور ایک کالج قائم کیا جائے جو ضروری کتب، آلات اور دوسرے سازو سامان سے آراستہ ہو۔"

شائد ادیب کے ناظرین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ اس عرضداشت کو شرف قبولیت حاصل نہیں ہوا اور سنسکرت کالج پرانے قسم کی ناقص تعلیم دینے کے واسطے قائم کر دیا گیا۔ ایسی حالت میں رام موہن رائے سوائے اس کے کیا کر سکتے تھے کہ نئے اصول پر دوسرا مدرسہ قائم کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دوست مسٹر ڈیوڈ ہیر اور دیگر احباب کے ساتھ مل کر انگریزی تعلیم کے لئے ایک کالج کھولنے کی کوشش شروع کی۔ اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ لیکن کالج قائم ہونے سے پہلے چند پرانے خیال کے ہندوؤں نے کمیٹی میں شریک ہونے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ اس میں رام موہن رائے شریک تھے۔ یہ سنتے ہی رام موہن علیٰحدہ فوراً کمیٹی سے علیحدہ ہو گئے اور گو وہ در پردہ کالج کا سارا کام کرتے رہے لیکن انہوں نے کمیٹی میں رہ کر کالج کا نقصان پہنچانا گوارا نہ کیا۔ کلکتہ کا ہندو کالج اسی کوشش کا نتیجہ تھا۔ علاوہ بریں اپنے ذاتی صرف سے رام موہن رائے نے ۱۸۳۰ء کے قریب ایک اور انگریزی اسکول قائم کیا تھا۔

اخبار نویسی ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں کہ جب عیسائی مطبعوں نے رام موہن رائے کے مضامین اور رسالے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا، تو انہوں نے اپنا مطبع قائم کر کے ان مضامین کو برہمنکل میگزین میں شائع کیا تھا۔ اس انگریزی رسالے کے علاوہ ۱۸۲۱ء میں انہوں نے ایک بنگالی ہفتہ وار اخبار سمبد کومدی نامی نکالا جس میں مفید مضامین عام فہم زبان میں شائع کئے جاتے تھے۔ انگریزی اور بنگالی پر اکتفا نہ کر کے رام موہن رائے نے مراۃ الاخبار فارسی زبان میں بھی ہر جمعہ کو شائع کرنا شروع کیا۔ اس وقت اشاعت اخبارات میں وہ سہولت اور آزادی نہ تھی جو ہندوستانیوں کو آج نصیب ہے۔ ہندوستانی تو ہندوستانی انگریز اخبار نویس گورنر جنرل کے حکم سے ملک سے نکال دیئے جاتے تھے۔ چنانچہ ایڈمس صاحب قائم مقام گورنر جنرل کے زمانے میں ایک ایسا ہی واقعہ ہوا اور اخبارات کے ساتھ بہت سختی برتی جانے لگی۔ اس وقت رام موہن رائے نے اخبارات کی آزادی کے لئے ہندوستان اور نیز انگلستان میں سخت کوشش کی اور گو وہ کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ تاہم اسکا ذرا بھی شک نہیں کہ ہندوستان جدید کے اخبارات اس شیر مرد کی سعی کے زیر بار احسان ہیں۔

برہمو سماج کی بنا سوشل اصلاح، ترقی تعلیم اور اجراء اخبارات کے متعلق جو کچھ

راجہ رام موہن رائے کے حالات اوپر بیان کئے گئے ہیں، اُن سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اُن کو مذہبی اصلاح کی طرف سے کسی قسم کی لاپروائی ہو گئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ وہ مذہبی اصلاح کو دوسرے کاموں پر مقدم سمجھتے تھے۔ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے کلکتہ میں روحانی ترقی کے لئے ایک انجمن قائم کی تھی اور اس کا نام آتمیہ سبھا رکھا تھا۔ اس میں راجہ رام موہن رائے اور ان کے خاص خاص دوست شامل تھے۔ اس انجمن کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے اور ان جلسوں میں اول راجہ رام موہن رائے اور ان کے دوستوں کے تصنیف کردہ بھجن گائے جاتے تھے اور بعد ازاں ہندو شاستروں کا پاٹھ ہوتا تھا۔ ایڈم صاحب نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے مسئلہ تثلیث کو خیرباد کہنے کے بعد ایک یونیٹیرین انجمن قائم کی تھی اور اس میں راجہ رام موہن رائے اور اُن کے دوست بابو دوار کا ناتھ ٹیگور، بابو پرسنو کمار اور بابو رادھا پرشاد رائے برابر شریک ہوتے تھے۔ جب اس انجمن کے متعلق مکان اور اسکول کی تجویز ہوئی، تو راجہ رام موہن رائے نے ۵ ہزار روپیہ خود دیا اور بہت کچھ روپیہ اپنے دوستوں سے دلوایا۔

لیکن باوجود ایڈم صاحب کی کوششوں کے یہ انجمن سرسبز نہ ہوئی۔ ایک دفعہ جب راجہ رام موہن رائے اور اُن کے دوست اس مجلس موحدین سے واپس آ رہے تھے تو تاراچند چکرورتی نے کہا کہ غیروں کی پرستش گاہوں میں جانے سے کیا فائدہ۔ ہم کو خدائے واحد کی پرستش کے لئے ایک مندر الگ بنانا چاہیے۔ یہ بات راجہ رام موہن رائے کو بھی پسند آئی اور انہوں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کر کے ایک انجمن ۲۰ اگست ۱۸۲۸ء کو برہم سبھا کے نام سے قائم کر دی۔ اس سبھا کے ہفتہ وار جلسے ہر سنیچر کو ہوا کرتے تھے۔ اول دو یا تین پنڈت وید پاٹھ کرتے تھے۔ پھر ایک اور پنڈت بنگالی زبان میں ان وید منتروں کی تشریح کرتا تھا۔ اس کے بعد بنگالی زبان میں وعظ دیا جاتا تھا اور آخر میں سنسکرت اور بنگالی زبان کے بھجن باجے کے ساتھ گائے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ضرورت محسوس ہونے لگی کہ سماج کے لئے ایک عمدہ مندر ہو اور اس کے انتظام کے لئے ایک باقاعدہ کمیٹی منتخب کی جائے۔ چنانچہ چت پور روڈ پر زمین خرید کر کے برہمو سماج کے لئے عمارت تعمیر کی گئی۔ ۲۳ جنوری ۱۸۳۰ء کو یہ عمارت بن کر تیار ہو گئی اور اسی روز اس میں برہمو سماج منتقل کر دی گئی۔ چھ ہزار روپیہ ایک کمپنی کے پاس اس غرض سے امانت رکھوا دیا کہ اس کے سود سے معمولی اخراجات چلائے جائیں اور تین شخص یعنی بیکنٹھ ناتھ سین، رادھا پرشاد رائے اور رام ناتھ ٹیگور اس جائداد کے امین مقرر کئے گئے اور اس کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا۔ اس مکان کے قیام میں مندر اور سماج کے مقاصد اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

(۱) اس مندر میں کائنات کے خالق نراکار پرمیشور کی پوجا کی جائے گی ۔

(۲) اس مندر میں بلا لحاظ قوم و ملت ہر شخص کو نراکار پرمیشور کی پرستش کرنے کا اختیار ہے ۔

(۳) کسی تقریر یا بھجن میں کسی مذہب یا فرقہ کے معبود کی مذمت نہ کی جائے گی ۔

(۴) اس میں بکری یا اور کسی جانور کی قربانی نہ ہوگی ۔

(۵) کسی قسم کا بت، تصویر یا فوٹو اس مکان میں نہ رکھا جائے گا ۔

یورپ کا سفر ۔ راجہ رام موہن رائے کو یورپ کے سفر کا عرصہ سے اشتیاق تھا، وہ چاہتے تھے کہ فرنگستان جاکر وہاں کے حالات کا خود مشاہدہ کریں ۔ علاوہ بریں جب سے ستی کی رسم کے حامیوں نے گورنمنٹ کے تصفیہ کے خلاف ایک لمبی چوڑی عرضداشت ولایت بھیجی تھی، تب سے راجہ رام موہن رائے کو یہ فکر تھی کہ خود ولایت جاکر اس کی تردید کریں ۔ اتفاق سے اس زمانہ میں اکبر ثانی بادشاہ دہلی کمپنی کی بعض تجاویز کے خلاف شاہ انگلستان کے حضور میں اپیل کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ اس کام کے لئے رام موہن رائے منتخب کئے گئے ۔ شاہ دہلی نے ان کو راجہ کا خطاب دیکر اپنا سفیر مقرر کیا اور ۱۵ نومبر ۱۸۳۰ء کو یہ کلکتہ سے روانہ ہوئے ۔ انگلستان کے اکثر لوگ راجہ صاحب کے نام سے واقف تھے ۔ کیونکہ وہاں کے اخباروں میں کبھی کبھی ان کا ذکر چھپا کرتا تھا ۔ اس کے علاوہ یونیٹرین سوسائٹی نے ان کی بعض تصنیفات بھی ولایت میں شائع کی تھیں ۔ چار مہینے ۲۰ روز کے سفر کے بعد جب یہ ۸ اپریل ۱۸۳۱ء کو لیور پول پہنچے، تو وہاں کے اکثر پڑھے لکھے لوگ ان سے بڑے شوق سے ملے اور اس بات کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ منجملہ اور لوگوں کے راجہ رام موہن رائے سے لورپول میں ولیم راسکو سے بھی ملاقات ہوئی تھی ۔ لنڈن میں بھی اشتیاق کا وہی عالم تھا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صبح سے شام تک ان کے ہوٹل کے سامنے گاڑیوں کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ لنڈن میں راجہ صاحب سے جرمی بنتھم سے ملاقات ہوئی ۔

یونیٹرین حلقہ میں تو ان کی خاص طور سے تواضع و تکریم ہوتی تھی اس فرقے کے بڑے چھوٹے جلسوں میں وہ ہمیشہ مدعو کئے جاتے تھے ۔ شاہ انگلستان کے حضور میں بھی راجہ صاحب پیش ہوئے اور پارلیمنٹ کی کمیٹی کے سامنے ان کو ہندوستان کے معاملات پر اظہار رائے کا موقع دیا گیا ۔ جن اصلاحوں کی تجاویز انہوں نے پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیں ان کو پڑھنے سے راجہ صاحب کی پولیٹکل قابلیت اور بیدار مغزی کا ثبوت ملتا ہے ۔

راجہ رام موہن رائے کی وفات شروع ماہ ستمبر ۱۸۳۳ء میں راجہ صاحب اپنے یونیٹرین دوستوں سے ملنے برسٹل گئے ۔ یہاں اُن کے دوستوں نے کئی جلسے منعقد کئے جن میں راجہ صاحب نے

ہندوستان کے معاملات پر تقریریں کیں۔ ۱۶ ستمبر کے جلسے میں انہوں نے تین گھنٹے تک تقریر کی اور بہت سے سوالوں کے جواب دیے۔ اس کے تین روز بعد اُن کو بخار آیا اور ۹ دن بیمار رہ کر ۲۷ ستمبر کو اس نامور ہندو رفارمر نے انتقال کیا۔ ۱۸ اکتوبر کو ان کے انگریز دوستوں نے بلا کسی ہندو یا مسیحی رسم کے ان کی نعش کو دفن کر دیا۔ ۱۸۴۲ء میں جب بابو دوارکا ناتھ ٹیگور انگلستان تشریف لے گئے تو انہوں نے ان کے تابوت کو اس جگہ سے نکلوا کر برسٹل کے ایک عمدہ خوشنما قبرستان میں دفن کر دیا اور ایک عمدہ مشرقی طرز کی عمارت بھی اس کے متعلق بنوا دی اور ۱۸۷۲ء میں ان کی قبر پر انکی یادگار میں ایک کتبہ لگایا گیا۔

راجہ رام موہن رائے کی زندگی کا سبق : یوں تو راجہ رام موہن رائے کی زندگی اور ان کے کارناموں سے سیکڑوں سبق اخذ ہو سکتے ہیں لیکن ہم اِس وقت دو خاص باتوں کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ راجہ صاحب موصوف مذہبی اور اخلاقی اصلاح کو ہر قسم کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ زندگی بھر اس معاملہ میں خاص طور سے کوشش کرتے رہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جبتک ہماری طبیعتوں سے ریاکاری اور باطل پرستی نہ جائے گی اس وقت تک کسی قسم کی اصلاح بار آور نہیں ہو سکتی۔ یوں چاہے ہم صبح سے شام تک بندے ماترم کے نعرے بلند کیا کریں ایمانداری اور سچائی ہر قسم کی ترقی کی جڑ ہے۔ حق پرستی سے منہ موڑ کر ہماری کوئی کوشش سرسبز نہیں ہو سکتی۔ وطن پرستی کا جذبہ نہایت قابل تعریف ہے لیکن وہیں تک جہاں تک وہ اخلاق کے اصول کے تابع فرمان ہے۔ اگر آپ جھوٹ بول کر یا بے ایمانی کر کے اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہیں گے ممکن ہے کہ آپ کو کچھ فوری فائدہ حاصل ہو جائے لیکن آپ کا نہیں بلکہ ساری قوم کا کیرکٹر گر جائے گا اور اس کی تلافی کسی نمائشی نفع سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی سعی کسی ایک خاص دائرے یا طبقے میں محدود نہ تھی بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو پر حاوی تھی۔ برہمو سماج انہوں نے قائم کی۔ ستی کی رسم کو انہوں نے موقوف کرایا۔ اسکول انہوں نے قائم کئے۔ اخبار انہوں نے نکالے۔ پولیٹکل اصلاح کی غرض سے پارلیمنٹ کے سامنے اظہار انہوں نے دیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوم کی زندگی کے تمام پہلو چاہے وہ سوشل ہوں یا پولیٹکل، مذہبی ہوں یا اخلاقی، ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور قومی ترقی کے لئے ان سب میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ پولیٹکل معاملات میں تو آپ اعلیٰ معراج پر پہنچ جائیں اور مذہبی اور سوشل معاملات میں آپ مطلق ترقی نہ کریں۔ ملکی انتظام کے لئے آپ بیسویں صدی کے اصول پر کاربند ہوں اور اپنے گھر کے کاروبار آپ پہلی صدی کے رسم و رواج کے مطابق چلائیں۔ جو قوم گورنمنٹ سے آزادی کی آرزومند ہے، اُسے

پروہتوں اور پنڈتوں کی غلامی سے پہلے اپنے کو آزاد کرنا چاہیے۔ جو لوگ دوسروں سے برتری کا دعویٰ کریں، ان کو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم نے اپنے یہاں "پنچ ذاتوں" کیسا کیا برتاؤ کیا ہے۔

راجہ رام موہن رائے کی زندگی کے یہ سبق ایسے ہیں۔ جن کی اس وقت ملک کو سخت ضرورت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کی "چیخ و پکار" نے ہمارے کانوں کو ایسا گنگ کر دیا ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی آواز اُن تک مشکل سے پہنچتی ہے۔

— منوہر لعل زتشی (جولائی ۱۹۱۰ء)

پنڈت مدن موہن مالوی حال میں آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی نے ہندو یونیورسٹی کی اسکیم شائع فرمائی ہے۔ جس میں تعلیمی ضروریات کو نہایت وسیع پیمانہ پر پورا کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ یہ یونیورسٹی بنارس میں قائم ہوگی اور اس کا نام "ہندو وشو ودیالہ" یا "ہندو یونیورسٹی آف بنارس" ہوگا۔ اس یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد یہ بتائے گئے ہیں:

ہندو شاستروں اور سنسکرت لٹریچر کے مطالعہ کی توسیع۔
تمام شاخہائے علوم و فنون کی تعلیم و تحقیقات۔
علمی، صنعتی و حرفتی تعلیم کی ترقی و اشاعت۔
مذہب و اخلاق کو تعلیم کا جزو لاینفک قرار دیکر نوجوانوں میں اخلاقی قوت پیدا کرنا۔

جو لوگ ہندو یونیورسٹی کے پہلے ٹرسٹی چنے گئے ہیں۔ ان میں ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کے قابل و ذی عزت اصحاب شامل ہیں، جن کی تعداد ۱۲ ہے۔ یقین ہے کہ گورنمنٹ کو چارٹر عنایت فرمانے میں کچھ عذر نہ ہوگا۔

ہندو یونیورسٹی کے ساتھ کس قسم کے کالج ملحق کئے جائیں گے؟ مذکورہ بالا اسکیم سے واضح ہوتا ہے کہ کالجوں کی تعداد حسب گنجائش سرمایہ ہوگی۔ مثلاً: (۱) سنسکرت کالج مع صیغۂ دینیات (۲) کالج آف لٹریچر (۳) کالج برائے تعلیم صنعت و حرفت (۴) زراعتی کالج (۵) کالج برائے تعلیم تجارت و ملک داری (۶) ایورویدک کالج، جس میں طب جدید کی بھی تعلیم ہوگی (۷) کالج فنون لطیفہ۔

—— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۱ء)

تُلسی داس

[جہاں ہندوستان نے بڑے بڑے رہنما، مہاتما، دیوتا، رشی منی، راجہ، مہاراجہ پیدا کئے ہیں وہاں ایسے ایسے شعراء بھی ہو گذرے ہیں، جو صرف اپنے زمانہ کے مجتہد ہی نہ ہوئے، بلکہ ان کی تصانیف سے اچھے اچھے فریدالعصر نامور ہوتے گئے۔ اگرچہ زمانہ بہت بدل گیا اور اس کے ہاتھوں تمدن ہند پر تباہی آچکی ہے پھر بھی والمیک جیسے فردوسی ہند ملک الشعرا کالیداس جیسے شیکسپیر زمانہ چند کوی جیسے انوری عہد اور کبیر داس جیسے مصلح کے نام اب تک تعظیم کے ساتھ لئے جاتے ہیں۔ اسی مردم خیز ہندوستان سے بابا سورداس و بابا تلسی داس جیسے یکتائے روزگار شعرا بھی اٹھے ہیں جن کے کلام آج بھی ہندوستان کے خط خط میں زبان زد ہو رہے ہیں۔ تُلسی جسے ریحان بالنگو یا نیاز بو بھی کہتے ہیں اصل میں ایک پودے کا نام ہے، جو ہندوؤں کے یہاں نہایت متبرک سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ سری کرشن جی کی معشوقہ کا یہی نام تھا جس کو انہوں نے تلسی کا پودا بنا دیا تھا۔ بابا تلسی داس قوم کے برہمن اور فقیر منش بزرگ تھے۔ بڑے پایہ کے پنڈت اور شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انہوں نے رامائن کو سنسکرت سے بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مقبول خاص و عام ہو گئی۔ عربی و فارسی کا اثر ان کی زبان میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان کے مختصر حالات جو دریافت ہو سکے ذیل کے مضمون میں یکجا کئے گئے ہیں۔ ایڈیٹر]

سال و مقام پیدائش شاید ہی کوئی ہندی جاننے والا ہوگا جو گوسائیں تلسی داس جی کا نام نہ جانتا ہو۔ یا ان کے رامائن سے واقف نہ ہو۔ گوسائیں جی کی پیدائش کی کوئی قطعی تاریخ یا سال بتایا نہیں گیا ہے مگر پنڈت رام غلام دوبے نے لکھا ہے کہ غالباً سنہ ۱۵۸۹ مطابق ۱۵۳۲ء میں وہ پیدا ہوئے تھے۔ ڈاکٹر گریرسن بھی اسی کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی لئے قابل وثوق بھی یہی سنہ[1] ہے۔

۱؎ کتاب شیو سنگھ سروج میں لکھا ہے کہ تلسی داس سنہ ۱۵۸۳ (مطابق ۱۵۲۷ء) میں پیدا ہوئے اور پروفیسر آزاد آب حیات میں فرماتے ہیں کہ تلسی داس ۱۶ویں صدی عیسوی میں تھے۔ لیکن پنڈت رام غلام دوبے نے اس بارہ میں بڑی تحقیقات کی ہے اس لئے وہی مانے جا سکتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ان کے مقام پیدائش کا بھی ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ کسی کا قول ہے کہ یہ مقام تاری میں پیدا ہوئے کوئی ہستنا پور بتاتا ہے۔ کوئی چترکوٹ اور کوئی حاجی پور اور کوئی راجا پور ضلع باندہ کہتا ہے۔ ان میں کوئی صاحب تاری کو ترجیح دیتے ہیں اور کوئی راجا پور کو اور قرین قیاس بھی یہی ہے۔ کیونکہ پنڈت رام غلام دوبے کے علاوہ بابو شیو سنگھ نے بھی شیو سنگھ سروج میں راجا پور ہی لکھا ہے اور وہاں گوشائیں جی کے مکان وغیرہ بھی پائے جاتے ہیں۔ مزید برآں رامائن کی زبان بھی اُسی طرف کی معلوم ہوتی ہے[1]۔

قوم — گوشائیں جی برہمن تھے۔ اختلاف اس میں ہے کہ کون برہمن تھے۔ کوئی قنوجیہ بتاتا ہے اور کوئی سرجو پاری۔ راجہ پرتاپ سنگھ سرجو پاری بتاتے ہیں۔ ڈاکٹر گریرسن اور پنڈت رام غلام نے بھی سرجو پاری ہی لکھا ہے[2]۔

والدین سے جدائی — تلسی داس کے ماں باپ کا نام کسی کتاب میں لکھا ہوا نہیں پایا جاتا لیکن کہا جاتا ہے کہ اُن کے والد آتما رام دوبے کے نام سے مشہور تھے اور اُن کی والدہ ہُلسی کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ ڈاکٹر گریرسن کا یہ خیال ہے کہ گوشائیں جی مُول نچھتر[3] میں پیدا ہونے کی وجہ سے ماں باپ سے علیحدہ کئے گئے۔ ممکن ہے کہ پیدا ہوتے ہی یا ان کے بچپن کے زمانہ میں ان کے ماں باپ مر گئے ہوں اور یہ امر قرین قیاس ہے۔ بہرحال گوشائیں جی ہمیشہ فقیروں کے ساتھ سیاحی میں رہتے تھے جس کا تذکرہ جابجا وہ اپنی تصانیف میں کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہوئی کہ ان کے مفصل حالات کسی کو نہ مل سکے۔ اگر کسی نے قلمبند کرنے کا خیال بھی کیا ہو تو کیونکر ان کے حالات اس کو مل سکتے تھے ان کا حال تو بعینہ یہ تھا کہ:

ایک جا رہتے نہیں عاشق ناکام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

بھرگو آشرم کا سفر — سادھوؤں کے ساتھ رہتے رہتے اور اپنی ذہانت سے گوشائیں جی اچھے خبیر ہو گئے۔ ایک مرتبہ سفر کرتے ہوئے بھرگو آشرم پہنچے۔ لوگوں کی دعوتیں قبول کرتے ہوئے وہاں سے اور آگے

---

[1] آبحیات میں لکھا ہے کہ بابا تلسی داس ضلع باندہ کے رہنے والے تھے۔ ایڈیٹر

[2] اور یہی ماننے کے قابل بھی ہے۔ راجا پور میں قنوجیہ برہمن بہت ہی کمیاب اور سرجو پاری بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ایڈیٹر

[3] مُول نچھتر اشیوینی نچھتر کو کہتے ہیں جو نہایت منحوس خیال کیا جاتا ہے اور گیارہ ستاروں کا ہوتا ہے۔ اگر کوئی بچہ اس نچھتر کے وقت پیدا ہو تو ہندوؤں کے نزدیک اس کے باپ کو چاہیے کہ وہ [illegible] بچے کا منہ نہ دیکھے۔ اگرچہ کسی زمانہ میں رواج ہو۔ لیکن گریرسن صاحب کے قول کو بشریت تسلیم کرنے نہیں دیتی۔ تلسی داس جیسے خوش نصیب کی پیدائش کو مول نچھتر میں محض قیاسی طور پر قرار دینا عقل سے بعید ہے۔ ممکن ہے کہ والدین سے جدائی کے اور اسباب ظہور میں آئے ہوں۔ ایڈیٹر

بڑھے۔ ایک گاؤں میں انہیں منگرو داہیر ملا۔ اس نے ایک گوسالہ ایسا بنایا تھا جس میں اکثر سادھو اور جاتا آ کر ٹھہرتے تھے۔ منگرو نے گوشائیں جی کی دعوت کی اور کچھ دودھ لاکر نذر کیا۔ گوشائیں جی نے اُس کا کھوبا تیار کرا اور خوب مزے لے لے کر کھایا۔ خوش ہو کر منگرو سے کہنے لگے کہ "جو کچھ مانگنا ہو مانگ" منگرو نے دست بستہ عرض کی کہ "میرا دل پرمیشور کی طرف رجوع ہو اور خاندان کی ترقی ہو" گوشائیں جی نے کہا اگر تم اور تمہارے خاندان کے لوگ چوری نہ کریں گے اور کسی کو ایذا اور تکلیف نہ پہنچائیں گے، تو ایسا ہی ہوگا۔ کہتے ہیں کہ یہ دعا گوشائیں جی کی قبول ہوئی۔ منگرو کا خاندان چوری وایذا رسانی سے تائب ہوگیا۔ بلیا اور شاہ آباد میں اب تک اُس کا خاندان سادھوؤں کی مہمان نوازی کے لئے مشہور ہے۔

شادی اور اولاد ان کی شادی دین بندھیا ٹھک کی لڑکی مسماۃ رتنا ولی سے ہوئی تھی جس سے تارک نام ایک لڑکا بھی پیدا ہوا تھا، جو بچپن ہی میں مر گیا۔ گوشائیں جی اپنی بیوی سے زیادہ محبت رکھتے تھے۔ اتفاق سے ایک مرتبہ بغیر اطلاع وہ اپنے میکے چلی گئی۔ گوشائیں جی اس کی مفارقت گوارا نہ کر سکے اور سسرال چلے گئے۔ ایک روز ان کی بیوی کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا کہ بہت متاثر ہوئے اور دنیادی بکھیڑوں سے منہ موڑ کر فقیرانہ لباس پہنا اور پھر سیاحی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ بنارس اور اجودھیا کے سوا متھرا، بندابن، چترکوٹ، پُری، جگناتھ وغیرہ وغیرہ جگہوں میں اکثر جایا کرتے تھے۔

ایک مدت کے بعد ضعیفی میں گوشائیں جی چترکوٹ سے واپس آئے تو حسن اتفاق سے سسرال میں ٹھہر گئے۔ ان کی بیوی بھی ضعیف ہو گئی تھیں۔ پہلے پہچان نہ سکیں اور ثواب حاصل کرنے کے لئے گوشائیں جی کی تواضع و تکریم میں مصروف ہو گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے پہچان لیا کہ یہ میرے خاوند ہیں اور محض انجان بن کر گوشائیں جی کے پاؤں دھونے بڑھیں۔ لیکن گوشائیں جی نے منع کیا اور پاؤں نہیں دُھلوایا۔ اُن کی بیوی تمام رات غور و خوض کرنے کے بعد اپنے کو ظاہر کر کے گوشائیں جی سے کہنے لگیں کہ اگر لونڈی کو بھی آپ اپنے ہمراہ رکھئے تو آپ کی خدمت میں یہ تھوڑی سی زندگی خوشی و خرمی کے ساتھ گذر جاتی" مگر گوشائیں جی نے نامنظور کیا۔

گوشائیں جی کے قیام کی جگہیں خروع شروع گوشائیں اجودھیا ہی میں آکر مقیم ہوئے۔ اُن کے کلام سے چترکوٹ میں بھی رہنا ثابت ہوتا ہے۔ مگر زیادہ تر وہ بنارس ہی میں رہا کرتے تھے اور آخیر وقت تک بنارس ہی میں رہے۔ یہاں چار مقام اُن کے رہنے کے منسوب تھے!۔

(۱) اسی گھاٹ (۲) گوپال مندر (۳) پرہلاد گھاٹ (۴) سنکٹ موچن ہنومان۔

وبائے طاعون اور تلسی داس کی دُعا شاہ جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہوا، اس کے عہد سلطنت میں ۱۶۱۶ء کا زمانہ یادگار ہے۔ اسی سال پنجاب میں طاعون کا زور شور ہوا اور ۱۶۱۸ء میں تو آگرہ میں اس طرح پھیل گیا کہ آٹھ برس تک وہاں پھیلا رہا۔ ایک سو آدمی روز مرتے تھے۔ شہر کو چھوڑ کر لوگ باہر بھاگ گئے تھے۔ مُردوں کا اٹھانے والا نہ ملتا تھا۔ لوگوں نے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ چاروں طرف یہ عارضہ پھیلا ہوا تھا مگر فتح پور سیکری، جہاں شاہ سلیم چشتی کا مزار ہے اس کے اثر سے بچا ہوا تھا۔

جن دنوں آگرہ میں طاعون تھا اس سے چار برس قبل ۱۶۱۲ء سے ۱۶۱۴ء تک بنارس میں طاعون کی بیماری پھیلی رہی۔ ان دنوں تلسی داس جی بنارس میں تھے۔ انہوں نے اپنے رامائن کے کبت نمبر ۲۱۷- ۳۱۸ میں اس کی کیفیت بیان کی ہے۔ گوسائیں جی دست بدعا تھے کہ اس مہلک بیماری سے باشندۂ بنارس نجات پائیں۔

ٹوڈر سے دوستی ٹوڈر نامی ایک زمیندار بنارس میں تھے۔ اس وقت تک اُن کے مکان کے کھنڈر بنارس کے محلہ کوری گلی میں پائے جاتے ہیں۔ پانچ گاؤں کے مالک تھے، جو بنارس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: بھدینی، ندیسر، شیوپور، چھیتوپور اور لہرتارا۔ بھدینی، اب مہاراجہ بنارس کے قبضے میں ہے اور اسی میں اسی گھاٹ ہے۔ ندیسر میں دیوانی کچہری ہے۔ شیوپور پنچکوسی میں ہے۔ یہاں پانڈوؤں کا مندر بنا ہے۔ چھیتوپور بھدینی سے جانب مغرب ہے۔ لہرتارا، بنارس کے کنٹونمنٹ اسٹیشن کے پاس ہے۔ ٹوڈر کے مرنے پر اُن کے پوتے کندھی اور ان کے بیٹے آنند رام میں فساد پیدا ہو گیا۔ اس میں گوسائیں جی حکم مقرر کئے گئے اور جو فیصلہ گوسائیں جی نے کیا تھا وہی گیارہ پشت تک ٹوڈر کے خاندان میں قائم رہا۔ وہ فیصلہ آگے لکھا جائے گا۔

ٹھاکر گریرسن کا خیال ہے کہ ٹوڈر اکبر کے وزیر اعظم[1] تھے۔ چونکہ راجہ ٹوڈرمل کا وطن لاہرپور تھا، اس سے وہ لہرتارا خیال کرتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ راجہ ٹوڈرمل ٹنڈن کھتری تھے اور ٹوڈر چھتری ہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ شہر کا قاضی فیصلے میں راجہ ٹوڈرمل وزیر اعظم کو ایسے حقیر الفاظ میں لکھے کہ "انند رام بن ٹوڈر بن دیو رائے و کندھی بن

---

[1] یہ واقعہ ہے کہ راجہ ٹوڈرمل اکبر کے وزیر اعظم نہ تھے بلکہ اور مشیروں میں سے ایک یہ مجلسہ۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ راجہ ٹوڈرمل سے تلسی داس کی دوستی تھی۔ (اڈیٹر)

رام بھدر بن ٹوڈر مذکور در حضور آمدہ الخ" وغیرہ راجہ ٹوڈرمل کا کوئی نشان بنارس میں موجود نہیں ہے۔

فیصلہ

اللہ اکبر

چون انند رام بن ٹوڈر بن دیو رائے و گندھی بن رام بھدر بن ٹوڈر مذکور در حضور آمدہ قرار دادند کہ موازی متروکہ کہ تفصیل آں در ہندی مذکور است بالمشافہ و بتراضی جانبین قرار دادیم دیک عدد و پنجاہ بیگھہ زمین زیادہ...... در موضع بھدینی انند رام مذکور و گندھی بن رام بھدر مذکور تجویز نمودہ بریں معنی راضی گشتہ شرعی نمودند بنابر آں مہر کردہ شد۔......

مہر کردہ سعد اللہ

قسمت انند رام	قسمت گندھی
قرعہ	قرعہ
بھدینی دو حصہ لہر تارا در ولبت	بھدینی سہ حصہ شیو پور در ولبت
قرعہ	قرعہ
نیپورہ حصہ ٹوڈر تمام	ندلیسہ حصہ ٹوڈر تمام
قرعہ	
چتو پورہ خرد حصہ ٹوڈر تمام"	

خان خاناں سے دوستی

بادشاہ اکبر کے نامی وزیر عبدالرحیم خانخاناں اور گوسائیں جی سے دوستی تھی۔ ایک مفلس برہمن کی لڑکی جب شادی کے لائق ہوئی اُس نے گوسائیں جی کو اپنی کیفیت اور مفلسی سے اطلاع دی۔ اُنہوں نے ایک پرچہ پر آدھا دوہا لکھ کر اسے خان خاناں کے پاس بھیج دیا۔

" سُرتیہ نرتیہ ناگتیہ۔ سب چاہت اَس ہوئے "[1]

خان خانان نے اُس برہمن کو روپے سے مالا مال کر کے نصف دوہا اُس کے جواب میں لکھ بھیجا:

" گود لئے ہلسی پھرے۔ تلسی سون سُت ہوئے "[2]

مہاراجہ مان سنگھ سے محبت

امبر کے مہاراجہ مان سنگھ اور اُن کے بھائی جگت سنگھ اکثر

---

[1] "सुरतिय, नरतिय, नागतिय, सब चाहत अस होय"

[2] " गोद लिये हुलसी फिरै, तुलसी सो सुत होय"

گوشائیں جی کی قدمبوسی کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک شخص نے گوشائیں جی سے دریافت کیا کہ مہاراجہ پہلے تو آپ کے پاس کوئی نہیں آتا تھا اور اب تو راجہ، مہاراجہ بادشاہ سبھی حاضر ہوتے ہیں اس کا کیا سبب ہے۔ تلسی داس جی نے اس کے جواب میں کہا:

"گھر گھر مانگے ٹوک پُن۔ بھوپت پوجے پائے[1] تے تلسی تب رام بن۔ تے اب رام سہائے"

بابا سورداس ان کے ہمعصر تھے۔ وہ بھی بڑے پایہ کے شاعر تھے۔ انہوں نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا۔ ان کی تصانیف میں سورساگر[2] بہت مشہور ہے۔

تصنیفات گوشائیں جی کی تصنیفات درج ذیل ہے:

(۱) دوہاولی۔ (۲) کبت رامائن۔ (۳) گیتاولی۔ (۴) راماگیان۔ (۵) بنے پتر کا۔ (۶) رام چرت مانس۔ (رامائن)۔ (۷) رام للا نہچھو۔ (۸) بیراگ سندیپنی۔ (۹) بروے رامائن۔ (۱۰) پاربتی منگل۔ (۱۱) جانکی منگل۔ (۱۲) کرشناولی۔

علاوہ اس کے کچھ تصنیفات شیوسنگھ سروج کے مؤلف نے لکھا ہے:

(۱) رام ستسئی۔ (۲) سنکٹ موچن۔ (۳) ہنومان باہک۔ (۴) رام سلاکا۔ (۵) چھنداولی۔ (۶) چھپے رامائن۔ (۷) کرکھا رامائن۔ (۸) رولا رامائن۔ (۹) جھولنا رامائن۔ (۱۰) کنڈلیا رامائن۔

رامائن کی خوبی ان کی جملہ تصانیف میں رامائن کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ اس قدر مقبول ہوئی ہے کہ شاید ہی کوئی کتاب ایسی مقبول ہوئی ہو۔ ڈاکٹر گریرسن لکھتے ہیں کہ اگرچہ گوشائیں تلسی داس جی نے کبیر داس وغیرہ کے مانند کوئی جدید مذہب جاری نہیں کیا تاہم کسی مذہب کا ہندو کیوں نہ ہو گوشائیں جی کے راستے کی پیروی ضرور کرتا ہے۔ مذہب اور شرع اور دنیاوی باتوں کو بغیر مذہبی تعصب کے اس خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر مذہب کے غیر متعصب پیرو ان کی باتوں کو قبول کرتے ہیں اور تلسی داس کے کلام معمولی آدمیوں کے دلوں میں تو گھر کر جاتے ہیں۔

---

[1] " घर घर माँगे टूक पुनि, भूपति पूजे पाय
ते तुलसी तब राम बिन, ते अब राम सहाय "

[2] بقول گارسن ڈی ٹاسی سورداس نے 'نل دمن' کے قصہ کو بھاشا میں نظم کیا ہے۔ اسی کو فیضی نے فارسی نظم کر کے مثنوی نل دمن کے نام سے مشہور کیا۔ (ایڈیٹر)

رامائن کا رواج ہندوستان کے ہر حصہ میں پایا جاتا ہے۔ مگر بہار سے لے کر پنجاب تک اور ہمالیہ سے لے کر بندھیاچل تک اس کا پورا عمل دخل ہے۔ ان جگہوں میں ایسا کوئی گاؤں نہیں ہے جہاں رامائن نہ ہو۔ اور ایسا کوئی آدمی نہیں ملتا کہ جس کی زبان پر رامائن کے دوہے چوپائی وغیرہ نہ ہوں۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں، جو رامائن کو پڑھ کر دنیا سے الگ ہو گئے ہیں۔

ہندو نصائح اور مذہبی تعلیم کے علاوہ رامائن کے احسانات سے بھاشا زبان زیر بار ہے۔ بقول ڈاکٹر گریرسن کے اس رامائن کو امیر و غریب، بادشاہ و رعایا دونوں کے گھروں میں جگہ ملتی ہے اور سب کے ساتھ اس کا سلوک یکساں ہے۔ (فروری ۱۹۴۲ء)

اخبار نویسی کی ابتدا

پہلا روزانہ انگریزی اخبار جو ہندوستان میں شائع ہوا وہ "ہرکورہ" (ہرکارہ) جو ۲۷ اپریل ۱۸۰۹ء کو اکہرے کوارٹو شیٹ Quarto Sheet (کاغذ کے چوتھائی حصے) پر چھپنا شروع ہوا اور جس کا مقام اشاعت کلکتہ تھا۔ اس کے بعد جلدی اس میں ایک تختہ کاغذ کا اضافہ کیا گیا اور ۱۲؍ جولائی ۱۸۲۱ء کو اس میں کاغذ کا تیسرا تختہ لگایا گیا۔ آخر یکم فروری ۱۸۲۴ء سے وہ رائل فولیو Royal Folio پر شائع ہونے لگا اور یکم جنوری ۱۸۳۴ء تک اسی حالت میں رہا جس کے بعد اس نے پھر اپنی صورت بدل لی اور اس صورت میں اس وقت تک چھپتا رہا۔ جبکہ اسے "انڈین ڈیلی نیوز" میں ملا دیا گیا۔ اپنے زمانے میں یہ اخبار بڑا طاقتور شمار کیا جاتا تھا اور جب یکم اکتوبر ۱۸۳۴ء کو اس میں انڈین گزٹ اور بنگال کوریر (Bengal Courier) کو ملا دیا گیا، تو اسے مزید تقویت حاصل ہوگئی۔

ذیل کی فہرست سے ان اخبارات کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ جو ۱۸۷۵ء میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع ہوتے تھے۔

نام صوبجات	انگریزی اخبارات کی تعداد	ورنیکلر اخبارات کی تعداد	انگریزی اور ورنیکلر دونوں زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کی تعداد
بمبئی	۳۵	۶۲	۲۱

مدراس	۳۶	۲۳	۲۵
بنگال	۳۵	۵۹	۵
صوبہ مغربی و شمالی	۹	۵۹	۵
پنجاب	۱۰	۳۰	۱
اودھ	۴	۷	۸
صوبجات متوسط	۳	۴	۲
برہما	۱۴	۵	۰
سندھ	۹	۳	۱
راجپوتانہ	۰	۲	۴
میزان	۱۵۵	۲۵۴	۷۲

ہندوستان میں آج کل اخبارات کی جو حالت ہے وہ اخبار سر رشتہ روزگار بابت ۲۴ فروری ۱۹۱۰ء کے اقتباس سے معلوم ہوسکتی ہے:

"تمام ہندوستان میں ۱،۷۵۰ چھاپے خانے ہیں جن میں ہر قسم کی کتابیں چھپتی ہیں۔ گذشتہ دس سال کے اندر ۲۵ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے۔ اخباروں کی تعداد ۷۳۵ ہے۔ ان میں بھی تقریباً دس فیصدی کا اضافہ ہوا ہے۔ ۱۰۶۲ رسالے شائع ہوتے ہیں .... بمبئی میں سب سے زیادہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے بمبئی کے بعد دوسرا نمبر پنجاب کا ہے۔"

یہ اعداد اخبار مذکور نے غالباً کسی معتبر انگریزی رپورٹ سے حاصل کئے ہوں گے اور اگر ایسا ہے تو یقیناً ان کی صحت میں کلام نہیں ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی اخبارات اور رسالوں نے کیا بلحاظ عمدگی مضامین اور کیا بلحاظ تعداد اشاعت بہت ترقی کرلی ہے۔ لیکن اگر ورنیکو اخبارات بھی کوشش کریں تو وہ اپنی حالت میں بہت کچھ اصلاح کرسکتے ہیں۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ سارے ہندوستان میں اردو زبان کے (جسے اکثر اس ملک کی لنگوا فرینکا۔ Lingua Franca کہا جاتا ہے) صرف چھ روزانہ اخبار ہیں اور گو ان خدمات کو جو وہ سرانجام دے رہے ہیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک ان میں وہ خوبیاں نہیں پائی جاتی جو روزانہ اخباروں

کے لئے ضروری ہیں۔ ان چھ اخباروں میں سے دو لاہور، ایک لکھنؤ، دو بمبئی اور ایک حیدرآباد (دکن) سے نکلتا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے ہندی میں جو اُردو کی برابری کا دعویٰ رکھتی ہے ایک بھی روزانہ اخبار موجود نہیں۔ گو اب سُنا گیا ہے کہ صوبہ جات متحدہ کے ایک اخبار کو (جس کا نام عمداً درج نہیں کیا گیا) روزانہ کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ ورنیکولر میں اگر کسی زبان کے عمدہ روزانہ پرچے آج کل نکل رہے ہیں تو وہ گجراتی ہے اور گو کچھ عرصہ پہلے بنگالی کے چند روزانہ اخبار نکلا کرتے تھے لیکن اب غالباً بسنت بازی کے علاوہ اور کوئی معتبر پرچہ روزانہ نہیں چھپتا۔ مرہٹی زبان میں چند پرچے روزانہ نکلتے ہیں لیکن وہ ابھی عرصۂ دراز میں بمبئی سماچار، جام جمشید اور سانجھ ورتمان ایسے گجراتی روزانہ اخباروں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ پنجاب کی تازہ ترین ایڈمنسٹریشن رپورٹ (Administration Report) سے معلوم ہوا ہے کہ آج کل اس صوبے میں جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۵۲ ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

اخبارات انگریزی	۳۸	انگریزی۔ فارسی۔ اُردو	۱
اُردو	۱۸۲	اُردو ہندی	۱
ہندی	۱۱	اُردو گورمکھی	۱
گورمکھی	۱۸		

رپورٹ مذکور سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ۹-۱۹۰۸ء میں تین نئے انگریزی اور ۵۱ ورنیکولر اخبارات جاری ہوئے اور ۶ انگریزی اور ۴۷ ورنیکولر اخبارات کی اشاعت بند ہو گئی اور جو ۲۵۲ اخبارات کی تفصیل درج ہوئی ہے ان میں سے ایک رسالہ ششماہی شائع ہوتا ہے، چار سہ ماہی، ۱۳۴ ماہوار، ۳۰ پندرہ روزہ پرچے ہیں۔ تین مہینے میں تین بار نکلنے والے، ۶۸ ہفتہ وار، تین ہفتہ میں دو بار، ایک ہفتے میں تین بار اور آٹھ روزانہ۔

ہندوستان میں ورنیکولر پریس کی حالت آج کل جس قدر قابلِ رحم ہے، وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ملک کے ہر حصے سے اخبار حشرات الارض کی طرح نکلتے اور برساتی مچھروں کی طرح غائب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ جو لوگ اخبار جاری کرنے لگتے ہیں، وہ اپنی مالی حالت کا پہلے سے بالکل اندازہ نہیں لگاتے۔ عام طور پر ایک ہی شخص اخبار کا ایڈیٹر، مہتمم، پبلشر اور پروپرائٹر ہوتا ہے اور اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں اخبار یا رسالے کو نکلے ۶ مہینے کا عرصہ ہوا پھر پبلک کے نام اپیل شائع ہونے شروع ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی نیم تعلیم یافتہ پبلک پہلے ہی اخبار خوانی کی طرف کم متوجہ ہے۔ اس لئے اگر کوئی اخبار بند ہو جاتا ہے، تو اس کا افسوس سوائے اس کے پروپرائٹر کے اور کسی کو نہیں ہوتا۔

— اقتباس: ہندوستان (ستمبر ۱۹۱۰ء)

اخبار و اخبار نگاری

اب سے پیشتر جس کو تقریباً پندرہ سال ہوئے ادیب[1] کے نام ایک رسالہ فیروزآباد سے شائع ہوا تھا۔ جس کے کل بارہ پرچے نکلے تھے اور دوسرے سال سے بند ہوگیا۔

اخبار جمع ہے عربی لفظ خبر کی، جس کے معنی ہیں نئی باتیں۔ ایرانی حدیث کو بھی خبر ہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگلے زمانہ میں بالخصوص شاہان مغلیہ کے عہد میں اخبار و وقایع نگار ہوا کرتے تھے، جو ایک ڈائری یا روزنامچہ میں روزمرہ کے واقعات قلمبند کرتے تھے۔ جس کی نقل صدر دفتر کے ذریعہ سے بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی تھی اور اصل مسودہ مورخوں کے بکارآمد ہوتا تھا، جس سے تاریخ نویسی میں مدد ملتی تھی۔ جن جن بادشاہوں نے اپنے زمانہ کی تاریخ آپ لکھوائی ہے ان کو یہ انتظام کرنا پڑا کہ اُن روزنامچوں کے مسودے یا نقلیں تاریخ نویس کے پاس بھیجنے کی تاکید کر دی۔ چنانچہ آئین اکبری و اکبرنامہ کی ترتیب کے

---

[1] اس نام کے دو رسالے جاری ہوئے تھے۔ یورپ میں بھی ایک نام کے چند اخبار بیک وقت شائع ہوتے ہیں۔ بہر حال ایک تو حیدرآباد سے نکلتا تھا اور دوسرا غالباً ۱۸۹۸ء میں فیروزآباد سے جاری ہوا تھا، جس کے ایڈیٹر سید اکبر علی صاحب تھے۔ ایک سال تک شائع ہوتا رہا پھر بند ہو گیا۔ یوں تو ۱۸۸۷ء میں پہلے پہل رسالہ "دلگداز" مولانا عبدالحلیم صاحب شرر نے نکالا تھا۔ اس لئے اولیت کا فخر ممدوح کو ہے اور اودھ ریویو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا لیکن ہندوستان میں موجودہ طرز کے رسائل کا پیشرو ادیب ہی تھا۔ اس سے پہلے چند گلدستے بھی نکلتے تھے، جن میں فقط مشاعروں کی غزلیں ہوا کرتی تھیں۔ اس مذاق کا قدیم ترین رسالہ پیام یار ہے۔ سید علی اکبر صاحب کے رسالہ کی دیکھا دیکھی گلدستوں میں بھی نثر مضامین بطور ضمیمہ شائع ہونے لگے۔ ۱۹۰۱ء میں بالکل ادیب کے طرز پر لاہور سے مخزن جاری کیا گیا اور مشہور اہل قلم کی نگاہیں جراید کو ڈھونڈھ رہی تھیں، یک بیک مخزن کی طرف اٹھ گئیں۔ رفتہ رفتہ ملک میں رسالوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی، پھر تو بیسیوں رسالے نکل پڑے۔ دکن ریویو، اردوئے معلیٰ، العزیز، عالمگیر، کمال دہلی، الحکم، نصیح الملک، مجید، زمانہ، زبان، ادیب الاطفال، الناظر، المشرق، الشمس، کشمیری میگزین، تنویر الشرق، صلائے عام، یادشاطر، علی گڈھ منتھلی، تحفہ، عصمت، خاتون، الحجاب، معارف وغیرہ۔

لئے اکبر اعظم کو یہی انتظام کرنا پڑا تھا۔ بہت سے اخبار و وقایع نگار ترقی کرکے شاہی دربار کے تاریخ نویس و سوانح نگار ہوتے گئے۔ جیسے منشی محمد امین قزوینی مؤلف شاہجہاں نامہ (دورِ اول) ملا باقی نہاوندی مؤلف ماثر رحیمی۔ ارادت خاں واضح صاحب وقایع ارادتخانی۔ معتمد خاں مؤلف توزک واقبالنامہ جہانگیری وغیرہ۔ اس مفید طریقہ و بکار آمد محکمہ کی پوری کیفیت کے لئے الگ مضمون چاہیے، جو پھر کبھی لکھا جائے گا۔

یورپ میں اخبار کا مفہوم

خبر کو انگریزی میں نیوز کہتے ہیں اور اخبار کو باعتبار رواج نیوز پیپر۔ نیوز کے لفظی معنی ہیں تازہ واقعات، نئی باتیں، جدید معلومات، اُن واقعات کی پہلی اطلاع جو اب تک ظہور میں نہ آئے تھے۔ ایسی خبروں کے مجموعے اور ان واقعات و سوانح کے شائع کرنے کے لئے جو پرچہ ہوتا ہے وہ نیوز پیپر کہلاتا ہے۔ اس کی اقسام بہت ہیں۔ روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار۔ بعض متمدن ممالک میں گھنٹے گھنٹے بھی اخبارات نکلتے ہیں۔ دن میں دو بار شائع ہونے والے اخبار تو بہت ہیں۔ پھر ان کے نام بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور غرض کے اعتبار سے بہرہ بھی جدا ہوتا ہے۔

ولایت میں اخبار سے مراد وہ پرچہ ہے، جس میں خبریں ہوں۔ حال کے واقعات کی اطلاع یا رپورٹ کا وہ طومار جو تھوڑے مگر باقاعدہ عرصہ میں شائع ہوتا ہو اور جو یا تو فروخت کیا جاتا ہو، یا مفت تقسیم ہوتا ہو۔ ایک ایسا روزانہ، ہفتہ وار، خواہ ہفتہ میں دو بار شایع ہونے والا پرچہ جو روزمرہ کی خبریں دیتا ہو۔ مثلاً عام سیاسی امور، قانون سازی، قوم کے موجودہ حالات، مقامی یا صوبہ کی عام خبریں، علوم و فنون، مذہب، تجارت، بیوپار کے مسائل پر بحث ہو۔ بازار و نرخ کے حالات ہوں۔ اشتہارات و اطلاعات جس سے عوام کو دلچسپی ہوتی ہو۔ یوں تو اخبار کی سیکڑوں قسمیں ہوسکتی ہیں۔ لیکن بالعموم اخبار دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عام اور دوسرا خاص:

(۱) عام اخبار وہ ہے، جس میں ہر طرح کی ایسی اطلاعات اور خبریں ہوں، جو بغیر کسی تفریق کے عام مذاق کے لئے مفید ہوں۔ (۲) خاص اخبار وہ ہے جس کا مقصد خاص خاص امور پر بحث کرنا ہو۔ مثلاً مذہب، پروپیگنڈا، ادب، قانون، وغیرہ سے متعلق مسائل خاص جگہ رکھتے ہوں اور عام خبریں اس میں بطور ضمیمہ ہوں۔

ہندوستان میں مطابع اس وقت قائم ہوئے جب کمپنی[1] کی یہاں حکومت تھی۔ اس زمانہ میں ایک آدھ

---

[1] آنریبل ایسٹ انڈیا کمپنی

اخبار بھی نکلتا تھا۔ لیکن اس کی کوئی ایسی وقعت نہ تھی۔ عہد لارڈ ولزلی سے کچھ پیشتر کلکتہ سے آٹھ با اثر اخبارات نکلتے تھے۔ ان میں سے کلکتہ گزٹ جو حقیقت میں بنگال گورنمنٹ کا اخبار تھا اب تک جاری ہے۔ اگرچہ صورت واغراض میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اخبار ہرکارو اور انڈین گزٹ دونوں کو ایک کر کے انڈین ڈیلی نیوز نام رکھ دیا گیا، جو اس وقت ہندوستان کے ممتاز اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بقیہ پانچ جو معدوم ہو گئے اُن کے نام یہ تھے۔ دی کلکتہ کوریر، دی بنگال جرنل، دی ایشیاٹک مرر، دی ورلڈ، دی ٹیلیگراف، لارڈ ولزلی پہلے گورنر جنرل تھے، جنہوں نے ۱۷۹۹ء میں قانون مطابع جاری کیا۔ جس کا ایک دفعہ یہ تھا کہ باغی دسرکش اڈیٹر جلاوطن کر کے یورپ بھیج دیئے جائیں گے۔ اسی زمانہ میں اس پر عمل بھی کیا گیا۔

۱۸۱۸ء میں مارکوئس آف ہیسٹنگز نے قانون مطابع کو منسوخ کر دیا اور اخبارات پھر جاری ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ۱۸۳۲ء میں ان کی تعداد گیارہ تک پہنچ گئی۔ یعنی چھ یورپین اور پانچ دیسی اخبارات تھے۔ ان میں سے تین روزانہ، ایک ہفتہ میں دو بار اور دو ہفتہ وار شائع ہوتے تھے۔ اس کے بعد سر چارلس مٹکاف کا زمانہ آیا۔ یہ بڑے علم دوست تھے اور عالم نواز حاکم تھے۔ چنانچہ کلکتہ کی امپریل لائبریری (سابق مٹکاف ہال) ان ہی کی یادگار ہے۔ ان کو اشاعت علم کا بڑا شوق تھا۔ ہمیشہ اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ ہندوستانیوں کے تبادلۂ خیال کا معقول انتظام کیا جائے۔ آخر مطابع و اخبار کی آزادی کو بہترین ذریعہ تصور کر کے اس مسئلہ پر زور دینے لگے۔ اُن کی یہ عبارت واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "میں اپنی ذات سے ہمیشہ آزادی مطابع کا حامی رہا ہوں محض اس یقین کے باعث کہ اس کے افادات ان کے نقائص سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اور میں یہی رائے قائم کرتا ہوں"۔ ان کی اس رائے سے دوسرے اہل الرائے حضرات نے اتفاق کیا اور آزادی مطابع کا وہ مشہور قانون جس کا مسودہ مکالے جیسے مدبر زمانہ نے تیار کیا تھا خود چارلس مٹکاف نے ۱۸۳۵ء میں بحیثیت گورنر جنرل نافذ کر دیا۔ اس کے اجراء سے بدیہی فائدہ یہ ہوا کہ ہر شخص عام مسائل پر آزادانہ رائے زنی کرنے لگا اور چار برس تک بخوبی لوگ تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ ملک میں اس کے مفید نتائج نمایاں ہونے لگے۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء کی وہ بدنصیب گھڑی آ پہنچی۔ اور جان و مال کی تباہی کے ساتھ علم و فن کی ترقی بھی ایک حد تک رک گئی۔ اسی سال لارڈ کیننگ نے قانون مطابع پھر جاری کر دیا۔ جس سے اخبارات ایک حد تک پابند ہو گئے اور آزادی میں کمی ہو گئی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ چنے کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ لیکن اس قانون کے اجراء سے علم و فنون کی اشاعت یا تبادلۂ خیال میں کوئی فرق نہیں واقع ہوا اور نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یکجائی

اور نیک نیتی دو ایسی صفات ہیں، جو انسان کو آلودگی و لغویات سے ہر طرح بچا سکتی ہیں۔

گارسن ڈی تاسی فرانس کا ایک زبردست ماہر السنۂ مشرقیہ تھا۔ ایک مدت تک وہ ہندوستان میں سفر کرتا رہا۔ یہاں کے حالات سے بہت واقف ہو گیا تھا۔ اُردو زبان کا جان دادہ تھا۔ مشاعروں میں شریک ہوتا اور کبھی خود بھی دو چار اشعار موزوں کر لیتا تھا۔ اس کے ہم وطن اس کو اُردو کا عالم قرار دیتے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اس کی معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس نے چند کتابیں اُردو زبان اور اردو کے شعراء کی نسبت لکھی ہیں اور وہ نہایت مقبول ہوئیں۔ اس کے تذکرۃ الشعرا کا ڈاکٹر فیلن نے اُردو میں ترجمہ کرایا۔ بمقام پاریس ۱۸۵۳ء میں جب "زبان اردو" پر وہ اپنی سالانہ تقریر کرنے لگا، تو اس نے کہا تھا کہ ہندوستان میں ۲۷ اخبارات جو قسم قسم کے ہیں اس وقت بزبان اردو شائع ہوتے ہیں اور ان کے مفصل حالات بھی بیان کئے تھے۔ پھر ۱۸۶۰ء میں دوبارہ اسی نے بیان کیا تھا کہ "اس تعداد میں ۱۷ اخبارات کا اور اضافہ ہوا ہے۔ اگرچہ ان کی اشاعت وادبی مراتب نسبتاً کم ہیں۔ اس پر بھی ان میں سے ایک کی اشاعت چار ہزار پرچوں تک پہنچ گئی ہے۔"

اس بنا پر بخوبی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں اخبار نگاری کی ابتدا گذشتہ صدی کے آغاز سے ہوئی۔ لیکن باقاعدہ اُردو اخبارات غدر کے بعد شائع ہوئے۔ ۱۸۵۸ء میں اودھ اخبار شائع ہوا، جو اس وقت تک جاری ہے۔ ۱۸۶۶ء سے اخیر تک سرسید کے مضامین جو اخلاقی، تمدنی، اور ملکی انشا پردازی کے بہترین نمونے ہیں، علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۸۷۶ء سے اودھ پنچ شائع ہونے لگا اور اُردو زبان میں ظرافت کی جو کمی تھی، وہ پوری ہو گئی۔ پھر ۱۸۷۷ء میں ہندی کا قدیم اخبار بھارت متر نکلا جو اب تک جاری ہے۔ سرسید مرحوم کو زبان کی اشاعت و محافظت کا بہت خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک میں مذاق صحیح پھیل جائے۔ اس غرض سے سائنٹفک ایسوسی ایشن قائم کیا اور تبادلۂ خیال کے لئے رسالۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جو غالباً سب سے پہلا رسالہ ہے۔ دوسرا اخبار اردو گائیڈ کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ زمانہ کی نامساعدت نے قاعدہ کلیہ کے رو سے ان دونوں کو بھی نہ چھوڑا مگر اس میں شک نہیں کہ ان اخبار والوں کی غرض اس وقت کے لئے مفید ضرور رہی۔ ان دونوں اخبارات کے نامہ نگار بھی اس زمانہ کے مشہور اہل قلم تھے۔ مثلاً سید کرامت علی[1] متوتی امام باڑہ ہوگلی، جن کی

[1] ابتدا میں دولت ایران کے شاہی انجنیر تھے۔

ریاضی دانی کو اہل ولایت نے تسلیم کیا ہے مولانا سید عبیداللہ[1] اول سپرنٹنڈنٹ مدرسہ ہوگلی و ڈھاکہ
نواب محسن الملک مہدی علی خان، مولوی چراغ علی حیدرآبادی، پروفیسر ذکاءاللہ، نواب وقارالملک
مولوی مشتاق حسین، سید محمد محمود، حالی وغیرہ ان بزرگوں کے علمی و فلسفیانہ مضامین جو ان اخبارات میں
وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے وہ اب تک یادگار ہیں۔ سرسید کو تو بار ہا اخبار بند کر دینا پڑا۔ لیکن یہ بھی
انہی کا استقلال تھا کہ جب موقع ملا اخبار کو زندہ کیا۔ اُردو گائیڈ کا پایہ بھی کچھ کم نہیں۔ سرسید کی سلامت روی
کی داد دینے والا، ان کی حمایت کرنے والا اور ناصح مشفق کی طرح ان کی غلط روی سے ان کو متنبہ کر دینے
والا۔ ان کا بھی معاصر تھا جس کے خلوص کا شکریہ خود سرسید نے جا بجا ادا کیا ہے۔ تہذیب الاخلاق
رفتہ رفتہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل کر دیا گیا۔ رہا اُردو گائیڈ وہ اخبار دارالسلطنت کلکتہ
کے ہاتھوں نکلا۔ اکثر نامور انشاپرداز اس کے اڈیٹر بھی رہے۔ لیکن یہ کچھ ضرور نہیں کہ یہ اہل قلم ویسا ہی
اہل الرائے اور مدبر ہو جیسا اڈیٹر کو ہونا چاہیے۔ سچ پوچھو تو اس کی جان کشمکش میں گئی۔ مالی حالت اگر
درست رہی اور مالک قدردان ہوا، تو ایسا اڈیٹر نہ ملا جو ملک و قوم کی ضرورتوں کو بعنوان احسن سمجھے
اور ابنائے وطن کے ذہن نشیں کرے۔ خوش قسمتی سے اگر اڈیٹر ایسا مل گیا جو ان ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر
ابنائے زمانہ کی حالت سدھارنے کے اسباب تک پہنچ سکے تو مالی حالت درست نہ رہی۔ یا مالک قدردان نہ رہا۔
ہم یہ نہیں کہتے کہ انہیں دو اخبارات نے اخبار کا پورا حق ادا کیا۔ لیکن یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ اس زمانہ کی روش
کے مطابق ان دونوں نے ملک و قوم کی ضرورتوں کا کچھ بُرا اندازہ نہ کیا تھا۔

ان دونوں کے بعد ہندوستان میں اور اور زبانوں کے علاوہ اُردو اخبارات کی بھی کثرت ہوگئی
چنانچہ ۱۸۸۲ء میں حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے اخبارات کی تعداد ۳۰۲ تھی جن میں ہر زبان کے اخبار
شامل تھے۔ بہتیرے اخبارات پر سرسید مرحوم کا یہ قول صادق آیا کہ جس کے پاس کاٹھ کی ایک مشین اور دو
پتھر ہو گئے وہ اڈیٹر بن بیٹھا اور لگا اخبار نکالنے۔ ایسے اخبارات کی دُھن یہی ہوا کرتی تھی کہ ایک دوسرے
کی ترقی کے درپے ہو جائے۔ کینہ بغض حسد عداوت اور اسی قسم کے جتنے بُرے خصائل ہو سکتے ہیں۔
سب کا مرکز اخبار ہی بنایا گیا اور ہجو گوئی میں ان کی عمر صرف ہو گئی۔ ایک نہیں سیکڑوں ایسے اخبار تو ہماری

---

[1] آنریبل ڈاکٹر عبداللہ المامون سہروردی ان ہی کے صاحبزادے ہیں۔ مولانا سید عبیداللہ ایک زبردست عالم تھے ان کی تعلیم بہت عمدہ تھی۔

نظروں سے ہو گذرے، جو آج نکلے اور کل بند ہو گئے۔ بمصداق "بد نام کنندۂ نکو نامے چند" اس کا ملک میں یہ بُرا اثر پیدا ہو گیا کہ کسی اچھے نئے اخبار کا چندہ اگر پیشگی طلب کیا جائے تو لوگ دینے سے ڈرتے ہیں وہ سمجھے گئے ہیں کہ اس کا حشر بھی اوروں کا سا نہ ہو اور پیشگی مفت میں جائے۔ اخبار والے خیال کرتے ہیں کہ ملک میں اخباروں کی قدر دانی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے۔ سوال یہ ہو گا کہ ایسے اخبارات قبل از وقت ناپید کیوں ہو گئے؟ اس لئے کہ حزم راسخ نہ تھا اور جب یہ نہیں تو استقلال کہاں اور جب استقلال نہیں، تو جو دن وہ ٹھہرے غنیمت نہیں تعجب خیز ہے۔ اعتراض ہو گا کہ تو انوکھا اور تیرے خیالات انوکھے۔ بعض معترض تو یہ بھی کہیں گے کہ بہتیرے لیڈری کے خبط کو تو ساتھ لے گئے اب یہ نیا مجتہد بننے چلا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہماری باتیں خواہ مخواہ بھی مان لی جائیں۔ ہمارا مسلک ہے یہ مقولہ کہ "نادان اگر دانائی کی کہے تو مان لو، اور دانا سے نادانی ہو جائے تو درگذر کرو"۔ ہماری باتیں من گھڑت نہیں، بلکہ معلومات ہیں، جو تجربہ و تحقیق سے حاصل ہوئی ہیں۔ جس معاملت کو آگے رکھو گے ظن غالب ہے کہ وہ یہی نتیجہ نکالے گا۔

ایڈیٹر
(جنوری ۱۹۱۳ء)

شیخ غلام محمد کے بعد
غلام قادر فصیح

اخبار وکیل کے نامور پروپرائٹر شیخ غلام محمد صاحب کی وفات کا زخم ابھی تازہ تھا کہ ایک اور چرکا لگا یعنی منشی غلام قادر صاحب فصیح سیالکوٹی نے گذشتہ ماہ کے اخیر میں عارضۂ کاربنکل انتقال کیا۔ آپ کی عمر ۸۴ سال کی تھی۔ آپ پرانے اخبار نویس اور بڑے مشاق مترجم تھے۔ کچھ عرصہ امپریل پیپر کے ایڈیٹر رہنے کے بعد انہوں نے سیالکوٹ سے پنجاب گزٹ نامی ایک اخبار نکالا تھا جو کئی سال تک جاری رہا۔ عرصہ تک ایک ماہوار رسالہ ناولسٹ بھی نکالتے رہے۔ اب آخر میں تاریخ اسلام کے نام سے ایک سلسلۂ کتب شروع کیا تھا۔ پندرہ سال تک سیالکوٹ کی میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور اس کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔ خداوند آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(مئی ۱۹۱۳ء)

اخبار ہمدرد

کچھ عرصہ ہوا لاہور سے ایک اُردو ہفتہ وار اخبار ہمدرد کے نام سے نکلا کرتا تھا، اگرچہ وہ بند ہو چکا ہے۔ کامریڈ کے فاضل ایڈیٹر، مسٹر محمد علی (آکسن) اسی نام سے ایک روزانہ اُردو اخبار دہلی سے جاری کرنے والے ہیں۔ یہ اخبار ذاتی ملکیت نہ ہوگا، بلکہ ایک خاص مشترکہ سرمایہ سے نکالا جائے گا۔ پراسپکٹس میں جس قسم کے مضامین شائع کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اُن کے لحاظ سے یہ ایک سیکیٹرین جرنل ہوگا اور امید کی جاتی ہے کہ فاضل ایڈیٹر کی سحر آفرینی کے باعث مسلمانوں میں زندہ دلی اور بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ مگر "ہمدرد" اُسی صورت میں ہمدرد قوم یا نیشن ہو سکتا ہے جبکہ وہ ملک کا سچا ہمدرد ہو اور اس کا اصل اصول بقول لارڈ میکالے، کسی خاص مذہب یا قوم کی جانب داری نہ ہو بلکہ بقول مسٹر اسٹیڈ مرحوم من حیث المجموع وہی اخبار ایک اخبار ہونے کا مستحق ہو سکتا ہے جس میں تعصب کی بو نہ پائی جائے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ بعض پنجابی اخبارات کی طرح "ہمدرد" بھی باہمی مخالفت اور منافرت کا شکار ہو کر پارٹی فیلنگ کی مجسم تصویر نہ بنے گا۔

—— پیارے لال شاکر (جولائی ۱۹۱۲ء)

انجمن اخبار نویساں

لاہور کی "جرنلسٹس ایسوسی ایشن" نہایت عمدہ تحریک ہے، جو خوشگوار امیدوں سے معمور نظر آتی ہے۔ اگرچہ ابھی تک اس کا کوئی خاص نتیجہ ظاہر نہیں ہوا مگر امید ہے کہ اس کے ذریعہ سے اخبار نویسوں میں محبت، اتحاد اور صلاحیت پیدا ہوگی۔ بدقسمتی سے لاہور کے اخبار نویس زیادہ تر، انہیں صفات سے مبرّا ہیں۔ ہندو اخبارات مسلمان اخبارات پر اور مسلمان اخبارات ہندو اخبارات پر، بلکہ بعض اوقات آپس میں بھی ایک دوسرے پر ایسے ناپاک اور رکیک حملے کرتے ہیں کہ انسانیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جب تک وہ خود ذاتی جھگڑوں، غیر ضروری تنازعوں اور آئے دن کے مخمصوں کی پریشان کن اُلجھنوں سے نہ نکلیں گے، اس وقت تک وہ ہرگز کسی اہم ملکی یا قومی مقصد میں عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ خدا کرے کہ یہ مفید تحریک زور کے ساتھ جاری رہے اور اس کی کوششیں بارآور ہوں۔ ہم وہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں جبکہ معاصرین کی باہمی کشمکش مفقود ہو جائے گی۔ اس نمبر میں "جرنلسٹس ایسوسی ایشن" کے ایک مجمع کی تصویر ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔ اس میں لاہوری اخبارات کے قریباً تمام ایڈیٹران موجود ہیں۔

—— پیارے لال شاکر (جولائی ۱۹۱۲ء)

پٹنہ اخبار

ایک ہفتہ وار اردو اخبار ہے، جو دارالسلطنت صوبہ بہار سے بڑی تقطیع کے آٹھ صفحوں پر شائع ہوتا ہے۔ ہر صفحہ کے تین کالم مفید، دلچسپ و ضروری مضامین سے بھرے ہوتے ہیں۔ یوں تو پٹنہ سے بہتیرے اخبارات نکلے اور بند ہو گئے، لیکن اس وقت وہاں ایک ایسے اخبار کی سخت ضرورت تھی جو ہموطنوں کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ ابتدا ہی سے اس کی روش شاندار اور پالیسی قابلِ تقلید رہی ہے۔ اس نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے امید ہوتی ہے کہ اہلِ وطن میں اتحاد و اتفاق کا مادہ بعنوان احسن پیدا کر سکے گا۔ اس کی رفتار روبہ ترقی ہے اور ہر نمبر گذشتہ نمبر سے بڑھا ہوا نکلتا ہے۔ اہلِ بہار کا فرض ہے کہ اس کی قدر دانی کر کے گرمجوشی کا عملی ثبوت دیں۔ دلی مسرت کے ساتھ اس ہونہار اخبار کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ لائق اڈیٹر صاحب کی محنتیں پسندیدہ ثابت ہوں گی۔

— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۳ء)

اخبارِ عام کے اڈیٹر کی وفات

اخبارِ عام کے اڈیٹر کی وفات کی خبر اخباری دنیا میں بڑی حسرت سے سُنی جائے گی۔ آپ کا نام پنڈت گوبند سہائے جی تھا۔ ایک زمانہ سے لاہور کے روزانہ اخبارِ عام کے ایڈیٹر تھے۔ کہنہ مشق اور تجربہ کار اخبار نویس تھے۔ کہتے ہیں کہ انہماک کا یہ عالم تھا کہ سوائے اخبار نگاری کے اور کسی شوق سے ان کی دلبستگی نہ ہوتی تھی۔ کچھ دن سے افیون کے عادی ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ایک روز مقدار میں زیادتی ہو گئی، جس سے طبیعت بگڑی۔ ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ لیکن کچھ کارگر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۶ مئی کی شام کو انتقال کر گئے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا انہیں پبلک کے خدمات کا بہترین اجر دے اور ان کے وابستگان کو صبر عطا فرمائے۔

— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۳ء)

نولکشور

ہندوستان کے علم ادب کی ہر قسم کی کتابوں کی اشاعت میں جس قدر کشش و کوشش اور محنت وجانفشانی کے ساتھ، بلا کسی قسم کی قومی یا مذہبی جانبداری کے مطبع اودھ اخبار نے کام لیا ہے، اسی کا حصہ ہے۔ اس کے لائق اور ہونہار مالک و کارپردازوں نے نہ صرف فارسی، عربی، ہندی، بھاشا، سنسکرت اور اردو حروف ہی میں کتابیں شائع کی ہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً ضروریاتِ زمانہ کو محسوس کرکے ہر قسم کی کمی پوری کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ منشی نولکشور صاحب آنجہانی ایک تو خود زمانہ کے ڈھنگ کو پہچانتے تھے، دوسرے ان کے کاملین اور کارپرداز بھی نورٌ علیٰ نور تھے۔ منشی ہادی علی رشک، لالہ کالکا پرشاد موجد، زریں رقم، جواہر رقم، منشی امیر اللہ تسلیم، بابو ترجھوی ناتھ ہجر، مولانا بحر العلوم، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور خدا جانے کتنے اور درجنوں اہل قلم جمع کر رکھے تھے، جو اپنے وقت کے بادشاہ کہلاتے تھے۔ ان کی جدت پسندی اور جذبہ پروازی کے باعث مطبع اودھ اخبار کی مطبوعات کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ اسی زمانہ شناس مطبع نے جہاں اور چیزیں آج سے آٹھ دس برس ادھر شائع کی تھیں، شہنشاہ خلد آرام گاہ ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر ایک خاص کتاب "صحیفۂ زریں" بھی نکالی، اس صحیفہ میں سرکاری کتاب "دربار قیصری" کے تتبع پر وہ جملہ مضامین درج کیے گئے جنہیں دہلی کے دربار تاجپوشی کے ساتھ خاص تعلق تھا۔ مختصر تاریخ جلسہ کے بعد رئیسانِ نامدار اور والیان ریاست ماتحت سرکار انگلشیہ وغیرہ کے حالات مع تصاویر اس خوش اسلوبی کے ساتھ چھاپے کہ اس وقت کی زندہ تاریخ ہیں۔ اگرچہ انہیں دنوں میں ایک دوسری کتاب لاہور سے "یادگار دربار" کے نام سے مولوی فیروز الدین صاحب نے بھی بڑی کاوش کے بعد نکالی تھی۔ مگر "صحیفۂ زریں" کا حجم اس سے کہیں بڑا تھا۔ یہ کہنا کہ قدرداوں نے اس کتاب کی پوری قدر نہیں کی، غلط ہے کیونکہ پچھلے تجربہ سے اور بھی جرات حاصل کرنے کے بعد لالہ منوہر لال صاحب بی اے۔ مینجر مطبع نے اس کے متعلق جو مختصر سی رپورٹ لکھی ہے، نہایت ہی طمانیت بخش ہے۔ "صحیفۂ زریں" کی زبان اردو تھی، یعنی وہ زبان جو ہندوستان کے بیشتر حصص میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ احاطہ مدراس کے لفٹننٹ گورنر صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری کا نے اس کی رسید دیتے وقت یہ لکھا تھا، کہ:

"حضور لفٹننٹ گورنر صاحب بہادر اس کتاب کو دیکھ کر نہایت ہی محظوظ ہوئے۔ مگر ان کو یہ افسوس بھی ہوا، کہ یہ ایک ایسی زبان میں ہے جس کو وہ خوبی نہیں سمجھ سکتے۔ ورنہ اگر وہ اس کو پڑھ سکتے، تو اس سے اور بھی زیادہ لطف اٹھاتے۔ بہر حال وہ کتاب

کی پری جمال صورت اور اس کی ظاہر حسن آرائی کے لئے مالک مہتم ایڈیٹر وغیرہ صاحبان کی محنت خاص کا اعتراف کرتے ہیں "

اور کوئی ہوتا تو شاید اس رائے سے اس کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی ۔ مگر اس واجب الاحترام مطبع نے اس ناکامی کو نپولین کی طرح کامیابی کا زینہ خیال کیا ۔ چنانچہ اس بات کو اس نے دل میں رکھا اور اب جو تاجپوشی کا یہ دوسرا موقع زمانہ نے دکھایا اور دہلی میں شہنشاہی دربار منعقد ہونے کا وقت آیا، تو اس وقت وہ بات بھی سامنے آگئی ۔ اب کے پہلے بھی کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ اسی قسم کی ایک دوسری کتاب شائع ہوگی ۔ مضامین بھی اسی رنگ کے ہوں گے ۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ اس کی زبان انگریزی ہوگی ۔ بنیجر صاحب نے اس کا نام THE GOLDEN BOOK کے بجائے ایک اور ہی جامع اور انگریزی طرز کا نام تجویز کیا ہے یعنی WHO'S WHO یہ نام عموماً ان کتابوں کے ہوتے ہیں، جو ہر سال مشاہیر و ہنر آزمایان روزگار کے حالات میں لکھی جاتی ہیں ۔ ان میں کسی خاص قوم یا جماعت کی تخصیص نہیں ہوتی ؛ نہ یہ تذکرہ اولیا کی مانند ایک خاص فرقۂ اولیا کے ساتھ علاقہ رکھتی ہے ۔ نہ رئیسان نامدار کے حالات سے مختص ہوتی ہے ۔ ان کتابوں میں ہر قسم کے ہنرور، پیشہ ور، مشہور اہل سیف و قلم، صناع، کاریگر وغیرہ کا تذکرہ ہوتا ہے ۔ اس صورت میں "صحیفۂ زریں" کا یہ انگریزی ایڈیشن اس مبارک عہد جارج پنجم کے آغاز حکومت کی نہایت عمدہ یادگار ہوگی ۔

— ایڈیٹر (اگست ۱۹۱۱ء)

مشرقی زبانوں کی ترقی کی تحریک : ایک ریسرچ اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی ضرورت

گذشتہ چند سال سے ہندوستان کی کلاسیکل زبانوں کی ترقی کا سوال گورنمنٹ ہند کے سامنے ہے ۔ خود یہ جو مستشرقین کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس کا مقصد بھی یہی تھا ۔ حال میں گورنمنٹ کے جوائنٹ سکریٹری نے پنجاب گورنمنٹ کے تعلیمی سکریٹری کے نام ایک مراسلہ بھیجا ہے جس سے اس معاملہ پر خاص روشنی پڑتی ہے ۔ اس مراسلہ سے چونکہ ہندوستان کی آئندہ امیدیں وابستہ ہیں، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ضروری حصہ عوام کی آگاہی کے لئے یہاں نقل کر دیا جائے ۔

.......میں یہ بھی ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ گورنمنٹ ہند اس ملک کی قدیم تعلیم اور کلاسیکل زبانوں کی حفاظت کو نہایت ضروری خیال کرتی ہے۔ متشرقین کی کانفرنس کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ جس طرح بمبئی میں مشرقی زبانوں کی حفاظت کے لئے ایک اسکول قائم ہے، اسی کے نمونہ پر ہندوستان میں بھی ایک سنٹرل ری سرچ انسٹی ٹیوٹ کھولا جائے۔ چونکہ موجودہ یونیورسیٹیاں مشرقی زبانوں کی ترقی کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتیں۔ اس لئے یہ اشد ضروری ہے کہ مذکورہ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ایک اعلیٰ پیمانہ کی لائبریری بھی کھولی جائے جس سے تمام ہندوستان کے طلبہ مستفیض ہو سکیں۔ اس نئے بیت العلوم کا تعلق ہندوستان کی جملہ یونیورسیٹیوں اور علمی مرکزوں کے ساتھ یکساں ہو۔ تبادلۂ خیالات کی غرض سے اس انسٹی ٹیوٹ کے پروفیسر وقتاً فوقتاً جملہ کالجوں میں جا کے لکچر دیا کریں۔ انسٹی ٹیوٹ میں اعلیٰ پایہ کے یورپین اور دیسی پروفیسروں کے علاوہ چند خاص لکچرار بھی تعین کئے جائیں۔ طلبہ کو مناسب وظایف دیئے جائیں۔ اب امید ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ ایسے ہندوستانی بھی پیدا ہو جائیں گے جو ہر طرح پر اپنی ضروریات کو مکمل کر سکیں گے اور تاریخ قدیم و صنادید خاص کی تحقیقات کرنے والے مدارس (اسکول آف آرکیالوجی) کی بنیاد ڈال دئیے اور مختلف مقامات میں یونیورسیٹیوں اور کالجوں میں خاص ایوان تفحص (ری سرچ روم) قائم کریں گے۔ گورنمنٹ ہند نے اسی قسم کا ایک انسٹی ٹیوٹ کھولنے کے لئے صاحب وزیر ہند سے سفارش کی ہے۔

شملہ کانفرنس کی رائے میں اگر پرانے پنڈت اور مولوی معدوم ہو گئے، تو اس سے ہندوستان کی علمی دنیا کو بڑا بھاری نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ ترقی زبان کے خیال سے ان لوگوں کی سرپرستی و حوصلہ افزائی کی جائے اور پرانے طریق پر تعلیم دینے والے مدارس کے چند فارغ التحصیل بزرگوں کو طریق جدید کے مطابق تحقیق و تدقیق (ری سرچ) کی تعلیم دی جائے.....کانفرنس کی رائے میں مندرجہ ذیل طریق مشرقی زبانوں کی ترقی کے لئے مستحسن ہوگا:

(۱) سنسکرت کالجوں، مدرسوں، پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور ایسے ہی دیگر انسٹی ٹیوشنوں کو سرکاری امداد دی جائے۔

(۲) یہ امدادی رقم اعلیٰ پایہ کے اسٹاف کی تنخواہ اور طلبہ کے وظائف میں خرچ کی جائے تاکہ طالب علم حتی الامکان اعلیٰ سے اعلیٰ پایہ کی تعلیم حاصل کر سکیں۔

(۳) قابل، لایق اور تجربہ کار انسپکٹر ملازم رکھے جائیں۔

(۴) اعلیٰ تعلیم یافتوں اور ٹرینڈ طلبہ کی ملازمت کا خاص انتظام ہو۔

(۵) اچھا کام کرنے والوں کو انعامات دیے جائیں۔

اس میں شک نہیں کہ ملک کے مختلف صوبوں کے حالات میں اختلاف ہے اور گذشتہ چند سال سے بعض صوبہ جات کی لوکل گورنمنٹوں نے مشرقی زبانوں کی ترقی کا کام شروع کیا ہے۔ اس لئے گورنمنٹ ہند ان کو حتی الوسع امداد دینے میں کمی نہ کرے گی۔

کانفرنس میں اس بات پر بھی زور دیا گیا تھا کہ آئے دن ہندوستان سے کثیر التعداد قلمی نسخے غیر ممالک کی لائبریریوں اور عجائب خانوں کو زینت دینے کی غرض سے بھیجے جاتے ہیں جس کی وجہ سے یہ ملک ان بیش بہا جواہر سے خالی ہو رہا ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایسی کتابوں کو ہندوستان ہی میں رکھا جائے۔ اس کے لئے گورنمنٹ ہند لوکل گورنمنٹوں کو ہر طرح کی امداد دینے کو تیار ہے۔

کانفرنس کی رائے میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹیوں کے آرٹ کے امتحان کے کورس کی نظر ثانی کی جائے اور نظر ثانی کے وقت یہ بھی ملحوظ رکھا جائے کہ جن مضامین کا باہمی تعلق ہو انہیں ملحق کر دیا جائے مثلاً کلاسیکل ہسٹری اور فلاسفی۔ اس تجویز کے عملی پہلو پر اظہار رائے ہونا چاہیئے۔

ڈاکٹر اسٹائین نے اپنی چٹھی (مورخہ ۴ جولائی ۱۹۱۱ء) میں تحریر کیا تھا کہ اگر ہندوستان کے علماء فضلا کو بیت العلوم کا فیلو یا دیگر پبلک باڈی کا ممبر نامزد کرکے ان کی عزت افزائی کی جائے، تو اس سے ہندوستان کے علوم قدیم کے دلدادگان کا حوصلہ بڑھے گا، نیز مدارس میں سنسکرت زبان کی تعلیم جدید معیار کے مطابق ہونی چاہیئے۔ امید ہے کہ گورنمنٹ پنجاب ان دونوں امور پر خاص توجہ مبذول کرے گی۔

امور متذکرہ بالا کے اعادہ کے بعد ترقی السنہ مشرقیہ کی تحریک پر مجموعی طور پر غور کرنے سے بکہ تعلیمی نقطۂ خیال کے لئے ایما کیا گیا ہے۔ گورنمنٹ ہند کو یقین ہے کہ اس وقت ہندوستان کے لیے نہ صرف پولیٹکل نقطۂ خیال سے بھی یہ ایک نہایت ضروری سوال ہے اور جیسا کہ اس سے پیشتر بھی ظاہر کیا گیا ہے، اگر السنۂ قدیم کی ترویج عام کے متعلق کوئی خاص تجویز پیش کی جائے، تو گورنمنٹ ہند حتی الامکان امداد دینے کو تیار ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہند کا یہ مراسلہ ہمارے ہاں کے قدیم طرز کی تعلیم کے دلدادگان اور خیر خواہوں کے لئے پوری حوصلہ افزائی اور مسرت قلبی کا باعث ہوگا اور اگر شملہ کانفرنس کی تجویز کے مطابق جدید دہلی میں انسٹی ٹیوٹ قائم ہو گیا، تو اس سے بڑی بھاری کمی پوری ہوگی۔

— ایڈیٹر (اگست ۱۹۱۲ء)

اُردو

ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت سے

[قومی زبان کا مسئلہ نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے کہ ہندوستان کے مذاہب و ملل کے درمیان باوجود اختلاف عقائد کے ایک مشترکہ زبان ہی سے اتفاق و اتحاد کی بنیاد پڑ سکتی ہے، ہر ایک بہی خواہ ملک کا فرض ہے کہ اس باب میں صحیح و معتدل رائے قائم کرکے آخری نتیجہ تک پہنچے۔ ہندوستان میں سیکڑوں اور ہزاروں زبانیں مروج ہیں۔ اور یہ قدرتی بات ہے کہ ہر شخص اپنی مخصوص زبان کی ترجیح کرے گا۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ جو زبانیں مختلف حصص ملک میں محدود ہوں اور جن میں عام زبان بننے کے خواص طبعاً مفقود ہوں، وہ مجموعی طور سے کُل باشندگان ہند کی بولی کیسے قرار پا سکتی ہیں۔ البتہ اُردو کو یہ امتیاز ہے کہ وہ "مقامی زبان" کی تعریف میں نہیں آسکتی! اور اندرونی و خارجی اسباب اس کے قومی و ملکی زبان بنائے جانے کی سفارش کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کا لٹریچر ایسا گراں قدر نہیں کہ یورپ کی کسی زبان کے بالمقابل لایا جا سکے، بلکہ خود ہندوستان کی بعض زبانوں کی حالت، اُس سے بدرجہا افضل ہوگی۔ لیکن اس افراتفری اور کسمپرسی کے عالم میں بھی اُس کا خزانۂ ادب اکثر نایاب جواہر ریزوں سے لبریز ہے اور اقوام ہند کی معمولی سی بھی متفقہ معاونت اُسے معاصر السنہ میں محسود بنا سکتی ہے۔

اس مضمون میں بھی جس کا ترجمہ ہم ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر منشی کانت چٹوپادھیا آنجہانی نے اسی مبحث پر اپنے وزندار خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جن کی افسوسناک وفات نے ہندوستان کے ذی علم طبقے سے ایک بہترین رکن کی کمی کردی ہے، ہمارے ملک کے روشن ضمیر اور وسیع الخیال بزرگوں میں تھے، اور آپ کی بالغ نظری کا شائبہ اس مضمون میں بھی موجود ہے جس کا محققانہ طرز استدلال آپ کی دقت پسندی اور معاملہ فہمی کی کافی دلیل ہے۔

آپ نے اپنے دعاوی کے ثبوت میں یورپ کے ان جدید علماء کی بیش قیمت آراء سے بھی استناد کیا ہے جن کی عظمت علم اللسان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام علمی حلقوں میں یکساں طور سے قائم ہے۔ آپ بنگالی ہونے کے باوجود اردو کے "لنگوا فرینکا" اور "نیشنل لنگویج" بنائے جانے کے حامی ہیں اور اس لحاظ سے یہ مضمون اُن اصحاب کی خاص توجہ کا مستحق ہے جو ہندوستان کی اس شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ (سید محمد فاروقی)]

(ا)

ہندوستان کی قومی زبان آخر انگریزی کیوں نہ بنائی جائے؟ یہ سوال ہے میرے انگریز نما ہندوستانی دوست کا جو طویل اقامت یورپ کی وجہ سے اپنے وطن کی زبان تک تقریباً بھول چکے ہیں۔ گزشتہ سالہا سال سے انگریزی زبان ہمارے دوست کا اوڑھنا بچھونا بنی ہوئی ہے۔ اس لئے انہیں اس قسم کی رائے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ اگر تمام ہندوستانی ان کی مثال کی تقلید اور انہیں کی طرح عمل کریں تو "بہت اچھی بات ہوگی" انگریزی ہی ملک بھر میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں، کانگریسوں، کانفرنسوں، جلسوں، انجمنوں، اخبارات اور رسالوں، عدالتوں اور محکموں کی زبان بنی ہوئی ہے۔ کیا یہ بتدریج تمام ملک کی زبان نہیں بنائی جاسکتی؟ نہیں! کیونکہ یہ امر ناممکن اور ناپسندیدہ ہے۔ یہ جواب ہے جو ہر طرف اور ہر طبقے کی جانب سے صاف صاف سننے میں آرہا ہے، ورنہ میں اسے تمام باشندگان ہند کی طرف سے نہ صرف مسرت آمیز بلکہ پُرجوش خیر مقدم کہتا۔ کیونکہ اگر کہیں وسیع برّ اعظم ہند کے تیس کروڑ بلکہ اس سے زائد رہنے والوں کے لئے اس شیریں اور مفید زبان کو جس کے بولنے والوں کی تعداد دنیا میں ہر ایک زبان سے زیادہ ہے اور جس کا تقدس شیکسپیر اور ملٹن، ایڈیسن اور مکالے، برک اور رائٹ، بیرن اور ٹینیسن، اسکاٹ اور ڈکنس، جان مل اور جان مارلے ایسے درخشندہ ناموں کے ساتھ وابستہ ہے، اپنی خاص زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنا ممکن ہوتا تو ہمارے قومی مسائل اور لسانی مشکلات کتنی سہولت سے حل نہ ہوجاتیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ انضمام خواہ اس کے لئے کوئی دل سے کسی قدر متمنی کیوں نہ ہو، ناممکن الوقوع اور خلاف رائے ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی بہرنوع قلیل التعداد ہونے سے گویا ہندی آبادی کے ذخار سمندر میں بمنزلہ ایک قطرے کے ہیں۔ غالب حصہ یعنی عوام کا ذریعہ تکلم دہ کئی سو زبانیں ہیں، جو تقریباً ۱۸ ملین مربع میل کے رقبہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ زیادہ تر یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی حکام نے دیسی زبانوں کی تعلیم و ترقی کے لئے ہمیشہ غیر معمولی زور دیا ہے۔

میکالے کے ۱۸۳۵ء والے ورد ملامت تعلیمی منٹ میں اس کی جھلک محسوس ہوتی ہے لیکن عملاً سرآئی ووڈ کے تعلیمی مراسلہ (۱۸۵۴ء) میں جس کو ہندوستان کی تعلیم یونیورسٹی کا میگنا چارٹا (سند شاہی) سمجھنا چاہیئے، اس کی خاص طور پر ضرورت دکھائی گئی ہے۔ کیونکہ دیسی زبانوں کی اشاعت و ترویج ہی صرف ایک ایسی حکمت عملی ہے جس کے ذریعہ سے حکام انگریزی باشندگان ہند اور اُن کے خیالات و آرار، ان کی عادات و مراسم اور ان کے طور و طریق سے واقفیت پیدا کر سکتے ہیں۔ بلکہ یہ بات سنسکرت اور فارسی و عربی کے تحصیل سے بھی جو ہند کی مفروضہ کلاسیکل زبانیں سمجھی جاتی ہیں اور جن کی اشاعت زیادہ تر شروع شروع میں وارن ہیسٹنگز، سر ولیم جونس اور کولبروک کی معاونت سے ہوئی، نہیں حاصل ہو سکتی۔ کیونکہ (ان کے متعلق) یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جیسا حال یورپ میں لاطینی اور یونانی زبانوں کا تھا اسی طرح فارسی اور سنسکرت یہاں کے اعلیٰ طبقے اور اہل قلم و ملازمت پیشہ اشخاص کے دایرہ میں محدود تھیں۔ بیشک فارسی عہد مغلیہ میں سرکاری زبان تھی اور اس لئے اس کا رواج تمام ملک کے تعلیم یافتوں اور حکام میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بہت تھا۔ فارسی کی حیثیت سلطنت مغلیہ میں وہی تھی جو کم و بیش انگریزی کو حکومت برطانیہ میں حاصل ہے۔ لیکن اب سلطنت مغلیہ کا وجود بھی باقی نہیں اس صورت میں اُس عہد کی سرکاری زبان کا جو غیر ملکی بھی ہے قائم رہنا کس طرح ممکن تھا (یہ امر البتہ قابل غور ہے) کہ کیا ہندوستان میں کوئی زبان ایسی نہیں تھی جو یہیں کے مرز و بوم سے پیدا ہوئی ہو اور جو باقاعدہ اشاعت و معاونت کا سامان پا کر رفتہ رفتہ فارسی کی جانشین بن سکتی۔ لاریب، جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں، دیسی زبانوں کی کوئی انتہا نہیں۔ حقیقت میں یہاں کثیر التعداد زبانیں تھیں اور اُن میں سے ہر ایک اپنی فضیلت کے لئے کوشاں تھی۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا یہاں ایک بھی ایسی زبان موجود نہیں جو اپنی قدیم تاریخ، اپنی لسانی کیفیات اور عملی صورت، اور لوچ دار ہونے کی وجہ سے اور زبانوں کے مقابلے میں "لنگوا فرینکا" اور نیز قومی زبان بننے کے قابل سمجھی جا سکے۔ اس کا جواب ہے کہ ہاں! پہلے ہی سے ایک زبان میدان میں موجود ہے جس کی نشو و نما کئی صدیوں سے ہوتی آ رہی ہے۔ اور اس کا نام **اُردو** یا **ہندوستانی** ہے۔ جیسا کہ اُس کے نام سے جو تُرکی میں "لشکر بازار" کا ہم معنی ہے ظاہر ہوتا ہے، اُردو اپنے ابتدائی ایام میں اس مخلوط و مرکب بول چال کا نام تھا، جو مغلوں کے لشکروں میں اُن کے آغاز تسلط کے وقت جاری تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے معتدد شہروں دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، احمد آباد، حیدرآباد دکن، اور بنگال کے ڈھاکہ اور مرشد آباد میں اردوئے معلیٰ کا وجود تھا اور اب بھی ہے۔ انگریزی کی طرح

یہ زبان بھی مخلوط اور رلوچدار اور ہندو اور اسلامی عنصر سے مرکب ہے۔ یعنی اس میں ہندی، سنسکرت اور فارسی عربی بلکہ ترکی الفاظ تک شامل ہیں۔ یہ پہلے ہی سے ایک طرح "لنگوا فرنیکا" (عام زبان) بنی ہوئی ہے اور مختلف شکل وصورت میں تمام ہند میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے بولنے اور جاننے والے تمام موجودہ زبانوں سے شمار میں زیادہ ہیں (غور کرنا چاہیئے کہ) آخر اسی کو گورنمنٹ کی سرپرستی میں اس کی صرف ونحو ترتیب دے کر اُسے شمالی ہند کی علمی زبان کیوں نہ بنادیا جائے۔ دہلی، آگرہ، لکھنو سے کیوں نہ ایک معقول تعداد اہل علم اصحاب کی بلاکر اُن سے سائینٹیفک اور علمی مضامین پر مفید مطلب کتابیں لکھوائی جائیں، جو نہ صرف نصاب مدارس میں کام آئیں گی بلکہ انگریزی حکام سول وفوج کے واسطے جن کے لئے ہندی وہندوستانی کی معمولی واقفیت ملازمت ہند کے معیار قابلیت میں شامل ہونا ضرور ہے کارآمد ہوسکتی ہے۔ (اسی نمونہ پر) ۱۸ ویں صدی کے خاتمہ سے پیشتر اور ۱۹ ویں صدی کے بالکل آغاز میں بمقام کلکتہ مارکوئیس آف ولزلی وائسرائے وگورنر جنرل کی سرپرستی میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تھا اور ڈاکٹر جان گلکرسٹ اولین پرنسپل کے جوش کا جس کے ساتھ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے عزیز اور ذمہ دارانہ کام میں وقف کردیا تھا، یہ عالم تھا کہ بہت تھوڑے عرصہ میں انہوں نے مذکورہ بالا شہروں سے مشاہیر ماہران علم کی ایک معقول تعداد اپنے گرد فراہم کرلی تھی۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ان لائق وفائق اشخاص کے ذمہ زیادہ تر فارسی وسنسکرت کی مشہور ومعروف کتب کو ہندی اور ہندوستانی ترجمہ کا لباس پہنانے کی خدمت سپرد کر رکھی تھی۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ایک جماعت ایسی تیار کی تھی جس کا کام تھا کہ انہیں دو زبانوں میں تاریخ وجغرافیہ وریاضی کے مضامین پر ایسی مستقل کتابیں تصنیف وتالیف کی جائیں، جیسا کہ یورپ میں رواج ہے۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے زیر نگرانی فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفین یہ لوگ تھے: سید محمد حیدر بخش حیدری جنہوں نے طوطا کہانی کے مشہور قصے کا ترجمہ کیا۔ میرامن دہلوی جنہوں نے اس سے بھی زیادہ شہرت پذیر کتاب "باغ وبہار" کا ترجمہ کیا۔ سری للولال کوی مترجم پریم ساگر، بیتال پچیسی، شیر علی افسوس، کاظم علی جوان، مظہر علی المتخلص بہ ولا وغیرہم ان میں سے بعض کتب کے مطالعہ سے جو حال میں میرا مشغلہ رہ چکا ہے، جو بات خصوصیت سے محسوس ہوتی ہے وہ ان کا صاف وسادہ اور شاندار طرز تحریر ہے جو ہندی اور ہندوستانی دونوں میں یکساں طور سے موجود ہے۔ کاش ہمارے موجودہ مصنفین اُردو بجائے شعرائے دہلی ولکھنؤ کے مغلق اور بعید از فہم طریقے پر مائل ہونے کے کلکتہ کے ابتدائی نمونے کی پیروی پر قائم رہتے! اگر انہوں نے ایسا ہی کیا ہوتا تو کوئی شبہ نہیں کہ میرامن کی

یہ سچی پیشین گوئی کہ ،

سو اُردو کی آراستہ کر کے زباں کیا میں نے بنگالہ ہندوستاں

پوری ہو کر رہتی ۔

ہم اس بات کے ثابت کرنے میں کہ انگریزی حکام ہند نے اپنی خاص زبان کو باشندگان ہند میں رائج کرنے کے بجائے اس ملک کی دیسی زبانوں اور بالخصوص شمال ہند کی ہندی و ہندوستانی کی اشاعت و تعمیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اس معاملہ میں کس قدر پیش بینی سے کام لیا اور گویا اضطراری طور پر اس جگہ فورٹ ولیم کالج کا جو ہندوستانی علم ادب کی تعلیم گاہ اور اس کی موجودہ تاریخ کا ماقبل آخر دور کہا جا سکتا ہے مختصر خاکہ کھینچا ہے اور اسی لحاظ سے جو لوگ برٹش گورنمنٹ کو جدید ہندوستانی نثر کا "روحانی باپ" کہتے ہیں وہ حق بجانب ہیں ۔ اور میں اس کے علاوہ تقریباً ان تمام رائج الوقت دیسی زبانوں کا بھی اضافہ کر سکتا ہوں جن کے ادب نثر نے اب تک کچھ نہ کچھ ترقی کی ہے اور اگر حکومت برطانیہ کو روحانی باپ کا درجہ حاصل ہے تو عیسائی مشنریوں ، اور ہندو مسلمانوں کے بعض اصلاح پسند فریق کو مساوی طور پر دایہ اور کھلائی کہلانے کا جائز حق ہے ۔ لیکن اس کا ذکر پھر ہو گا ۔ بالفعل مجھے اس شاہراہ کو چھوڑ کر اردو زبان کے مختصر حالات بالکل آغاز سے مسلسل لکھنا چاہیے تاکہ یہ بات صاف ہو جائے کہ میں تمام دیسی زبانوں میں اُردو کو جدید ہند کی قومی زبان بنائے جانے کے واسطے سب سے زیادہ کیوں کار آمد سمجھتا ہوں ۔ مگر میں نہایت سختی سے اس کو اردو کا لقب دینے کا مخالف ہوں ۔ اس کو بالکل اڑا دینا چاہیے ۔ خصوصاً اس کے ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کے دعاوی کے خیال سے "ھندوستانی" ہر طرح سے نہایت مناسب لفظ ہو گا ۔ اور میں نے اکثر اس بات پر استعجاب ظاہر کیا ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بجائے اُردو کے کیوں یہی نام علی العموم استعمال نہیں کرتے جس سے اس کے خالص ملکی ابتدائی اور ایک مخصوص نوعیت کا بھی پتہ چلتا ہے محض اس وجہ سے کہ ہندوستانی اپنے نشو و نما کے اولین زمانہ میں لشکر میں رائج رہ چکی ہے اور اسی بنا پر اسے اُردو کہا جاتا ہے اس کا یہ نام جاری رکھنا کچھ زیادہ قرین صواب نہیں ہو سکتا ، جس طرح آدمی کو صرف اس لئے بندر کہنا کہ ڈارون کی تھیوری کے مطابق اس کا مفروضہ تعلق "انسان نما میموں" سے بتایا جاتا ہے ۔

(۲)

ہندوستانی زبان کی واقعی ابتدا کس طرح ہوئی ؟ اس کے آغاز کا کھوج کہاں سے لگانا چاہیے

جو اس کی حقیقی ماں کے درجہ پر ہے۔ برج بھاشا سے ہماری مراد وہ ہندی کا ہے جو دہلی اور اس کے ملحقہ علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اسی برج بھاشا میں بتدریج فارسی عربی اور نیز ترکی الفاظ اور جملے بھی شامل ہو گئے تھے جسے ہندوؤں اور اسلامی فاتحوں کے جو آٹھویں صدی عیسوی میں یہاں آئے شاہراہ زندگی کے دائمی اور مستقل میل ملاپ کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ دریائے سندھ کے پار یا ہمالیہ کے شمال سے آنے والی فاتح جماعتیں کم و بیش فارسی زبان بولتی تھیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوستانی میں عربی و ترکی کی بہ نسبت فارسی الفاظ کی کثرت ہے۔ نارمن فرینچ کو جو نسبت اینگلو سیکسن سے ہے وہی فارسی کو ہندی کے ساتھ ہے۔ اس لئے اگر ہندی کو ہندوستانی کی ماں کہا جائے، تو فارسی کو ابوت کا درجہ ملنا چاہیے اور عربی کو نسبتی جد ہونے کا۔ بشرطیکہ میں اس لقب کے استعمال کرنے کا مجاز ہوں۔ کیونکہ اس کا حقیقی رشتہ اس وجہ سے نہیں ہو سکتا کہ فارس اور ہندوستان کی لسانی برادری سے عربی کو براہ راست کوئی واسطہ نہیں، اسی وجہ سے ہندوستانی کا اسے نسبتی جد کہا ہے۔ کیونکہ تعلقات مابعد کی بنا پر باوقعت حیثیت پیدا کر لینے پر بھی وہ اجنبی تھی اور آج کے دن تک ہے جس طرح انگریزی میں لاطینی۔ ہندوستانی میں کسی نظم یا کہانی کا لکھنا عربی کا ایک حرف استعمال کئے بغیر ممکن ہے حالانکہ یہ بات ہندی اور فارسی الفاظ کے بدون دشوار ہے۔ اسی طرح اینگلو سیکسن اور نارمن فرینچ الفاظ کے بغیر فصیح انگریزی ممکن نہیں۔ حالانکہ بلا لاطینی اور یونانی الفاظ کے ایسا ہونا قریب الامکان ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک انگریزی مصنف جو لاطینی کم اور یونانی کمتر جانتا تھا، تاہم انگریزی زبان کا سربر آوردہ ترین مصنف تھا۔ بایں ہمہ اگرچہ قدیم ہندی میں فارسی عربی اور دوسرے غیر ملکی عناصر کے اس طرح شامل ہو جانے سے اس میں ایک جداگانہ زبان ہونے کی حیثیت پیدا ہو گئی لیکن پھر بھی اس میں جسے **اردو یا ہندوستانی** کہتے ہیں قدیم ہندی کی مخصوص نحو، لہجہ اور تصریف باقی ہے، اور اس لئے لسانی نقطۂ خیال سے اس کو ایک بالکل علیحدہ اور جدا زبان سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اس بات کے یقین کرنے کی بھی کافی وجوہات موجود ہیں کہ اگرچہ فارسی اور عربی عناصر ہندی میں کئی صدیوں سے داخل ہو چکے تھے لیکن ہندوستانی زبان نے سولہویں صدی تک کوئی خاص امتیازی شکل و صورت نہیں قبول کی تھی۔ جیسا کہ مسٹر بیمس کہتے ہیں :

"قطب الدین ایبک جو دہلی کا پہلا اسلامی فرماں روا تھا، کی فتوحات کے بعد کئی نسلوں تک فاتحان اسلام نے اپنی خاص زبان فارسی اور مفتوح قوم نے ہندی قائم رکھی۔ مسلمان ایک عرصہ تک فصیح ہندی بولنے کے عادی تھے اور کچھ انہوں نے ہندی میں فارسی الفاظ بھی شامل کئے

بلکہ خود ہندو مذکورہ بالا زمانہ میں ٹوڈرمل کے "طریق مالگزاری" کے رواج کی وجہ سے فارسی سیکھنے پر مجبور ہوئے۔"

میں ناظرین کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کراؤں گا کہ خود ہندوؤں نے اکبر کے "ریونیو سسٹم" کے نفوذ پر جو ٹوڈرمل ایسے پیدائشی و تربیتی راسخ العقیدت ہندو کا طبعزاد تھا ہندی میں فارسی الفاظ کے شمول کی شروعات کی۔ اس لحاظ سے فارسی کی تحصیل ہندوؤں پر اس طرح جبری نہ تھی جس طرح اہل فارس و باشندگان اسپین کے لئے عربی کی تعلیم شاید رہی ہو، بلکہ انہوں نے اس کو بخوشی قبول کر کے اسے برضامندی اپنی خاص زبان میں شامل کیا اور اس اعتبار سے مسلمانوں کی طرح انہیں بھی ہندوستانی کے وجود میں لانے کا کریڈٹ ملنا چاہیئے۔ ایڈورڈ اول کے عہد حکومت میں جو حال انگریزی کا تین صدی پیشتر تھا اسی طرح ہندوستانی بھی سولہویں صدی کے آخر میں بزمانہ اکبر اعظم عالم طفلی میں تھی۔ اس لئے قومی گورنمنٹ اور قومی مذہب یعنی دین الٰہی کی طرح ہندوستانی زبان کی ابتدا کے لئے بھی جس کے آئندہ قومی زبان ہونے کی قوی امید ہے، اکبر کے وقت سے کھوج لگانا چاہیئے۔۔۔ عہد اکبری واقعی طور پر ہندوستانی کی پیدائش کا دور تھا اور اس کی تصدیق میر امن دہلوی نے بھی کی ہے۔ وہ اپنے دیباچۂ باغ و بہار میں اسی امر کے متعلق لکھتے ہیں:

جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔

اس کے علاوہ مولوی محمد حسین آزاد بھی اپنی مشہور کتاب آبحیات میں اسی خیال کو اپنے شاندار اور عدیم النظیر تحریر میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو گئے، یہ نوبت ہوئی کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جبّہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ ادھر ہندو شرفا راجے مہاراجے ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے بلکہ "مرزا" کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے۔

(۳)

لیکن جس طرح اکبر کے زمانہ میں **ہندوستانی** شمالی ہند میں عالم وجود میں آرہی تھی، اسی طرح اور تقریباً اسی وقت اُس کی عم زادہ خواہر دکھنی گولکنڈہ اور بیجاپور کے درباروں میں نشوونما حاصل کر رہی تھی۔ بلاشبہ اس بات کا دعویٰ جائز فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ اُردو یا ہندوستانی کے قدیم ترین مصنفین انہیں بعض اسلامی خاندانوں کی سرپرستی میں گزرے ہیں اور ان کی تصنیفات انہیں کے عہد کی یادگار ہیں، جو قدیم سلطنت بہمنی کے زوال کے بعد وجود میں آئیں، خواہ اس وجہ سے کہ حکومت بہمنی کا بانی ایک برہمن کا چیلا تھا جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے یا اس لئے کہ خاندان ہائے بہمنی بعض بانیان ہندو یا شاید برہمن نومسلم تھے جس طرح کہ برار اور احمد نگر والے یقیناً تھے یا اس سبب سے کہ دکن کے اسلامی حکمران اور رؤسا ہندو خواتین کو رشتۂ مناکحت میں منسلک کرنے کے عادی تھے جیسا کہ ان کی اکثر اولاد کا اب تک بھی قاعدہ ہے، یا اس کے برعکس، یا اس باعث سے کہ مذہبی آزادی کی حکمت عملی پر بالعموم کاربند ہونے سے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوؤں کی تعداد سرکاری ملازموں میں بہت زیادہ تھی، اس وقت اس حصۂ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات نہایت صلح آمیز اور حد سے زیادہ خوش گوار تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مخلوط زبان جسے ریختہ کہتے ہیں اور جو شمال کی **ہندوستانی** سے بہت مشابہ تھی دو صدی کے اندر دکن میں موجود تھی۔ صوبہ سرحدی اور پنجاب سے جو ایک عرصہ تک افغانستان اور وسط ایشیا کی حملہ آور جماعتوں کا مرکز رہ چکے ہیں جدا اور نسل و مذہب کے اُن شدید تعصبات سے جو وہاں کے لئے آئے دن کی بات تھے علیحدہ رہنے کی وجہ سے سلاطین گجرات اور دکن کے ملوک بہمنی کو امن آمیز انتظام اور اندرونی ترقی کا اپنے شمالی معاصر سے زیادہ تر موقع حاصل تھا۔ چنانچہ **اُردو** کا نہایت قدیم شاعر شجاع الدین نوری گجرات کا باشندہ تھا اور اکبر اعظم کے درباری شاعر فیضی کا ہمعصر تھا۔ اسے سلطان ابوالحسن قطب شاہ والی گولکنڈہ کے وزیر زادے کی اتالیقی کی خدمت سپرد تھی اور اس کی چند ہندوستانی غزلیات کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اب تک محفوظ ہیں۔ قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ (۱۵۸۱ - ۱۵۸۶ء) اور نیز اس کے جانشین عبداللہ قطب شاہ (۱۶۱۱ء) ان دونوں نے اپنے کلام کا مجموعہ جس میں غزلیات، رباعیات، مثنویاں اور قصائد شامل ہیں بطور یادگار چھوڑے ہیں اور مؤخر الذکر کے زمانہ میں ابن نشاطی نے دو کتابیں دکھنی زبان میں طوطی نامہ اور پھول بن کے نام سے لکھی ہیں۔ اس لحاظ سے ہندوستانی علم ادب کی بنیاد گولکنڈہ میں پڑی یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بمقام حیدرآباد

دکن حضور نظام کی مملکت میں جو قدیم سلاطین بہمنی کے مقبوضہ ممالک کے غالب حصہ پر حکومت کر رہے ہیں، جس کا علم ناظرین کو بجائے خود ہے۔ ہز ہائی نس میر محبوب علی خاں کے قبضہ میں ملوک بہمنی کی صرف سطوت و مملکت ہی نہیں آئی بلکہ آپ **ہندوستانی** زبان و ادب کی سرپرستی کرنے میں بھی مؤخر الذکر کے نقش قدم پر چلے ہیں۔ سبھوں کو معلوم ہے کہ ہز ہائی نس نظام خود ہندوستانی کے اعلیٰ درجہ کے سخن گو ہیں اور غزلیات آصف آپ کے ممالک محروسہ میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہز ہائی نس کے وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد، جن کا تخلص شاد اس وجہ سے نہایت موزوں واقع ہوا ہے کہ آپ مہاراجہ چندو لال شاداں کے جو آپ ہی کی طرح اپنے زمانہ کے ایک نامی شاعر تھے نواسے ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا اور مجھے یہ امید و یقین کرنے کی وجہ موجہ حاصل ہے کہ ان ہر دو ذی مرتبت اور عالی مناقب نفوس کے ظل عاطفت اور فیاضانہ معاونت سے **ہندوستانی** زبان اور لٹریچر کو جدید ہندوستان کی تمام دیگر مروجہ زبانوں کے مقابلہ میں ترقی حاصل کرنے اور عروج پانے کا بہترین موقع ہے۔ کاش **ہندوستانی** زبان و ادب کے محافظ اس سنہرے موقع کی قدر و قیمت کو سمجھیں اور اس سے صحیح طور پر فائدہ اٹھا کر ان میں وہ بات پیدا کر دیں کہ تمام اقوام ہند کو مجبوراً اُن کی عظمت کا قائل ہونا پڑے[1]۔

(۴)

ہندوستانی زبان و ادب کی ابتدا اور اس کی ترقی کے متعلق مذکورۂ بالا خیالات کا اظہار مختصراً امپیریل گزیٹیر جلد اول کے صفحات ۳۶۵ و ۳۶۶ میں اس طرح کیا گیا ہے:

لیکن ہندوستانی جو مغربی ہندی کی شاخ ہے معمولی طور پر کوئی مقامی زبان نہیں بلکہ برِ اعظم ہند کے شمال و مغرب میں بھی تمام وہ زبان ثانیہ کے طریقے پر بولی جاتی اور عدالتوں اور بازاروں میں عموماً مستعمل ہے۔ مسلمان اور ہندو دونوں کے ہاتھوں اُسے معتد بہ علمی تقویت پہنچی ہے۔ اول الذکر نے لکھنے میں فارسی رسم الخط استعمال کیا اور اس کے

---

[1] یہ مضمون اس وقت کا لکھا ہوا ہے جب حیدر آباد کی مسند حکومت کو سلطان دکن میر محبوب علی خاں مرحوم کی ذات والا صفات پر فخر کرنے کا موقع حاصل تھا۔ اب دکن کی عنان فرمانروائی آپ کے جانشین محترم میر عثمان علی خاں بہادر بالقابہم کے دست مبارک میں ہے اور امید ہے کہ آپ بھی اپنے والد کرم کے نقش قدم پر چلیں گے اور آپ کا دربار اہل کمال و ماہران فن سے بدستور معمور رہے گا۔ (مترجم)

لغت میں فارسی و عربی کا کثیر ذخیرہ شامل کر دیا ہے۔ جب اس قسم کے مستعار الفاظ کی کثرت انتہائی درجہ کو پہنچ جاتی ہے، جیسا کہ استثناً لکھنؤ کا رواج پیش کیا جا سکتا ہے اس وقت صرف تعلیم یافتہ مسلمان اور وہ ہندو جنہیں اسلامی طرز پر تعلیم دی گئی ہو اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں۔ دکن میں اردو زیادہ تر مسلمانوں میں رائج ہے اور یہیں اردو علم و ادب نے ابتدائی نشو و نما بھی پائی ہے۔ دکھنی ہندوستانی جیسا کہ عام طور پر اس کا نام لیا جاتا ہے، دہلی و لکھنؤ کے موجودہ معیار سے کس قدر مختلف ہے اور اس میں بہت سی قدیم خصوصیات اب تک ایسی باقی ہیں جن کا شمال میں پتہ بھی نہیں۔

گولکنڈہ کے قطب شاہیوں کی طرح عادل شاہی سلاطین بیجاپور بھی ہندوستانی علم و ادب کی سرپرستی کے لئے مشہور رہیا۔ ابراہیم عادل شاہ (١٥٧٩-١٦٢٦ء) جس کی اکیلی منکوحہ بیگم ایک مرہٹہ خاتون بابوجی خانم نام کی تھی۔ نورس کا مصنف تھا۔ لیکن اس کی یہ تصنیف اردو کے بجائے ہندی کہے جانے کی زیادہ تر مستحق ہے۔ علی عادل شاہ کا درباری شاعر ایک برہمن تھا اور اسی برہمن سخن گو نے جس کا تخلص نصرتی تھا ١٦٥٧ء میں ایک مثنوی گلشن عشق کے نام سے لکھی تھی۔ لیکن گولکنڈہ و بیجاپور کے قدما واقعی معنوں میں صرف راستہ صاف کرنے والے تھے اور اردو اولین اور مقبول انام معیار ادب ولی دکھنی اورنگ آبادی کا (جس نے اورنگ زیب کا آخری زمانہ پایا اور بہادر شاہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد حکومت کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا) قائم کیا ہوا ہے۔ اس کا نام بابائے ریختہ رکھا گیا ہے اور اُسے اردو کا چاسر کہنا درست ہو گا۔ جب ولی کا دیوان دہلی میں بعہد محمد شاہ اول مرتبہ آیا، تو اسے دیکھ کر تمام شمالی ہند والے متحیر تھے۔ اور یہ بات عام طور سے تسلیم کر لی گئی ہے کہ اٹھارویں صدی میں نظم اردو کی ساری ترقیات زیادہ تر ولی کی نظیر اور مثال کا نتیجہ تھیں۔ ولی کا دیوان یورپ میں پہلے پہل میرے محترم اُستاد اور عالی مرتبت دوست پروفیسر گرسین دی تاسی، ساکن پیرس کے اہتمام سے جو ہندی و ہندوستانی کے ایک محنت پسند اور متبحر عالم گزرے ہیں اور جن کی تین جلدوں میں ترتیب دی ہوئی "ہندی و ہندوستانی زبان و لٹریچر کی تاریخ" معلومات و تحقیقات کی ایک ایسی بیش قیمت کان ہے جس کے بغیر ہندی و ہندوستانی کے کسی طالب علم کو چارہ نہیں ہو سکتا اشائع ہوا تھا۔ میں ان کا آخری شاگرد تھا اور اس ہشتاد سالہ فرنچ عالم کی اس متواضعانہ خلق اور غایت مہربانی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جو انہوں نے کتب مشرقی کے نادر الوجود مجموعہ کا خزانہ میرے سپرد کرنے اور دار السلطنت فرانس و یورپ میں بیٹھ کر مجھے پریم ساگر ہندی اور

باغ و بہار ہندوستانی کے مطالعہ میں امداد دینے میں ظاہر فرمائی۔

جس زمانہ میں نظام الملک آصف جاہ بہادر ملک دکن میں اپنا تسلط جمائے ہوئے تھے ولی دربار دہلی میں شاعرانہ امتیاز پیدا کر رہا تھا۔ جہاں حاتم، سودا، میر تقی، آرزو، درد اور بہت شعرا نے اس کو اپنا استاد تسلیم کیا اور اس کے پُرجوش مقلد اور پیرو بن گئے۔ جب نادر شاہ مرہٹوں اور دُرّانیوں کے حملوں کی وجہ سے ان میں سے اکثر شعرا شجاع الدولہ کے دربار میں لکھنؤ چلے آئے تو وہاں اُن کے بعد ایسے قابل و لائق شاگرد پیدا ہوئے جیسے میر حسن، میر سوز، آتش، انیس انیس، واجد علی شاہ اختر کا بھی شمار ہو سکتا ہے، جو لکھنؤ کا آخری اور بدنصیب نواب وزیر تھا، اور گولکنڈہ کے آخری فرماں روا تانا شاہ کی طرح خود بھی ایک بڑا شاعر اور ماہر فن موسیقی تھا۔ اگرچہ اختر کا قیام کلکتہ میں بمقام مٹیا برج ایک اسیر سلطانی کی حیثیت سے تھا باایں ہمہ دارالسلطنت ہند میں اس کی صرف موجودگی ہی سے بنگال کی اُردو فارسی شاعری کے چراغ سحری میں جس کی مدھم روشنی در بلد مرشد آباد اور ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کے چند قدیم ذی اختیار خاندانوں میں پائی جاتی تھی نئی جان ڈال دی۔ اس کی دو مشہور غزلیں:

جب چھوڑ چلے لکھنؤ نگری

اور شہزادۂ عالم تیرے لئے

مشرقی و مغربی بنگال میں جس ذوق و شوق سے گائی جاتی تھیں اور اس کے سننے سے بنگالیوں کے گھروں اور دلوں میں معزول بادشاہ اودھ کی حالت پر جو ہمدردانہ جذبات ہوتے تھے، وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ اس زمانے میں بنگال میں بالعموم اور مشرقی بنگال میں خصوصیت سے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات البتہ اب سے مختلف تھے۔

اُردو زبان و ادب کا مختصر خاکہ مندرجہ بالا سطور میں کھینچنے کے بعد ہم اب اس پہلو سے بحث کرنا اور دکھانا چاہتے ہیں کہ اُردو کو تمام رائج الوقت دیسی زبانوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی قومی زبان بننے کے لئے کیوں حق مرجح حاصل ہے۔

(۱) اُردو ایک طرح سے کم و بیش ہندوستان کی لنگوا فرینکا (عام بولی) رہ چکی ہے، اور اب بھی ہے۔ ڈھاکہ سے کراچی تک اور لاہور سے تنجور تک یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس وجہ سے اور ہر ایک زبان سے اس کے سمجھنے والے تعداد میں زیادہ ہیں۔

(۲) اُردو انگریزی کی طرح ایک مخلوط اور مرکب زبان ہے جس میں موزوں تناسب کے ساتھ ہندو اور اسلامی عنصر دونوں پائے جاتے ہیں۔ اور یہ صفت ہر ہندوستانی انسٹی ٹیوشن کے لئے خواہ وہ معاشرتی ہو

یا مذہبی، ملکی ہو یا لسانی لازمی ہے۔

(۳) اس کے ماسوا یہ انگریزی کی طرح ایک علمی اور لوچدار زبان ہے، جو نہ واضعان حرف و نحو کے ہاتھوں مکلف بنائی گئی ہے نہ حریص واقفان علم اللسان نے اسے بطور خود ایجاد کیا ہے بلکہ اس کا وجود ضرورت واقعی اور ہندو مسلمانوں کے صدہا سال کے روزمرہ کاروبار پر مبنی ہے۔ اس کے لوچدار ہونے سے اس میں یہ قابلیت پیدا ہوگئی ہے کہ حسب ضرورت نئے اجزا اس میں شریک ہو سکتے ہیں اور اس اعتبار سے اس میں آئندہ غیر محدود ترقی کا سامان موجود ہے۔ آزاد بھی اس بات کو کس خوبصورتی سے کہتے ہیں:

"بیان ہائے مذکورۂ بالا سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی، فارسی آئی اُس سے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے، گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی (آب حیات ص ۲۱)

(۴) اسے کم و بیش برٹش گورنمنٹ ہند کی سرپرستی کا فخر حاصل رہ چکا ہے اور اب بھی ہے۔ مسٹر بیمس کے قول کے مطابق وہ "فاتح قوم کی مخصوص محبوبہ ہے" اور اسی لئے مذہب، قوم اور زبان کے خوفناک تنازعوں میں بھی جو اس وسیع برِ اعظم ہند میں روز بروز شدید ہوتے جاتے ہیں اسے آئندہ ترقی کے مواقع ہر دیگر ہندوستانی زبان سے زیادہ حاصل ہیں۔

(۵) اس کا رسم الخط ناگری بلکہ تمام دوسرے خطوں سے جو خالص ہندو دیسی زبانوں کے لئے مستعمل ہیں آسان تر ہے اور ہندو مسلمان دونوں صدیوں تک اسے استعمال کر چکے ہیں۔ اُردو رسم الخط ایک طرح سے مختصر نویسی کا نمونہ ہے اور تھوڑی سی مشق کے بعد تقریباً ہر شخص اُسے نہایت روانی کے ساتھ خوشخط لکھ سکتا ہے فارسی اُردو کا ہر ایک نستعلیق نوشتہ جو کسی استاد کا لکھا ہوا ہو فنِ خوشنویسی کا ایک نہایت دیدہ زیب اور پُرصنعت نمونہ ہوتا ہے، جس کی نظیر انسان کی نگاہ میں بمشکل آسکتی ہے۔

(۵)

لیکن بعض ایسے عالم بھی ہیں جو فارسی و عربی حروف تہجی کو علم اللسان کے اصول کے لحاظ سے اُردو کیلئے جس کا شمار حقیقتہً آریہ زبانوں میں ہوتا ہے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک نہایت مشہور بزرگ اور میرے عزیز اور پرانے دوست شمس العلماء ڈاکٹر سید علی بلگرامی بھی ہیں جنہوں نے اپنی مشہور و معروف کتاب

تمدن عرب کے معرکۃ الآرا مقدمہ میں اس کے متعلق حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے ہیں :

" پہلوی اور جدید فارسی کی طرح اُردو بھی ان بدنصیب زبانوں میں ہے جن کے حروف ہجا اجنبی اقوام کے بنائے ہوئے ہیں اور یہ بات قدرتاً اس زبان کے خواص کے خلاف ہے اور اس سے تمام اصوات بھی ادا نہیں ہوتیں، اردو حروف کثیر الاصوات ہونے کے ساتھ ہی نامکمل بھی ہے۔ کئی حروف سے یکساں آواز پیدا ہوتی ہے اس پر بھی بہت سی آواز ظاہر نہیں ہوتیں۔ آریہ زبانوں میں یہ ایک مفید امتیاز ہے کہ حرکات کا اظہار حرفوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ حالانکہ سمتقطی زبانوں میں جداگانہ علامات زیر، زبر، پیش، اور تنوین وغیرہ سے ایسا ہوتا ہے اس سے ثابت ہے کہ آریہ زبان کا پڑھنا سمتقطی زبان سے زیادہ آسان ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی کی سی زبان میں بلا صرف و نحو کی قابلیت کے ایک فقرہ بھی صحیح پڑھنا ممکن نہیں۔ حالانکہ ایک نوآموز بھی سنسکرت، یونانی، اور لاطینی کے حروف ہجا سیکھ کر اُن کا ایک ایک جملہ پڑھ سکتا ہے باوجودیکہ وہ اس کے معنی بھی نہ سمجھتا ہو۔ یہ بات بہ آسانی محسوس ہو سکتی ہے کہ غیر طبعی طرز تحریر نے اُردو کی ضروریات کو غیر معمولی طور پر کس طرح دشوار بنا دیا ہے اور اس بات سے کسی کو متعجب نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے بچوں کو اپنی مادری زبان روانی کے ساتھ پڑھنے کے لئے دو سال سے زیادہ لگ جاتے ہیں۔ اُردو پڑھ لینے کی یہ مشکل مسلمانوں کی تعلیم کا سب سے بڑا سبب رہ چکی ہے۔ اور اب بھی ہے[1]۔" (تمدن عرب ص ۲۳-۶۶)

اگر اُردو علم ہجا واقعی ایسا ہی ناقص ہے اور اسلامی تعلیم کے فقدان کا یہی سب سے بھاری سبب ہے جیسا کہ ہمارے شمس العلما موصوف فرماتے ہیں، تو میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے مسلمان برادران ملک اس کو جس قدر جلد ترک کر سکیں کر دیں اور کوئی دوسرا رسم الخط جو موزوں تر اور زبان کی طبعی ضرورت کے لحاظ کر مفید اور جس کا پڑھنا اور حاصل کرنا زیادہ سہولت آمیز ہو، اختیار کر لیں۔ بایں ہمہ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شمس العلما جن کی علم اللسان کی صحیح واقفیت محتاج تصریح نہیں، ان کے یہ خیالات انگریزی کے حروف و اصوات پر بھی بجنسہٖ مساوی عاید ہوتے ہیں جس کے ساتھ جیسا کہ میں بہ تکرار بتا چکا ہوں اُردو کی پہلو سے ایک حیرت خیز مماثلت رکھتی ہے۔ انگریزی زبان کے حروف اصوات اس درجہ ناقص اور

---

[1] باوجود تلاش "تمدن عرب" نہ مل سکی۔ لہٰذا یہاں انگریزی اقتباس ہی کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ (مترجم)

بے ترتیب واقع ہوئے ہیں کہ میرے ایک جرمن پروفیسر ہمیشہ ان کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے اور اس کے باوجود اس کے بولنے اور لکھنے والے سنسکرت زبان سے تعداد میں کہیں زیادہ ہیں۔ حالانکہ موخرالذکر اپنے قواعد صرف ونحو اور اصوات کے اعتبار سے دنیا کی مکمل ترین زبان خیال کی جاتی ہے۔ حکومتوں کی طرح زبانوں کی کامیابی خیالی تکمیل پر نہیں بلکہ عملی فوائد پر منحصر ہوتی ہے ورنہ سنسکرت یا یونانی اقوامِ عالم کی زبان ہوتی اور افلاطون کی کتاب "ری پبلک"[1] یا مور کی تصنیف "اٹوپیا" تمام عالم کی سلطنتوں کی بنا قرار دی جاتی۔ جبتک عوام اُردو اور انگریزی کا لکھنا پڑھنا آسان اور کار آمد پائیں گے اور وہ یقیناً سنسکرت کے مقابلے میں مرجّح طور پر انہیں حاصل کریں گے کیونکہ سنسکرت خیالی طور پر مکمل ہونے کے باوجود اس وقت تک ناقابلِ حصول ہے تاوقتیکہ ڈاکٹر آٹو شریڈر (ڈائرکٹر آڈیر لائبریری مدراس) کے ظاہر کردہ خیالات کے بموجب اُسے سہولت آمیز نہ بنادیا جائے۔ اُردو کے کار آمد ہونے اور اُس کی نفاست کے متعلق میرے خیالات کی تائید مسٹر جان بیمس کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

"مختصر یہ ہے کہ مقامی تُعد کے رفع اور مختلف اقطاعِ ملک کے تعلقات زیادہ تر آزاد و مستقل ہو جانے پر یہ صاف وسادہ، خوش وضع، لوچدار اور سہل الاظہار زبان جو اب بھی اکثر حصص ہند کی لنگوا فرینکا اور حکمران قوم کی اس لحاظ سے موردِ عنایات ہے کہ کئی ضروری حیثیات سے ان کی خاص زبان سے مشابہ ہے بلاشبہ اگر سب نہیں تو بہت سی مختص المقام زبانوں کی جگہ لے لیگی اور تمام ہندوستان میں ایک مشترک اردو ملکی ذریعۂ تقریر رائج کر دیگی۔ گویا عام ہند کی انگریزی ہو جائے گی۔"

میں بالکل شروع میں انگریزی زبان کے ہندوستان کی قومی زبان ہونے پر پسندیدگی ظاہر کر چکا ہوں۔ لیکن اگر اُردو یا ہندوستانی "عالم ہند کی انگریزی" بن جائے جیسا کہ مسٹر بیمس ارشاد فرماتے ہیں، تو بھی گویا وہی بات ہوئی۔

ذیل میں اُنہیں آراء کی تائید مزید پیرس کے پروفیسر گارسین ڈی ٹاسی کی جانب سے جو اوّل الذکر سے بھی زیادہ مستند ہے، ملاحظہ ہو:

---

[1] ان دونوں کتابوں میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ بہترین حکومت کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ لیکن بقول فاضل مضمون نگار کے محض خیال ہی خیال ہے۔ عملی طور پر اُن سے فائدہ اٹھانا کم از کم ابھی تک غیر ممکن رہا ہے۔ (مترجم)

"اول تو یہ کہ مستعمل زبانوں کی حیثیت سے ہندوستانی کو تمام ایشیا میں فصاحت و شستگی کے باعث وہ تفوق حاصل ہے، جو کسی اور زبان کو نصیب نہیں۔ ایک عام مثل کے مطابق مسلمان عربی کو تمام اسلامی مشرقی زبانوں کی بنیاد اور مکمل ترین زبان اور ترکی کو علوم و فنون اور تفریحی لٹریچر کا مجموعہ اور فارسی کو شاعری اور تاریخ کا گنجینہ سمجھتے ہیں۔ لیکن جس زبان میں انسانی سوسائٹی کی عام ضروریات کے اعتبار سے ان تینوں زبانوں کی خوبیوں کو یکجا کرنے کی قابلیت موجود ہے، وہ ہندوستانی ہے، جو اُن کے لئے روز مرہ کی بولی ہونے اور علمی پہلو سے ہر طرح قابل ترجیح ہے۔ درحقیقت ہندوستان کی یہ عام بول چال اظہار خیالات کا بہترین ذریعہ اور نہایت شیریں زبان ہے اور ساتھ ہی بالعموم مستعمل ہونے سے اس کا جاننا حد درجہ کار آمد ہے۔ اور جب سے اس نے محاکم و عدالت میں دفتری زبان کی حیثیت سے فارسی کی جگہ پائی ہے اُس وقت سے صوبجات شمال اور شمال و مغرب میں اسے خاص وقعت حاصل ہو گئی ہے۔"

پروفیسر گیسن ڈی تاسی آگے چلکر مندرجہ ذیل خیالات خاص طور سے اُردو اور فارسی کے رسم الخط کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"ہندو فارسی رسم الخط کے شاکی ہیں اور ناگری کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ تعصب سے آدمی ایسا ہی اندھا ہو گا، جو فارسی کے رسم الخط بلکہ شکستہ تحریر پر بھی جس کا پڑھنا نہایت دشوار ہوتا ہے بدہیئت مروجہ ناگری کا کیتھی کو (میرا مطلب یہاں دیوناگری کے خوبصورت حرفوں سے نہیں) ترجیح دے گا۔"

یہ خیالات ہیں دو مقتدر عالموں کے جن میں سے ایک انگریز اور دوسرا فرانسیسی ہے ہندوستانی زبان اور ہندوستان میں اس کے اغلب مستقبل کے بارے میں۔ اس پر بھی ڈاکٹر آٹو شریڈر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ انڈین ریویو بابت جون ۱۹۰۹ء کے صفحات میں اسی مسئلہ پر بحث کر کے ان الفاظ کے ساتھ اُردو کے ہندوستان کی لنگوا فرینکا ہونے کے دعاوی کا فیصلہ کرتے ہیں:

"آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اُردو اس قابل رحم حالت کا آئینہ ہے، جو

ہندوستان پر طاری ہے۔ اُس کے اختیار کرنے سے آپ جلدتر زوال پذیر ہو سکتے ہیں لیکن اپنی قوم کو عروج پر نہیں پہنچا سکتے۔"

(۶)

کیوں؟ یقیناً اس وجہ سے نہیں کہ یہ ایک مخلوط زبان ہے۔ نہ اس لئے کہ یہ ایک سہل الاصول علمی زبان ہے جب کہ خود ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ایک انگریز بھی نسبتاً بہت قلیل عرصہ میں اسے سیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ برخلاف اس کے اس زبان کے مخلوط اور لچکدار الفاظ اس کے سہل قواعد صرف و نحو گو یا جن باتوں میں اُردو کو انگریزی کے ساتھ قریبی مشابہت ہے جس کے خود ڈاکٹر صاحب معترف ہیں یہی اسباب ہیں جن کی بنیاد پر اس کے "لنگوا فرنکا" بلکہ ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی سفارش کی ہے اب رہا اس کا باعث اس کے سمٹقلی اجزا رہیں؟ مگر یہ سمٹقلی عنصر بھی اس میں صدیوں سے ہیں اور اس کا اُردو سے خارج کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح انگریزی سے نارمن فرنچ الفاظ کا۔ اس کا وجود ہی اس کی اختلاط پسند طبیعت پر دال ہے اور اگر چہ صحیح غور و فکر سے فارسی و عربی عنصر کسی قدر کم ہو سکتا ہے جیسے کہ گذشتہ سو سال کے اندر نارمن فرنچ انگریزی سے کم ہو چکا ہے۔ تاہم اُردو بغیر سمٹقلی عنصر ہندوستان کی قومی زبان اسی طرح نہیں ہو سکتی جس طرح ہندوستان میں بلا اسلامی آبادی کے باضابطہ شمول و اشتراک کے ایک متحدہ قومیت نہیں قایم کی جا سکتی۔ یا اس کی وجہ موجودہ علم ادب اُردو کی پست حالت ہے؟ اس میں صحت کی بہت گنجایش ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا نقص ہے جس کا علاج اس صورت میں بسہولت ہو سکتا ہے کہ اُردو ایک دفعہ ملک کی قومی زبان تسلیم کر لی جائے اور تعلیم یافتہ ہندو مسلمان اور پارسی عیسائی اپنی روحانی ضروریات اور مباحث اخلاق کے لئے اسے ذریعۂ اظہار قرار دے دیں۔ اس نقص کی وجہ یہی ہے کہ اُردو اب تک اپنی ابتدائی حالت میں ہے یا یوں کہو کہ عہد طفولیت کے خوشنما لباس میں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے حقیقی محافظوں اور سرپرستوں نے باستثنا چند جدید سائنس اور علوم کی طرف رخ نہیں کیا اور اس لئے اُردو ملک کی دیگر بڑی بڑی زبانوں از قسم بنگالی، مرہٹی، گجراتی کے دوش بدوش نہیں چل سکتی۔ اس بات سے چاہے کوئی متحیر کیوں نہ ہو تاہم یہ بالکل سچ ہے کہ ہندوستان کی کسی زبان کا علم ادب جس میں اُردو بھی شامل ہے صرف انگریزی کے ذریعہ سے آگے ترقی کر کے تکمیل کے بلند تر درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یعنی یورپ کے جدید خیالات، جدید نظاریے جو طبع

علوم، جدید فلسفہ، جدید تجارت اور جدید مصنوعات کے اجتماع ہے۔ اور ان چیزوں پر ہمیں ہندوستان میں دسترس حاصل کرنا کلیتہً زبان شاہنشاہی کے توسط سے ممکن ہو سکتا ہے۔ اگرچہ دیگر دیسی زبانوں نے جن کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں اپنی ترقی و اصلاح کی قابلیت دکھائی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مغربی خیالات اور کمالات کو اپنے آپ میں جذب اور انہیں اپنی مخصوص زبان کی خصوصیات اور نیز اپنے قومی جذبات قائم رکھ کر منتقل کر لینے میں اُردو سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ علم ادب کی ترقی کے کم سے کم تین مدارج ہیں، ترجمہ، تالیف اور تصنیف اور جس طرح تالیف ترجمہ سے بہتر ہوتی ہے اسی طرح تصنیف ترجمہ اور تالیف دونوں سے رتبہ میں بلند ہوتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اُردو نے اس وقت تک ترجمہ کی منزل باقاعدہ طور پر بمشکل طے کی ہوگی۔ جو کتابیں اب تک اُردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں وہ زیادہ تر انگریزی کے بے وقعت اور مبتذل ناول اور قصے ہیں اور میں اس خیال سے لرزہ براندام ہو جاتا ہوں کہ آخر اس قسم کے تراجم کے مطالعہ سے لڑکے اور لڑکیوں کے کم تجربہ اور اثر پذیر قلوب کی کیا حالت ہوتی ہوگی جنہیں نفیس اور سریع الہضم غذا کے نہ ہونے سے بھوسی اور بھُس پر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ اس سے تو یہ کہیں بہتر ہوتا کہ ہم اپنی قدیم عزیز کتابوں الف لیلہ اور باغ و بہار سے تجدید تعلقات کر لیتے کہ اشتعال انگیز اور سم آلود فضلہ جو کباب اور پلاؤ کی شکل میں دستر خوان پر چُنا گیا ہے۔ زہر مار نگلنا پڑتا۔

نظر بریں اس بات کی ضرورت ہے کہ انگریزی کی تمام مفید کتب جو تاریخ و سائنس و فلسفہ پر ہوں اور بہترین ناول بھی تالیف کے ذریعہ جیسا کہ بنگال میں ۵۰ سال پہلے کیا جا چکا ہے، فصیح و عام فہم اردو میں لے جاویں اور اُردو کو بھی جلد یہ فخر کرنے کا موقع مل جائے گا کہ اس میں بھی ودیا ساگر سا فاضل، مادھو سُدن سا شاعر، بنکم چندر سا ناول نویس اور رومیش چندر دت سا مورخ موجود ہے۔ ہندوستانی لٹریچر میں اپنی طرز کی بہترین کتاب ڈاکٹر سید علی بلگرامی (مرحوم) کی مشہور تمدن عرب ہے، جو ڈاکٹر لی بان کی فرنچ تالیف لا سویلزیشن ڈی عربس کا قابل قدر ترجمہ ہے۔ اگر اس قسم کی کتابوں میں بسرعت اضافہ ہوتا رہتا تو ہندوستانی علم ادب یقینی طور سے چند سال میں خاصی ترقی کر جاتا۔

(۷)

لیکن باوجود اپنی مخصوص لسانی صفات اور معاشرتی و ملکی فوائد کے جو واضح طور پر اُسے حاصل ہیں۔

اُردو، کبھی ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی، تاوقتیکہ اس کے قدرتی محافظ اور موروثی نگران کار اُن صفات اور فوائد کا استعمال ٹھیک طریقہ اور صحیح طور پر نہ کریں۔ ملکی سرپرستی خواہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو کسی زبان کی ترقی پر اس وقت تک گہرا اثر نہیں ڈال سکتی تاوقتیکہ وہ قوم یا فرقہ جو اسے برتتا ہے گورنمنٹ کا ساتھ نہ دے۔ یہ ایک پرانی مثل ہے کہ کسی زبان کی ترقی یا کسی قوم کا عروج جو عموماً دوش بدوش ہوا کرتے ہیں خارجی اثرات کے بہ نسبت فی الحقیقت زیادہ تر ذاتی مساعی سے ترقی پذیر اور مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ معمولاً قدرتی نشو و نما کا مادّہ دونوں میں موجود ہوتا ہے لیکن اُس کے اجزائے لاتجزّی ہی وہ چیز ہیں جو ان کی ترقی کو تیز یا سست کر سکتے ہیں۔ ان اجزا کے ہاتھوں ہندوستانی کی نشو و نما صرف اسی حالت میں بڑھ سکتی ہے کہ اُن کی کوششیں عاقلانہ اور اُن اصول کے ساتھ ہوں، جو بالعموم تمام زبانوں اور بالخصوص ہندوستانی کے عروج پر حاوی سمجھے جا سکتے ہیں۔ وہ اصول کون سے ہیں، جو ہندوستانی کی آیندہ ترقی اور مستقل عروج کو مجتمع کر کے اس کے ہندوستان کی قومی زبان بنائے جانے کی صورت پیدا کر سکتے ہیں۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ہندوستانی کے جزوِ غالب زیادہ تر ہندی، فارسی اور عربی ہیں۔ اس مشابہت کو جو اُسے انگریزی کے ساتھ ہے، پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں ہندی کا وہی درجہ ہے، جو اینگلو سکیسن کا انگریزی میں، اور فارسی مع عربی متعلقات کے بمنزلہ نارمن فرنچ کے ہے اور بعینہٖ جیسے کہ انگریزی نہ صرف جزائر انگلشیہ کی بلکہ گریٹ برٹن ماورای البحر کی بھی قومی زبان بن گئی ہے۔ جہاں کے لوگ اپنے جرمنی النسل اجداد کے خالص اینگلو سکیسن الفاظ اور جملوں کے استعمال سے انہیں نظموں کا مطالعہ کرتے اور اُنہیں گیتوں کو گاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستانی اس طریقے سے ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے کہ اس میں حتی الوسع قدیم ہندی کلاسیکل الفاظ استعمال کئے جائیں، جن سے برج بھاشا یا قدیم مغربی ہندی بافراط معمور رہ چکی ہے۔ اس کے بعد ہندوستانی آبادی کا کثیر حصّہ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان اسے سمجھنے لگے گا اور اس کے بغیر یہ امر ناممکن ہے۔ بیشک فارسی و عربی کو اپنا استحقاقی حصّہ پانا چاہیے کیونکہ یہ اُسی کُل کا ایک لازمی جز ہیں۔ لیکن جہاں ان کی شرکت اعتدال سے بڑھ جاتی ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرز تحریر نہایت دقیق اور ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ مسلّم امر ہے کہ کسی زبان یا علم ادب کی ترقی اُس کے سلیس، سہل اور قابلِ فہم ہونے کے تناسب ہوتی ہے۔ دوسرا نکتہ جو ہندوستانی ادب کے ترقی خواہوں کو دلنشیں رکھنا چاہیے یہ ہے کہ اُس میں اُسی مرز بوم کے خواص پیدا کئے جائیں۔ یعنی اُسی کی زمین، درختوں، پھولوں، کیڑوں، جانوروں، ندیوں، پہاڑوں، جرگوں، قوموں، مردوں اور عورتوں کا ذکر ہو۔ بقدرِ خواہش عربی اور فارسی کی تحصیل

میں کوئی حرج نہیں لیکن ہندوستانی مصنف یا شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے خیالات، استعارات اور تلمیحات، زیادہ ہندوستان کی زمین اور یہاں کے باشندوں سے اخذ کئے جائیں اور حتی الوسع انہیں فارس و عرب کے تشبیہات وغیرہ پر ترجیح دی جائے ورنہ علم و ادب کم و بیش غیر ملکی سمجھا جائے گا اور اُس کا اثر اُن کثیر التعداد ناظرین کے قلوب پر مطلق نہ پڑ سکے گا جن کے لئے وہ حقیقت میں وجود میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندوستانی شاعر یا ناولسٹ پر فرض ہے کہ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئن کا تعلق اپنے وطن کی تاریخ سے جس قدر قریبی دکھا سکے دکھائے نہ کہ غیر ممالک کی تاریخ سے گو یہ ممالک مذہب و عقائد کے رُو سے ایک ہوں۔ بلاشبہ مذہب اقوام کو مربوط کرنے کے لئے ایک مضبوط بندش ہے لیکن ہم وطنی کا شیرازہ زیادہ تر مضبوط، مؤثر اور نیچرل ہوتا ہے اور مشترکہ حکومت کے تاثرات قومیت سے بھی زیادہ گہرے اور استوار ہوتے ہیں۔ سوئزرلینڈ والے جن کا حُبِّ وطن مثالی طور پر مشہور ہے اس میں تین قومیں شامل ہیں۔ جرمن، فرانسیسی اور اطالی، یہ لوگ جب اپنے اپنے ملکوں میں رہتے تھے، تو ان کے باہمی تعلقات خوشگوار نہ تھے۔ اس کے سوا یہ لوگ دو مختلف مذہبی عقاید کے پیرو ہیں یعنی رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ اور از منہ گذشتہ میں ان دونوں میں باہمی میل جول اتنا بھی نہ تھا جتنا آج کل ہمارے ہندوستان کے بعض مذاہب میں ہے۔ انگلینڈ اور انگلش قوم کو دیکھئے، فتوحات کے بعد کیا سیکسن اور نارمن پشتہا پشت تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہیں رہے۔ اس کے باوصف بتدریج انہوں نے سابقہ دشمنی اور بُغض کی باتیں بُھلادی ہیں اور اب ایک دوسرے میں ملنے کے بعد وہ دنیا کی قوی ترین اور محب الوطن قوم بن گئے ہیں ....

زمانہ حال کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال مسلمان بزرگ نے جو سنسکرت کے فاضل ہونے کے ماسوا ہندوؤں کی قدیم تاریخ اور علم ادب سے اپنے دیگر ہم مذہبوں سے زیادہ ماہر ہیں ایک مرتبہ ایک دوستانہ و بے تکلفانہ گفتگو کے دوران میں مجھ سے جواباً کہا تھا کہ وہ اپنے ہندی النسل ہونے پر بہ نسبت عربی النسل ہونے کے زیادہ نازاں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی رگوں میں ہندی خون موجود ہے، خدا کا شکر ہے کہ تعلیم یافتہ و مہذب مسلمان ہندوستان میں ایسے اور بھی موجود ہیں، جو مساوی طور پر ہندو نسل ہونے پر فخر اور مادرِ ہند کے ساتھ عزت و محبت کے جذبات دلوں کے اندر پیدا کرنے میں ہندوؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ مسٹر علی امام پریسیڈنٹ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنی صادق حب الوطنی کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

"ہم تعلیم یافتہ مسلمانانِ ہند اپنے مولد سے کچھ کم محبت نہیں کرتے ۔ ہمارے تعلقات صدہا سال کے قیام سے مضبوط ہو گئے ہیں ہم مادرِ وطن کی محبت و وقعت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں ۔ ہماری تمام امیدیں اور حوصلے عام ترقی سے وابستہ ہیں جس سے اُس کی تمام اولاد کو بلا کسی ادنیٰ تفریق کے حفاظت و ترجیح حاصل ہو ۔"

(۸)

آؤ ہم سب مل کر ان خیالات پر تہہ دل سے آمین کہیں ۔ اگر تمام تعلیم یافتہ مسلمان مسٹر علی امام کے خیالات اور امیدوں میں جو یہاں درج کئے اور تھوڑے ہی دن ہوئے انڈین یونین سوسائٹی آف لنڈن کے سامنے دُہرائے جا چکے ہیں شریک ہوں اور ہندوستانی زبان کے ذریعہ اُن کے اظہار کی کوشش کریں ، تو اس کی شان اُس الزام سے بالا ہو جائے گی جو اس پر آئے دن ہوتے رہتے ہیں کہ نہ تو اس کا لٹریچر قدر کے لائق ہے نہ آج کل کی ضرورت پورا کرنے کی قابلیت اس میں پیدا کی گئی ہے یا یہ کہ اس میں دربار دہلی و لکھنؤ کی دقیانوسی روائتیں اس درجہ بھری ہوئی ہیں کہ ہندوستان کی نئی پود کے طبائع پر کامیابی کے ساتھ وہ موثر نہیں ہو سکتا ۔ دربار کی آب و ہوا کبھی قومی علم ادب کی آزادانہ نشو ونما کے لئے دنیا میں موافق ثابت نہیں ہوئی ۔ خاص کر اس صورت میں کہ درباری زبان بھی غیر ملکی ہو جیسا کہ دلی و لکھنؤ کے درباروں میں بلا شبہ فارسی تھی ۔

لاکلام دہلی و لکھنؤ کے شعرا نے اعلیٰ درجہ کی فارسیانہ اُردو لکھی ہے جسے صرف وہ خود اور اُن کے شاگرد اور وہ دربار جس سے ان کا تعلق تھا حقیقی معنوں میں سمجھتے اور ان کا لطف اٹھاتے تھے ۔ وہ نہایت پُر تصنع طرز تحریر تھی ، جو شاید اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ناگزیر تھی لیکن اب آج کل وہ بالکل بے وقت کی راگنی ہے اور اگر اُردو ادب کو نئے اور ترقی یافتہ طریقوں پر بڑھنا ہے ، تو اُسے ترک کر دینا چاہیئے اور ہندوستانی کو تمام ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لئے اُس میں ہند کے متعلق عمیق جذبات اور اعلیٰ درجہ کے خیالات پیدا کرنا چاہیئے ...... اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستانی اہل قلم کو سب سے پہلے قومی و مذہبی تعصبات سے کنارہ کر لینا چاہیئے ...... ہندوستانی لٹریچر کی خوش قسمتی سے گذشتہ صدی کے دوران میں چند ایسے مصنفین گزر چکے ہیں جنھوں نے نئی زمینوں میں قلم رانی کر کے راستہ بتا دیا ہے جس پر چل کر دوسرے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ یہ مصنفین اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں

جو ہندوستانی لٹریچر کا پانچواں اور سب سے آخری دور کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلا اور سب سے افضل نام سرسید احمد خاں (دہلی و علی گڑھ) کا ہے جنہیں مذہبی، معاشرتی، سیاسی و علمی ریفارمر کی حیثیت سے شمالی ہند کے مسلمانوں میں وہی منزلت حاصل ہے، جو راجہ رام موہن رائے کو بنگال میں، بلکہ میں کہوں گا کہ ہندوستان بھر کے ہندوؤں میں۔ یہ بات نہایت دلچسپ ہے کہ سرسید احمد خاں نے جب وہ بمشکل ۱۲-۱۳ برس کے بچوں گے اس ہندو ریفارمر کی ایک جھلک اُس وقت دیکھی تھی جب موخر الذکر بعض ملکی معاملات کی بنا پر ۱۵ نومبر ۱۸۳۰ء کو یورپ جانے کے پیشتر اکبر شاہ ثانی سے ملنے دہلی گئے تھے۔ رام موہن رائے جو ایک مسلمہ باعظمت ہندو مصلح قوم اور سنسکرت کے عالم تھے فارسی و عربی کے بھی کامل تھے اور حلقہ ہائے بغداد و نیشاپور کے نازک فن منطق وغیرہ میں اس درجہ دستگاہ رکھتے تھے کہ ان کے مسلمان احباب جن کی تعداد بہت تھی، انہیں "زبردست مولوی" کہا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کئی رسالے وحدت الوجود کے اثبات میں بزبان فارسی مرتب کئے تھے جن میں سے "تحفۃ الموحدین" بہت مشہور ہے۔ لیکن اسی سلسلہ میں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انہوں نے ان میں سے بعض رسالوں کو ہندوستانی میں بھی شائع کیا تھا۔ گویا سرسید احمد خاں کے دوش بدوش رام موہن رائے کا بھی انصافاً ان لوگوں میں شمار ہو سکتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے سنجیدہ مسائل پر ہندوستانی زبان میں لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا ہے۔

(۹)

سید احمد خاں کے رفیق اور سوانح نگار مولوی الطاف حسین حالؔی کوئی معمولی نثار و شاعر نہیں۔ اس کی تصدیق ان کی متعدد تصانیف سے پوری پوری ہوتی ہے۔ فی زمانہ وہ "علی گڈھ اسکول" کے سلسلہ سرگروہ ہیں۔ مولوی نذیر احمد اور مولوی شبلی کا بھی تعلق اسی گروہ سے ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی دولت آصفیہ کے نمکخوار رہ چکے ہیں۔ ناولسٹوں کے زمرہ میں سرشاؔر اور شرؔر بہت مشہور ہیں۔ لیکن میں ان تصنیفات سے اتنی کم واقفیت رکھتا ہوں کہ کوئی رائے اُن کے متعلق نہیں قائم کر سکتا۔ لیکن سید احمد خاں کے بعد جو ہندوستانی مصنف اپنی وسیع الخیالی اور سہل و آسان طرز تحریر کے ذریعہ سب سے زیادہ میری توجہ کو اپنی طرف کھینچتا ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد ہیں، جن کی دو کتابیں آبحیات اور دربار اکبری ہندوستان میں منجملہ تمام ہندوستانی تصانیف کے نہایت متداول ہیں۔ کتنی تاسف خیز بات ہے کہ ایسے عالی دماغ اور روشن خیال مصنف نے اس قدر جلد اس فرق کو اٹھا دیا، جو عقل و حواس اور مجنونیت کے درمیان حائل

سمجھا جاتا ہے اور اب اُس وقت سے اب تک ان کے بقیہ زندگی کے ایام بالکل بیکار گذر رہے ہیں۔ لیکن اسی شہر میں جہاں محمد حسین آزاد عربی و فارسی ادب کے پروفیسر تھے یعنی لاہور میں ہمارے لئے ڈاکٹر محمد اقبال پی۔ ایچ۔ ڈی ایسا نوجوان موجود ہے، جو علمی شہرت کے مدارج طے کر رہا ہے۔ جن کی مختصر لیکن شیریں نظم "ہندوستان ہمارا" تمام ہندوستان میں نہایت کیفیت انگیز چیز سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اس مضمون کو اُسی حُب وطن کے راگ کے چند اشعار نقل کر کے اس امید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ زمانۂ حال کے دوسرے ہندوستانی شعراء بھی انہیں کے نقش قدم پہ چلنے اور اپنے اشعار میں یہی کیفیت پیدا کرنے کی سعی کریں گے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہیں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آب رود گنگا! وہ دن ہے یاد تجھ کو — اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

— نشی کانت چٹوپادھیا، مترجمہ سید محمد فاروق (مارچ و جولائی ۱۹۱۲ء)

بہار یونیورسٹی اور انجمن ترقی اُردو بہار

مسٹر آر نتھن سی ایس آئی کی خدمت حاصل کرنے سے گورنمنٹ بہار کی غرض یہ ہے کہ صوبہ بہار کی یونیورسٹی کرنے کے لئے مسودہ ایک اسکیم مرتب کریں ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کے ساتھ ہمیں انجمن ترقی اردوئے بہار کے قائم ہونے کی بھی مسرت خیز خبر آئی ہے۔ — ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۳ء)

اُردو میں انگریزی الفاظ

تمام اُردو اخبارات میں کم وبیش انگریزی الفاظ کا استعمال رائج ہوگیا ہے اور اس صورت میں اُردو زبان پر جو اثر پڑتا ہے۔ وہ ترقی خواہان زبان اُردو سے مخفی نہیں۔

ہمارے صوبہ برہما میں چونکہ آج کل اُردو زبان سرعت سے ترقی کر رہی ہے اور اس کو بطور علم کے نہایت محنت سے یہاں حاصل کیا جا رہا ہے اس لئے یہاں کے ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی اُردو اخبار آہی جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمان باشندے اردو پرچوں کو نہایت شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ مگر ان لوگوں میں عموماً یہ شکایت پائی جاتی ہے کہ انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال گویا اُن کے لئے اُردو عبارت کے سمجھنے میں سخت رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔

مجھے مدت سے اس کا خیال تھا اور کسی مناسب موقع کا انتظار تھا کہ اپنے خیالات کو ظاہر کروں کہ "روزانہ پیسہ اخبار" مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۱ء پر نظر پڑی جس میں ایک مضمون بعنوان انگریزی الفاظ کا استعمال شائع ہوا ہے۔ اس کے دیکھنے سے مجھے نہایت خوشی ہوئی اور میں صاحب مضمون سے اس بارے میں بالکل متفق ہوا۔ لیکن مجھے مدیر "پیسہ اخبار" معاف فرمائیں کہ میں ان کے جواب سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ وہ حسب ذیل رقمطراز ہیں:

"مجبوراً اُردو اخبارات میں انگریزی الفاظ واصطلاحات درج کرنی پڑ جاتی ہیں۔ مگر جو صاحب انگریزی داں نہ ہوں وہ کارخانہ پیسہ اخبار سے کتاب ضروری انگریزی الفاظ منگوا کر اس میں سے تمام الفاظ کے معنی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ تمام انگریزی الفاظ جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں اس کتاب میں بطور لغات الجد کے قاعدے سے درج ہیں۔"

مثلاً آپ نے آفینسو (offensive) اور ڈیفینسو (Defensive) دو لفظ پیش کئے ہیں اب کتاب کے صفحہ ۶ پر ردیف الف میں "آفینسو" درج ہے جس کے سامنے لکھا ہے "وہ جنگ یا امر جس میں پیش دستی کی جائے۔" اور "ڈی فنسو" کے سامنے صفحہ ۱۶ پر ردیف دال میں درج ہے "وہ لڑائی یا فعل جو اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لئے کیا جائے۔" ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کونسی ایسی مجبوری تھی کہ بجنسہ انگریزی لفظ لکھ دیا

گیا۔ حالانکہ اس کا ترجمہ اُردو میں بہ آسانی ادا ہو گیا۔

چند روز ہوئے کہ ہمیں ایک نہایت بارسوخ اور ذی علم صاحب سے (جو خاص شہر مانڈلے کے باشندے ہیں) ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ دوران گفتگو میں اردو اخبارات کی خریداری کی بابت سفارش کی گئی تو جواب ملا کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اُردو اخبارات کا برابر مطالعہ کیا کریں لیکن عبارت میں انگریزی الفاظ کا حائل ہونا اخبار بینی کے لطف کو زائل کر دیتا ہے۔

یہ امر قابل قدر و باعث مسرت ہے کہ بہت سے انگریزی داں اُردو کے مصنف بے ضرورت انگریزی الفاظ کو اردو عبارت میں داخل کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک معزز خاتون کے خیالات پیش کرتا ہوں۔

"ہماری بیدار مغز، علم دوست بہی خواہ قوم اور نہایت قابل بہن جناب خجستہ اختر بانو صاحبہ نے ہنری وُوڈ کے ایک اخلاقی ناول کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کیا ہے، جس کا نام "آئینۂ عبرت" ہے ۔۔۔۔ ترجمہ سلیس زبان میں ہے اور اس بات کا حتی الوسع خیال رکھا گیا ہے کہ انگریزی الفاظ شامل نہ کئے جائیں۔ یہ واقعی خوبی کی بات ہے کیونکہ آج کل مرد بھی بمشکل اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ رسالے اور ناول غیر ضروری انگریزی الفاظ سے خلط ملط ہو کر عجیب صورت پیدا کر دیتے ہیں، جہاں ضرورت ہو اور اُردو، فارسی، عربی الفاظ نہ ملتے ہوں تو اور بات ہے۔ لیکن مشیخت جتانے کے لئے تو بہت ہی غیر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ زبان کا لطف جاتا رہتا ہے۔ بعض مشرقی علوم کے جاننے والے، جن کو انگریزی زبان میں دخل نہیں ہے جب انگریزی لفظوں سے اپنی عبارت کو رنگتے ہیں تب تو سبحان اللہ ایسی وضع پیدا ہوتی ہے کہ بے اختیار ہنسی کا خیال آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ کاش تیتر بٹیر نہ بنے ہوتے۔ بطور مثال ایک جملہ ہدیۂ ناظرین کرتی ہوں۔ ایک صاحب اثنائے گفتگو میں فرماتے ہیں۔ "چلڈرن ونڈو میں سے پیپ کرتے ہیں اُردو کا خدا حافظ ہے۔ لیکن انگریزی کا حشر بھی تو ملاحظہ ہو، یعنی اُن کا مطلب ہے کہ بچے کھڑکی (یا دریچہ) سے جھانکتے ہیں" ۔ ایسی زبان سے کس کو نفع ہو سکتا ہے۔ بیشک گفتگو میں حد درجہ کو یہ بات پہنچتی ہے لیکن تحریر میں بھی بعض حضرات غضب ڈھاتے ہیں۔ ویسی عبارت بہت کریہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ حاکم کا اثر پڑنا بدیہی بات ہے، مگر

"کچھ تو پرہیز ہو"

رسالہ زمانہ (دسمبر ۱۹۰۴ء) میں باستانی روایات کے عنوان سے ایک مضمون چھپا تھا، اس میں مضمون نگار صاحب نے تحریر کیا تھا کہ :

"بیچاری اردو زبان تو ابتدا ہی سے مرکب و مخلوط ہے اب مزید آمیزش سے اُس میں بہت تصرف روا رکھا گیا ہے۔ غدر سے پہلے دہلی کے مستند اساتذہ اس ترکیب مجلس کو مزاحاً گذا ابر کہتے تھے اور شاید صرف یہی ایک مصنوعی لفظ انگریزی کا اس وقت کے نامی عالم عربی و فارسی کے جانتے تھے۔ التباس زبان کے اندیشہ کے علاوہ اکثر مقدس اہل اسلام اس زمانہ کے متنفر سے بھی بہت پرہیز کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض مسائل ملی میں بھی اختلاف تھا جو اب بھی ہے اور رہے گا ...... اُردو زبان میں انگریزی الفاظ کا امتزاج ناپسند تھا۔ غالب نے مرشد زادہ آفاق مرزا جواں بخت کی شادی کے منظوم سہرے میں ایک لفظ انگریزی کا ابر کا اتفاقیہ استعمال کیا تھا۔ اس پر اُردوئے معلیٰ میں سخت ہنگامہ برپا ہوا"

اس جگہ ہم مسٹر سی ڈبلیو وشن کے اُس قابل قدر مضمون کا بھی جو انہوں نے زبان اُردو پر لکھ کر رسالہ مخزن (فروری ۱۹۰۵ء) میں شائع کرایا تھا، کچھ اقتباس کرتے ہیں :

"ایک مدّت سے اردو کے بولنے والوں کو انگریزوں سے معاملہ پڑا ہے۔ علوم جدیدہ اور مشاغل جدیدہ کا چرچا شروع ہے۔ انکی بابت لکھنے یا بولنے کے لئے اُردو کے بولنے والے انگریزی الفاظ بجنسہٖ لے کر اُردو میں ملا دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اصطلاحی الفاظ لینے پر ہم مجبور ہیں، تاہم ان کے لینے میں بھی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان کو مناسب وضع اور لباس میں لیا جائے تاکہ ان کی اجنبیت جاتی رہے اور بے ضرورت انگریزی الفاظ داخل کرنے سے تو بہر صورت پرہیز چاہیئے۔ میرے خیال میں اہل زبان کو سب سے پہلے یہ اچھی طرح دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان کی زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود ہے یا نہیں جس سے وہ خیال ظاہر ہو سکے جس کو ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اکثر لوگ محض غفلت یا سہل انگاری سے دوسری زبان کے الفاظ ملا دیتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا ان زبانوں میں جو قدرتی طور اسی زبان کا بنی ہوئی ہیں، ایسا لفظ موجود ہے

یا نہیں جس سے مطلوبہ خیال کا اظہار ہو۔ اگر ان میں ہے تو وہ مقدم ہے۔ مثلاً اُردو کے لئے سنسکرت عربی اور فارسی کے خزانوں میں ڈھونڈنا چاہیئے کہ مناسب الفاظ میسر ہیں یا نہیں؟ اگر ان میں تلاش کرنے پر بھی مطلب نہ نکلے تو کسی دوسری زبان سے لینے میں مضایقہ نہیں۔ مگر حتی الامکان یہ استثنا صرف اصطلاحی الفاظ کے لئے رکھنی چاہیئے اور عام نہیں کرنا چاہیئے۔"

آگے چل کر صاحب ممدوح فرماتے ہیں:

"اگر کسی کو اس ضرورت کا پوری طرح احساس نہ ہو تو اکثر اُردو اخبارات اور رسالوں پر نظر ڈالنا کافی ہوگا وہ آسانی سے دیکھ سکے گا کہ کس کثرت سے انگریزی الفاظ کی بھرمار ان میں ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جس زبان میں اخبار لکھا ہوا ہے وہ اُردو ہے یا انگریزی۔ اس خرابی کا علاج ایک حد تک ایڈیٹر صاحبان کے ہاتھ میں ہے اگر وہ اس طرح کھچڑی زبان میں لکھے ہوئے مضامین کے لینے سے انکار کر دیا کریں یا لکھنے والے کے پاس بدیں الفاظ درخواست بھیجا کریں کہ وہ صفائی زبان کا زیادہ تر خیال رکھ کر درست کر دیں اور پھر بھیجیں تو بہت سا فائدہ ہو سکتا ہے۔ تھوڑی سی توجہ سے عموماً ویسی الفاظ مل سکتے ہیں اور قیاس میں نہیں آتا کہ اپنی تین زبانوں کی موجودگی میں ہندوستان والوں کو انگریزی سے اس کثرت کے ساتھ مدد لینے کی ضرورت ہو۔ اگر واقع میں اپنی تینوں زبانوں سے لفظ مناسب نہ ملے تو انجمن کا کام ہوگا کہ کوئی نیا لفظ گڑھے جو زبان میں بخوبی کھپ جائے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ سب ضروری اصطلاحات اور باریکی ہائے معنی کے لئے اردو میں الفاظ اور محاورات موجود ہو جائیں۔ یہ کام خاص حصہ تو محقق علما کا ہے، مگر دوسرے لوگ بھی جو زبان کے بولنے والے ہیں خواہ بڑے عالم نہ بھی ہوں، اس کام میں معقول مدد دے سکتے ہیں اور خود اپنی بولی میں صفائی اور پاکیزگی کی کوشش کر کے بیجا ملاوٹ کے دن بدن بڑھتے ہوئے شوق کو روکنے میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر لوگ اس کام کی اہمیت کو سمجھ جائیں اور جان لیں کہ عمدہ اور مکمل زبان کا مالک ہونا ملک کی عزت

اور بیہودگی کا باعث ہوگا، اور اس میں نقص پیدا کرنے یا اس کی خرابی کا علاج نہ کرنے سے ملک کے اغراض کو نقصان پہنچ جائے گا، تو پھر انہیں احتیاط سے کام لینا اور خود اپنی زبان کے وسائل کو بڑھانا کچھ دشوار نظر نہ آئے گا۔ زبان کے اتحاد اور اس کی پاکیزگی کے لئے اہلِ ہند کی متفقہ کوشش کی ضرورت محض خیالی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس میں اتحادِ ملک کا راز چھپا ہوا ہے اور اسی سے امید کی جا سکتی ہے کہ ملک میں ملکی ہمدردی اور قومیت کا خیال اپنا ظہور دکھائے۔

کرنل رنکنگ صاحب جو اُردو زبان کے ایک اعلیٰ مصنف اور اُردو کے ممتحن ہیں، اپنی انگریزی اُردو لغات کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

.... کوئی متنفس آج کل کے کسی ہندوستانی اخبار کو جو مادری زبان کے ایک موزوں اور بامحاورہ لفظ کے بجائے انگریزی الفاظ کے استعمال کرنے کے میلان میں تیزی سے بڑھ رہا ہے بغیر متاثر ہوئے ہاتھ میں نہیں لے سکتا۔ یہ امر ہر پہلو سے نہایت ناقابلِ قدر ہونا چاہیئے، کیونکہ یہ ہندوستانی زبان کی خرابی کا باعث ہوتا ہے اور اس پر اصرار کیا جائے تو لامحالہ کچھ عرصے کے بعد اکثر قیمتی الفاظ جو پھر بازیافت نہ ہو سکیں معرضِ گمنامی میں پڑ جائیں گے۔ اس افسوسناک زوال کو کسی قدر روکنے کی امید سے میں نے تحریری پیرایہ میں انگریزی اور ہندوستانی کے درمیان تناسب کی حفاظت کرنے کے لئے کوشش کی ہے۔ میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ باشندوں سے جو مذاقِ سلیم رکھتے ہیں استدعا کرتا ہوں کہ وہ اُس سیلاب کو جو ہندوستانی زبان کے ساحل پر فضول اور غیر کارآمد انگریزی الفاظ کے تموّج کی تہدید کر رہا ہے، تھامیں۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ اُردو زبان کی یہاں تک نگہداشت کرتے تھے کہ غیر فصیح الفاظ کو سننا بھی پسند نہیں کرتے تھے، اور اب اخباری عبارت کی عموماً یہ حالت ہے کہ غیر ضروری انگریزی الفاظ کی بھرمار سے اس کو اس قدر بگاڑ رہے ہیں کہ وہ دن دُور نہیں ہے کہ غالبؔ اور ذوقؔ کی اُردو سے علیحدہ ایک نئی زبان پیدا ہو کر رہے گی۔

اگرچہ ہمارے صوبہ کی بری زبان ایک محدود اور علم ادب میں بے مایہ زبان ہے، تاہم بری لوگوں نے باوجود یکہ اجنبی قوموں کے ساتھ مدتِ دراز سے میل جول ہے، ابھی تک اس کو غیر ضروری اجنبی الفاظ سے خلط ملط نہیں

ہونے دیا اور اپنی اصلی حالت میں ان کو قائم رکھا ہے۔

مثلاً یہ انگریزی الفاظ اسٹیشن ماسٹر، ریل گاڑی، انجن، ٹکٹ، پوسٹ ماسٹر، اپیل، بائیسکل، ٹرام، پریس، پنسل، سلیٹ، وائسرائے، علیٰ ہذا القیاس اور بہت سے اس قسم کے انگریزی الفاظ، جو پوری طرح سے اردو زبان میں مل گئے ہیں، برمی لوگوں نے انہیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ چنانچہ آپ کسی برمی کی زبان سے لفظ اسٹیشن ماسٹر خواہ وہ انگریزی داں ہی کیوں نہ ہو، جب وہ اپنی زبان میں گفتگو کرے گا تو ہرگز نہ سنیں گے۔ برمی روزانہ اخبارات Friend of Burma اور Burma Herald جو ٹائپ میں چھپتے ہیں اور جن کی تقطیع اور ضخامت کے برابر اُردو اخبار ابھی تک موجود نہیں ہے، اگر آپ ملاحظہ فرمائیں تو شاذ و نادر ہی کوئی انگریزی لفظ ملے گا ورنہ صاف اور شستہ برمی عبارت ہی نظر آئے گی۔ جیسا کہ عربی خواں اصحاب مصر کے روزانہ عربی جرائد میں پاتے ہیں۔ لہٰذا ہم ہندوستان کے ان فصحا و بلغا اور اراکین انجمن ترقی اُردو سے جو زبان اُردو کی ترقی و توسیع اور اس کی صفائی و شستگی میں تابمقدور کوشش کر رہے ہیں درخواست کرتے ہیں کہ اس امر پر بخوبی غور کر کے کوئی مناسب عملی صورت اس ناگوار سیلاب کو روکنے کے لئے اختیار کر کے ہماری موجودہ اور آئندہ نسل پر ایک علمی اور مستقل زبان کی میراث چھوڑ کر ہمیشہ احسان مندی کا موقع بخشیں اور وہ ان کے ادائے شکر سے ہمیشہ قاصر رہے گی۔

—— م۔ی۔ چھاپینا (ستمبر ۱۹۱۲ء)

ایک رسم الخط کی کانفرنس

الٰہ آباد میں جہاں اور کانفرنسیں فراہم ہوئیں، وہاں ایک رسم الخط بنانے والی کانفرنس بھی ۲۹ دسمبر ۱۹۱۰ء کو کانگریس کے پنڈال میں ہوئی۔ اس کے پریسیڈنٹ آنریبل جسٹس کرشنا سوامی آئر تھے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"ہندوستان میں ایک رسم الخط بنانے والی ایک بالکل نئی کانفرنس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے کی نسبت اب اتحاد کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اگر یہ تازہ تحریک کامیاب ہو گئی تو ملک کو ایک نعمت بے بہا حاصل ہو جائیگی۔ اس کانفرنس کی یہ غرض نہیں ہے کہ ہندوستان کی زبان ایک ہو جائے بلکہ یہ ایک رسم الخط کی موید ہے۔۔۔ ہندوستان میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی ہیں اور تقریباً ۲۰ ہزار مختلف حروف رائج ہیں۔ ۲۲ کروڑ بھارت باسی ایسی زبانیں بولتے ہیں جو آرین زبان کہلاتی ہیں اور کوئی ساڑھے ۵ کروڑ باشندے ایسی زبانیں بولتے ہیں جو آرین زبانوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔۔۔ آپ ذرا اس نقصان کو دیکھیں جو مختلف زبانوں کے بولنے سے ہوتا ہے۔ اگر زبانیں جدا ہونے پر رسم الخط ہی ایک ہوتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔ کیونکہ ہندوستان کی مختلف زبانیں ایک ہی منبع سے نکلی ہیں اور بہت کچھ آپس میں ملتی جلتی

ہیں ... یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ کوئی زبان کسی خاص مذہب سے تعلق رکھتی ہے .... ملک کی بہتری کے لئے ایک رسم الخط کا رائج ہونا بہت ضروری ہے۔ مگر یہ مطلب نہیں ہے کہ اس تحریک سے کسی زبان کو دبا دیا جائے ... دیوناگری اور رومن رسم الخط ایسے ہیں جن میں کسی قدر تبدیلیوں کے بعد ملک کی سب بانیں لکھی جا سکتی ہیں۔"

— ایڈیٹر (مارچ ۱۹۴۸ء)

اُردو ہندی

اُردو ہندی کے جھگڑے نے اب یہاں تک طول کھینچا ہے کہ معزز ہمعصر آریہ گزٹ کو زمانہ اور ادیب کا ذکر کرتے ہوئے یہ فقرہ لکھنا پڑا ہے "ہندوؤں نے ہندی اور دیوناگری اکشروں (حروف) کے برخلاف مسلمانوں کے ساتھ مل کر اور مسلمانوں سے بڑھ کر کام کرنا شروع کر دیا ہے"! دنیا کے کسی دور میں ایسا تاریک زمانہ کبھی نہ آیا ہوگا جب ذاتیات سے گزر کر زبانوں اور علموں کی تحقیر کی گئی ہو۔ بلکہ مہذب اور شائستہ اقوام میں ہمیشہ ایک سے زیادہ زبانیں حاصل کرنے کو معیار تمدن سمجھا گیا ہے۔ بہر نوع کسی زبان کے ساتھ خاص تعصب کا اظہار نہ ترقی تمدن کے منافی ہے بلکہ ایک بدترین اخلاقی جرم ہے۔ ضرورت ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے کی زبان کو نہ صرف حاصل کریں، بلکہ اس کی ترقی و اشاعت میں ساعی ہو کر اپنے اخلاقی فرائض سے سبکدوش ہوں۔ — ایڈیٹر (فروری ۱۹۱۱ء)

اُردو مطبوعات

صوبجات ہذا کی انتظامی رپورٹ بابت سال گزشتہ حسب معمول حال ہی میں شائع ہوئی ہے، جس کے ایک حصے میں لٹریچر اور اخبارات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب و اخبارات کی تعداد میں خاطر خواہ ترقی ہوئی اور ان صوبجات میں علمی شوق برابر ترقی کر رہا ہے۔ تعداد کتب میں بمقابلہ سال پیوستہ ۵۵۵ کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ اضافہ انگریزی اور ہندی تصانیف سے تعلق رکھتا ہے۔ اُردو کتب میں بمقابلۂ سال ماسبق افسوسناک کمی واقع ہوئی ہے۔ بلکہ اس خیال کے ساتھ اور بھی حیرت انگیز ہے کہ سال گزشتہ میں اُردو زبان کی ترقی کے لئے خاص کوششیں کی گئیں اور صوبۂ ہذا میں اُردو کانفرنس کمیٹی بھی قائم ہوئی۔ نیز علی گڈھ پارٹی اور مسلم لیگ نے بھی اُردو کی سرپرستی کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن علمی کوشش یعنی تصنیف و تالیف کی کارروائی نسبتہً شکست رہی۔ سارے صوبے میں صرف دو کتابیں قابل تعریف سمجھی گئی ہیں۔ ایک علامۂ عصر مولانا شبلی مدظلہٗ کا سلسلہ "شعر العجم" (جو ہنوز نامکمل ہے اور جس کی تکمیل میں ابھی برسوں کی دیر ہے) اور دوسری مسٹر گردھاری لال سکسینہ کی تصنیف "ہندوستان انجینیرنگ" جو اُردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کتاب خیال کی گئی۔ علامۂ شبلی مدظلہ العالی کی پیرانہ سالی کثرتِ کار اور ندوۃ العلما کی اہم ذمہ داریوں کا خیال کرتے ہوئے اُردو زبان کے متعلق ان کی علمی کوشش حد تعریف سے باہر ہے۔ ہزاروں طالبانِ اُردو میں صرف حضرت ہی کی ذات بابرکات اُردو کے لئے مایۂ ناز ہے۔ — ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۱ء)

آل انڈیا اُردو کانفرنس

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس دور انگلیشیہ میں ریل و تار کے ذریعہ دور دور کے شہروں کا باہمی فاصلہ اس قدر قریب ہوگیا ہے کہ یہاں کے تجارتی تعلقات دن بدن بڑھتے جاتے ہیں اور تبادلۂ خیالات نے ثابت کر کے دکھا دیا ہے کہ اُردو کے بولنے والے ہندوستان، اس کے پرے افغانستان، اور ادھر عربستان، اور لنکا تک، جہاں چلے جائیں، بغیر اس کے کہ انہیں اپنے اظہار خیالات کے لئے ٹامس کک اینڈ سن کے کسی ترجمان سے مدد لینی پڑے، اپنے آپ ہی سب کچھ کر سکتے ہیں، ہندوستان میں بہم مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان سب میں کیا بلحاظ طرز تحریر، اور کیا بلحاظ اظہار خیالات اُردو ہی کو وہ فخر حاصل ہے، جو کسی اور زبان کو نہیں ہو سکتا۔ جب ہمارے یہاں کے چند بزرگوں کو اُردو کی مزید ترقی کا خیال پیدا ہوا، تو آل انڈیا اُردو کانفرنس کی بنیاد ڈالی گئی، تاکہ اردو کو خاص ملکی زبان تصور کر کے ایک متفق کوشش سے آئندہ کے لئے کچھ ایسے اصول بنائے جائیں جن کی رُو سے پورے ملک کے لئے ریل کی ایسی سیدھی سڑکیں قائم ہو جائیں۔

خوشی کا مقام ہے کہ آل انڈیا اُردو کانفرنس کی ضرورت محسوس کر کے ہوا خواہان ملک نے سالانہ جلسے تجویز کئے، چنانچہ پچھلے برس اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس وقت دلّی، لکھنؤ، آگرہ کے بجائے بدایوں کو جلسہ کے لئے انتخاب کیا گیا تھا اور مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے اس کے پریسیڈنٹ چنے گئے تھے۔ آپ نے جو تقریر فرمائی تھی وہ ایسی اعلیٰ تھی کہ اس سے ہندو الگ خوش تھے اور مسلمان الگ محظوظ۔ اس کانفرنس میں جو تجاویز پیش ہوئی تھیں، وہ مجموعی طور پر ترقی زبان کے لئے نہایت ہی موزوں تھیں اور ملک نے انہیں پسند کیا، گو اس وقت بعض اہل الرائے نے اتنا ضرور کہا کہ جس شہر کو جلسہ گاہ کے لئے انتخاب کیا گیا ہے، موزوں نہیں، مگر بعد میں جواب مل گیا کہ ہندوستان کی کسی ایسی زبان کے متعلق جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت سمجھی جاتی ہو، ہندوستان کے کسی شہر کا انتخاب کرنا برابر ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ بدایوں کو محروم الارث قرار دیا جائے۔ حالانکہ بدایوں ایک زمانہ میں ایسا نام پا چکا ہے کہ اس کے مؤرخ، مصنف، مؤلف، شاعر، ناظم، ناثر "منتخب التواریخ" تھے۔

عام خیال تھا کہ بدایونی جلسہ کے بعد دوسرے سالانہ جلسے کے واسطے کوئی اور بڑا شہر انتخاب ہوگا، جلسہ پہلے سے کہیں وسیع پیمانے پر کیا جائے گا، جو فروگزاشتیں، عدیم الفرصتی کی وجہ سے، پہلے ہو چکی تھیں

ان کی خاص اصلاح ہوگی۔ مگر اہل الرائے کی امیدوں کے خلاف بدایوں کے بعد دوسرے سال کے لئے مولوی رفیع الدین صاحب نے اپنے پریکٹس والے شہر "پونہ" کو تجویز کیا اور بجائے اس کے کہ اس علمی جلسہ کی صدارت کے لئے: راجہ سر کشن پرشاد صاحب، مدار المہام حیدر آباد (دکن)،

شمس العلما مولانا امداد امام صاحب اثرؔ، شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی،

شمس العلما مولانا عبد الحکیم صاحب، شمس العلما مولانا الطاف حسین صاحب حالیؔ،

ابو ادریس مولانا احمد حسن صاحب شوکتؔ، شمس العلما مولانا نذیر احمد صاحب،

خان بہادر مرزا سلطان احمد خاں صاحب، شمس العلما مولانا محمد یوسف صاحب،

آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما، مولانا عبد الحلیم صاحب شررؔ،

شمس العلما مولوی عبد اللہ صاحب، مسٹر ایم۔ ایل۔ لیلا رام صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی،

مولوی عبد اللہ العمادی صاحب ایڈیٹر "وکیل امرتسر" نواب سعید الدین خاں صاحب طالبؔ (دہلوی)،

اور مولوی سید احمد صاحب، مؤلف "فرہنگ آصفیہ" میں سے کوئی صاحب انتخاب کئے جاتے، آنریبل خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب ممبر لیجسلیٹو کونسل پنجاب کو نامزد کیا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ میاں صاحب اپنی قانون دانی اور قانون فہمی کے باعث اس وقت "زندہ دلان پنجاب" کے سر برآوردہ حضرات میں سے ہیں، اور لاہور کے خطۂ یونان موضع باغبان پورہ میں آنریبل خان بہادر میاں محمد شاہ دین صاحب جج چیف کورٹ پنجاب سے دوسرے درجہ پر ہیں۔ مگر آپ کا انتخاب اس وقت نہایت ہی موزوں ہوتا، اگر یہ کوئی قانونی جلسہ ہوتا۔ لیکن ایک ایسے جلسہ کے لئے جس میں محض علمی ہی باتیں ہوں ایسا انتخاب قابل حرف گیری ہے، کیونکہ اس سے پہلے میاں صاحب نے لٹریری دنیا میں کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا جس سے ان کا شمار زبان اردو کے بہی خواہوں میں ہو سکتا۔

بہر حال جلسہ کو رفیع الشان بنانے کے لئے مولوی رفیع الدین احمد صاحب نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ اسپیشل ٹرین دوڑائی گئی اور پونہ دبمبئی کے اطراف کے قریباً ہر ایک شہر کے قائم مقام استقبال کو آئے۔ ۲۱ جولائی کو نہایت تزک واحتشام کے ساتھ طمطراقی جلوس نکلا اور دوسرے دن اسلامیہ اسکول میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا جس میں آنریبل میاں محمد شفیع صاحب خان بہادر نے اپنی پریسیڈنشیل تقریر فرمائی۔

آپ کی تقریر اگرچہ بیش بہا معلومات کا خزانہ تھی مگر اس میں بعض ایسے چبھتے ہوئے فقرے پائے جاتے ہیں جن سے بحث کا ایک نیا میدان کھل گیا ہے۔ چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما لکھتے ہیں:

"یہ کانفرنس محض علمی ہے، اور مجھ کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ اپنے دوسرے اجلاس میں یہ کانفرنس دو عظیم قوموں کے درمیان برہمی کا باعث بنائی جائے گی، یا یہ کہ اس کے ذریعہ پولیٹیکل اظہار ہوگا اور دل کے بخارات نکالے جائیں گے"۔

حکیم برہم بھی اپنے اخبار "مشرق" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہم کو آنریبل میاں محمد شفیع صاحب کی دل آزار باتوں سے اتفاق نہیں۔ انہوں نے گول گول الفاظ میں ہندوؤں پر الزام لگایا ہے کہ وہ سوراجیہ کی ترقی کے لئے ہندی کی ترقی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک ذاتی قیاس ہے کسی مسلمان کا یہ قیاس نہ ہونا چاہیے..... سوراجیہ کے غلط معنی ملک میں پھیلائے گئے ہیں۔ حالانکہ انسان کے دل و دماغ میں سوراجیہ کا مسکن ہے ...... میاں محمد شفیع صاحب کا یہ اعتراض پردے پردے میں ناروا تھا اور ان کو بحیثیت ایک صدر انجمن کے اس بات کو نہ کہنا چاہیے تھا۔ اس واسطے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ اگر ہندو اُردو سے نفرت کرنے لگے ہیں، تو ان کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے، نہ یہ کہ ان کو اشتعال دیکر اُردو سے نفرت بڑھانے کی کوشش کی جائے"۔

ان کے علاوہ اور بہت سے اہل الرائے کو کچھ موافق، کچھ مخالف، خیالات کے اظہار کے لئے اس تقریر نے بیس ٹو کر مجبور کیا۔ کسی نے لگانے کی اور کسی نے بجھانے کی کوشش کی۔ انصاف پسند طبائع صرف یہی چاہتے ہیں کہ زبان کی ترقی کے لئے پولیٹیکل مذاق کا نام نہ ہونا چاہیے کیونکہ اہل قلم کو اہل سیف سے کیا کام؟

آل انڈیا اُردو کانفرنس میں جو ریزولیوشن پیش ہوکر پاس ہوئے "مسلم" نے ان کو حسب ذیل لکھا ہے:

۱۔ صوبہ بمبئی کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو ہے، اور اس کانفرنس کی رائے میں گورنمنٹ کا وہ خیال کہ اُردو محض آرائشی زبان ہے اور دنیوی کاروبار میں مفید نہیں، محض غلطی پر مبنی ہے۔ لہذا یہ کانفرنس مؤدبانہ عرض کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے دینی اور دنیاوی معاملات میں اُردو کی بیحد ضرورت ہے اور بجز اُردو کے ان کی تعلیم ناممکن ہے۔

۲۔ صوبہ بمبئی میں اُردو مدارس کی تعلیم ہرگز درست نہیں ہوسکتی اور نہ کافی تعداد اُردو مدرسین کی دستیاب ہوسکتی ہے تاوقتیکہ اس صوبہ میں ایک اُردو ٹرننگ کالج نہ قائم کیا جائے۔

۳۔ اس صوبہ کے ہر ڈویژن میں ایک مسلمان ڈپٹی انسپکٹر خاص اُردو مدارس کے لئے مقرر کیا جائے۔

جیسا کہ جنوبی ڈویژن میں، گورنمنٹ نے مقرر کیا ہے اور ان افسروں کو پورے عملی اختیارات عطا کئے جائیں۔ اور نیز ان نائبوں کی سالانہ رپورٹیں (اردو مدارس کے بارے میں) براہ راست سب انسپکٹروں کو بھیجی جائیں۔

۴۔ حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن اس صوبہ میں اینگلو ورنیکلر مدارس زیادہ کھولے جائیں اور پونہ کیمپ کا اینگلو اردو اسکول، جہاں فی الحال پانچویں جماعت تک انگریزی پڑھائی ہوتی ہے، ہائی اسکول کر دیا جائے۔

۵۔ اوّل درجے کے اُردو اسکولوں میں مدرسۂ ناسک کی طرح، تیسری جماعت تک انگریزی پڑھائی جائے۔

۶۔ مڈل اور ہائی اسکولوں میں، اُردو کورس نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان طلبا کو بیحد نقصان پہنچتا ہے، لہٰذا مڈل اور ہائی اسکولوں میں اُردو کورس پڑھائے جائیں اور اُردو مدرس مقرر کئے جائیں۔

۷۔ جن سرکاری ہائی اسکولوں میں فیس بڑھائی جائے، وہاں مسلمان طلبا کے ساتھ حسب سفارش ایجوکیشنل کمیشن، رعایت کی جائے۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم میں جو نقصان عظیم اس صوبہ کے اندر ہو رہا ہے، اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ایجوکیشنل کمیشن نے جو سفارشیں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کی ہیں اُن کی پوری تعمیل نہیں ہوتی۔

۹۔ اُردو کی ترقی کے واسطے اردو زبان میں انواع و اقسام کے علوم و فنون کی کتابیں بکثرت تصنیف و تالیف ہوں اور دیگر زبانوں سے ترجمہ کی جائیں۔

۱۰۔ صوبہ بمبئی کی دیسی زبانوں کی درسی کتابوں میں بزرگان و سلاطین اسلام کے متعلق توہین آمیز الفاظ اور بے بنیاد روایات موجود ہیں، جن سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ یہ کانفرنس درخواست کرتی ہے کہ ایسے مضامین کتابوں سے نکال دیئے جائیں اور ٹکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ نیز ہر ایک دیسی زبان کی ٹکسٹ بک کمیٹی میں مسلمانوں کے قائم مقام ہوں۔

۱۱۔ مردم شماری میں مسلمانوں کی زبان، اُردو، کے کم دکھانے کی وجہ سے زبان کی خانہ پری میں غلط اعداد بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ کانفرنس اظہار افسوس کرتی ہے اور گورنمنٹ کی توجہ بغرض تحقیقات اس پر مبذول کرتی ہے۔

۱۲۔ اس صوبہ کے چند اُردو نصاب کی ترمیم کے لئے اور نیز ان تعلیمی سوالات پر جو آج کل گورنمنٹ

بمبئی کے زیر تجویز ہیں اپنی رائے ظاہر کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس چند لائق اصحاب کی ایک کمیٹی مقرر کرتی ہے۔

ان جملہ ریزولیوشنوں پر ایک نگاہ دوربین سے دیکھنے والے فوراً معلوم کرلیں گے کہ :

(۱) پہلا رزولیوشن کسی قدر خلاف واقعات ہے، کیونکہ مسلمانان بمبئی کی زبان مجموعی طور پر اردو نہیں ہوسکتی۔ وہاں عموماً گجراتی زبان کا استعمال ہے۔

(۲) رزولیوشن نمبر ۲ و نمبر ۳ و نمبر ۴ و نمبر ۵ و نمبر ۱۰ و نمبر ۱۱ زیادہ تر اس قسم کے ہیں جنہیں آل انڈیا اُردو کانفرنس کے ساتھ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تجاویز اگر "مسلم لیگ" میں پیش ہوتیں تو زیادہ موزوں تھیں۔

(۳) رزولیوشن نمبر ۶ لغایت نمبر ۸ اور نمبر ۱۲ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے زیبا تھے۔

(۴) رزولیوشن نمبر ۹ سے ہمیں کلی اتفاق ہے۔ ہمارے خیال میں اتنا حصہ اور بھی ہونا چاہیے تھا کہ جن لوکل گورنمنٹوں نے زندہ مصنفین کی چند خاص تصانیف کے لئے قدر افزائی کی ہے، اُن کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ استدعا کی جائے :

(الف) ایک مستند، سستی، عمدہ، اُردو کی لغت بنائی جائے۔

(ب) اصطلاحات علمی کے لئے مناسب ہم معنی الفاظ تجویز کئے جائیں، جن سے اُن کا مفہوم واضح ہو۔

آل انڈیا اُردو کانفرنس کے رزولیوشنوں میں مندرجہ ذیل رزولیوشنوں کی بھی ضرورت تھی۔

۱۔ اشہری، برق، سرور، تسلیم، ظہیر، ڈاکٹر بلگرامی، مولانا ذکاء اللہ اور دیگر بزرگوں کی وفات پر اظہار تاسف، جن کی بدولت اُردو لٹریچر نے خاص ترقی حاصل کی۔

۲۔ لالہ سری رام صاحب ایم۔اے کی ان خدمات کا اعتراف جو انہوں نے "خمخانہ جاوید" ایسا تذکرہ لکھنے سے اردو لٹریچر کی بھاری کمی کو پورا کیا ہے۔

۳۔ انشا پردازی کے لحاظ سے اس وقت کس قسم کی اُردو کا رواج ہے۔ کم از کم ہر ایک کے قواعد و اصول مرتب کئے جائیں۔

۴۔ آئے دن نئے نئے علمی، ادبی، اخلاقی رسالے جاری ہوتے ہیں، جو ملکی لٹریچر کی مزید ترقی کا باعث ہیں۔ جس رسالہ کو اُس کے حسن خدمات کے لحاظ سے زیادہ ممتاز سمجھا جائے، اس کی خاص عزت افزائی کی جائے۔ جس طرح کہ یورپ کی لٹریری سوسائٹیاں اپنے ملک کے میگزینوں کو اعزازی تمغات عطا فرما کر ان کی خدمات کا اعتراف کرتی ہیں۔ نیز ایسے رسائل کے ایڈیٹروں کو بھی خاص اعزازنہ سے ممتاز کیا جائے اور اُن کے

لٹریچر کو مفید سمجھ کر گورنمنٹ سے سفارش کی جائے کہ ان کی چند کاپیاں مدارس کے لئے خریدی جائیں۔

۵- کم بضاعت مترجم بعض وقت اچھی کتابوں کو ترجمہ کے لئے انتخاب کرتے ہیں اور اسی طرح اپنی کم بضاعتی کی وجہ سے بہت غلط ترجمہ چھاپتے ہیں۔ لہٰذا لٹریچر کے خاص مذاق کو مدنظر رکھ کے ایسے اصول مرتب کئے جائیں جن سے تجاوز کرنے والے کی کتاب اشاعت پذیر نہ ہو۔

۶- دربار تاجپوشی کے موقع پر جو مشاعرہ "تاجِ سخن" کے نام سے زیرِ اہتمام نواب احمد سعید خاں صاحب طالب دہلی میں ہونے والا ہے، اس کو بھی اس کانفرنس کی ایک شاخ قرار دے کر جس قسم کے تمغے تجویز کئے جائیں اس کانفرنس کی وساطت سے تقسیم ہوں۔

اس قدر اظہارِ خیالات کے بعد ہم ایک اور بات ظاہر کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ کہ جب آل انڈیا اُردو کانفرنس والے کانفرنس کو کوئی مذہبی کانفرنس نہیں سمجھتے، تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صدارت کے لئے یکے بعد دیگرے ہر مذہب کے لٹریری اصحاب انتخاب کئے جایا کریں۔ اور اس لحاظ سے آئندہ سال کے جلسے کے لئے ہم آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما کا نام پیش کرتے ہیں، جن کے انتخاب سے سلوی غلطیوں کا دفعیہ ہو جائے گا۔"

— پیارے لال شاکر (ستمبر ۱۹۱۱ء)

آل انڈیا اردو کانفرنس

آل انڈیا اُردو کانفرنس ۲۶ و ۲۷ مارچ گزشتہ کو بمقام بدایوں منعقد ہوئی تھی۔ اُردو زبان کے لئے یہ پہلا ہی موقع ہے کہ اس کی ترقی کی باقاعدہ کوشش شروع ہوئی ہے۔ صدارت کے لئے مولوی محمد عزیز صاحب بی اے سکریٹری مسلم لیگ منتخب کئے گئے تھے جن کی فضیلت، روشن خیالی اور معاملہ فہمی محتاج تصریح نہیں۔ فاضل پریسیڈنٹ نے اپنی اسپیچ میں اُردو کے اصول و فروغ اس کی تاریخ اور اس کی ترقی کے اسباب پر نہایت جامع و مانع بحث کی اور پُرزور استدلال کے ساتھ ثابت کیا کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ انہوں نے نہایت کشادہ دلی سے اعتراف کیا کہ اُردو زبان کی ترقی میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے کچھ کم محنت نہیں کی ہے اور ہندو اہلِ قلم کا پایہ مسلمان اہلِ قلم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ بشرکا، کانفرنس میں بجز مقامی حکام اور رؤسا کے بیرونی حضرات کی تعداد نہایت قلیل تھی جس کی وجہ کانفرنس کا موقع انعقاد تھا۔ اول عین ہولی کا دور، دوسرے ملک کے اکثر حصوں میں انہیں تاریخوں میں دوسری انجمنیں بھی منعقد تھیں۔ تاہم اس کمی تعداد کو ملک کے زندہ دل شعرا نے اپنی شرکت سے پورا کر دیا تھا۔ پہلے اجلاس میں تقریباً کوئی مقامی ہندو شریک نہ ہو سکا، لیکن دوسرے روز یہ کمی ایک حد تک پوری ہو گئی تھی۔ فاضل پریسیڈنٹ کے علاوہ مولوی محمد عربی صاحب ایم اے بیرسٹر

ایٹ لا لکھنؤ۔ منشی محمد واحد علی صاحب انڈر سکریٹری اجلاس ہمایون دربار رامپور، سید علی احسن صاحب احسن مارہروی، سید محمد مہدی صاحب کمال خلف حضرت جلال مرحوم اور سید نظام شاہ دلگیر اکبرآبادی کی شرکت سے کانفرنس میں ایک خاص رونق پائی جاتی تھی۔ مشہور جادو نگار مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر اپنے شیرخوار بچّہ کی علالت کے سبب شریک نہیں ہو سکے جس کا اہل کانفرنس کو افسوس ہوا، اور اب یہ افسوس اور بھی زیادہ ہوگیا کیونکہ چند ہی روز بعد وہ معصوم دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ابتدائی حالت کی وجہ سے اگرچہ جلسہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا لیکن جن حضرات نے یہ کام شروع کیا ہے ان میں لیاقت، سرگرمی اور استقلال کے اوصاف موجود ہیں اور اس لئے اس کوشش کی کامیابی بالکل مشتبہ بھی نہیں ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مولوی امیر احمد صاحب جنرل سکریٹری اور بابو عطا محمد صاحب جائنٹ سکریٹری اُردو کانفرنس بدایون کی سرگرمی، حوصلہ مندی اور ایثار نفسی انہیں اپنے ارادوں میں جلد کامیاب کرے گی۔

— ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۰ء)

آل انڈیا اردو کانفرنس

آل انڈیا اُردو کانفرنس کے مجمع کی تصویر محض اس لحاظ سے شائع کی جاتی ہے کہ اس کا نام مجمع اُردو کانفرنس ہے مگر سخت افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس کو اُردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اس مجمع میں مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کے سوا کوئی حضرت ہمیں ایسے نظر نہیں آئے جنہوں نے اُردو لٹریچر کی کچھ خدمت کی ہو۔

— ایڈیٹر (ستمبر ۱۹۱۱ء)

مطبوعات پنجاب

صوبۂ پنجاب کی سرکاری رپورٹ (بابتہ ۱۱-۱۹۱۰ء) ابھی حال میں شائع ہوئی

ہے۔ ۴۰۸ ایسی کتابیں مختلف زبانوں میں شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۹ء کے مطبوعات کی تعداد ۱۹۱ تھی، گویا ۲۱۷ کی زیادتی ہوئی۔ اُردو کتب ۲۹۷ کی تعداد میں شائع ہوئیں اور ہندی ۸۲۔ اخبارات و رسائل کی تعداد ۲۴۷ تھی۔ یعنی اُردو ۱۷۸، انگریزی ۳۸، گورمکھی ۱۹، باقی اخبار و رسائل مشترک زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ دونوں صوبوں کی رپورٹ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان اُردو سرعت کے ساتھ ترقی کر رہی ہے۔ — ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۲ء)

ترقی اُردو کی نسبت ایک خیال

آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر مرحوم جب پنجاب کے دوسرے سفر میں امرتسر تشریف لے گئے اور خان بہادر حاجی خان محمد شاہ صاحب مرحوم کے مکان پر لیکچر دیا، تو اس کے دوران آپ نے فرمایا تھا:

"اگر یہ خیال کیا جائے کہ ملکی ترقی کے واسطے ایک خاص زبان چاہیے، تو ترقی معدوم ہو۔ البتہ ضرورتِ وقت خود بخود ایک ایسی زبان پیدا کر دے گی، جو ہندوستان کے علاوہ قرب و جوار کے ممالک میں بھی مایۂ ناز سمجھی جائے گی۔ وہ دن دُور نہیں جبکہ وہی زبان جس کو دہلی والے "اُردوئے معلیٰ" کہتے ہیں اور جس کو پنجاب میں پروفیسر آزاد اور مولانا فیض الحسن مرحوم نے اس معراج تک پہنچایا ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان قرار پائی ہے اصول علم اللسان کے مطابق، علی مسجد سے لے کر راس کماری تک اور کچھ سے لے کے ڈھاکہ اور آسام تک اس آسانی اور سہولت کے ساتھ سمجھی جائے گی کہ لوگ اس کو ہندوستان کی لنگوا فرینکا کہنے لگ جائیں گے۔ مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ اگر ڈاکٹ کے شہید یا کوئی ایسی قوم و جماعت جو اپنی زبان کو ٹکسالی زبان کہہ کر دوسروں کے ساتھ اختلاط کرنے سے محترز ہوں گے، تو اس کا نتیجہ وہی ہوگا، جو کسی وقت مسلمانوں نے ہندوؤں سے الگ رہ کے خمیازہ اٹھایا ہے۔"

حال میں ایک بنگالی علم ادب کے دلدادہ 'بابو ستیش چندر سماج پتی' نے اُردو لٹریچر پر ایک رائے زنی

کرتے وقت اپنے ایک مضمون کے دوران میں بنگلہ زبان کے مشہور رسالہ ساہتیہ میں تحریر کیا ہے:

"گورنمنٹ برطانیہ کے ظلِ عاطفت میں ہندوستان کی تین زبانوں نے زیادہ ترقی کی ہے بجملہ ان کے اُردو کی روزافزوں ترقی ایسی ہے کہ اگر ہم اسے ملکی زبان کے بجائے صرف مسلمانوں ہی کی زبان کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ شمالی ہند کے مشہور سرحدی شہر پشاور سے لے کے سلہٹ تک کے تعلیم یافتہ مسلمان جس خوش اسلوبی اور فصاحت کے ساتھ اسے بولتے اور سمجھتے ہیں، دوسری زبان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اُردو بنگلہ زبان سے بھی بدرجہا جاندار ہے۔ پین اسلام ازم کے سارے خیالات اس کے البم میں موجود ہیں۔ اس نے بنگلہ زبان کی نئی نئی خوبیوں کو بھی لوٹ لیا ہے۔ دربار آصفی، سرکار رامپور اور دیگر اسلامی ریاستیں اس کی خاص امداد کرتی ہیں۔ علیگڈھ کالج میں اس کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ شعرا نے اس کو اپنے جواہر زواہر سے چوکھی کی دلھن بنا رکھا ہے اچھی اچھی تاریخیں اس میں موجود ہیں۔ اظہار خیالات وجذبات میں اس کے روزمرہ میں خاص لطف ہے۔ بنگلہ اخباروں کی بہ نسبت اُردو اخبارات کا اثر دن بدن زیادہ ہوتا جارہا ہے۔ عاشقانہ اور رزم وبزم کے اشعار جس قدر اُردو میں پُر اثر ہیں، دوسری زبانوں میں یہ اعجاز نہیں ہے۔ جس زبان پر بنگالی فخر کرتے ہیں، دیکھ لینا، کسی زمانہ میں اُردو اس پر بھی مسلّط وحاوی ہو جائے گی"

ان کے علاوہ اُردو کے سند الوقت مایۂ ناز شمس العلما حالی فرماتے ہیں کہ "اُردو کی ترقی جس قدر گذشتہ دس سال میں ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے بیس سال کے عرصہ سے کہیں زیادہ ہے، اور پھر اس گذشتہ دس سال کے آخری حصے میں جب سے ماہوار رسالے جاری ہوئے اس کو اور بھی زیادہ ترقی ہوئی ہے۔"

گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے زمانہ میں مسٹر ڈبلیو۔ بیل (جو بعد میں پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے) ایک دن ماسٹر جیالال صاحب ایم اے (اسسٹنٹ پروفیسر) سے فرمانے لگے۔

"جس طرح انگلستان کے وسطی صوبوں کی زبان دوسرے صوبوں کی زبان پر قابو پاکر ملکی زبان قرار پاگئی ہے، دیکھنا، ایک نہ ایک دن الٰہ آباد سے لے کے لاہور تک کی زبان ہندوستان کی دیگر زبانوں پر خاص فوقیت حاصل کرے گی...."

اس کے جواب میں ماسٹر صاحب موصوف نے فرمایا:

یہ سب کچھ سہی، مگر یہاں تو مقامی محدود محاورات کے دلدادہ زبان کی خاص وقعت و عزت کو چھوڑ کر، صوبوں کی زبان کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تنگ خیالی نے ایسا سکہ جمایا ہے کہ وہ پراونشیل ڈائلکٹ کی زنجیروں میں زبان کو جکڑنا احسن خیال کرتے ہیں۔"

بیل صاحب نے فرمایا "زمانہ ایک اعلیٰ ادیب ہے۔ اگر اُردو زبان ملک کی لنگوا فرینکا بننے کا فخر حاصل کرنا چاہتی ہے، تو دیکھ لینا کہ وہ ان سدراہوں کو رستمی ہفتخوانوں کی طرح طے کر کے اپنے محلِ مقصود تک پہنچ جائے گی۔"

باوجود ان سب باتوں کے جب ہم آجکل ہندوستان کی زبان کے بجائے صوبے کے محاورات کی آواز سنتے ہیں، تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ جس بات کا رونا برسوں پیشتر سر سید اور مسٹر بیل رو چکے ہیں) وہ خرابی ابھی تک دور نہیں ہوئی ہے، بلکہ وہی مشرق و مغرب کا فرق چلا جاتا ہے۔ اور جب تک زمانہ تعصب پسندوں سے خالی نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ قضیۂ نامرضیہ ضرور برہم رہے گا۔

— ایڈیٹر (جولائی ۱۹۱۲ء)

ناگری پرچارنی سبھا کا سالانہ اجلاس ۲۰ اور ۲۱ اکتوبر کو بمقام بنارس منعقد ہونے والا ہے۔ جس کی صدارت آنریبل پنڈت مدن موہن صاحب مالوی نے قبول فرمائی ہے۔ اس مرتبہ سبھا موصوف کی ایک قابلِ تعریف کارگزاری یہ ہوگی کہ وہ "ترقی اُردو" کے مسئلے پر بھی غور کرے گی جس کی ہم کو خاص طور پر اطلاع دی گئی ہے۔ ہمارے خیال میں ناگری پرچارنی سبھا کے لئے ترقی اُردو کا مسئلہ جو ضرورت سے زیادہ واضح ہو چکا ہے اس قدر قابلِ غور نہیں جس قدر اُردو ہندی کے تعلقات کا نازک مسئلہ جو ملک کی بدقسمتی سے روز بروز زیادہ پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ اگر ناگری پرچارنی سبھا کے روشن خیال ممبروں کی کوشش سے یہ گتھی سلجھ جائے تو گویا یہ پہلا قدم ہوگا، جو صحیح راستے پر پڑے گا۔ اُردو اور ہندی ملک کی دو نہایت وسیع زبانیں ہیں، جو ہندوستان کی دو بڑی قوموں سے تعلق رکھتی ہیں اور جن میں کسی ایک کا مٹ جانا دوسرے کے لئے باعثِ نقصان ہوگا۔ نظر بریں سب سے پہلے مخالفت کی اس بے پایاں خلیج کو کم کرنے کی ضرورت ہے جو گذشتہ دس بارہ سال سے ان دونوں زبانوں کی راہِ ترقی میں حائل ہے۔ اس صورت میں دونوں پارٹیاں جو ایک دوسرے کی مخالفت و معاندت میں اپنا اپنا زور ختم کر رہی ہیں ایک دوسرے کی ضروریات و احساسات کا لحاظ کریں اور اپنی اپنی ترقی کی جداگانہ راہیں اختیار کریں تو تمام پیچیدگیاں آسانی سے دور ہو سکتی ہیں۔ رہا زبان کی ترقی کا مسئلہ وہ لٹریچر کی ترقی سے وابستہ ہے۔ جس زبان کا علم ادب جس قدر زیادہ وسیع اور مفید عام ہوگا، اسی قدر اس کی ترقی یقینی ہے۔

— ایڈیٹر (دسمبر ۱۹۱۰ء)

مادری زبان میں تعلیم کا اثر

جس وقت ڈاکٹر لائٹنر صاحب آنجہانی نے پنجاب یونیورسٹی کی اسکیم گورنمنٹ عالیہ میں پیش کی تھی، تو بڑے مدلل اور معقول دلائل سے ثابت کیا تھا کہ "پنجاب کی ملکی، قومی اور ہر قسم کی ترقی کو مدنظر رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس امر کو تسلیم کرلیں کہ یہاں والوں کو اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہ کیا جائے جو یورپ وامریکہ کے مہذب ممالک میں عام ہو رہا ہے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ایک ایسا صیغہ تصنیف وتالیف قائم کرنا نہایت ضروری ہے جو علوم متداولہ کو اپنی ملکی زبان کا لباس پہنائے۔ جب اس قسم کا ایک خاص ذخیرہ موجود ہو جائے گا، تو اہل ملک کی ترقی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی۔ شروع شروع میں ڈاکٹر لائٹنر کی اس اسکیم کی بہت مخالفت کی گئی تھی، جس میں سب سے زیادہ اخبار ٹریبیون نے حصہ لیا تھا اور اس مخالفت کا یہ نتیجہ ہوا کہ بجائے اس کے اہل پنجاب کی خاص تعلیم ملکی زبان میں ہوتی، اس کے حصول کے لئے غیر ملکی زبان سیکھنی پڑی۔ مگر آج کل کے عام خیالات کا اندازہ ان الفاظ سے لگانا چاہیے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا موجودہ طریق جس میں انگریزی ذریعۂ تعلیم بن رہی ہے قانون قدرت کے سراسر خلاف ہے۔ موجودہ طرز عمل کچھ ایسا ہے جس کے رو سے چند ایک ابتدائی جماعتوں کے کورس رٹنے کے بعد "مادری زبان" سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔ اگر ڈاکٹر لائٹنر کی اسکیم چل نکلتی تو اس وقت نہ صرف یورپ کے تمام علوم وفنون کی کتابیں ہماری مادری زبان میں موجود ہوتیں، بلکہ تعلیم یافتہ دماغوں کی محنت اور کوشش سے ہماری زبان بھی "علمی" زبان بن جاتی۔ انگریزی تعلیم کو ذریعۂ ترقی خیال کرنے کے متعلق ۱۹۱۱ء میں ہندوستان ریویو میں کلکتہ کے ایک یورپین پادری صاحب نے ہندوستانی طلبا کی بابت تحریر کیا تھا کہ:

مجھے اس میں شک ہے کہ کوئی شخص جو ایک زبان میں افہام وتفہیم کا مادہ نہ رکھتا ہو، اس کا تعلیم یافتہ بن سکتا ہے۔ بہت سے ہندوستانی طلبا انگریزی زبان نہیں سمجھتے اور اس لئے استعجاباً یہ کہنا پڑتا ہے کہ آیا انہیں اصلی تعلیم دی جاتی ہے کہ نہیں؟

حال میں ماڈرن ریویو میں ایک مضمون چھپا ہے جس میں مضمون مذکورہ کا جواب دیا گیا ہے۔ مضمون نگار صاحب فرماتے ہیں کہ:

"میرے خیال میں اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ یہ شک نہیں بلکہ حق الیقین ہے کہ ہندوستانی طلبا کو اصلی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہر قسم کی ترقی کے خیال سے انہیں انگریزی زبان میں غور وفکر

کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لئے دیسی زبان ہی کیا کم ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ انہیں مادری زبان ہی میں تعلیم دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم و تلقین اسی حیثیت سے ہو جیسے فرنچ یا جرمن زبانوں کی ہوتی ہے۔"

اگر اُن مدارس میں جو قیصرِ وکٹوریہ خلد آشیانی کے عہدِ میمنت مہد میں ہندوستان میں قائم ہوئے تھے، ڈاکٹر لائنز صاحب کے خیال کے مطابق مغربی سائنس کی تعلیم ہندوستانی زبان کے ذریعہ سے دی جاتی تو ناممکن تھا کہ ہندوستان بھی جاپان کی طرح ہر قسم کی ترقی نہ کرتا۔ بہرحال اگر اب بھی ہمارے اہلِ ملک سمجھ جائیں کہ مادری زبان ہی ہر قسم کی ترقی کا ذریعہ ہے، تو اُس نقصان سے ضرور ہی بچے رہیں گے جو آئندہ ہونے والا ہے۔

—— ایڈیٹر (اکتوبر ۱۹۱۲ء)

اُردو زبان کی ترقی

ترجموں کی ضرورت

سب موقعوں سے زیادہ ضرورت الفاظ کی ترجمہ کے وقت ہوتی ہے۔ جن خوش قسمت قوموں کو دوسری زبانوں سے نفرت نہیں یا جو ایسی خوش نصیب ہیں کہ ان کو اکتسابِ کمال کا شوق ہے اور وہ دوسری زبانوں کے قیمتی جواہرات اپنی زبان میں لانا چاہتی ہیں، وہ محسوس کرتی ہیں کہ ترجمہ کے لئے کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ایک تعزیرات ہی کی اصطلاحوں کے ترجمے کے لئے خدا جانے ترجمان کا کس قدر وقت صرف ہوا ہوگا اور کہاں کہاں سے وہ الفاظ ڈھونڈتے رہے ہوں گے۔ نظم کا نظم میں ترجمہ سب سے مشکل کام ہے۔ لیکن دیکھیے گرفتھ کی ۳۰ سالہ محنت، جو رامائن کے منظوم کرنے میں ہوئی۔ ہم لوگ باتیں تو بڑی بڑی بناتے ہیں۔ چند نکمی ناولوں کے سوا، فرمائیے تو کون سی ادب کی کتاب کسی غیر زبان سے اصلی خوبی کے ساتھ ہندوستان کی زبان میں لائی گئی ہے جسے کسی پایہ کی کتاب کہہ سکیں۔ جہاں اپنی محدود و ناکمل بول چال کے ذخیرہ پر ناز ہو اور غیر زبانوں کو وحشیوں کی زبان تصور کریں، یا اُن کو ناپاک خیال کریں، یا ان کا ترجمہ کفر سمجھیں، تو زبان کیا ترقی کر سکتی ہے۔

از شیو نرائن شمیم (فروری ۱۹۱۳ء)

اُردو کی رفتار

گزشتہ سے پیوستہ سہ ماہی کی رپورٹ شاہد ہے کہ اُردو کی رفتار ایک حد تک تشفی بخش معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو اس کی خاطر خواہ ترقی کی امید بندھتی ہے۔ یہ وقت آگیا ہے کہ انجمن ترقی اُردو اپنے محدود دائرے کو وسیع کر کے سرگرمی سے کام لے۔ انہیں تو نام لینے کے لئے ملک میں بہتیری ایسی انجمنیں ہیں جو سال بھر دم توڑتی رہتی ہیں اور جب اڈریس پیش کرنا پڑتا ہے تو جی اٹھتی ہیں۔ حامیانِ اردو کو ادیب کے کسی پچھلے نمبر میں ہم اس طرف متوجہ کر چکے ہیں۔ خود اردو زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ ع "خواہی تو مرا بسوز خواہی بنواز"۔ انجمنیں جب تک نبض شناس نہ ہوں گی ترقی نہیں کر سکتیں۔ اُردو میں خود بخود ترقی کرنے کا جو کچھ مادہ ہے اس سے وہ کام لے رہی ہے۔ اس کی قوت کو بڑھانا مدعیوں اور حامیوں کا فرض ہے۔ ذیل کی تفصیل سے اس کی رفتار کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے:

ممالک متحدہ اکتوبر سے دسمبر ۱۹۱۲ء تک کل ۳۰۴ کتابیں اور رسالے شائع ہوئے۔ یعنی ہندی میں ۱۲۰، مختلف زبانوں میں ۶۲، اُردو میں ۵۸، انگریزی میں ۳۸، سنسکرت میں ۱۲، فارسی میں ۷، عربی میں ۳، نیپالی میں ۲، پربتی میں ۱، اور بنگلہ میں ۱؛ اخبار اور رسالوں کی تعداد صرف ۱۵ ہے:- ماہوار ۱۲، ہفتہ وار ۲، اور پندرہ روزہ ۱۔ ان میں سے انگریزی میں ۶، ہندی میں ۵، اردو میں ۲، سنسکرت اور مختلف زبانوں میں ایک ایک۔ اگرچہ باعتبار تعداد ہندی کے مقابلہ میں اُردو نصف سے بھی کم ہے۔ لیکن اُردو کے ہندوستان کے عام زبان ہو جانے کی نہایت قوی وجہ پیش کی جاتی ہے کہ حامیانِ ہندی بھی اردو کو ہی پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ ۵۸ اردو کتابوں میں سے تقریباً ۴۰ فیصدی ایسی ہیں جن کے مصنف یا مؤلف حامیانِ ہندی ہیں۔

صوبہ پنجاب ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک کل ۵۶۰ کتابیں اور رسالے شائع ہوئے۔ یعنی ۴۸ فیصدی اردو میں، ۳۵ فیصدی پنجابی میں۔ انگریزی میں صرف ۸، اور ہندی میں کل ۶۸ کتابیں شائع ہوئیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ ۴۷ فیصدی اردو استعمال کرنے والی آبادی کے لئے ۴۸ فیصدی کتابیں لکھی گئیں، ۳۶ فیصدی پنجابی زبان استعمال کرنے والی آبادی کے لئے ۳۵ فیصدی کتابیں لکھی گئیں۔ اور ۷ فیصدی ہندی والی آبادی کے لئے صرف ۴ فیصدی کتابیں کافی سمجھی گئیں۔ اُردو کا ایک فیصدی بڑھ

جانا اور ہندی کا ۱۳ فیصدی گھٹ جانا اس امر کے لئے کافی ثبوت ہے کہ اردو میں عام زبان ہو جانے کا مادہ موجود ہے۔ ۱۹۱۱ء میں یہاں کل ۲۴۵ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے اُردو کے ۱۷۱، انگریزی کے ۳۹، گورمکھی کے ۲۲، اور ہندی کے ۱۳ تھے۔ ان تمام اخبارات ورسائل کی مجموعی اشاعت کی تعداد ۱۹۱۰ء میں ۲۰۲۹۰۵ تھی، جو ۱۹۱۱ء میں ۲۸۷۶۴۱ ہو گئی۔ اس سال صرف ۱۳ بڑے بڑے اخبارات کی تعداد اشاعت ۵۰۷۴۶ ہے، جن میں سے ۹ اُردو کے اخبارات کی تعداد اشاعت ۵۷۷۶۰ ہے۔

صوبہ بہار بہار کی رپورٹ اب تک مرتب نہیں ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ لکھی جائے گی۔ — ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۳ء)

رپورٹ صوبجات متحدہ

حال میں صوبجات متحدہ و آگرہ کی سرکاری رپورٹ بابتہ ۱۱-۱۹۱۰ء شائع ہوئی ہے۔ اس پر سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوتا ہے کہ سال زیر رپورٹ میں علمی تصانیف میں روز افزوں ترقی جاری رہی۔ یعنی تعداد اشاعت ۱۹۸۸ سے ۲۱۴۵ پر پہنچ گئی ہے۔ حامیانِ اُردو کو خوش ہونا چاہیئے کہ خاص طور سے کثرت اشاعت اردو تالیفات وتصنیفات میں ہوئی، جس کی زیادتی اشاعت کا اوسط ۲۵ فی صدی رہا۔

۱۹۰۹ء میں ہندی کتب کی اشاعت غیر معمولی طور پر نمایاں اور کثرت تعداد میں ہوئی تھی۔ مگر تعجب ہے کہ اس مرتبہ ہندی کتب کی تعداد بہت کم رہا۔ اسی طرح بنگالی کتب میں بھی ۴۰ فیصدی کی کمی محسوس کی گئی ہے۔

۱۹۱۰ء میں مذہبی کتابیں بہت لکھی گئیں، جن کی تعداد ۶۸۰ پر پہنچتی ہے۔ فلسفہ مذہب کے متعلق سب سے دلچسپ کتاب "الدین والقوم" ہے، جس کے مصنف آنریبل جسٹس سید کرامت حسین صاحب ہیں۔ اس میں خدائے برتر کا وجود، اس کی وحدانیت، اور قیاس، دکلیہ ارتقا نہایت معرکہ سے ثابت کیا گیا ہے۔ دوسری قابل ذکر کتاب فطرۃ الاسلام ہے، جس کے مصنف نواب سید علی حسن خاں صاحب ہیں۔ اس میں عقل اور حکمت کو معیار حقانیت قرار دے کر اسلام کو مذہب حق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تاریخی کتابوں کے زمرہ میں پروفیسر رام دیو کی "تاریخ ہند" جلد اول (ہندی) کا ذکر ہو سکتا ہے۔ اس کی زبان صاف ہے اور عمدہ اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ مؤلف میں تنقید وتحقیق کا مادہ نہیں، جس کے باعث یہ عظیم الشان تالیف بے قدر وقیمت ہو گئی ہے۔ اگر تاریخی حیثیت سے دیکھا جائے

تو تاریخ اودھ اور تاریخ ابن خلدون کے اجزا قابل قدر ہیں۔

قانونی کتابیں بھی کافی تعداد میں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض نہایت قابل قدر ہیں۔

نظم میں بھی تالیفات و تصنیفات بہت ہوئی۔ جن میں زیادہ تعداد منظوم کتابوں کی ہے۔

ناول اور افسانہ کے متعلق کوئی خاص اور نئی بات نہیں۔ غیر زبان کے تراجم کثرت سے شائع کیے گئے۔ تاہم بعض اچھے ناول اور افسانے بھی شائع ہوئے۔

سال زیر رپورٹ کی عام کتابی اور علمی حالت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ، فلسفہ، مذہب اور دنیائے نظم میں تو چند کام کی کتابیں نکلی ہیں۔ مگر سخت افسوس کا مقام ہے کہ سائنس کے متعلق کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ گویا مذاق علمی اور رفعت دماغی کا معیار بہت پست رہا۔

اخبارات کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہوا۔ اردو میں ۸۲، ہندی میں ۵۶ اور انگریزی میں ۱۴، اخبارات و رسائل شائع ہوئے۔ جدید اخبارات و رسائل میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں:۔

انگریزی	(۱) ویدک میگزین	(۲) مسلم ریویو	
اردو	(۱) ادیب الہ آباد	(۲) القاسم دیوبند	
ہندی	(۱) مریادا	(۲) کام دھینو	(۳) گورو کل سماچار

ادیب اور مریادا کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے۔ چنانچہ ادیب کے متعلق یہ الفاظ ہیں:

"A well-written, illustrated magazine of considerable literary merit"

چونکہ قانون مطابع کی ضابطہ بندی سے تین اخبارات، (سوراجیہ، کرم یوگی، ہند دیر دیپ) کو بند ہونا پڑا اس وجہ سے اخبارات کا لب و لہجہ ترقی پذیر رہا۔ تاہم مذہبی مسائل کے متعلق ان کا لب و لہجہ نہایت ترش رہا اور مختلف دھڑا بندیوں کے قایم مقام اخبارات نے اپنے مخالفین پر نہایت زہریلے حملے کیے اور بالآخر تین اخباروں سے ضمانت طلب کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو پرچوں کی زندگی، ضمانت داخل نہ کرنے کے باعث، ختم ہو گئی۔ نکتہ چینی کے لحاظ سے ایک گونہ اصلاح اور ترقی کے آثار پائے گئے، البتہ حقیقت حال اور معقول معلومات کا پلہ نیچا رہا۔

گورنمنٹ کی رائے میں سال زیر رپورٹ میں بمقابلہ ۱۹۰۹ء کے نظمی ماحصل زیادہ رہا۔ خصوصاً مذہبی

تصنیف و تالیف میں کثرت رہی، گو تعداد کی زیادتی سے صفات و محاسن میں کوئی نمایاں فروغ نظر نہیں آیا۔ معدودے چند تاریخی اور قانونی کتب کے سوا کوئی اور کام کی چیز نہیں دیکھی گئی۔ دونوں مذہبی فریق کے اخبارات کا لب و لہجہ، امور مذہبی کے متعلق نہایت متعصبانہ رہا۔ مگر امور سیاست پر نرم۔ اگرچہ کئی ایڈیٹروں سے ضمانت طلب کی گئی، مگر مقدمہ صرف ایک ہی اخبار پر چلایا گیا۔

— ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۲ء)

رفتارِ اُردو

مارچ کے ادیب میں اس موضوع پر ایک مختصر بحث کی گئی ہے اور سرکاری رپورٹ سے دکھایا گیا تھا کہ اُردو کی روز افزوں ترقی اس امر کا کافی ثبوت دے رہی ہے کہ اس میں ہندوستان کی عام زبان ہو جانے کی صلاحیت بدرجۂ احسن موجود ہے۔ ادیب کی گذشتہ جلدوں میں بھی ملک کے مستند اہل الرائے بزرگوں کے خیالات اس کی حمایت میں ظاہر کیے جا چکے ہیں۔ اور ہوا خواہان ترقی اردو کو بارہا متوجہ کیا گیا ہے کہ اس ہونہار زبان کی دستگیری کا سرگرمی سے کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ کوئی عملی ثبوت نہیں دیتے۔ حالانکہ اُردو زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ میری فطرت میں ترقی کا مادہ ودیعت رکھا گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مخالفین اس کے در پے آزار ہوں اور اس کو پامال کر دینے کی فکر میں لگے ہوں۔ مگر اُردو ان کی ایک نہیں سُنتی اور یہ کہتی ہوئی بڑھتی چلی جاتی ہے کہ ع :
"ماراست ردیم لیک تو دخ می بینی"۔ بہرحال، ہمعصر مساوات نے حال ہی میں اس کی رفتار کا اندازہ کر کے دکھایا ہے۔ جس کا اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"اُردو کی عالمگیر ترویج" اور باوجود انتہا مخالفانہ کوششوں کے اس کی شاندار ترقی ہمارے نزدیک تو اعجاز سے کم نہیں۔ مخالفین اُردو تو غریب، بیکس، بے بس اُردو کا کوئی مفروضہ یا ناقابل ذکر گناہ بھی ہم کو اب تک نہیں تبلا سکے۔ ایک مُردہ زبان کے سڑے گلے جسم میں نئے سرے سے جان ڈالنے کی بے سود کوششیں، اور ایک چلتی چلاتی اور ترقی پذیر زبان و رسم الخط کا محض نحس کر نا ضروری سمجھتے ہیں، جو امر کسی معقول پسند شخص کے نزدیک مستحسن نہیں ہو سکتا۔ باوجود ان تمام مخالفانہ سازشوں کے یہ بات مسرت انگیز ہے کہ زبان اردو بفضلہ تعالیٰ امید سے زیادہ نشو و نما پا رہی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قدرتی اسباب کا مقابلہ عبث ہے۔ صوبجات متحدہ کی رپورٹ مردم شماری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں اُردو خواں اصحاب کی تعداد میں معقول بیشی ہوئی ہے۔ سن ۱۹۰۱ء میں ۲۴۴۸۴۶۸ آدمی اُردو داں تھے۔ ۱۹۱۱ء میں یہ تعداد ۲۸۶۶۵۱ تک جا پہنچی

گویا اس عرصہ میں ۳۸۱۸۳ کی بیشی ظہور میں آئی ۔ اس ۱۵ فی صدی اضافہ کے مقابلہ میں ہندی کے سرپرست اصحاب تین فی صدی سے زیادہ نہیں بڑھ سکے ۔ تاہم اردو کی یہ ترقی صوبجات متحدہ کے لئے جو زبان اردو کا مرکز ہے کسی طرح قابلِ تسکین نہیں ہے ۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ اردو کے سرپرست اپنی مظلوم زبان کی اشاعت کا بہت کم خیال رکھتے ہیں ۔"

اگر حامیان اردو اس سے کم کوشش اور سرگرمی بھی دکھائیں ' جو مخالفین اردو اس کی بربادی کے لئے کر رہے ہیں تو یقین ہے کہ اس کی رفتار میں حیرت انگیز ترقی ہو اور کسی مخالفت کا اُردو پر اثر نہ پڑے ۔

— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۳ء)

اُردو شارٹ ہینڈ

ہوا خواہانِ اردو یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ ریڈر کرسچین کالج لکھنؤ میں اُردو مختصر نویسی کا جو طریقہ جاری کیا گیا تھا ، اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے ۔ حال میں وہاں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں طریقہ کی آزمائش کی گئی ۔ اس کے طلبا فی منٹ ۲۰۰ لفظ بآسانی لکھ سکتے ہیں ۔ چنانچہ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما نے جو تقریر اس جلسہ میں کی تھی اس کی رپورٹ قابل اطمینان طریقہ میں لی گئی ۔ صدر جلسہ نے رائے دی کہ ہندی مختصر نویسی کا طریقہ بھی رائج کیا جائے ۔

— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۱ء)

ہندو یونیورسٹی

یہ دریافت کرنا بہت کچھ طمانیت بخش اور مسرت انگیز ہے کہ "ہندو یونیورسٹی" کے لئے چندہ فراہم کرنے کا کام عملی طور پر شروع ہو گیا ہے ۔ اس مقصد کے لئے پہلا جلسہ ۱۲ مئی کو کچہری میں منعقد ہوا تھا ، جس میں بڑے بڑے ہندو معززین شامل تھے ۔ آنریبل بابو گنگا پرشاد صاحب ورما اور پنڈت گوکرن ناتھ صاحب مشر لکھنؤ سے اور پنڈت اقبال نارائن صاحب بنارس سے تشریف لائے تھے ۔ راجہ راجندر بہادر سنگھ صاحب تعلقدار میر مجلس تھے ۔ جلسہ کی کارروائی پنڈت اقبال نارائن صاحب کی تقریر سے شروع ہوئی ، جس میں انہوں نے "ہندو یونیورسٹی" کی اسکیم کو واضح کیا تھا ۔ آپ نے فرمایا :

" موجودہ یونیورسٹیاں بیشک اچھا تعلیمی کام کر رہی ہیں ۔ لیکن "ہندو یونیورسٹی" کچھ اور ہی چیز ہوگی اور اس کا تعلیمی کام ہندو نقطۂ خیال سے بدرجہا بہتر اور اعلیٰ ہوگا ۔"

بابو گنگا پرشاد صاحب ورما نے ایک ریزولیوشن پیش کیا ، جس میں یہ چاہا گیا تھا کہ آنریبل پنڈت

مدن موہن مالوی اور مسز اینی بیسنٹ کی یونیورسٹیوں کی تجاویز کو ملا دیا جائے اور صرف ایک ہی یونیورسٹی قائم ہو۔ بابو سیتارام صاحب بی اے، نے اس ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے دونوں یونیورسٹیوں کی تجاویز میں اصولی اختلاف ظاہر کیا، اور فرمایا کہ:

"یہ اختلاف بھی دور ہو سکتا ہے، بلکہ اس کو دور کرنے کی سخت ضرورت ہے، تاکہ ہندؤں کی طاقت اور دولت دو یونیورسٹیاں قائم کرنے میں نہیں، بلکہ ایک ہی یونیورسٹی قائم کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے میں صرف کی جائے۔"

آخر میں چندہ کی اپیل ہوئی اور اسی جگہ ۵۲ ہزار روپیہ کے وعدے ہوئے۔ گویا ایک گھنٹہ سے کم عرصہ میں نصف لاکھ روپیہ سے زیادہ جمع ہو گیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ابتدا اچھی نہیں ہے۔ امید ہے کہ ہندو قوم اس عظیم الشان تحریک کے متعلق اپنی اہم ذمہ داریوں کو محسوس کرے گی اور ثابت کر دکھلائے گی کہ وہ ایک زندہ قوم ہے اور اپنی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کا دل اور حوصلہ رکھتی ہے۔

— ایڈیٹر (جون ۱۹۱۱ء)

ہندو یونیورسٹی

بعض اخبارات نے مسز اینی بیسنٹ کی مجوزہ "انڈین یونیورسٹی" اور آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی کی مجوزہ "ہندو یونیورسٹی" کے الحاق کی خبر مشتہر کی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی محرک مسز اینی بیسنٹ کی وہ تحریر ہو جس کو انہوں نے سنٹرل ہندو کالج میگزین میں شائع کیا تھا۔ لیکن یہ خبر بے بنیاد ہے۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستقل تجویز نہیں ہوا۔ چنانچہ خود آنریبل پنڈت صاحب اخبار لیڈر کے ذریعہ سے اس خبر کو قبل از وقت بتاتے اور اس کی تردید کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"الحاق کا سوال ہنوز زیر غور ہے، جن لوگوں کو اس تحریک سے دلچسپی ہے، انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ ہندو جماعت کے لیڈروں اور مالی مددگاروں کی آرا پر خوب غور کیا جائے گا۔ لیکن سب سے ضروری سوال روپیہ کی فراہمی کا ہے۔ جو لوگ جلد یونیورسٹی کو قائم دیکھنا چاہتے ہیں ان سے میری درخواست ہے کہ وہ اپنی توجہ اور اپنی طاقت کو اسی کام میں صرف کریں جب تک ۲۵ لاکھ روپیہ فراہم نہ ہو جائے اس وقت تک چارٹر حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جا سکتی۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ رقم فراہم ہو جائے۔"

— ایڈیٹر (جون ۱۹۱۱ء)

کانفرنس صلح

تعلیم کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان خود غرضی کے تنگ اور منحوس دائرہ سے نکل کر فائدہ عام کے وسیع اور کشادہ میدان میں قدم مارنے لگتا ہے اور کھلی تازہ ہوا کا لطف اٹھاتا ہے۔ چنانچہ ہندو محمڈن کانفرنس اسی گلزار کا ایک شگوفہ ہے کہ سرکردگان اہل ہنود و اہل اسلام ایک کانفرنس میں جمع ہو کر باہمی اتحاد کے وسائل پر غور کریں اور اس اتحاد میں جو امور حائل اور مخل ہوں ان کو دور کریں۔ اس کانفرنس کا اجلاس یکم جنوری ۱۹۱۱ء کی صبح کو راجہ ہوٹل میں فراہم ہوا۔ جو شخص اس کانفرنس کے انعقاد کو اچھا خیال نہیں کر سکتا وہ کسی اچھی بات کو بھی سمجھنے کے لائق نہیں۔ الٰہ آباد میں گنگا اور جمنا ملتی ہے اور یکجان ہو کر بہتی ہے۔ یہیں اب قوم کے دو بچھڑے ہوئے بھائی ملتے ہیں۔ یہ ایک قابل یادگار اور تاریخی واقعہ تھا۔ اگر مشرق اور مغرب آپس میں نہیں مل سکتے تو کوئی وجہ نہیں کہ مشرق مشرق بھی نہ مل سکیں۔ بہر حال سر ولیم ویڈربرن کی تحریک پر اس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ دونوں گروہوں کے قائم مقاموں کی کافی تعداد موجود تھی۔ سر ولیم ویڈربرن نے افتتاحی تقریر فرمائی جس کا ایک ایک لفظ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے:

"میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ لوگ میری درخواست پر یہاں تشریف لائے۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا خیر اندیش ہوں اور میرا یہ خیال ہے کہ دونوں کی بڑھتی ہوئی شکر رنجی ملک کی ترقی اور خوش حالی کے لئے سخت مضر ہے۔ اگر ہندو اور مسلمان دونوں مل کر کام کریں، تو ہندوستان کو ایک شاندار مستقبل حاصل ہو سکتا ہے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات اچھے نہ ہوں گے اس وقت ہندوستان کی بہبودی کی امید کرنا ایک امید موہوم ہے۔"

— ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۱ء)

انڈین نیشنل کانگریس

انڈین نیشنل کانگریس کا ۲۵ واں اجلاس ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ ماہ رواں کو احاطۂ نمائش کے اندر ایک وسیع میدان میں منعقد ہوا۔ کانگریس کا پنڈال سفید کپڑے سے منڈھا ہوا تھا اور اندر کی جانب رنگین کپڑوں کی تہری جھالر بھی لگائی گئی تھی۔ ستونوں میں نامور لیڈران کانگریس کی تصویریں آویزاں کی گئی تھیں، جو گذشتہ اجلاسوں میں کانگریس کے پریسیڈنٹ ہو چکے تھے۔ ۲۵ دسمبر سر ولیم ویڈربرن پریسیڈنٹ کانگریس کے داخلے کی تاریخ تھی اور علی الصباح ہی سے لوگ اسٹیشن الٰہ آباد پر جمع ہونے لگے تھے۔ استقبال نہایت شاندار تھا اور خلقت کے انبوہ کثیر سے وہ منت پذیری ظاہر تھی، جو سر ولیم ایسے محب ہند اور بانی کانگریس کے اس پیرانہ سالی میں اسی دور دراز سفر کے لئے ہر دل میں موجزن تھی۔ اس معمر بزرگ کی نورانی صورت نمودار ہوتے ہی ہر طرف خوش آمدید کے نعرے گونجنے لگے اور جوش مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

دوسرے روز ۱۲ بجے اجلاس شروع ہوا۔ اس روز اگرچہ مجمع کم تھا تاہم پریسیڈنٹ کی آمد پر غیر معمولی مسرت کا اظہار ہوا اور نعرہ ہائے خوشی دیر تک گونجتے رہے۔ سر ولیم ایک دریا کرسی پر متمکن ہوئے۔ ان کے داہنے جانب مشہور فصیح بنگال سریندر وناتھ بنرجی اور بائیں طرف آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر واچا جلوہ افروز تھے۔ اسی طرح سارا پلیٹ فارم مشہور لیڈران کانگریس سے بھرا ہوا تھا۔ پلیٹ کے بائیں جانب زنانہ درجہ تھا جس میں پردہ نشین وغیر پردہ نشین لیڈیوں کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ پنڈال کی ساخت مدوّر تھی اور گرداگرد مختلف درجے تھے۔ بیچ میں مختلف ممالک کے ڈیلیگیٹوں کی نشست کا انتظام کیا گیا تھا جو دور دراز مقامات سے شرکت کانگریس کے لئے آئے تھے۔

سب سے پہلے آنریبل پنڈت سندر لال سی۔ آئی۔ ای چیرمین ریسپشن کمیٹی نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ بعد ازاں انتخاب پریسیڈنٹ کا مسئلہ پیش ہوا اور بابو سریندر وناتھ بنرجی نے اپنی فصاحت وخوش بیانی کے پھول سر ولیم کی تعریف اور ان کی مسلسل خدمات کانگریس کے انتخاب میں نچھاور کئے۔ انتخاب پریسیڈنٹ کا مسئلہ اگرچہ مہینوں پیشتر طے ہو جاتا ہے تاہم اس رسمی کارروائی سے پریسیڈنٹ کے اوصاف پر تفصیلی روشنی پڑ جاتی ہے۔ بہرکیف مسٹر بنرجی کی تجویز کی تائید میں آنریبل راؤ بہادر۔ آر۔ این۔ مدھولکر (امراوتی) آنریبل مسٹر۔ این۔ سبا راؤ۔ (مدراس)، لالہ ہرکشن لال (لاہور) اور آنریبل پنڈت مدن موہن مالوی (الہ آباد) نے تقریریں کیں۔ موخر الذکر کے سوا سب کی تقریریں نہایت مختصر تھیں۔ مسٹر مالوی نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی کہ مجھ سے ہندی زبان میں اسپیچ کی فرمائش کی گئی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی اسپیچ میں فیصدی نوّے الفاظ اردو یا فارسی تھے۔ ان ابتدائی مراسم کے بعد پریسیڈنٹ کا ایڈریس شروع ہوا۔ جس کے ابتدائی پیراگراف خود سر ولیم نے باوجود ضعف ونقاہت خود بیان کئے۔ بعد ازاں اپنا ایڈریس آنریبل مسٹر گوکھلے کو دے دیا جنہوں نے نہایت فصاحت سے مگر کسی قدر عجلت کے ساتھ اُسے ختم کیا۔ اس ایڈریس میں کانگریس کے تمام مقاصد کا اعادہ کیا گیا تھا اور اہل ہند کو ادب واستقلال کے ساتھ گورنمنٹ سے حقوق طلبی کی ہدایت کی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک کمیٹی نے مضامین بحث طلب کا انتخاب کیا اور اجلاس تقریباً دو بجے برخاست ہو گیا۔ پہلا اجلاس اس قدر مختصر ہونے کی وجہ تقریروں کا اختصار تھا جو عام طور پر جلد ختم کی گئیں۔

دوسرے روز بھی بارہ بجے سے اجلاس شروع ہوا اس روز مجمع کثیر تھا اور سارے پنڈال میں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ اس روز تقریریں بھی زیادہ ہوئیں اور اکثر مقرروں نے داد خوش بیانی دی۔ پہلا رزولیوشن شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی وفات پر اظہار افسوس اور ہز مجسٹی کے عہد میں ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے ملنے کی شکرگزاری سے تعلق رکھتا تھا۔

دوسرا رزولیوشن ملک معظم شہنشاہ جارج پنجم کی تخت نشینی کی مبارک باد اور تخت انگلستان سے کانگریس کی وفاداری کے اظہار میں پیش کیا گیا۔ اس میں حضور اقدس و اعلیٰ اور علیا حضرت ملکہ معظمہ کی تشریف آوری ہندوستان کی خوشخبری پر اظہار مسرت بھی کیا گیا۔

تیسرا رزولیوشن جدید وائسرائے کے خیر مقدم اور ہز ایکسلنسی کی خدمت میں ایڈریس اور ڈپوٹیشن کے متعلق تھا، جو پریسیڈنٹ کانگریس کی سرکردگی میں پیش ہوگا اور جس میں مع پریسیڈنٹ تمام منتخب اصحاب ہوں گے۔

چوتھا رزولیوشن کونسل رفارم کے قوانین سے تعلق رکھتا جو ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی (الہ آباد) نے پیش کیا اور راے بہادر ایم۔ اوی نراین ایہ (مدراس) نے تائید کی اور جس کی تائید مزید میں آنریبل مسٹر ہرچند رائے (کراچی)، نواب صادق علی خاں (شیش محل لکھنؤ) اور شیخ فیاض علی (ہردوئی) نے تقریریں کیں۔

پانچواں رزولیوشن لا ممبری سے متعلق تھا جس میں چاہا گیا کہ وائسرائے لیجسلیٹو کونسل میں بیرسٹروں کے علاوہ ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ اور وکیل بھی لا ممبری کے عہدے پر مقرر کیے جائیں۔ یہ رزولیوشن آنریبل مسٹر مجید الحق (بانکی پور) نے پیش کیا اور راؤ بہادر بی۔ ان سرما (وزیاگرم) نے تائید کی۔

چھٹا رزولیوشن صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ میں اگزیکٹو کونسل قائم ہونے کے متعلق تھا، جسے پنڈت گوکرن ناتھ مسر (لکھنؤ) نے پیش کیا اور مسٹر راج پال (امرتسر) نے تائید کی۔

ساتواں رزولیوشن ٹرانسوال کے ہندوستانیوں سے تعلق رکھتا تھا جن پر ٹرانسوال کی گورنمنٹ سخت تشدد کر رہی ہے۔ جسے مسٹر جی۔ اے۔ نٹیسن (مدراس) نے پیش کیا اور جس کی تائید ڈاکٹر منی لال (ماریشس) نے اور تائید مزید مسٹر رگھونندن پرشاد (بستی) نے کی۔

آٹھواں رزولیوشن سودیشی تحریک سے تعلق رکھتا تھا جسے مسٹر چنتامنی (الہ آباد) نے پیش کیا اور مسٹر جتیندر لال بنرجی نے تائید اور بابو دوارکا ناتھ (مظفرپور)، مسٹر کرشن راؤ (راجمندری)، سریندر پرشاد باسو (کلکتہ) اور مسٹر لوکامل (کراچی) نے تائید مزید کی۔

نواں رزولیوشن جوڈیشیل رفارم کے متعلق تھا، جسے بابو جوگیندر ناتھ مکرجی (کلکتہ) نے پیش کیا اور آنریبل بابو برج کشور پرشاد (دربھنگہ) نے تائید، مسٹر رام سوامی آئر (مدراس) اور بابو بنارن چندر داس (بریسال) نے تائید مزید میں تقریریں کیں۔

دسواں رزولیوشن لوکل سلف گورنمنٹ کے متعلق تھا جسے ڈاکٹر ایچ ایس۔ گوڑ (راے پور) نے پیش کیا اور آنریبل مسٹر رگھو راؤ (برہمپور) نے تائید۔ مسٹر سری نواس شاستری (مدراس) اور منشی سنکٹا پرشاد (بنارس) نے تائید کی۔

گیارہواں رزولیوشن تقسیم بنگال سے تعلق رکھتا تھا جسے بابو امبیکا چرن موزمدار نے نہایت زوردار تقریر کے ساتھ پیش کیا اور دیوان بہادر کرنگرا مینن (مدراس) نے تائید مزید کی۔

مندرجہ بالا رزولیوشن جس ترتیب سے پروگرام میں درج تھے اس ترتیب سے پیش نہیں ہوئے۔ بلکہ ان میں سے اکثر مقدم و موخر ہو گئے۔ نیز دوسرے روز کے پروگرام کے سب رزلیوشن اُس روز پیش بھی نہیں ہو سکے۔ چنانچہ لوکل سلف گورنمنٹ اور تقسیم بنگال کے مسئلے تیسرے اجلاس میں پیش ہوئے۔ اس روز کے پہلے اجلاس میں پریسیڈنٹ کسی ضرورت سے چلے گئے تھے اور بابو سر سریندر ناتھ بنرجی ان کے بجائے کانگریس کی کارروائی انجام دیتے رہے۔ اس میں ہندوستانیوں کو میڈیکل سروس میں داخل کرنے کے متعلق بھی ایک رزولیوشن پیش ہوا۔ جسے سر بھالچند کرشنا (بمبئی) نے تائید اور ڈاکٹر ہری دت پنت (لکھنؤ) نے تائید مزید کی۔

اس کے بعد باغیانہ جلسوں اور پریس ایکٹ کے متعلق رزولیوشن مسٹر جے۔ چودھری (کلکتہ) نے پیش کیا اور مسٹر کرشنا راؤ (نیلور) نے تائید اور مسٹر دوارکا ناتھ (بانکی پور) نے تائید مزید میں تقریریں کیں۔ اسی طرح تمام پولیٹکل مسائل کے متعلق رزولیوشن پیش ہوتے رہے اور مختلف اضلاع کے اسپیکر تقریریں کرتے رہے۔ دو بجے اجلاس عارضی طور پر برخاست ہوا اور چند گھنٹے بعد پھر شروع ہوا۔ اس میں بھی حسب دستور پولیٹکل اصلاحات کے مسئلے پیش ہوتے رہے لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے بہت سے اسپیکروں کو تقریر کا موقع نہیں ملا۔ تیسرے روز کے پہلے اجلاس میں مجمع بہت کم تھا لیکن دوسرے اجلاس میں تمام پنڈال بھرا ہوا تھا اور تقریریں بھی زور شور سے ہوتی رہیں۔ ہر طبقے اور ہر ملت کے سربرآوردہ اشخاص کانگریس میں شریک تھے، جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے تھے اور مجموعی حیثیت سے الہ آباد کا اجلاس کانگریس کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن لکھنؤ، بنارس اور کلکتہ کے اجلاسوں کے مقابل میں نہایت پھیکا تھا۔ اس کانگریس میں ہندو مسلمانوں کی موجودہ نااتفاقی پر بھی بحث کی گئی اور ان اسباب کو دور کرنے کی صلاح دی گئی، جو ملک کی دو بڑی قوموں میں عناد کا باعث ہیں۔ ان کے لئے عملی کارروائی کی بھی تجویز پیش ہوئی اور جابجا اتحادی جلسے کرنے پر زور دیا گیا۔ لیکن درحقیقت اتحاد محض دلی صفائی پر مبنی ہے۔ اس کے لئے ہمیں صرف اب سے نصف صدی پیشتر کے طرز عمل پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہندو مسلمان شیر و شکر ہو رہے تھے اور قومی تفریق کا نام و نشان تک باقی نہ تھا۔ موجودہ حالت میں جب قومی احساس اور پولیٹکل خودغرضی کے سمندر ہلکورے لے رہے ہیں، ایسے اتحادی جلسے جن کی کارروائیاں محض کاغذ تک محدود رہتی ہیں زیادہ نتیجہ خیز نہیں معلوم ہوتے۔

کانگریس کی بقیہ کارروائی کے لئے چوتھے روز بھی اجلاس ہوا اور یہ اجلاس نسبتہً سب اجلاسوں سے زیادہ بارونق تھا۔ اسپیچیں بھی زیادہ زوردار ہوئیں اور پریسیڈنٹ کے شکریہ پر کانگریس برخاست ہوئی۔

اسکے روز سوشیل کانفرنس بھی منعقد ہوئی، جس کے پریسیڈنٹ راجہ رامپال سنگھ بالقابہ تھے۔ حاضرین کی تعداد اور جلسہ کی کارروائی قابل تعریف تھی۔

ٹمپرنس کانفرنس بھی اسی روز ایک دوسرے خیمے میں منعقد ہوئی جس کے پریسیڈنٹ پادری فریڈرک صاحب تھے اور عام مذاہب کی کانفرنس بھی جس کے پریسیڈنٹ جسٹس کرشنا سوامی آئر تھے۔

انڈین انڈسٹریل کانفرنس ۳۰ دسمبر کو کانگریس کے پنڈال میں زیر صدارت مسٹر آر۔ این۔ مکرجی منعقد ہوئی، جس میں ایک اعلیٰ درجے کے ٹکنیکل کالج کے انعقاد پر زور دیا گیا۔

— ایڈیٹر (دسمبر ۱۹۱۰ء)

دہلی میں کتبخانہ

دہلی کے روشن خیال اصحاب چاہتے ہیں کہ حضور وائسرائے کی صحتیابی کی یادگار اس طرح قائم کی جائے کہ اس جگہ پر جہاں ۲۳ دسمبر کو حادثہ ظہور میں آیا تھا ایک عمارت بنادی جائے، جس سے پبلک لائبریری کا کام لیا جائے ... سنا جاتا ہے کہ حضور وائسرائے نے خود اس تجویز سے اتفاق کیا۔ جلسہ ہونے سے پیشتر تقریباً ۲۵ ہزار روپوں کے وعدے بھی ہو گئے ...

— ایڈیٹر (اپریل ۱۹۱۳ء)

الہ آباد کا جدید کتبخانہ

الہ آباد کے ایک نوجوان روشن خیال لالہ برجموہن داس صاحب نے کچھ دنوں سے ایک کافی ذخیرۂ کتب مہیا کر رکھا تھا اور مرنے سے پیشتر دس ہزار روپے الگ کر گئے تھے کہ اس کتب خانہ کے لئے علیحدہ عمارت بنادی جائے جہاں اہل علم مطالعہ کتب کر سکیں اور ۲۵ ہزار روپے کی ایک اور رقم اس لئے مخصوص کر دی تھی کہ اس کے منافع سے کتب خانہ کو ترقی دیجائے۔ لالہ صاحب کے بڑے بھائی لالہ بھوانی پرشاد صاحب نے اور ۲۲ ہزار روپے لگا کر کتب خانہ کے لئے ایک خوشنما وسیع عمارت تیار کردی ہے جہاں تقریباً چار ہزار کتابیں اس وقت موجود ہیں۔ آنریبل ڈاکٹر سندر لال صاحب بہادر سی۔ آئی۔ ای نے اس کتب خانہ کا افتتاح فرمایا۔ چنانچہ لوگ اس کتب خانہ سے مستفید ہو رہے ہیں۔ الہ آباد میں واقعی ایسے کتب خانوں کی سخت ضرورت ہے جس سے عوام کو فائدہ پہنچے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اور روشن خیال حضرات بھی اس زندہ مثال کی تقلید کریں گے۔

— ایڈیٹر (مئی ۱۹۱۳ء)

مسلمانوں کا علمی شوق

یورپ کے بعض مؤرخ مسلمانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انہوں نے غیر ممالک کے علوم کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ان بزرگوں کو اس وقت تک خبر نہیں کہ اہل اسلام نے کس کوشش اور تشویق کے ساتھ غیر زبانوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ان کی شرحیں لکھیں اور بلا مبالغہ پبلک میں نئے جلوے کے ساتھ پیش کیا۔ جناب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی نے اس مبحث پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس میں بالتفصیل عنوان دے کر ثابت کیا ہے کہ ہر علم و فن کی کس قدر کتابیں مسلمانوں نے عربی میں ترجمہ کیں اور ان کو کس طریقہ سے ایجاد مرتب کیا۔ بلاشبہ یورپ صحت کا جو طریقہ غیر ملکی تصانیف کے ساتھ برت رہا ہے وہ مسلمانوں کا ایجاد ہے۔

ہم اس مضمون میں صرف ان یونانی تصانیف کا ذکر کریں گے، جو مختلف علوم و فنون کے عنوان میں آسکتی ہیں:۔

افسانے یونانی ادب کی جان ہومر کا کلام ہے، جس کی نسبت یورپ مان گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر اعلیٰ درجہ کی نظم آج تک نہیں ہوئی۔ کلیات ہومر کا ترجمہ خلیفہ مہدی کے عہد میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ تھاذ فیلوس نے سریانی میں کیا اور اصل یونانی زبان سے حال میں پروفیسر سلیمان بستانی نے عربی میں کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سے یونانی افسانے جو ناول کی حیثیت رکھتے تھے، ترجمہ کئے گئے مثلاً سمر ودمن، مورد یانوس، انطوس سیلاح دیوان و رجیل وغیرہ۔

تواریخ یونانی زبان میں جس قدر تاریخی سرمایہ ہاتھ آیا اس سب کو مسلمانوں نے اپنے یہاں لے لیا اور واقعی امر یہ ہے کہ جس درستی کے ساتھ روم و یونان کے حالات عربی میں ملتے ہیں اس قدر کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ مورخ مسعودی کی تصانیف اس برہان کی شاہد ہیں۔ مسعودی سے پہلے بھی مورخان اسلام نے اکثر یونانی تواریخ سے امداد لے کر تاریخیں لکھی ہیں۔ مثلاً قیس مارونی کی تاریخ شاہان روم و ممالک مختلفہ، ابن قسطنطینی کی کتاب فرق ملکیہ کے حالات میں، سعید بن بطریق کی تاریخ؛ اثنابوس کی تاریخ ابتدائے حضرت آدم سے شہنشاہ

ؔ دائرۃ المعارف جلد ۱۴ صفحہ ۲۶۱

قسطنطین کے حالات تک ۔ ان کے علاوہ یعقوب اور ابوزکریا کی تاریخیں بہت مستند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں۔

یہ اسلام ہی کا طفیل ہے کہ افلاطون، بقراط، ارسطو وغیرہ حکمائے یونان کا نام بچہ بچہ جانتا ہے۔ ان سب کی تصانیف کو مسلمانوں نے عربی میں ترجمہ کیا اور مضامین کی تشریح کی۔ اگر طب یونانی کو طب اسلامی کہا جائے تو بالکل درست ہے۔ مسلمانوں نے طب یونانی کو بالکل اسلامی سانچہ میں ڈھال دیا۔ رہا یونانی فلسفہ اس کی جانب مسلمانوں کا اس قدر شغف بڑھا کہ ایک نیا علم علمائے دین نے ایجاد کیا جس کا نام علم الکلام ہے۔ کیونکہ اسی فلسفہ کے اثر نے لوگوں کے خیالات کو الٹ پلٹ کر دیا تھا اور بعد کو شاہانِ اسلام نے اس کا ذخیرہ خاص طور پر کیا۔

فنِ حرب فن حرب کے متعلق یونان میں دو بڑے مصنف ایلیانوس دیوفیس گذرے ہیں ان کی تصانیف نہایت اعلیٰ پایہ کی اور بینظیر ہیں ۔ چنانچہ کل کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا گیا اور بعض یورپ میں چھپ بھی گئی ہیں ۔

نیرنجات قالس تانس (ارسطو کا شاگرد) غالباً شعبدات و نیرنجات کا یونان میں بانی ہے۔ چنانچہ اس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہوگئی ہے ۔ اس کا نام الجامع فی النیرنجات والخواص[1] ہے۔ ایک اور شخص بلیناس نامی گزرا ہے۔ اس کی کتاب کا بھی عربی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

قیافہ و فال قیافہ و فال کے متعلق حسب ذیل تصانیف عربی میں ترجمہ ہوئیں : کتاب الفراسۃ، کتاب زجر الروم۔ کتاب الخیلان ۔ کتاب فیثاغورس فی القرعۃ ۔ کتاب قرعۃ ذی القرنین۔ کتاب القرعۃ المنسوبۃ الی الاسکندر[2]

تعبیر خواب تعبیر خواب کے متعلق حسب ذیل کتب ترجمہ ہوئیں :۔ کتاب ارطامیدوروس۔ کتاب النوم والیقظۃ لفرفوریوس ۔

کیمیا جہاں اور کتابیں ترجمہ کی گئیں وہاں اس لغو فن کو بھی نہ چھوڑا۔ غرض یہ ہے کہ جس قدر علمی سرمایہ ہاتھ آیا، خواہ وہ کسی قسم کا کیوں نہ ہو اپنے یہاں لے لیا۔ کیمیا کے متعلق ذیل کی کتابیں عربی میں موجود ہیں : کتاب دیقرس فی الصنعۃ ۔ کتاب الاسکندر فی الحجر۔ کتاب دیقرس فی حجاب برلیوس ۔ کتاب قطوبعدو ۔ کتاب سقناس ۔ کتاب دومنیوس ۔ کتاب کرمانوس ۔

---

[1] کتاب الفہرست ص ۳۱۲ [2] ایضاً ص ۳۱۴

عربی پر یورپ کا احسان

بہت بڑا احسان یورپ کا عربی زبان پر یہ ہے کہ جو کتابیں نایاب اور مسلمانوں کے واسطے مایۂ فخر وناز تھیں ان کو نہایت جد و جہد سے تلاش کیا اور برسہا برس تک ایک ایک کتاب کو لائق علما نے درست کر کے شائع کیا۔ اس کام میں پہلا درجہ ہالینڈ کا ہے اور مخصوص فخر مسٹر برل کے پریس کو حاصل ہے۔ یہ مطبع لیڈن میں واقع ہے۔ ہالینڈ کے بعد جرمنی و فرانس ہیں۔ علما یورپ نے حقیقت میں ایسا کام کیا ہے کہ ہم مسلمان اُن کے احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کس قدر صدمہ دہ بات ہے کہ مسلمانوں کی یہ نایاب تصانیف دوسروں کے ہاتھ آئیں اور ہم ایسے ناخلف ہوں کہ اپنے بزرگوں کے علمی سرمایہ کو تلاش بھی نہ کر سکیں۔ مصر وغیرہ میں جو کتابیں چھاپی گئی ہیں وہ اکثر یورپ کے مطبوعات ہی سے منقول ہیں۔

مستشرقین کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔ ان کے ملاحظہ سے واضح ہو گا کہ علمی تحقیقات یوں کرتے ہیں۔

(۱) کتاب الفہرست کا جس جرمن مستشرق نے تصحیح کی اس کی عمر کے ۲۰ سال اس کام میں صرف ہوئے۔ یہ ایسی نایاب کتاب ہے کہ علم التاریخ کو اس کے شائع ہونے سے بہت مدد ملی ہے۔

(۲) ڈاکٹر فلیڈ ہرشل (جرمن مستشرق) نے تاریخ القرآن اٹھارہ سال صرف کر کے لکھی ہے اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن نے اس کو بحسن و خوبی طبع کیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور میں بار بار مؤلف کی تحقیق و محنت کا قائل ہو جاتا ہوں۔ ہمارے علما اگر یوروپین کوششوں کو نہ سراہیں تو کیا لیکن مصر وغیرہ کے علما کیونکر انکار کر سکتے ہیں۔

(۳) پروفیسر زاخو (جرمن) اور دیگر علما نے طبقات ابن سعد کا کامل نسخہ (۱۲ جلدوں میں) برسوں کے بعد تصحیح کر کے شائع کیا۔

(۴) پروفیسر دائٹ نے دیوان جریر اٹھارہ برس کی محنت میں شائع کیا۔

علاوہ ان کے پروفیسر رینان، پروفیسر سیدیو، ڈاکٹر لی بان، پروفیسر ڈوزی[۱] وغیرہم نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دی تھیں۔ ذیل میں ایک نقشہ صرف عربی تواریخ کا دیا جاتا ہے، جن کو یورپ نے

۱؎ پروفیسر ڈوزی نے ایک بڑا معرکۃ الآرا کام کیا ہے۔ پرانی عربی کتب میں ہزاروں ایسے الفاظ ہیں جو کہ موجودہ عربی لغات میں نہیں ملتے۔ چنانچہ پروفیسر ممدوح نے ایک لغت ان الفاظ کی دو جلدوں میں لکھی ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے یہ دقت بالکل رفع ہو گئی۔

شائع کیا ہے۔ تاریخ طبری (۱۲ جلد) اسلام میں اس سے زیادہ معتبر کوئی تاریخ نہیں ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اپنی مستند تاریخ میں جا بجا طبری سے مدد لی ہے۔ اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری۔ کتاب التنبیہ والاشراف علامہ مسعودی۔ انساب الاشراف علامہ بلاذری۔ تاریخ یعقوبی۔ فتوح البلدان علامہ بلاذری۔ الفہرست علامہ ابن الندیم بغدادی۔ رحلہ ابن جبیر اندلسی۔ المعجب۔ البیان المغرب فی اخبار المغرب علامہ مراکشی۔ سیرۃ صلاح الدین۔ قاضی بہاؤ الدین بن شداد۔ الفتح القسی علامہ عماد الاصفہانی۔ ذیل الطبری۔ المشتبہ علامہ ذہبی۔ معجم ابن ابار۔ اخبار مکہ، علامہ ازرقی۔ المنتقی باخبار ام القری۔ اعلام باعلام بیت اللہ الحرام۔ استبصار فی عجائب امصار۔ الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ۔ کتاب الاعتبار علامہ ابن منقذ۔ المام علامہ مقریزی۔ البیان والاعراب بما بارض مصر من الاعراب۔ کتاب الہند، علامہ ابو ریحان بیرونی۔ الخبر عن اول من دول الاشراف العلویین۔ عیون والحدائق۔ زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب۔ تاریخ آل سلجوق۔ زبدۃ النصرۃ فی اخبار الوزراء السلجوقیۃ۔ سلسلۃ التواریخ۔ اخبار العصر۔ اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس۔ تاج التراجم لقاسم بن قطلوبغا۔ الفخری فی الآداب السلطانیۃ۔ مروج الذہب علامہ مسعودی۔ کتاب الصلۃ ابن بشکوال۔ بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس۔ طبقات المفسرین علامہ سیوطی۔ اخبار ملوک المغرب والفارس علامہ مقریزی۔ عجائب الہند بزرگ بن شہریار۔ تکملۃ صلۃ۔ تہذیب الاسماء۔ علامہ نووی۔ طبقات الانساب۔ علامہ مقدسی۔ فتوح الشام علامہ بلاذری۔ تلخیص طبقات الحفاظ علامہ سیوطی۔ معارف ابن قتیبہ۔ یہ سب کتابیں بیش قیمت اور نایاب ہیں۔ خیال فرمانے کی بات کہ اول تو علماء یورپ نے عربی زبان میں تبحر پیدا کیا اور بعد ازاں ان کتابوں کو تلاش کر کے ان پر مفید حواشی اور شروح لکھیں۔ بلا شبہ ان کی ہمت و محنت پر آفرین ہے۔

تواریخ کے علاوہ اسلامی مصنفین کے جغرافیوں کا بھی ایک سلسلہ چھاپا گیا ہے۔ یہ کتابیں بھی نہایت دشواری سے ہاتھ آئی ہیں اور بلا مبالغہ امر ہے کہ ہم محض یورپ کی بدولت اس بات سے واقف ہوئے ہیں کہ مسلمانوں نے جغرافیہ میں کس قدر مستقل تصانیف چھوڑی ہیں اور کیا کمال اس فن میں پیدا کیا تھا۔

جغرافیہ کے متعلق کتب ذیل شائع ہو چکی ہیں۔ معجم البلدان علامہ یاقوت حموی (چار جلد) مشترک علامہ یاقوت حموی۔ مراصد الاطلاع۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔

مختصر کتاب البلدان ابن الفقیہ ہمدانی۔ کتاب البلدان علامہ یعقوبی۔ تقویم البلدان، المسالک والممالک علامہ ابن خرداذبہ۔ مسالک الممالک علامہ اصطخری۔ نزہۃ المشتاق علامہ ادریسی۔

مندرجہ بالا مضمون بہت مختصر ہے۔ مگر اس میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ مختلف علوم وفنون کی جس قدر کتابیں یونانی سے مسلمانوں نے ترجمہ کیں قریب قریب سب کا ذکر آجائے اور اس کے ساتھ ہی علماء یورپ کی کوششوں کا بھی حال معلوم ہو۔ جو کچھ اس مضمون میں لکھا ہے یہ بھی بہت سے سلف کے مآخذ کا کیا ذکر ہم نے کہا کیا۔ ؎

گرفتم کہ مولفاں ہیش یا کم میتواں گفتن ۔۔۔ ز دستت تا چہ آمد آخر این ہم میتواں گفتن

—— محمد شفیع الدین خلا (دسمبر ۱۹۱۲ء)

صوبہ سرحد میں اعلیٰ تعلیم

صوبہ سرحد کی تازہ ترین سالانہ رپورٹ سے واضح ہوتا ہے کہ صوبۂ مذکور کے اہل اسلام پشاور میں ایک اسلامیہ کالج قائم کرنے کی تجویز کر رہے ہیں۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک نہایت معتدد کمیٹی قائم کی گئی ہے جس کے تمام ممبر سربرآوردہ مسلمان ہیں۔ اس کمیٹی کا ارادہ اعلیٰ تعلیم کے لئے پشاور میں علی گڑھ کالج کے نمونہ پر نہ صرف ایک اسلامیہ کالج اور بورڈنگ ہوس تعمیر کرنے کا ہے، بلکہ صوبۂ سرحدی کے تمام اضلاع میں اسکولوں کی تعداد میں اضافہ کرنے اور موجودہ اسکولوں کو ترقی دینے کا ہو رہا ہے۔

ہم کو اس تجویز سے دلی ہمدردی ہے کیونکہ اس کی تکمیل سے صوبہ سرحدی میں اعلیٰ تعلیم بہت ترقی کر جائےگی کالج کے قیام کے لئے ۵ لاکھ روپے کی ضرورت بیان کی گئی ہے، جس کی فراہمی کا کام شروع ہوگیا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ یہ تحریک امید سے بڑھ کر کامیاب ہو رہی ہے۔ چنانچہ چندہ کی مقدار دو لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ یہی نہیں کہ کھاتے پیتے اور خوشحال لوگوں ہی نے چندہ دیا ہو، بلکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں نے اپنی حیثیت کے موافق چندہ دینے سے دریغ نہیں کیا۔ گورنمنٹ کی ملازمت میں جس قدر اہل اسلام ہیں، انہوں نے ایک ایک ماہ کی سالم تنخواہ دیدی یا دینے کا وعدہ کیا ہے اور بعض بعض تحصیلوں میں مسلمان زمینداروں نے مال گذاری کے ساتھ ایک آنہ فی روپیہ چندہ دینے کی تجویز منظور کرلی ہے: ع یہی کہنے کی باتیں ہیں، یہی کرنے کی باتیں ہیں

یقین ہے کہ اس مبارک تحریک میں لوگ دل وجان سے چندہ دیں گے۔ اگر عام چندہ سے رقم مطلوبہ فراہم ہوگئی، تو امید ہے کہ ہماری شفیق گورنمنٹ بھی امداد فرمانے میں دریغ نہ کرے گی کیونکہ عدم تعلیم ہی کی وجہ سے سرحد پار کے لوگ گورنمنٹ سے گاہے گاہے برسر پرخاش ہوتے ہیں جس کی وجہ سے گورنمنٹ کا بہت سا روپیہ صرف ہوجاتا ہے۔

—— ایڈیٹر (جون ۱۹۱۱ء)

اسلامی پردہ

... منجملہ اور اہم مسائل کے پردہ کا مسئلہ بھی ایسا ہے جس کا تعلق بلا واسطہ عورات سے ہے اور جس سے ملک اور قوم کی عام ترقی کو کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور ہے۔ ہندوستان میں یہ مسئلہ ایک عرصہ سے معرض بحث میں ہے۔ لیکن ایک خاص فرقہ مسلمانوں میں ایسا موجود ہے جو ہندوستان کے موجودہ پردے کو عین قرآن و حدیث کے موافق بتاتا ہے۔ ہماری رائے میں جہاں اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ خیال سے غور کرنا ازبس ضروری ہے وہاں یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ اس سے کیا کیا نقصانات قوم کو پہنچ رہے ہیں یا اس کی پابندی کون سی خیر و برکت کی موجب ہے۔ میں نے اس مسئلہ کو کامل کئی سال تک اسٹڈی کیا ہے اور ایک عرصہ تک حیص بیص اور تذبذب کی حالت میں رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان کا موجودہ پردہ احکام شریعتِ محمدی کے مطابق نہیں ہے اور یہ مردوں کی حکومت پسند طبیعت کی صرف ایک جدّت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ رسم پردہ ایک عرصہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں مروج ہے۔ لیکن صرف اسی قدر کہہ دینا اس کی تقدیس کی کفالت نہیں کر سکتا کہ یہ رواج اسی شکل اور اسی صورت سے ہمارے بزرگوں میں موجود تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے قائم کرنے کی آخر کون سی ضرورت داعی ہوئی۔ قیاس ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی مدد سے آدمی زمین اور آسمان ایک کر سکتا ہے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ ہندوستان میں اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ عرب میں آنحضرتؐ (روحی فداہ) کے زمانہ مبارک سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ممالک اسلامیہ میں آج بھی پردہ کی اس قدر قید کہیں نہیں ہے اور اسلامی حکومت جب قائم تھی، اس وقت بھی ہندوستان کا سا پردہ کسی جگہ نہ تھا۔ ظن غالب ہے کہ مسلمان جس وقت یہاں آئے تھے اس وقت وہ اس ملک میں کیا بلحاظ مذہب و معاشرت اور کیا بلحاظ خیالات و روایات غرض ہر پہلو سے محض اجنبی تھے اور چونکہ اس وقت جنگ و جدال کا بازار عموماً گرم رہتا تھا اور یہاں کوئی دوست یار غمگسار نہ تھا اس وجہ سے انہیں ضروری معلوم ہوا کہ وہ مستورات کے لئے حفاظت کا انتظام کریں اور غالباً اس طریقے سے ہندوستان کے موجودہ پردے کی بنیاد قائم ہوئی جو رفتہ رفتہ اس درجہ سخت و تکلیف رساں ہو گئی ہے۔ دوسرے ممالک اسلام میں چونکہ مسلمانوں کو ہندوستان کی سی اجنبیت وغیرہ سے سابقہ نہیں پڑا اس وجہ سے وہاں پردہ اس قدر شدید نہیں ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے علاوہ اس کے قوانین و احکام عین فطرت کے مطابق ہونا چاہیئے۔ لیکن جب ہم اس مروجہ پردہ پر غور کرتے ہیں تو بمشکل کوئی پسندیدہ پہلو نظر آتا ہے۔ اس سے زیادہ مضرت اس رسم

کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ گویا یہ تحصیل علوم میں جس پر دینی و دنیاوی بہبود و فلاح کا انحصار ہے ایک ناقابل انسداد رکاوٹ ہے۔ تعلیم نسواں کی ضرورت و اہمیت پر یہاں کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ موجودہ پردے کے مؤیدین کی بھی ایک بڑی جماعت عورتوں کو ضروری علوم و فنون کی تعلیم دلانا ضروری سمجھتا ہے۔ مخالفین تعلیم نسواں چونکہ عورتوں کے فرائض بہت محدود خیال کرتے ہیں اس لئے اُن کے خیال میں تعلیم بھی بے ضرورت چیز ہے۔ لیکن غور کیا جائے کہ امور خانگی کے انصرام میں بھی کسی قدر عقل کی ضرورت ہوتی ہے اور عقل فطری جس کی نشو و نما خارجی اسباب سے غیر ممکن ہے اس باب میں مطلق کارآمد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا تعلق عقل مکتسب سے ہے اور مکتسب عقل بلا علم کے نہیں پیدا ہو سکتی۔ غرض اس قسم کے اور بہت سے نقائص پردہ کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں مگر نعوذ باللہ ایک مسلمان کے دل میں کبھی اس بات کا شبہ تک نہیں عائد ہو سکتا کہ اس کے مذہب کے احکام فطرت کے خلاف ہیں۔ اب سچے مسلمانوں کو اس کے سوائے اور کیا چارہ ہے کہ خود ہندوستان کے مروجہ پردہ کو خلاف عقل سمجھیں اور حقیقت حال بھی یہی ہے۔

ہم نے پردہ کے متعلق اوپر جو کچھ عرض کیا ہے وہ تمام و کمال ہندوستان کی موجودہ رسم سے متعلق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کے لئے پردہ ضروری قرار دیا ہے لیکن اسلامی پردے کو ہندوستان کے پردہ سے کوئی نسبت نہیں۔ بانیٔ اسلام کی شریعت پُرحکمت اصول پر مبنی ہے اور انہیں حکیمانہ اصول پر اسلامی پردہ وضع کیا گیا ہے جو تمدن و معاشرت یا مذہب کے کاموں میں کسی طرح حارج نہیں ہو سکتا اور اس کے پہلو بہ پہلو عورتوں کی عزت و حرمت قائم رکھنے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اسلامی پردہ اپنی اصلی شان میں تو شائد ہندوستان کے کسی خطہ، کسی شہر، کسی قصبہ اور کسی گھرانے میں موجود نہیں۔ ہاں اس کی معمولی سی جھلک معراور ترکی میں مل سکتی ہے جہاں عورتیں چاردیواری میں محبوس نہیں ہوتیں بلکہ اپنی ضروریات کی دیکھ بھال گھر کے باہر بھی کر سکتی ہیں۔ لیکن گھر سے باہر اُن کا لباس اور اُن کا طرز عمل شرم حجاب نسوانی کی محافظت کرتا ہے اور انہیں بدچلنوں کی نگاہیں اور بداندیشوں کے ناقص خیالات کوئی صدمہ نہیں پہنچا سکتے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کا پردہ عین ہدایات اسلامی کے مطابق ہوتا، تو اس کی نظیر دوسرے ممالک میں بھی ملتی۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں میں سے اکثر اصحاب روم، شام، دمشق، مصر، ایران اور افغانستان وغیرہ میں بہ تقریب سیاحت ہو آئے ہیں لیکن ان کا بیان ہے کہ کہیں پردہ کی یہ سختی اور شدت نہیں ہے جو ہندوستان کی بے زبان مستورات کے نصیبوں میں لکھ دی گئی ہے۔

ایک نکتہ اور بھی قابل تحریر کرنے کے ہے کہ اگر ہندوستان کے پردہ کو اسلامی پردہ بھی تسلیم کر لیا جائے، تو اس کے رُو سے عورتوں کو سفر حج سے باز آنا پڑے گا کیونکہ اثنا سفر و ایام حج میں وہ پابندیاں قائم نہیں رہتیں، جو یہاں کی عورتوں کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اسلام نے فریضۂ حج ذکور و اناث کے لئے یکساں لازمی قرار دیا ہے، ہاں مستورات کے لئے کسی محرم کو ساتھ لے لینے کا حکم ہے، جو اعلیٰ درجہ کی مصلحت اندیشی اور دُور بینی پر محوّل ہے۔

اسلامی پردہ کی بنیاد چونکہ حکمت آمیز اصول پر ہے، اس لئے وہ نہ عورتوں کے لئے بمنزلہ قید کے ہے اور نہ اُن پر بار گذر سکتا ہے، نہ وہ امور مذہب کی ادائیگی میں ہارج ہوتا ہے نہ اس کی پابندی سے دنیاوی کاموں اور پیشوں میں خلل پڑتا ہے اور میرے خیال میں اس قسم کا پردہ عورت ذات کے لئے ازبس ضروری ہے، جو ایک طرف تو اُس کے دینی و دنیاوی مشاغل میں مخل نہ ہو اور دوسرے جانب اس کی وجہ سے اُس کی عفت و عصمت خطرے سے محفوظ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عورت خود اپنی محافظ ہوتی ہے اور ظاہری رکاوٹیں بجائے خود بیکار ہیں لیکن اشتعال انگیز اسباب کا انسداد فی نفسہ بہت بڑا ذریعہ درستی اخلاق کا تسلیم کیا گیا ہے۔ زمانہ کے موجودہ انقلاب کے ساتھ ہندوستان کے پردے کے پُرزے بھی ڈھیلے پڑ چلے ہیں اور لوگوں کو صحیح و غلط کی تمیز کرنے کا شوق ہو گیا ہے۔ اکثر مبصروں کی رائے میں موجودہ پردہ بہت تھوڑے عرصہ کا مہمان ہے۔ وہ دن بہت مبارک ہو گا جب اس مذموم رسم کی بیخ کنی کامل طور پر ہو جائے گی۔ ہاں اس قدر خوف ضرور ہے کہ کہیں ہم ایک مصیبت سے نکل کر دوسری آفت کے پنجہ میں نہ پھنس جائیں، موجودہ پردہ کے مخالفوں میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو کوتاہ اندیشی سے ہر ایک امر میں یورپ کی تقلید کا شرف حاصل کرنے کی تمنی نظر آتی ہے۔ گویا اس کے خیال میں "اسلامی پردہ" اپنے حقیقی اور اصلی معنوں میں بھی قائم نہ رہنا چاہیئے۔ افراط و تفریط کسی حال میں پسندیدہ نہیں کہی جا سکتی۔ تفریط سے نکل کر افراط کی بلائے جان دلدل میں گر پڑنا کونسی عقلمندی ہو سکتی ہے۔ "خیر الامور اوسطہا" اسلام کے ہمیشہ پیش نظر رہا ہے۔ اگر ہمیں اسلام سے علیٰحدہ ہو کر دنیا میں رہنا سہنا ہے تو اس کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں مسلمان اور سچے مسلمان کے نام سے اگر ترقی کرنا ہے تو ہمارا کام ہو گا کہ جہاں اس پردہ کو جو ہندوستان کی مسلمان خواتین کے حق میں آسمانی آفت سے کم نہیں مٹانے کی سعی کریں۔ وہاں "اسلامی پردہ" کے قائم کرانے میں بھی عملی تدابیر سے کام لیں۔ تاکہ ہمارا ملک اور ہماری قوم بے پردگی کے اُن نتائج سے محفوظ ہے، جو یورپ کی تہذیب و تمدن کے دامن پر بمنزلہ داغ ہے اور جس کی وجہ سے وہاں کی ترقی بعض اوقات ایشیا والوں کو اپنے ظرف سے

منتشر بنا دینے کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ علی گڑھ میں مدرسۂ تعلیم المعلمات کا اجرا مناسب و مستحسن ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اگر وہاں بھی اسکول کی چار دیواری میں مقید رہ کر لڑکیوں نے تعلیم حاصل کی تو اس کے نتائج چنداں مفید اور حوصلہ افزا نہیں ہو سکتے۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے چونکہ مسلمانوں کی تعلیمی معاملات کی رہنمائی اپنے ذمہ لی ہے اور اپنی ذمہ داری کو اس نے ایک حد تک محسوس کیا ہے اس لئے اس کی مساعی جمیلہ کا رجحان بہت جلد اس مسئلہ کے حل کرنے کی طرف ہونا ضروری ہے۔ موجودہ پردہ کے سبب سے جو بیجا قیود لڑکیوں کی تعلیم میں دقتیں پیدا کر رہی ہیں ان کے رفع کرنے کے لئے فوری توجہ درکار ہے۔ علی گڑھ کے مدرسۂ نسواں میں لڑکیوں کو اسلامی پردہ کے ساتھ تعلیم دینے کا انتظام ہو جائے تو اس وقت جو مشکلات معلمات کے بہم پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں وہ کسی قدر کم ہو سکتی ہیں اور ابتدائی تعلیم کا آغاز بوجہ احسن ہو سکتا ہے۔

اس وقت اکثر مسلمان موجودہ پردہ کو غیر شرعی اور بے ضرورت سمجھنے کے باوجود اس کے پابند نظر آتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ اب تک موجودہ پردہ کی مخالفت جس پیرائے میں کی گئی ہے اس سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ مصلحان پردہ کی غرض اس رسم کو ایک سرے سے اٹھا دینے کی ہے۔ حالانکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہمارا منتہائے نظر یہ ہونا چاہیئے کہ اس وضعی پردے کو خیرباد کہکر خالص اسلامی پردہ کو رائج کیا جائے جب مسلمانوں کے سامنے اسلامی پردہ اپنی شان کے ساتھ پیش کیا جائے گا تو انہیں اس کے تسلیم کرنے سے چارہ نہ ہوگا۔

اسلامی پردہ کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ حکیمانہ اصول پر مبنی ہے۔ ——————

—————— حجاب کے متعلق جو شرعی احکام موجود ہیں ان میں اس کے اختیار کرنے سے کوئی فرق نہیں آسکتا اور ضروری کاروبار سے بھی وہ مستورات کو روک نہیں سکتا۔ عرب میں اس وقت بھی عورتیں بازار میں بیع و شرٰی کی غرض سے جاتی ہیں۔ خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوتی ہیں۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات کرنے کو دن دہاڑے باہر نکلتی ہیں لیکن کوئی ان پر بے شرمی و بے حجابی کا الزام نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ وہ گھر سے باہر نکلتے وقت ایک ایسا لباس پہن لیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی آرائش و زینت اغیار کی نظر بازوں کا شکار نہیں ہونے پاتی۔

ایک دفعہ کانپور سے الہ آباد جاتے ہوئے فتحپور کے ریلوے اسٹیشن پر میں نے ایک مسلمان خاتون کو دیکھا جو تن تنہا سفر کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ فتحپور میں اس کو اترنا تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ سیدھے

اسٹیشن ماسٹر کے کمرہ میں چلی گئی اور وہاں سے اپنا اسباب لے کر قلیوں کے حوالے کر دیا۔ تار دینے کے لئے سگنلر کے پاس پہنچی اور فیس دیکر رسید لے لی۔ بُرقعہ جس کی وضع و تراش میں خاص قسم کی دل آویز جدت کی گئی تھی اُس کے جسم پر تھا اور اُس کے طرز سے معلوم ہوتا تھا کہ تعلیم یافتہ اور ضروریات زمانہ سے باخبر ہے۔ اس قسم کی واقفیت ہمارے طبقۂ اُناث کو حاصل کرنا ضروری ہے، ورنہ ناقابل برداشت مصائب کا سامنا ہوتا ہے اور اچھے اچھوں کے حواس ٹھکانے نہیں رہتے۔ میرے ایک ہمسفر دوست بھی اس لیڈی کے طرز لباس اور طریق عمل سے متاثر ہوئے۔ ہم دونوں میں پردہ سسٹم پر ایک دلچسپ بحث چھڑ گئی اور بالآخر دونوں اس نتیجہ پر متفق ہوئے کہ اسلامی پردہ کو رائج کرنے کی ہندوستان میں ضرورت ہے کیونکہ یہ سہل اور سادہ ہونے کے ساتھ ہی کسی پہلو سے مضرت بخش نہیں ہو سکتا۔ بعض دوست شاید بُرقعہ کو ناپسند کریں اور ہم بھی اس قسم کے بُرقعہ کو جو اکثر آجکل مستعمل ہے مفید مطلب نہیں سمجھتے۔ تاہم اس میں ضروری ترمیم و اصلاح کی گنجایش ہے جس کے بعد یہ تکلیف رساں نہ رہے گا۔ ٹرکی میں جو لباس رواج پذیر ہے غالباً ہندوستان میں بھی اُس کا استعمال نامناسب نہ ہوگا۔ ایک فرنچ لیڈی نے (افسوس ہے کہ اس وقت مجھے اُس کا نام یاد نہیں رہا) وہاں کے بُرقعہ کی بہت تعریف کی ہے اور کہتی ہے کہ ترکی عورتیں جس وقت اس کو زیب تن کرتی ہیں تو اُنکی حالت و حیثیت میں نقص پیدا ہونے کی جگہ خوبصورتی ظاہر ہوتی ہے اور وہ اُن عورتوں سے کہیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہیں جو کھلے بندوں اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہیں۔

الغرض اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے خیالات کو اُلفِ عادات کی مضبوط زنجیروں سے آزاد کرا کے موجودہ پردہ کو خیرباد کہیں اور بے زبان جنس لطیف کے اُوپر سے ناجائز و ظالمانہ قیود کا انسداد کر کے انہیں زندہ درگور ہونے سے بچا دیں۔ اگر ہم کو اس افلاس و مصیبت کی حالت سے نکلنا ہے، اگر ہمیں تنازع للبقا کے میدان میں شہسوار بن کر صف آرا ہونا منظور ہے، اگر ہم کو قومی زندگی کی خواہش ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم بھی اقوام متمدن کی طرح اپنے علوم و فنون اپنے فضل و کمال وغیرہ کی داستانیں صفحات تاریخ پر چھوڑ دیں تاکہ آنے والی نسلیں اُن کو دیکھ کر ہماری ذہنی و دماغی قابلیتوں کی معترف ہوں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے کاموں میں عورتوں کو بھی شریک کریں اور رسم و رواج کی بیڑیاں اُن کے پیروں سے کاٹ کر انہیں ہاتھ پیر ہلانے کے قابل بنائیں اور جائز حدود کے اندر اُنہیں آزادی دینے سے دریغ نہ کریں اور اگر یہ نہیں تو ہمیں ہمیشہ کے لئے حقیقی ترقی کو خیرباد کہدینا چاہیئے۔

——— سید محمد فاروق (جون ۱۹۱۰ء)

اندور کا محرم

.... سرکاری تعزیہ ریاست کے اخراجات سے تیار کیا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے محل قدیم کے عقب میں گوپال مندر کے محاذی ایک امام باڑہ بنا ہوا ہے جس کی نوتعمیر سنگی جو گوشۂ عمارت دور جدید کی یادگار ہے۔ مکانیت کچھ ایسی زیادہ نہیں تاہم ضرورت کے مطابق گنجائش بہت ہے۔ ہر سیاح کے دل میں امام باڑہ دیکھ کر اس بات کی تفتیش کا خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اس کے چاروں گوشوں پر جو مینار ہیں ان میں شمالی و شرقی کونے والا باقی تینوں میناروں سے غیر موزونیت کے ساتھ کیوں زیادہ بلند رکھا گیا ہے۔ میں نے اکثر احباب سے اس کی بابت دریافت کیا مگر کسی سے یہ معمہ حل نہ ہوا۔

سرکاری تعزیہ مخصوص اشخاص کی نگرانی میں تیار ہوتا ہے۔ اس امام باڑہ کے اخراجات کی کفالت ریاست کے خزانہ سے ہوتی ہے اور یہاں کے انتظام وغیرہ کے لئے معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ تعزیہ چونکہ بہت بلند اور ارتفاع کی مناسبت سے طویل و عریض ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی تیاری میں وقت کے ساتھ محنت و کوشش بھی پوری پوری صرف ہوتی ہے۔ پہلی تاریخ سے امام باڑہ کھلتا ہے اور بیسیوں اشخاص کی شبانہ روز محنت دسی سے تعزیہ وقت مقررہ پر تیار ہوتا ہے۔ تعزیہ میں علاوہ گنبد کے آٹھ یا نو کھنڈ ہوتے ہیں۔ ہر کھنڈ کو بجائے خود ایک بڑا تعزیہ سمجھنا چاہیئے۔ جب اس کے کل ٹکڑے ملا دیئے جاتے ہیں، تو تعزیہ بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ امام باڑہ اس قدر بلند نہیں کہ پورا تعزیہ اس میں آسکے۔ اس کے اندر جُدا جدا ٹکڑے بنائے جاتے ہیں۔ نویں کی رات اور دسویں کے دن کو وہ باہر مکمل حیثیت میں رکھا جاتا ہے۔ فرمانروایانِ ہلکر کا محل قدیم جس کو "جونا باڑہ" کہتے ہیں بہت بلند واقع ہوا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پیشتر تعزیہ اسی کے برابر بنایا جاتا تھا۔ اب اس قدر اونچا تو نہیں ہوتا تاہم بحالت موجودہ بھی دیکھنے والوں کے لیے وہ عجیب چیز ہے۔ اندور کے اور تعزیے جس قدر چھوٹے ہوتے ہیں، اُتنا ہی یہ بڑا ہوتا ہے۔ گویا اُن کی تمام کمی یہ پوری کرتا ہے۔ قلعہ کا تعزیہ جو فوج کی جانب سے تیار ہوتا ہے سرکاری تعزیہ سے کسی قدر پست ہوتا ہے لیکن بالکل اسی کے نمونے پر بنایا جاتا ہے۔ اس میں بھی کئی کھنڈ ہوتے ہیں۔ ان دونوں تعزیوں کے گنبدوں میں کوئی نہ کوئی خاص صنعت بھی رکھی جاتی ہے۔ مثلاً اگلی دفعہ یہ تھا کہ چلتے چلتے گنبد غنچۂ البستر کی طرح کھل کر پھول کی صورت کشادہ ہو جاتا اور اس میں سے ایک خوبصورت مور نمودار ہوتا تھا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد پھر بند ہو جاتا تھا۔ — اقتباس (مارچ ۱۹۱۱ء)

اُردو ترجمہ قرآن بغیر متن

از طرف مہتمم صیغۂ اشاعت القرآن' انڈین پریس' الہ آباد ——— یہ اشاعت خدا بخش میں محفوظ ہے۔ "قابل ذکر بات یہ ہے کہ ترجمہ ابوالفضل صاحب کا ہے۔ — اشتہار (جون ۱۹۱۳ء)

قطب مینار

دہلی کا قطب مینار، ہندوستان کے عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے اور ممکن نہیں کہ کسی سیاح کی نظر اس پر نہ پڑے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی رفعت کے باعث وہ دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ لیکن جب ہم نیویارک کی زمانۂ حال کی بلند عمارتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قطب مینار اب اس دعوے کا حقدار نہیں رہا۔ جو سیاح دہلی میں وارد ہو ممکن نہیں کہ وہ اس شخص کی شہرت پسند طبیعت کی تعریف کئے بغیر رہ سکے جس نے اس مینار کو بنوایا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ قدیم عمارات کے متعلق تحقیقات کرنا صرف انہیں لوگوں کا کام ہے، جو زمانۂ قدیم کے معاملات سے دلچسپی رکھتے ہیں یا جو مؤرخ ہوں۔ مگر قطب مینار کے متعلق بعض دلچسپیاں اس قسم کی ہیں کہ ان میں ہر خیال کے لوگ حصہ لے سکتے ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ یہ عظیم الشان عمارت کسی بہت بڑے بادشاہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ مگر کچھ عرصہ سے اس کے متعلق ایک دلچسپ سوال یہ چھڑا ہوا ہے کہ آیا اسے پہلے ہندوؤں نے بنوایا اور بعد میں مسلمان فاتحوں نے اس میں تبدیلی کر کے مکمل کرایا تھا، یا مسلمانوں نے ہندوؤں کے مندروں سے مسالہ لے کر اسے از سرِ نو تعمیر کرایا تھا یا ان دونوں باتوں کو چھوڑتے ہوئے بقول کننگھم صاحب مسلمانوں نے اصلی مسالہ سے اسے تعمیر کیا تھا؟

فی الحقیقت قطب مینار کی تعمیر کی تھیوری کے متعلق دو مختلف پارٹیاں موجود ہیں، جن کے خیالات ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں یعنی ایک کا خیال تو یہ ہے کہ اسے ہندوؤں نے تعمیر کرایا تھا اور دوسری کا یہ کہ مسلمانوں نے استعمال شدہ مسالہ کا سوال بلحاظ اہمیت دوسرے درجے پر ہے اور اس لئے اس کے متعلق اس موقعہ پر بحث نہیں چھیڑی جا سکتی۔

عام طور پر جو خیال لوگوں میں پھیلا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ سلطان محمد غوری کی فتح کی یادگار میں اسے قطب الدین ایبک نے تعمیر کرایا تھا، چنانچہ اس بیان کی تائید میں ذیل کے دلائل پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱) برج پر فارسی زبان کے کتبے بہت کثرت سے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے مسلمانوں نے بنوایا تھا۔

(۲) قطب الدین کے انتقال کے ایک دو صدی بعد فیروز شاہ نے اس کا نام "برج فتح" رکھا، جس سے مطلب یہ تھا کہ اسے محمد بن سام غوری کی فتوحات کی یادگار میں تعمیر کیا گیا ہے۔

(۳) بُرج کی بُنیاد کے قریب ایک مُجھا ہوا سا کتبہ موجود ہے جس میں قطب الدین کا نام پڑھا جاتا ہے۔
(۴) مشہور عالم آثار قدیمہ جنرل کننگھم کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ مسلمانوں کے وقت کی عمارت ہے۔
(۵) ان تمام دلائل کے علاوہ سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کا نام "قطب مینار" ہی صاف ثابت کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں تعمیر ہوا ہوگا۔

یہ سب دلائل اس قسم کے ہیں، جو اس بات کے ثبوت میں پیش کئے جاتے ہیں کہ قطب مینار مسلمانوں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔

برعکس اس کے فریق ثانی یہ خیال کرتا ہے کہ اسے راجہ پرتھوی راج نے اپنی اکلوتی لڑکی اوشادتی کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ اتہاس میں آیا ہے کہ وہ جمنا جی کے درشن کے بغیر کھانا نہ کھاتی تھی۔ چنانچہ اس کی سہولت کے لئے رائے پتھورا نے اس قدر بلند بُرج تعمیر کرایا تھا۔ معلوم نہیں یہ خیال کہاں تک درست ہے مگر کم از کم جزا غلب نہیں ہو سکتا۔

قطب مینار کے مسلمان بادشاہوں کے عہد میں تعمیر ہونے کے متعلق جو دلائل اوپر درج کئے جا چکے ہیں ان میں سے آخر الذکر کی تردید میں مسٹر مرے نے اپنی کتاب ہینڈ بک فار انڈیا اینڈ سیلون (HAND BOOK FOR INDIA AND CEYLON) ایڈیشن ۱۸۹۲ء کے صفحہ ۱۴۵ پر لکھا ہے کہ "لوگوں میں یہ اعتقاد عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اسے رائے پتھورا نے اس غرض سے تعمیر کرایا تھا کہ اس کی لڑکی اس پر چڑھ کر جمنا جی کے درشن کر لیا کرے" لیکن ملکی روایات کو چونکہ تاریخی وقعت نہیں دے سکتے اس لئے ہم طرفین کے ان دلائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

آثار قدیمہ کی تحقیقات کے میدان میں مسٹر کننگھم ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کے بیانات ناقابل تردید ہوں یا یہ کہ اُن کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص موجود نہ ہو۔ مشہور بنگالی لیڈی شریمتی سورن کماری دیوی نے جن کے مضامین اکثر انگریزی اور بنگالی رسالوں میں نکلتے رہتے ہیں "دیپ نردان" کے نام سے ایک تاریخی ناول لکھا ہے، جس کے دیباچے میں اس نے مختلف مستند مورخوں کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ قطب مینار کو ایک ہندو راجہ نے تعمیر کرا کے اس کا نام "جمنا استمبھ" رکھا تھا۔ چنانچہ مسٹر کننگھم کی تردید میں اُس نے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال IOURNAL OF THE ASIATIC SOCIETY BENGAL کا حوالہ دیا ہے جو ہندوستان کے آثار قدیمہ کے متعلق نہایت مفید اور مستند خیال کیا جاتا ہے۔ اس جرنل کی جلد ۳۳ بابت ۱۸۶۴ء میں مسٹر لگلور نے نہایت قابلیت سے اس مضمون پر رائے زنی کرتے ہوئے نتیجہ نکالا ہے کہ دراصل یہ ہندو زمانے

کی عمارت ہے جسے مسلمان حملہ آوروں نے تبدیل اور مکمل کیا تھا۔ اسی ضمن میں یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ڈاکٹر سید احمد نے اپنی مشہور کتاب "آثار الصنادید" میں اس عمارت کے متعلق کچھ شبہ سا ظاہر کیا ہے جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھی اسے ہندوؤں کے وقت کا بنا ہوا خیال کرتے تھے۔

تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ مسلمان حملہ آور حتی الامکان مذاہب غیر کی عمارات میں تغیر و تبدل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مثال کے طور پر قسطنطنیہ کی مسجد ایا صوفیہ کو دیکھئے جسے سلطان محمد فاتح کے عہد میں جب ترکوں نے بازنطینی سلطنت کو نیست و نابود کر دیا تھا، تو گرجا سے مسجد بنا لیا گیا تھا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ ہندوستان کے حملہ آوروں نے جمنا استمبھ کی حالت بدل کر اسے قطب مینار بنا دیا۔

لیکن سب سے عجیب بات اس مینار سے متعلق کتبوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ جس سیاح کو اس مینار کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اسے معلوم ہوگا کہ تمام اسلامی کتبے ہر ایک منزل کے داخلے پر کندہ ہیں۔ لیکن دوسری عمارات کی یہ حالت نہیں بخلاف اس مینار کے وہ اوپر سے نیچے تک اسلامی کتبوں سے بھرا ہوا ہے۔ اس صورت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ کتبے جو داخلے کے مقامات پر کندہ ہیں بعد میں کندہ کر دیئے گئے ہوں؟ فی الحقیقت ایسا ہونا نہایت سہل اور قرین قیاس ہے۔

اس جگہ تک ہم نے صرف معمولی دلائل کی تردید پر اکتفا کی ہے۔ لیکن یہاں چند ایسے دلائل درج کرنا ضروری معلوم ہوتے ہیں جن سے بالواسطہ طور پر اس مینار کا ہندوؤں کے وقت میں تعمیر کیا جانا ثابت ہے۔

اولاً تو اس مینار کی بنیاد کے پتھروں پر مختلف دیوتاؤں کی تصاویر کندہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتھر چونکہ بنیاد میں تھے اس لئے نا ممکن تھا کہ انہیں نکال کر تازہ پتھر جن پر فارسی کتبے کندہ ہوں رکھ دیئے جاتے۔

ثانیاً ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں اس بات کا رواج نہ تھا کہ کسی مسجد کے قریب صرف ایک ہی برج بنایا جائے۔

ثالثاً اس مینار سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر ایک اور مینار کے آثار پائے جاتے ہیں جسے اس کی طرز کا بنانے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مینار بخلاف جمنا استمبھ کے آیات قرآنی کے کتبوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ہم نے فریقین کے دلائل پیش کرنے پر اکتفا کی ہے اور اس سے اس بات کا فیصلہ کرنا مد نظر نہیں کہ یہ مینار ہندوؤں کا بنایا ہوا ہے یا مسلمانوں کا۔ ممکن ہے زمانہ مستقبل میں اس مسئلہ پر کوئی صاحب مزید روشنی ڈال سکیں جس سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اس عظیم الشان مینار کی تعمیر کا سہرا کس ہندو راجہ یا مسلمان بادشاہ کے سر رہا تھا۔

—— تیرتھ رام (مئی ۱۹۱۰ء)

قطب مینار کس نے بنایا

مئی کے ادیب میں اس کے متعلق دو خیال ظاہر کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوؤں کی عمارت ہے جس کی شکل مسلمانوں نے بدل لی، اور دوسرا یہ کہ از سرتا پا مسلمانوں کی بنا ہے۔ چونکہ یہ مضمون قومی تعصب سے قطع نظر کرکے محض تحقیقی انداز سے لکھا گیا ہے۔ اس لئے میں بھی اپنی واقفیت بلا خیال جانبداری کسی گروہ کی ظاہر کرنی چاہتا ہوں۔

ہندوؤں کی تعمیر ہونے کا ثبوت ان دلائل سے دیا جاتا ہے جن میں سے چند ادیب میں مذکور ہیں اور باقی میری یاد میں محفوظ تھیں۔

۱۔ مینار میں کرسی نہیں ہے اور مسلمانوں کی سب عمارتیں کرسی دار ہوتی ہیں۔

۲۔ مینار کا دروازہ شمال رویہ ہے، مگر مسلمان بڑی عمارتوں خاص کر مسجدوں کا دروازہ شرق رو بناتے ہیں۔

۳۔ مینار کے پاس ایک برج ہے۔ حالانکہ مسلمان مسجد کے تین برج ہوتے ہیں

۴۔ مینار کی بنیادوں میں مورتیں بنی ہوئی ہیں، جو ہندوانی ساخت کی علامت ہے۔

۵۔ سرسید مرحوم نے آثار الصنادید میں مینار کی نسبت کچھ شبہ سا ظاہر کیا ہے، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی عمارت ہے۔

اسلامی عمارت ہونے کا دعویٰ ان براہین پر مبنی ہے:۔

۱۔ مینار کے دروازوں کی محرابیں بیضی ہیں اور ہندوؤں کو اس زمانہ میں بیضی محراب[1] بنانی نہیں آتی تھی۔

۲۔ مسجد قوت الاسلام کے بائیں پہلو میں مینار اس قرینہ سے بنایا گیا ہے کہ فاصلہ او موقع صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ مسجد کا مینار ہے۔

۳۔ لارڈ کرزن کے زمانہ میں جب مسجد و مینار کی مرمت ہوئی تو مسجد کا فرش درست کرنے میں پتھر اکھاڑے گئے تھے، معلوم ہوا کہ اندر ان کے بت بنے ہوئے ہیں۔ اسی قسم کے پتھر قطب مینار کی بنیاد اور وسطی حصہ میں پائے گئے، جن کا بیرونی حصہ صاف تھا اور اندر بت تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بت خانہ کے پتھروں سے مسجد اور مینار بنایا گیا۔ ہندوؤں کی عمارت ہوتی تو مورتوں کو اندر کے رخ نہ چھپایا جاتا۔

---

[1] اسی ثبوت میں اختتا کے ایک غار کی تصویر دی جاتی ہے جو اسلامی اثر سے بہت پیشتر کی حیرت انگیز عمارت ہے۔ اس میں بیضاوی محرابیں صاف طور پر نظر آتی ہیں اور دکن میں بحالت اصلی دیکھی جا سکتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

۴ — ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں اس کی تعمیر کا چشم دید حال لکھا ہے۔ اس کے بیان سے ثابت ہے کہ قطب الدین ایبک کی اس عمارت کو ابن بطوطہ کے وقت میں کوئی بادشاہ مکمل کرا رہا تھا جس کی پاڑ اتنی بڑی تھی کہ ہاتھی پتھر لے کر اس پر چڑھ جاتے تھے۔

۵ — کتبوں اور آیات قرآنی کی نشست بالکل موزوں اور چست ہے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بعد میں لگائے ہیں۔

مسلمان محقق ہندوؤں کی مذکورہ پانچوں دلائل کا یہ جواب دیتے ہیں:

۱ — مینار اگر بذاتہٖ کوئی مستقل عمارت ہوتی تو اسے کرسی دی جاتی مگر وہ مسجد کے تابع ہے۔ مسجد میں کرسی دی گئی ہے جس کا نمایاں اثر علاؤالدین کے دروازہ سے معلوم ہوتا ہے۔ شاہجہاں کی دہلی جامع مسجد میں بھی میناروں کو کرسی نہیں دی گئی۔ مسجد کے تحت میں وہ بھی ہیں۔

۲ — شرقی رو دروازہ ہونے کی کوئی خاص قید مسلمانوں کے ہاں نہیں ہے تاہم کہہ سکتے ہیں کہ مسجد کا دروازہ شرقی رو تھا۔ مینار مسجد کے ماتحت ہے اس میں اس کا خیال رکھنا ضروری نہ تھا۔

۳ — مینار کی بنیاد میں کہیں کہیں مورتوں کے نشانات تو اسلامی عمارت ہونے کی دلیل ہیں کیونکہ وہ پتھر مندروں سے لئے گئے تھے اگر ان پتھروں کو دیوار سے جدا کر کے دیکھا جائے تو نمایاں مورتیں نکلیں گی۔

۴ — مینار کے پاس جو برج ہے وہ مسجد کا برج نہیں ہے، بلکہ دروازہ مسجد کا ہے جس کو تعمیر مینار کے عرصہ دراز کے بعد علاء الدین خلجی نے بنایا ہے اور جس کی طرز تعمیر اور کتبے صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ خلجیوں کے وقت کی عمارت ہے۔ مسجد میں کوئی برج نہیں ہے وہ کھلی ہوئی ہے۔

۵ — سرسید مرحوم نے آثار الصنادید میں کوئی شبہ نہیں کیا۔ صرف لوگوں کے افواہ کو بیان کر کے اسلامی عمارت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

اب یہ بیان کہ مینار پرتھی راج کی بیٹی کے لئے بنایا گیا تھا تاکہ وہ اس پر سے جمنا کے درشن کرے، قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ کہا یہ جاتا ہے کہ مینار کی ابتدائی منزل پرتھی راج نے بنائی تھی۔ پس اگر ابتدائی منزل پر چڑھ کر دیکھیں تو جمنا نظر نہیں آتی۔ بہر حال یہ جو کچھ لکھا گیا محض تاریخی اور آثار قدیم پر مبنی ہے۔ ورنہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر قطب مینار ہندوؤں کی عمارت ہے تو بچشم ما روشن دل ما شاد۔ اور اگر اس کو مسلمانوں نے بنایا تب بھی کرت اور شاد ملتی دونوں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ غیر ملکوں میں دونوں کے کام سے ملک ہند کا نام ہوتا ہے اور یہی ہم سب کے لئے باعث فخر ہے۔

— لطیف الدین چشتی (جون ۱۹۱۰ء)

مصورانِ لکھنؤ

شاہانِ مغلیہ میں شہنشاہ اکبر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ہندوستان کے بہت سے علوم و فنون کے ساتھ مصوری کو بھی ایک حد تک زندہ کیا۔ مغل فرمانروا ہندوستان میں براہ راست ایران سے آئے تھے اور ایران بھی مصوری کا ایک پرانا اسکول ہے پس ایران اور ہندوستانی مصوری کے میل جول سے ایک نئے آرٹ (صنعت) کی بنیاد پڑی۔ مسلمانوں میں مذہبی ممانعت کی وجہ سے صورت کشی کا عام رواج نہ تھا اور انہوں نے اس کا نعم البدل ایک اور ہنر ایجاد کیا جس کا نام خوشنویسی ہے جس طرح تصویر میں رنگ بھر کے اور جا بجا سونا چڑھا کے اُسے نظر فریب بنایا جاتا ہے اسی طرح مسلمان خوشنویسوں نے اپنے قطعات کو دلفریب بنانے کی کوشش کی اور دنیا کے لئے ایک نئے ہنر کی بنیاد ڈالی جو افسوس کہ اب بالکل معدوم ہو گیا۔ وصلیوں پر ابری کام یعنی سونے کی افشاں ہندوستان کے اگلے عہد کی یادگار ہے لیکن مسلمانوں نے اس میں بھی ایک نفاست پیدا کی تھی اور خوشنویس اپنے قطعات عموماً ابری ہی وصلیوں پر لکھتے تھے۔ ہاتھی دانت کے ٹکڑوں، شیشوں اور کاغذ پر آبی رنگ کی تصویریں بھی اسلامی مصوری کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ کتابوں میں رنگین اور سنہری جلد ولین، نقاشی اور تصویریں اگرچہ اس عہد کی ایجاد نہیں تاہم عہد اکبری کی تمام کتابوں میں یہ خصوصیات موجود ہیں۔ اکبر کے عہد میں بہت سے مصور (جن میں ہندو مسلمان دونوں داخل ہیں) اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے۔ انہیں تاریخی، واقعاتی اور خیالی تصویریں بنانے میں خاص امتیاز حاصل تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کو بھی اس فن سے خاص دلچسپی تھی اور اس کے عہد میں باکمال مصوروں کی کافی تعداد موجود تھی۔ چنانچہ جب سر ٹامس رو نے شہنشاہ کو ایک تصویر اس دعویٰ کے ساتھ نذر کی کہ کوئی ملک اس قسم کی صناعی نہیں پیش کر سکتا، تو اس کے دوسرے ہی روز اُن کی لاف زنی خاک میں مل گئی اور وہ یہ دیکھ کر دریائے حیرت میں غرق ہو گئے کہ اس تصویر کی چار نقلیں تیار کر دی گئیں جو ہو بہو اصل کے مطابق تھیں۔ شاہجہاں کا عہد بھی مصوری کے لئے خوش نصیبی کا زمانہ تھا جس کے دربار میں بہت سے عدیم النظیر مصور موجود تھے۔ لیکن خاندان مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی مصوری پر بھی زوال آنے لگا اور دہلی کے اچھے اچھے مصور دربار اودھ میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کے دربار میں دہلی کے مصوروں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ ان مصوروں کی صناعی کے بہت سے نادر نمونے اگلے زمانے کی یاد موجود تھے لیکن اب ان کا پتہ لگانا محال ہے۔ تصاویر میں سفیدہ اور سونا چڑھانا دہلی اسکول کی مصوری کے

خصوصیات میں داخل ہے۔ اودھ کے قدیم مصور اسی اسکول کے شاگرد تھے۔ لیکن ان میں بہت جلد تبدیلی واقع ہوئی اور ان کی صناعی میں یورپین مصوری کے خصوصیات اس کثرت سے داخل ہو گئے کہ لکھنؤ ایک جداگانہ اسکول ہوگیا۔ یورپ کے بعض مصوروں کو دربار اودھ سے خاص تعلق رہا ہے جن میں زوفینی سب سے پہلا مصور تھا، جو نواب آصف الدولہ کا ملازم تھا۔ اس کی تصویروں میں "مرغ کی پالی" اور "مرزا حیدر بیگ کا لارڈ کارنوالس کے پاس برسم سفارت جانا" یورپ تک مشہور ہیں۔ زوفینی نے نواب آصف الدولہ بہادر، کلاوڈ مارٹین اور دوسرے اُمرا کی شبیہیں بھی بنائی تھیں۔ چنانچہ مارٹین صاحب کی ایک اصلی تصویر کلکتہ مارٹینیر میں اب تک موجود ہے۔ مرغ کی پالی اور دوسری تصویروں کی اصلیں اب مفقود ہیں۔ لیکن ان میں بعض کی نقلیں یورپ میں اب تک موجود ہیں۔ اول الذکر تصویر ۱۷۸۵ء کے قریب بنائی گئی تھی جس میں اس منظر کو نہایت خوبی سے دکھایا تھا۔ یہ تصویر بہت عرصے تک نواب آصف الدولہ کے محل موسوم بہ دولتخانہ کی رونق رہی۔ مسز پارکس نے ۲۴ جنوری ۱۸۳۱ء کو اُسے شاہی محل میں بچشم خود دیکھا تھا۔ غالباً ہنگامۂ غدر میں دوسرے قیمتی ذخائر کے ساتھ یہ تصویریں بھی فنا ہوگئیں۔ مرغوں کی لڑائی والی تصویر کی ایک نقل ۱۷۹۴ء میں اُس کی تشریح کے چھاپی گئی تھی اور اس کی ایک رنگین نقل تانبے کی پلیٹ پر بھی بنائی گئی تھی جو آخری شاہ اودھ کے جواہر خانہ میں موجود تھی۔ اسے نواب علی نقی خاں (وزیر اودھ) اپنے محل واقع گوگھاٹ میں اٹھا لے گئے تھے اور اب اُس کا بھی پتہ نہیں۔

مرزا حیدر بیگ کی سفارت کلکتہ والی تصویر میں چند طویل القامت ہاتھیوں کی قطار تھی جس کے وسط میں سب سے بڑا ہاتھی اپنی سونڈ میں ایک زندہ آدمی کو لپیٹے ہوئے تھا۔ ہاتھیوں کے آگے آگے چند پیدل آدمی بے قاعدگی سے جا رہے تھے اور چند لوگ اطراف میں بیٹھے ہوئے تھے جن میں ایک نیم برہنہ عورت بھی نظر آتی تھی۔ تصویر کا منظر پٹنہ کے قرب و جوار میں کسی مقام پر قائم کیا گیا تھا، جو کلکتہ کے راستے میں واقع ہے۔ لیکن تصویر کو کسی تاریخی واقعہ سے چنداں تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

زوفینی کے بعد مسٹر ہوم اور ان کا بیٹا (اس کا نام بھی ہوم تھا) وارد ہند ہوئے۔ مسٹر ہوم ایک مشہور مصور تھے۔ ان کی شہرت دربار اودھ تک بہت جلد پہونچ گئی اور نواب سعادت علی خاں نے انہیں مدراس سے طلب کر کے ایک ہزار روپیہ ماہانہ پر ملازم رکھا۔ مسٹر ہوم کو شبیہ نگاری میں خاص کمال حاصل تھا اور انہوں نے بہت سی نادر تصویروں کے علاوہ نواب سعادت علی خاں کے پورے قد کی بھی ایک تصویر کھینچی تھی۔ شاذ و نادر طور پر کسی منظر کی تصویریں بھی بناتے تھے۔ اس قسم کی تصاویر میں ایک کا ذکر سلیمن صاحب (رزیڈنٹ لکھنؤ) نے اپنی یادداشت میں کیا ہے جو ان کی نظر سے گذری تھی

اس تصویر میں ایک شکار گاہ کا سین کھینچا گیا جس میں راجہ بختاور سنگھ نواب سعادت علی خاں کے پیچھے شکار کرنے کے انداز سے کھڑے ہوئے تھے۔

مسٹر ہوم کے بیٹے رابرٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں کپتان تھے لیکن اپنے نامور باپ کی طرح مصوری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاہ غازی الدین حیدر نے اپنے عہد سلطنت میں نہ صرف مسٹر ہوم ہی کی قدر افزائی کی، بلکہ ان کے بیٹے کو بھی اپنے زمرۂ مصاحبین میں داخل کر لیا۔ یہ بھی شبیہ نگاری کے استاد تھے۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر اور اس عہد کے اُمرائے شاہی کی بہت سی تصویریں اُن کے زور قلم کا نتیجہ تھیں۔ رسالہ "ٹیپ سپر" بابت ۱۸۲۴ء اور مسز پارکس کی تصنیف "سین اینڈ کیریکٹر آف ہندوستان" مطبوعہ ۱۸۳۷ء میں ان باپ بیٹوں کی مصوری پر زوردار ریمارک درج ہیں۔ مسٹر ہوم اپنی ضعیف العمری میں پنشن یاب ہو کر کانپور چلے گئے جہاں آخر وقت تک نہایت عیش و آرام سے بسر کرتے رہے اور وہیں وفات بھی پائی۔

ان دونوں کے بعد "چارلس ہاسٹر" آئے جن کا ذکر "ایک مشرقی بادشاہ کی پرائیوٹ زندگی" نامی کتاب میں ایک جرمنی مصور کی حیثیت سے آیا ہے۔ یہ شاہ نصیر الدین حیدر کے خاص مصاحب تھے اور ایک معقول تنخواہ پر طلب کیے گئے تھے۔ انہوں نے بادشاہ کی کئی نادر تصویریں انگریزی اور ہندوستانی لباس میں بنوائی تھیں۔ نیز بیگمات شاہی میں کسی فرضی بیگم کی ایک خیالی تصویر بھی بنائی تھی جس کی یورپین حلقوں میں مشرقی حسن کے ایک دلکش نمونے کی حیثیت سے بیحد شہرت ہوئی تھی۔ ان سب کے بعد ایک اور قابل الذکر یورپین مصور داخل دربار ہوا جس کا نام "بیچی" تھا۔ یہ آخری شاہ اودھ محمد واجد علی شاہ کا خاص مصور تھا۔ اس نے بھی ایک بادشاہ بیگم کی خیالی تصویر بنائی تھی، جو ۱۸۵۱ء کی نمائش گاہ لندن میں نمایاں کی گئی تھی اور جس کی بیحد شہرت ہوئی۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ دربار اودھ میں اول سے آخر تک ایک نہ ایک یورپین مصور داخل رہا اور اس طرح دیسی مصوری پر مغربی صناعی کا اثر پڑتا رہا۔ لیکن مصوران لکھنؤ اس نئی صنعت سے زیادہ بہرہ اندوز نہیں ہوئے۔ ایک انگریزی مورخ کا بیان ہے کہ اوّل اوّل جو مغربی مصور یہاں آئے انہوں نے دیسی مصوروں کو اپنا ہنر سکھانے میں فیاضی سے کام نہیں لیا۔ اوّل تو اُن تک پہونچنا اور ان کی شاگردی اختیار کرنا ہی سخت دقت طلب تھا اور جو نہایت مشکل اور صرف کثیر سے اُن کے شاگرد ہوئے ان کو عمدہ تعلیم نہیں دی گئی۔ دوئم ان کی تصاویر بھی عام طور پر دیکھنے میں نہ آتی تھیں کہ ان کی باریکیوں اور طرز صنعت کی تقلید کی جا سکتی۔ تاہم لکھنؤ میں مصوروں کا ایک کافی گروہ موجود تھا جس میں مختلف طبقوں کی مصوری کے خصوصیات کے باہم میل جول سے ایک نئی صنعت کی بنیاد پڑ رہی

تھی۔ ان لوگوں نے تصویروں میں سونا چڑھانا اور سفیدہ کی زمین تیار کرنا دہلی اسکول سے حاصل کیا تھا اور رنگ بھرنے کا طریقہ جے پور اسکول سے۔ روغنی تصاویر اور پرداز کے خصوصیات مغربی اسکول سے اُڑائے تھے اور اس طرح ایک نیا اسکول قائم کر لیا تھا جس میں ذاتی ذہانت اور زورِ قلم سے ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا تھا۔

شاہ زمن غازی الدین حیدر کے دربار میں ایک دیسی مصور کی بجید شہرت تھی جس کا نام "ٹھاکر داس" تھا۔ اسے روغنی اور آبی دونوں قسم کے رنگوں کی تصاویر بنانے میں کمال حاصل تھا۔ اس کی صناعیوں میں راگ اور راگنیوں کا ایک سلسلہ جس میں قاعدۂ الیگوری کے مطابق دیسی مذاق کی تمثیلی تصویریں بنائی گئی تھیں، نہایت اعلیٰ ہنرمندی پر مبنی تھا۔ جس کی تعریف میں یورپین نقادانِ فن بھی رطب اللسان ہیں۔ اس حیرت انگیز مصور کی نسبت ایک روایت نہایت دلچسپ ہے۔ ایک مرتبہ کسی رزیڈنٹ نے بادشاہ سے اثنا گفتگو میں دیسی مصوری کی نسبت نہایت حقارت آمیز کلمات کہے۔ اس پر بادشاہ نے ٹھاکر داس کو ایک سرکاری نوٹ کی ہو بہو نقل بنانے کا حکم دیا حالانکہ ٹھاکر داس انگریزی کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تاہم اُس نے نوٹ کی ایسی پوری نقل اُتار دی کہ جب دوسرے روز بادشاہ نے رزیڈنٹ صاحب کو بلا کر اصلی و نقلی نوٹوں کے پہچاننے کی فرمائش کی، تو انہوں نے حیرت داستعجاب کے ساتھ دونوں کو بہت دیر تک ملاتے رہے، اُلٹنے پلٹنے اور توڑنے مروڑنے کے بعد نقل کو بجائے اصل کے منتخب کیا۔ اس پر جناب عالی مسکرائے اور اصل نوٹ کو رزیڈنٹ صاحب کی طرف بڑھا کے نقل کو اپنے پیچوان کی چلم پر رکھ دیا۔ حتیٰ کہ وہ جل کر خاک ہو گیا اور اس عدیم النظیر صناعی کی یادگار مٹ گئی جس کا ذکر تاریخوں میں درج کرنے کے قابل سمجھا گیا۔

محمد علی شاہ کے عہد میں جس مصور نے شہرت و ناموری کی معراج حاصل کی اس کا نام محمد علی تھا جسے مانی رقم کا خطاب دیا گیا تھا۔ اس کی مصوری میں پرداز کے گھٹاؤ بڑھاؤ اور اندھیرے اُجالے کے خصوصیات نہایت قابلِ تعریف تھے۔ محمد علی شاہ کے دربار تخت نشینی کی تصویر جو شاہی محل کی زینت سمجھی جاتی تھی اسی مصور کی صناعی کا نمونہ تھی۔ اس کا بیٹا فضل علی جس کا لقب "بہزاد رقم" تھا، واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کا خاص مصور تھا۔ شاہی تصویر خانہ کی ساری زینت اسی ایک مصور کے قلم سے وابستہ تھی جس نے بہت سے محلات شاہی کی شبیہیں اور رزمانہ مناظر کی تصویریں بھی بنائی تھیں۔ اس کا داد ابھی ایک پرانا مصور تھا جس کی روغنی تصویریں نہایت نفیس اور قابلِ ستائش تھیں۔ اسی طرح بے شمار مصور تھے جن میں صاحب رائے اور بچو بیگ بہت مشہور تھے۔

ان مصوروں کی صناعیاں شبیہ نگاری کے علاوہ سوسائٹی کے مختلف مذاق پر مبنی تھیں۔ شاہی

مصوروں کا زورِ قلم زیادہ تر بادشاہوں کی تشبیہیں، دربار کے منظر، گورنر جنرلوں اور ریذیڈنٹوں کی آمد اور اُن کی سواریوں کے جلوس اور عام دھوم دھام کے دکھانے میں صرف ہوتا تھا۔ اکثر اوقات موکب خسروی اور شاہی شکار کے مناظر بھی بنائے جاتے تھے اور محلات شاہی کے سین بھی دکھائے جاتے۔ جس طرح اس زمانے میں اہلِ لکھنؤ کی زندگی پُر واقعات اور زندہ دلی کی روح لیے ہوئے تھی، اسی طرح اس عہد کی مصوری بھی اپنی بوقلمونی میں لاجواب تھی۔ کہیں گینڈوں اور ہاتھیوں کی لڑائی ہو رہی ہے، کہیں شیر ڈکار رہے ہیں کہیں چیتیں، پاڑھوں اور بارہ سنگوں کا جھرمٹ ہے۔ کسی تصویر میں کوئی نوجوان نواب مع بیگم صاحبہ زرنگار مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ سونے چاندی کے پاندان، اوگالدان، خاصدان، چنگیریں، شمعدان اور پیچوان قرینے سے رکھے ہوئے ہیں اور سامنے ڈومنیوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ کہیں عیش باغ کی برسات کا منظر پیشِ نظر ہے۔ جدھر، جھیل لہریں لے رہا ہے اور آم کے اونچے اونچے درختوں میں جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں، ہوا سن سنا رہی ہے اور جھولنے والی حور جمال بیگموں کے پینگ درختوں کی چوٹیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔

لیلیٰ و مجنوں کی محبت کے افسانوں کو بھی تصاویر کا لباس دیا گیا ہے اور بعض ہندو مصوروں نے مذہبی روایات کو بھی تصاویر کے ذریعے سے ایسے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کیا تھا کہ عقیدت مندانہ نگاہیں اُن کی زیارت سے سیر نہیں ہوتی تھیں۔ کرشن جی کی مُرلی بجانے کی ادا اور گوپیوں کی محویت جیسے نادر نمونے اُن مصوروں کی صناعی میں ملتے ہیں اب نظر نہیں آتے۔ قدیم و جدید مصوری کی مذہبی شاخ میں اب بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ اصولِ فن کے اعتبار سے جدید مصوری خواہ کتنی ہی قابلِ ستائش کیوں نہ ہو لیکن موجودہ مصوروں کے دل اس عقیدتمندی سے لبریز نہیں ہیں، جو اگلے مصوروں کی صناعی کو دلکش بنا دیتی تھی۔ راجہ راوی ورما کی تصاویر جو بیشتر مذہبی رنگ لیے ہوئے ہیں ان مقدسانہ جذبات کے اظہار سے قاصر ہیں جو ہادیانِ مذہب کے لیے ضروری ہے۔ اسی وجہ سے ان تصاویر کو نمائش گاہ الٰہ آباد میں نمایاں نہیں کیا گیا۔ لیکن مجھے لکھنؤ کی مصوری سے مطلب ہے یہاں کی اس سوسائٹی میں جو عیش پرستی کے طوفان میں غرق تھی، اگر چند عقیدت مند مصوروں نے روحانی جذبات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی تو اگرچہ ان کی صناعی ناقص ہی سہی تاہم ہزار تحسین و آفرین کے قابل ہے۔

عشق و محبت کی داستانیں عام تھیں۔ مثلاً کوئی عورت اپنے گھر میں بال کھولے بیٹھی ہے۔ مکان کی دیواریں اس قدر پست ہیں کہ کوئی شہزادہ گھوڑے پر سوار اُدھر سے گزرتا ہے اور عورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ عورت غیر مرد کو دیکھ کر شرم و حیا سے گڑ جاتی ہے اور نو وارد خدنگِ محبت سے زخمی ہو کر کلیجہ تھام لیتا ہے۔ مصور

اس ساری داستان کو ایک تصویر میں اس خوبی سے دکھاتا تھا کہ بادی النظر میں سارا قصہ ذہن نشیں ہو جاتا تھا۔ بعض تصویروں میں کوئی شہزادہ کسی شاہزادی کے محل کے نیچے ہاتھی پر سوار کھڑا ہے اور شہزادی اپنی سہیلیوں سمیت محل کے کوٹھے پر کھڑی ہوئی اس انداز سے جھکی ہوئی ہے گویا شہزادے کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ یا اس سے کوئی پھول یا دوسرا تحفہ لے رہی ہے۔ کہیں اندھیری رات میں کوئی حسینہ اپنے محل کے چور دروازے میں اس انداز سے خوفزدہ کھڑی ہوئی کہ اس کے عاشق کو جو اس سے ملنے آیا ہے کوئی دیکھ نہ لے اور اس پر روشنی کی شعاع نہ پڑ جائے۔ تصویر میں روشنی کا اظہار طلائی تحریر سے اور اندھیرے کا امتیاز سیاہ رنگ سے کیا جاتا تھا۔ بلکہ تصاویر میں سونے کا استعمال اس کثرت سے ہوتا تھا کہ آفتاب و مہتاب اور ستارے وغیرہ بھی طلائی ہی بنائے جاتے تھے۔

ہر تصویر کا عقبی حصہ (Background) دکھانے کے لئے عموماً تصویر کے عرض میں ایک برجیوں دار دیوار یا کٹہرہ بنایا جاتا تھا جس کے اوپر پھول پتیوں کے گچھے یا سرو، یا اور کوئی جھاڑی ضرور بنائی جاتی تھی۔ جھاڑیوں سے تھوڑے فاصلے پر بالائی جانب آسمان دکھایا جاتا تھا جس پر ہلکی ہلکی بدلیاں چھائی ہوتی تھیں اور درمیان میں کوئی پرندہ اڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ خصوصیات لکھنؤ کی مصوری کے اصول میں داخل تھے۔ صورتیں عموماً حسین بنائی جاتی تھیں۔ بوڑھے اور بدشکل چہروں کا کوئی شائق نہ تھا۔ لہٰذا مصوروں کو اپنی تصویروں کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے سوسائٹی کے مذاق کی متابعت کرنا پڑتی تھی لیکن توسیع فن کے اعتبار سے حسنِ قدرت (Natural beauty) کے اکثر نمونے دکھائے جاتے تھے۔ مثلاً مائیں اپنے بچوں کی حرکات دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں۔ رامچندر جی بن باس کے لئے جا رہے ہیں۔ یا گوپیاں جمنا میں نہا رہی ہیں اور کرشن جی ان کی ساریاں لے کر کدم کے درخت پر جا بیٹھے ہیں۔ یا شیو جی جنگل میں بیٹھے ہوئے ہیں اور پاربتی جی اُن کے پہلو میں جلوہ افروز ہیں۔ بعض تصاویر میں جنگل کے سین نہایت کامیابی سے دکھائے جاتے تھے اور ہندوؤں کی مرتاضانہ زندگی اور ریاضت کے واقعات کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا جاتا تھا۔ ان تصاویر میں لمبی لمبی جٹاؤں والے جوگی اور جوگنیں تقدسانہ انداز کے ساتھ عبادت میں مصروف ہیں اور دریا کے کنارے کٹیاں بنی ہوئی ہیں جن میں بعض اس قدر قریب ہیں کہ دریا اُن کے پاس ہی لہریں مار رہا ہے۔ میدان جنگ کے سین اگرچہ لکھنؤ کی آخری سوسائٹی سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے لیکن یہاں کے مصوروں نے اس صیغے میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ یہ منظر اس طرح دکھائے جاتے تھے کہ دونوں جانب صفیں آراستہ ہیں اور ڈھال تلوار سے معرکہ آرائی ہو رہی ہے۔ آخری مصوروں نے توپوں اور بندوقوں کی لڑائی بھی دکھائی تھی۔ لیکن یہ صناعی اُن سے طبعی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ البتہ ڈھال تلوار کی گھمسان لڑائی دکھانے میں ان کے قلم کو لغزش نہیں ہوئی۔

بادشاہ کی سواری مع بجید فوج اور لاانتہا جلوس کے عیدگاہ یا کسی دوسرے مذہبی مقام پر جاتی ہوئی عموماً دکھائی گئی ہے۔ شاہی شکار کے منظر بھی عام طور پر بنائے جاتے تھے جن میں شیر کا غضبناک حالت میں ہاتھی کی سونڈ یا جھول پر چڑھ جانا اور مہاوت کا اس پر بچاؤ سے وار کرنا بہت کچھ قدرتی بیساختگی کا پہلو لئے ہوتا تھا۔ اس منظر کو یہاں تک مقبولیت ہوئی کہ مٹی کے کھلونوں میں بھی دکھایا جانے لگا اور اب تک مقبول ہے۔ بعض ایسی تصویریں بھی بنائی گئی تھیں جن میں بادشاہ یا اُمرا اپنے محلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان میں عمارتی نقشے زیادہ وضاحت کے ساتھ دکھائے جاتے تھے جن میں در و دیوار، ستون و برج اور سائبان سب کی کیفیت نظر آتی تھی۔ اس قسم کی ایک تصویر راقم کی نظر سے گزری تھی جس میں مہاراجہ بالکرشن اپنے محل کے سائبان میں رونق افروز تھے۔ مہاراج کو آزاد چڑیوں سے بجید اُنس تھا اور ان کو اپنے ہاتھ سے دانہ دیا کرتے تھے۔ مصور نے اپنی تصویر میں مہاراج کے اسی جذبہ کو نمایاں کیا تھا۔ مہاراج کُرسی پر بیٹھے تھے۔ اردگرد بیشمار پیالے اور پیالیاں رکھی ہوئی تھیں اور پرند پر جوڑ جوڑ کر اُنکی طرف آ رہے تھے۔

مغربی صنّاعی کے اثر سے پیشتر لکھنؤ میں روغنی تصاویر بنانے کا رواج نہ تھا۔ صرف آبی رنگ کی تصویریا ہاتھی دانت، شیشہ، ابرک اور کاغذ پر بنائی جاتی تھیں۔ تانبے اور پیتل کے پتّروں اور ظروف پر بھی رنگین تصویریں اور گلکاری بنائی جاتی تھی۔ ابرک پر بعض نہایت نفیس اور نادر کام اب تک لکھنؤ کے اکثر تعزیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں جو ساری دنیا میں عدیم النظیر ہیں۔ لیکن کتنے ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس بے مثل صنّاعی کو اس نظر سے دیکھا ہے اور اُن مفلوک الحال کاریگروں کی محنت کا اندازہ کیا ہے، جو سال بھر اسی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کے تن پر کپڑا نہیں اور شاید اُن کے بچوں کو ایک وقت سے زیادہ کھانا نہیں ملتا۔

تصویر کے گرد بیل اور مداخل بنانا اور اس کی پشت پر قطعہ لکھنا بھی لکھنؤ کے خصوصیات فن میں داخل تھا۔ قطعہ کے گرد بھی رنگین یا سنہری بیل اور مداخل کا التزام ہوتا تھا اور بیلی کی زمین عموماً افشانی ہوتی تھی۔ سونا حل کرنے اور رنگ بنانے میں جو کمال اگلے مصوروں کو حاصل تھا اس کی مصوران حال کو آرزو ہے۔ اگلے مصور مو قلم بھی خود ہی بنا لیتے تھے۔ لیکن اب ولائتی برش کی محتاجی ہے۔ اب رنگ بھی ولائتی استعمال ہوتے ہیں اور لاجورد، سفیدہ و زنگار وغیرہ کا استعمال خواب و خیال ہو گیا ہے۔ لیکن ان معمولی رنگوں کی شوخی اور پائداری اب تک حیرت خیز نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔

فوٹوگرافی کے ایجاد سے پیشتر تناسب اعضا اور رگ و ریشہ کا صحیح اظہار عام طور پر ناممکن تھا۔ لیکن جو مصور علم تشریح سے واقف تھے اور کمال فن کے ساتھ دقت نظری سے بھی بہرہ ور تھے۔ ان کی صنّاعی میں یہ وصف بدرجۂ اتم موجود تھا۔ لکھنؤ کے بہزاد و رقم اور صاحب رائے اس صنف میں خاص کمال رکھتے تھے۔ اندھیرے اُجالے

کے اصول بھی عام طور پر رائج تھے اور پرداز کی گھلاوٹ میں تمام مسبوق الذکر مصوروں کو کمال حاصل تھا۔ اسی طرح قلم کی نزاکت اور رنگوں کی موزونیت میں بھی وہ کسی اسکول کے مصوروں سے دوسرے درجے پر نہیں ہے۔ لکھنؤ میوزیم اور شاہ نجف وغیرہ میں ان مصوروں کی صناعی کے اکثر نمونے اب تک موجود ہیں، جو دستبرد زمانہ سے بچ رہے ہیں اور ان سے نہ صرف ان کا کمال ظاہر ہوتا ہے بلکہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی خاص اسکول کی مصوری ہے۔

آخر آخر کئی قابل قدر مصور اور پیدا ہوئے۔ لیکن اب زمانہ کی ہوا اُن کے موافق نہ تھی اور عام افلاس، ناقدری اور کس مپرسی کی بدولت انہیں اُبھرنا نصیب نہیں ہوا۔ درحقیقت غدر کے بعد اہل شہر کے دل مُردہ ہو گئے تھے اور ان میں تمدنی زندگی کا احساس تک باقی نہیں رہا تھا۔ اس حالت میں مصوروں کی قدردانی درکنار انہیں پیٹ بھر روٹی ملنا محال تھا۔ شاہی عہد کا بہزاد رقم غدر کے بعد عرصے تک زندہ رہا۔ اسے اپنے کمال پر آخر وقت تک غرہ تھا اور باوصف ضعف بصارت اور فاقہ کشی کی وجہ سے قبل از وقت بڑھاپا آجانے کے جس سے ہاتھوں میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا، اس کی صناعی اصول فن اور حدود مصوری کے اعتبار سے بے نظیر ہوتی تھی۔ بلاقی داس بھی ایک ایسا ہی مصور تھا جو باوصف فاقہ کشی اور در بدر مارے مارے پھرنے کے اپنے وقت کا ایک لاجواب مصور تھا۔ اسے شبیہ نگاری میں اس قدر مہارت تھی کہ ادنیٰ فرمائش پر بھی فوراً تصویر بنا دیتا تھا۔ تصویر کا ہوبہو فوٹو کہنا چاہیے کہ اصل و نقل میں مطلق فرق نہیں۔ اس کی ساری ضرورتیں مصوری سے پوری ہوتی تھیں۔ بنئے سے آٹا لیا اور اُس کی تصویر بنا دی۔ حجام سے خط بنوایا اور عوض میں تصویر پیش کر دی۔ لوگ روزمرہ تصویریں لیتے لیتے تھک جاتے تھے اور اس کا قلم کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اگر کسی نے کچھ فیاضی دکھائی اور دو چار آنے نقد دینے کے تو اس کی رنگین تصویر مع نقش و پرداز بنا دی گئی اور وہ بھی ایسی لاجواب کہ اب قلم کی یہ نزاکتیں مفقود ہیں۔

شیخ قائم علی بھی ایک خاندانی اور مشہور مصور تھے۔ اُن کی صناعی کے اکثر نمونے اب تک اُن کے خاندان میں موجود ہیں اور بعض اہل شہر کے پاس بھی نظر آتے ہیں۔ نولکشور پریس کی بدولت انہیں زمانہ کی سختیاں نہیں برداشت کرنا پڑیں اور اس کے تعلق سے خوش و خرم زندگی بسر کرتے رہے۔ "گلستاں باتصویر" کی خیالی تصویریں انہیں کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ حسین بخش بھی ایک حیرت انگیز مصور تھا جس نے فکر معاش سے تنگ آکر جعلی اسٹامپ بنانا شروع کئے تھے، جن کی مدتوں شناخت نہ ہو سکی۔ آخر وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ لیکن اگر اس کی صناعی کے قدردان موجود ہوتے، تو اسے اپنی اعلیٰ ذہانت کو ایسے مجرمانہ فعل کی نذر نہ کرنا پڑتا اور دنیا اس کے کمال سے محروم نہ ہو جاتی۔

فوٹوگرافی بھی مصوری کی ایک شاخ ہے اور اس میں بھی اہل لکھنؤ کو قدیم الایام سے کمال حاصل رہا ہے اوّل اوّل تقریباً ۱۸۵۰ء میں ایک فوجی انگریز کے ذریعے سے یہ فن لکھنؤ میں داخل ہوا تھا اور اہل شہر میں سب سے پہلے "چھوٹے میاں" نے اس فن کو حاصل کیا تھا جو حسین آباد اور قیصر باغ ایسی عمارتوں کے نقشے بنانے کی وجہ سے تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد مشکور الدولہ نے بھی اس فن میں خاص کمال حاصل کیا۔ ان کے فوٹوؤں کی اب تک خاص شہرت ہے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ خصوصاً ٹون کے کام میں بے نظیر استاد تھے۔ آخری شاہ اودھ نے اُن کے کمال کی قدردانی میں مندرجۂ بالا خطاب دیا تھا۔ داروغہ عباس علی بھی ایک پرانے اور نہایت مشہور فوٹوگرافر تھے۔ انہوں نے بعض کتابیں مع فوٹو شائع کی تھیں۔ مثلاً "لکھنؤ البم" جس میں عمارات لکھنؤ کے پچاس فوٹو اور ان کی تشریح تھی۔ "حسینانِ لکھنؤ" دوسری کتاب تھی جس میں پچپیس رقاصہ یا حسینانِ بازاری کے فوٹو شائع کئے گئے تھے۔ "مرقع تعلقداران" آخری کتاب تھی جس میں چار سو تعلقداران اودھ کے فوٹو شامل تھے۔ آخر آخر "اصغر جان" برادر مشکور الدولہ نے بھی اس فن میں خاص شہرت حاصل کی اور اس کے بعد یہ فن اس قدر عام ہو گیا کہ گلی گلی فوٹوگرافر نظر آنے لگے۔

ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۱ء)

ہندوستانی مصوری

رباعیات عمر خیام کا ایک بیش بہا ایڈیشن

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ پانچویں صدی ہجری میں یاران قدح نوش کی بزم کا نقشہ کچھ ایسا جم گیا تھا کہ مولانا روم، سعدی، حافظ کے کلام میں اس کی چاشنی خاص طور پر نظر آتی ہے۔ شعرانے بھی بادۂ شیراز اور میخانۂ حجاز کی ترنم نوازیاں اس خوش اسلوبی سے کیں کہ خدا شناس اور خدا رس بھی بھول گئے۔ زمانہ کا مذاق دیکھ کر اہل الرائے کو بھی اسی شراب و کباب کی محفل کے تلازمات کا استعمال کرنا آیت اور حدیث سے بھی جائز ثابت ہوتا تھا۔ حافظ کے بعد جس شخص نے بے ثباتی عالم کی سادہ، شوخ اور دلکش تصویر جام و شراب کے پیرایہ میں کھائی ہے وہ عمر خیام ہے۔ اس کی رباعیاں عرفانی خیالات اور رازِ آفرینش کا لب لباب ہیں۔ جس طرح ان سے ایک دیندار مسلمان فائدہ اٹھا سکتا ہے اسی طرح ایک دھرمی ہندو اور سچا مسیحی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے کوئی رباعی ایسی نہیں جو معرفت اور گیان کا مخزن نہ ہو۔ عمر خیام تھا تو ایک ایرانی، اور اس کی قدر بھی اسی کے ملک

کی ایک خاص جماعت میں ہوا کی مگر جب سے فٹز جیرلڈ نے اس کی چند رباعیات انگریزی میں ترجمہ کر کے پبلک کے سامنے پیش کی ہیں، اس وقت سے زمانہ جو پہلے ایک جان سے اس کا طلبگار تھا اب ہزار جان سے عاشق زار ہے۔ فٹز جیرلڈ کے علاوہ اور بھی چند بزرگوں نے عمر خیام کی کچھ رباعیاں انگریزی میں ترجمہ کی ہیں۔ مگر جو قبولیت فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو حاصل ہوئی وہ کسی اور ترجمہ کو نہیں ہوئی۔ ایک ایڈیشن کے بعد دوسرا ایڈیشن نئے رنگ میں نکلا اور ہاتھوں ہاتھ اٹھ گیا۔ یہی نہیں بلکہ عمر خیام کے کلام اور خیال کے شیدائیوں نے جداگانہ کلب اور ہال تجویز کئے، جہاں آئے سال اس کی رباعیات پر لکچر ہوتے ہیں۔

کتابوں میں نفس مضمون کے مطابق تصاویر شامل کرنا خاص اہل ہند کا ایجاد ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک بزرگ نے ویدک طب کے متعلق ایک رسالہ میں چند تصویریں بھی کھینچیں۔ راجہ بکرماجیت کے بزرگوں میں سے کسی نے رامائن اور مہابھارت کے متعلق تصویریں بنوائیں۔ اگرچہ اس زمانہ میں تصویر بنانے یا بنوانے والے نے کسی خاص جدت سے کام نہیں لیا۔ مگر اب انہیں تصویروں سے اُس وقت کے طرز معاشرت پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ ہندوستان قدیم سے اپنی مصوری اور نقاشی کے لئے مشہور تھا۔ ماہران آثار الصنادید کے خیال میں جس قدر پرانے زمانے کی سنگتراشی کے نمونے یا موقلم کی مدد سے بنائی ہوئی مورتیں ہندوستان میں مل سکتی ہیں، کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ چنانچہ وہ پنج تنتر جو ہندوستان سے ایران پہنچکر کلیلہ دمنہ کے لباس میں ظاہر ہوئی تھی، باتصویر تھی۔ محمود غزنوی نے سومنات کے مندر سے رامائن کا ایک نسخہ حاصل کیا تھا جس کا کوئی صفحہ تصویر سے خالی نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور کے کتب خانہ میں شاہنامہ کی بھی ایک جلد باتصویر تھی اور کسی زندہ دل نے امیر علی شیر کے حکم سے نظامی کے سکندر نامہ کے چند ایک سین فن تصویر کے ذریعہ اس خوش اسلوبی سے دکھائے تھے کہ دیکھنے والے ایک نظر میں داستان کا سارا مضمون سمجھ لیتے تھے۔ بیتال پچیسی کی تصویریں بادامی کرنا جاننے سے پہلے بنا کے اور ہی خیالات پیدا کر دیئے تھے۔ بنگال کے ایک عالی خیال مصور نے کالیداس کے میگھ دوت شکنتلا اور دیگر ناٹکوں کے مختلف سین ایسے وقت میں تصویر کے ذریعہ دکھائے تھے، جبکہ کسی کو اس امر کا شان وگمان بھی نہ تھا، کہ اس سے کتاب کی زینت دوبالا ہوتی ہے۔ اہل یورپ نے اس سے ایک گونہ اور بھی جدت کا کام لیا ہے، یعنی کتاب مقدس کے مختلف سین مختلف پہلوؤں سے دکھلائے ہیں، اُن کے خیال میں اس سے بچے بغیر استاد کی مدد کے بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بات کو مدنظر رکھ کر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ولایت سے آتے ہی یہ بھی ایک خیال ظاہر کیا تھا کہ مسلمانوں میں تعلیم عام کرنے کے

لئے قرآن شریف کے بعض قصص کے متعلق رنگین، سادہ، روغنی تصویریں بنا کر بے انتہا تعداد میں اگر تقسیم کی جائیں، تو نہایت ہی مفید ہوگا۔ مطبع نولکشور کا خاص ایڈیشن "گلستان با تصویر" بھی نہایت پُرلطف اور دیکھنے کی چیز ہے۔

جس طرح یورپ کے باملاق آج کل مصوری کے فن لطیف میں نام پیدا کر رہے ہیں اسی طرح کسی زمانہ میں ہندوستان کے مصور مشہور تھے۔ اس وقت بھی ہمارے ہاں کی پرانی تصویروں کی اس قدر عزت ہے کہ ایک تصویر پانچ سے پانچ ہزار تک بکتی ہے۔ کسی مصور کی وہ تصویر جو راجہ جے چند والئی قنوج کی بیٹی کے سوئمبر کی تھی اور جس میں فتح چند کی فتح دکھائی گئی ہے، دس ہزار کو اٹھی تھی۔ الغرض ہندوستان فن تصویر میں کافی شہرت حاصل کر چکا تھا۔ لیکن کچھ برس پیشتر وہ بات جاتی رہی تھی، جو پہلے حاصل تھی۔ مگر راجہ راوی ورما نے از سر نو اس میں جان ڈالی اور کافی نام پیدا کیا۔ ادھر بنگال کے چند ایک بزرگوں نے بھی اپنی فنکاری کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ مثلاً بابو نند لال بوس نے "ساوتری اور فرشتہ موت" کی تصویر مشرقی خیالات کے مطابق پیش کی۔ لندن والوں نے اس کی خاص قدر کی۔ بابو سمیندر ناتھ ٹیگور کی "ستی" والی تصویر نے امید سے بڑھ کر عزت حاصل کی۔ بابو بنیندر ناتھ ٹیگور کی "چراغاں" والی تصویر ایک قیامت کا نمونہ ہے۔ غرض ان دنوں پھر ہندوستانی فنِ تصویر نے اس قدر ترقی حاصل کی ہے کہ یورپ کے نقادانِ فن کو داد دیتے ہی بن پڑتی ہے۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ تصویروں سے کتاب کی خوبصورتی دوبالا ہو جاتی ہے چنانچہ اس خیال کو مدنظر رکھ کر لندن کے رسالہ THE STUDIO کے کارپردازان نے جب رباعیات عمر خیام (انگریزی) کا ایک ایڈیشن نکالنے کا خیال ظاہر کیا، تو بیشمار ترجموں کے مقابلہ میں فٹز جیرلڈ کے ترجمہ کو ترجیح دی گئی اور پھر انتخاب پر انتخاب یہ کہ مصنف کی ۷۵ رباعیاں ایسی لیں، جو تقریباً مذاق عام کی دلچسپی کا سامان ہیں۔ چھپائی میں بھی خاص جدت سے کام لیا گیا ہے، یعنی:

ہر ایک رباعی پر سلسلہ وار نمبر شمار ہے۔

رباعی کے چاروں مصرعے چار چار سطور میں ہیں۔

کاغذ اعلےٰ قسم کا بہت دبیز اور چھپائی نہایت صاف۔

اور ان سب سے بڑھ کر مشرقی تہذیب، وضعداری اور اصلیت کو ایک نئے رنگ میں ظاہر کرنے کے

لے کلکتہ کے مشہور و معروف مصور، بابو ابنیدر وناتھ ٹیگور کے ہاتھ کی ایک درجن دلکش تصویریں دی گئی ہیں جو علیحدہ علیحدہ بارہ کارڈوں پر چھاپی ہیں۔ ان کو دیکھ کر بے اختیار باچھیں کھل جاتی ہیں۔ ہر ایک تصویر اپنے کارڈ کے کاغذی چوکھٹے میں نگینہ کے مانند جڑی ہے۔ لیکن مزید احتیاط کی غرض سے اس پر ایک باریک کاغذ لگایا گیا ہے جس پر سرخ رنگ میں وہ رباعی بھی چھاپ دی گئی ہے جس کا مضمون اس تصویر کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ یہ مجموعۂ رباعیات اور ایک درجن دستی قلمکاری کا نمونہ تصویریں، مشرقی طرز کی منقوہ کی جلد میں ہے۔ ہر ایک چیز نورٌ علیٰ نور اور اعلیٰ کاریگری کا نمونہ ہے۔

بابو ابنیدر وناتھ ٹیگور کا درجہ بحیثیت فن تصویر کے ماہر ہونے کے کیا ہے۔ یہ امر ہمارے احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ اس نمبر میں ہم آپ کی ایک مشہور تصویر "دیبلتی اودینس" ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اس سے آپ کی مصوری کا رنگ اور جدت طرازی واضح ہو سکتی ہے۔ حاجتِ مشاطہ نیست روے دلآرام را۔

رباعیاتِ عمر خیام کے اس نادر انگریزی ایڈیشن کی قیمت صرف ۱۵ ہے، جو محنت اور لاگت کو دیکھتے ہوئے کچھ چیز نہیں۔ جو صاحبان منگانا چاہیں، پتہ ذیل پر درخواست بھیجیں۔

THE STUDIO OFFICE
44. LEICESTER SQUARE
LONDON, W.C.

—— از ہمایوں لال شاکر (اکتوبر ۱۹۱۱ء)

تصویر بتیج گنگا گھاٹ

... شہاب الدین غوری کی فوج نے یورش کی اور تقریباً ایک ہزار مندر مسمار کر دیے گئے ...
سولھویں صدی میں آزاد خیال اکبر کی حکمت عملی کی وجہ سے اسے پھر ترقی نصیب ہوئی۔ لیکن اکبر کے بعد ہی اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی اور ۱۶۶۹ میں اورنگ زیب نے شہر پر حملہ کر کے گیان باپی سے ملی ہوئی ایک مسجد تعمیر کرائی جو نہایت قدیم مندر لشونا تھ کو مسمار کر کے بنائی گئی تھی اور جس کے عالیشان مینار اب تک اپنی گزشتہ عظمت و جبروت کی زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں — ایڈیٹر (فروری ۱۹۱۰ء)

مسمار مندر

سجادن دیو الہ آباد سے آٹھ میل کے فاصلے پر دریائے جمنا میں ایک چھوٹا سا جابو ہے۔ یہ عجیب و غریب پہاڑی ٹیلہ ایک نہایت قدیم اور بہت بڑے شہر کی یادگار رہے، جسے دریائے جمنا کی بیرحم موجوں

نے تباہ کر دیا تھا۔ اس شہر کی بہت سی علامتیں موضع دیوریا میں اب تک موجود ہیں، جو سجاون دیو سے صرف دوسو گز کے فاصلے پر واقع ہے۔ سجاون دیو اپنی پُرعظمت تنہائی اور خاموشی کے ساتھ جمنا کی چوڑی دھار میں ایک نامعلوم مدت سے کھڑا ہے۔ اس کی بلندی ۶۰ فیٹ ہے جس کی چوٹی پر ایک بُرج بنا ہوا ہے۔ یہ بُرج شاہجہاں کے عہد میں نواب شائستہ خاں نے ایک قدیم ہندو مندر کو مسمار کر کے بنایا تھا جس کا قطر ۲۱ فیٹ ہے۔ نواحِ الٰہ آباد میں یہ ٹاپو نہایت دلچسپ اور فرحت بخش مقام ہے۔
— ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۱ء)

مذہب پر حملہ

کتاب "معیارِ صداقت" کے متعلق (جس پر جنوری گزشتہ کے ادیب میں ریویو کیا گیا تھا) منیجر صاحب جیون شدھار پستکالہ لاہور تحریر فرماتے ہیں کہ "معیارِ صداقت میں حملے موجود ہیں۔ مگر وہ غیر آریہ ہی مذاہب پر نہیں، بلکہ آریہ مذہب پر بھی ہیں۔ ہر مذہب کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ یہ حملے مصنف کی طرف سے نہیں ہیں، بلکہ جو جو حملے آپس میں ایک مذہب نے دوسرے مذہب پر کئے ہیں ان کا نمونہ پہلو بہ پہلو دکھایا گیا ہے۔" ہندو مسلمان ہر فرقے نے اس کی بالاتفاق تعریف کی ہے۔ — ایڈیٹر (مارچ ۱۹۱۱ء)

تناسخ کی تردید

مؤلفہ سیتا رام صاحب۔ مطبوعہ یونین اسٹیم پریس لاہور، قیمت دو آنے۔ ۴۴ صفحات کا یہ ایک دلچسپ مکالمہ ہے، جس میں تناسخ کی تردید کی گئی ہے۔ دلایل ایسے واضح اور عام فہم کہ معمولی عقل کا انسان بھی بخوبی سمجھ جائے۔ اگر اس میں حکمائے پیشین کے اقوال ہوتے تو بحث اور مدلل ہو جاتی۔ مثلاً شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ حکیم عمر خیام تناسخ کا قایل تھا۔ حالانکہ خیام خود کہتا ہے:

دریاب تو این یکدمہ وقعت کہ نہ — آں ترہ کہ بدرودند و دیگر ردمید
گوزرنہ ای غافل نادان کہ ترا — درخاک نہند و باز بیروں آرند
کز جملہ رفتگان یکی نامد باز — می خور کہ بدین جہاں نمی آئی باز

اسلوبِ بیان کے ساتھ ساتھ اگر زبان کی خوبی ہوتی، تو اس کتاب کی پسندیدگی اور بڑھ جاتی۔ ممکن ہے کہ طبع ثانی میں اس کا لحاظ کیا جائے۔ چھپائی صاف تقطیع چھوٹی اور کتاب بکار آمد ہے۔ — ایڈیٹر (فروری ۱۹۱۱ء)

دھمپد

"بودھ مذہب کی کتابوں میں جو درجہ دھم پد کا ہے، وہ اور کسی کتاب کا نہیں ... خوشی کی بات ہے کہ پنڈت مانک راؤ وٹھل راؤ صاحب نے اس کتاب کو زبان اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے، اس اردو ترجمہ کا نام اقوال بدھ ہے۔ اشتہار (ستمبر ۱۹۱۱ء)

جبری عقیدہ

ہم نے بعض تعلیم یافتہ افراد کو بچشم خود دیکھا ہے جو اپنے مخالف عقائد رکھنے والوں کو بجبر خاموش کر دینا چاہتے ہیں " الناظر کے پچھلے پرچوں میں ہمارا مضمون جو تنقید الکلام پر شائع ہوا ہے اور جس کے ضمن میں مخالفت مذہب بھی شامل ہے اس پر باستثناء چند روشن خیال و منصف مزاج حضرات کے پبلک نے جس قدر ناخوشی کا اظہار کیا اس کے ذکر سے ہم ناظرین کی سامعہ خراشی کرنا نہیں چاہتے۔ خیر اگر بعض قدامت پرست اور جبہ پوش مشائخ نے جن کے معاش کا دار و مدار لوگوں کی ضعیف الاعتقادی پر ہے، اس پر غیظ و غضب کا اظہار کیا تو چنداں تعجب نہیں، لیکن باعث حیرت یہ امر ہے کہ تعلیم یافتہ جماعت کے ایک شہرت پسند رکن نے جو ہندوستان کے مختلف جماعات میں مساوات و اخوت پیدا کرنے کے مدعی اور ... و یورپ کے باہمی مشیر ہیں اس مضمون کو پڑھ کر اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ ایسے مخالف مذہب مضامین کی اشاعت ملک کے لئے مفید نہیں" مقالہ "نفرت" از ایک طالب علم (مئی ۱۹۱۰ء)

بیان ملکیت

سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل و دیگر تفصیلات

(بمطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸)

۱- مقام اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۲- وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳-۴- پرنٹر و پبلشر کا نام : محبوب حسین

قومیت : ہندوستانی

پتہ : رمنہ روڈ، پٹنہ - ۴

۵- ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندوستانی

پتہ : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ - ۴

۶- ملکیت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ - ۴

میں محبوب حسین، اعلان کرتا ہوں کہ مندرجۂ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر : محبوب حسین
۳۱ مارچ ۱۹۷۹ء

of 2 or 3 kos from Bihar Sharīf. An interesting disciple of Dīwān Rashīd was Mīr Sayyid Sa'du'llah Madārī of Village Pasaund in Sarkār Tājpūr of Saran for he alone had free access to his *Pīr* at all times in every condition. He used to accompany him whenever he embarked on a journey to Purneah. Although he was unlettered he used to talk sense and discussed problems. He died in 1127. Qāḍī Ḥabibu'llah, the Qāḍī of Tājpūr, Saran, had become known by the title Sirāj-ul-Ḥaque, for he was very pious, virtuous, honest and of very refined tastes. He died in 1140. There was another, Ḥabibu'llah Bihārī, a direct descendant of Shaikh Dhakī'uddin, son of Makhdūm Sharafu'ddin Manerī. He wrote *Hidāyāt-us-Sālikīn* and *Tuhfat udh-Dhākirīn*, and died on 29 Rabī' I, 1118. Miyān Shaikh 'Abdu'llah of Takia near Teghra in North Bihar, originally a disciple of 'Abd-ul-Qādir Sayyāḥ, restlessly wandered about in Jaunpur, Patna, and went without meals for many days. He met Sayyid Ja'far Patnāvī and Mīr Sayyid Madanī at Pasaund, and ultimately settled down and died at Takia near Teghra in 1137. Mullā Shaikh Mu'īnu'ddīn Manerī 'Uthmānī originaly belonged to village Madhaura of Pragana Barh and he received his education in rational and traditional subjects from Dīwān Rshīd. He died in 1131. One very famous disciple of Shāh Arshad was Miyān Shāh Ẓuhūru'llah of Sarkār Tājpūr, Saran, but he had gone to, and settled down at, Makhṣūṣābād (Bengal). Qāḍī Nūru'llah, a grandson of Qāḍī Ḥabibu'llah, was another notable disciple of Shah Arshad who died at his home village, Tājpūr, Saran in 1140. He was well versed in all the subjects then studied. There are a few others also.

with highly philosophical and mystical matters as were propounded by Muḥyīu'ddīn Ibn-i-'Arabī. He was an embodiment of humility. When the son of his *Pir* came to his place at Sharī'atābād (Chitkohra, Patna) he served him as an attendant. He died on 3 Ramaḍān, 1075. His sons were among the venerable disciples of Shāh Arshad, and Mīr Bāqir had been the teacher of his son, Ghulām Rashīd, the compiler of *Ganj-i-Arshadī*. Mīr Bāqir taught him *Taṣdīqāt-i-Quṭbī*. Mīr Aslam was an expert physician and would diagnose diseases of women through a thread fastened to their hands near the pulse. He was very well-read and had studied sciences such as astronomy, geometry, arithmatic, and astrolabe. Abu'l Ḥasan, the Foujdār of Benaras, told the compiler how lofty and disdainful of worldly things he was, and how Prince 'Aẓīm-ush-Shān, then at Patna, sent his courtiers with presents to seek his advice and guidance, but he would not see him. He was very strict in the observance of the religious duties, and on the occasion of the marriage of his son, Mīr Mahdī, he would not allow any kind of silken stuffs to be used even by the bride. He preferred the dress of country people called *Lak* which was like *Maḥmūdī*, a sort of Muslin and *Bāfta*, a cotton cloth. He was born in 1072, and died in 1118. He had passed the whole of his life in teaching and practising medicine. Mīr Aslam had become the spiritual successor of his father. He had been a fellow student of Shāh Arshad, and had finished his studies of the works there in current use (*Kutub-i-Mutadāwilah*) including those of Ibn-i-'Arabī, the *Fuṣūṣ* and the *Futūḥāt*. He was, like his brother, averse to *Samā'* or Sufic music. Once the compiler was a guest at Patna of Qāḍī Dā'im of Saran who had made an arrangement for a Qawwālī assembly for which two boy-ministrels had been kept ready. The Qāḍī hesitated, for one of his honoured guest was Mīr Aslam. When the latter was told that his venerable father had not prohibited music, he kept silent. Striken by paralysis, he died on 22 Shawwāl, 1138, and was buried in family vault at *Sharī'atābād*, Patna east.

One of the most learned and saintly personalities mentioned in the *Ganj-i-Arshadī* was Maulānā Allahadād, the famous commentator of the standard works *Kāfīyah* (logic), *Hidāyah* (law) and *Madārik* (*Tafsīr*). He was a pupil of and was deemed as an authority on *Fiqh*, *Uṣūl*, *Ka'ām* and *Ḥadith*. Among his inspirers and teachers mention is made of Qāḍī Shihābuddin Daulatābādī, Mullā 'Abd-ul-Mālik 'Ādil, and Maulānā Talambī. Strangely speaking he was a disciple or *Murīd* of Rāje Ḥāmid Shāh, an unlettered saint. He died in 923 and was buried at Sarā'i-Allahdīn which is at a distance

On 27 Jamādī II. 1075 H. Arshad quoted from a Qāḍī that Shāh Jahān had sent 2,000 rupees through Ḥājī Md. Sa'īd and had also directed Mirzā Mukarram Khān that if his father (Dīwān 'Abd-ur-Rashīd) willingly agreed to go to the court he should be sent there, and if he was reluctant he should not be interfered with. When the letter summoning him to the court was received and Mirzā Mukarram had a talk with him about it, the saint said, "If you have the imperial command to send me, why did not you do so in what ever manner you deemed to be proper. But if the matter is left to my choice, I shall not go ". Some men told the saint to respond favourably for the good of his nearer ones, and he replied that there were two reasons of which one was based on law. What is destined cannot be changed. Secondly, if my sons are fated to be prosperous, they would be so; and if not, all efforts for them would be useless. Somebody said to Mīr Ja'far Patnāvī "If your *Pīr* goes to the court to assume the *Vizārat* you would become an Amīr". He replied that his *Pīr* would never go. It was only after six months that Shāh Jahān was virtually imprisoned (f. 209).

The flashes splashed in the book include brief notices of those who were intimately connected with the Rashīdī family of Shaikhs of Jaunpur. We shall consider here only those who belonged to Bihar. Shaikh 'Abd-ush-Shakūr and Md. Naṣīb of Maner have been already referred to. The former has been repeatedly mentioned in some way or the other. He was a favourite disciple and also a pupil of Shāh 'Abd-ur Rashīd, and had admirers in aristocratic orders also. Once Shāh Nawāz Khān gave him a lift in his *Pālkī*, and showed him many jewels, including a lustrous diamond which was valued at Rs. 70,000 The Shaikh said that mustard oil which could be had for 4 *Khar Muhra* (small shells called cowri) would suffice to illumine a whole house, and if with such a large amount barley was purchased and distributed, it would confer a great benefit upon many poor people. He wanted a *Ḥaud* (reservoir of water for ablution) to be built for the congregational mosque, and it was done. A two storeyed mosque is still extant at Maner and bears his name. He was outlived by his *Pīr*, for he died earlier in Jamādī I, 1075. His son-in-law, Md. Māh Maneri, and Mullā Shaikh Mu'īnu'ddīn 'Uthmānī Maneri have also been mentioned.

Others very close to Shāh Rashīd and Shāh Arshad were Mīr Ja'far Patnāvī and his sons, Mīr Bāqir and Mīr Aslam. Mīr Ja'far was a Ḥusainī Sayyid of ascetic habits and scholarly attainments. The numerous letters addressed to him by his *Pīr*, Shaikh Rashīd, deal

and died at the age of 81 in 981 (31). Shaikh Ḥasan Ṭāhir who was born in Bihar, and Maulana Allahdād whose shrine still exists in Allahdin Sarāi, 2 or 3 'Karoh' from Bihar town, were friends and fellow students; and when the former entered into the spiritual discipleship of Rāje Ḥamīd Shāh, the latter who was one of the most learned scholar and mystic Ṣūfī of the time, and had written standard and widely read commentaries on *Kāfiyah*, *Hidāyah*, *Buzdavī*, *Madārik* etc. said, "Oh, Miyān Hasan! You have thrown the dignity of seekers of knowledge to the wind". He was asked to test the Sayyid; and when the learned Allahdād confronted the unlettered saint with difficult problems, he felt astonished at his replies, and himself became his *Murīd* (31) — Shaikh Ṭayyib, son of Shaikh Mu'īnu'ddīn, wrote a letter to Dīwān 'Abd-ur- Rashīd, and exhorted him to remain all along engaged in studying and giving lectures and lessons (*Dars-o-Tadrīs*); and once he wrote, "I wish to seek a *Farmān* for you through the Nawwāb from the Bādshāh, so that you may settle down in Benaras, impart lessons and learning, and this might serve as a propagation of Islām in this mine of infidelity. (f. 110). On 14 Jamādī I, 1075 Shāikh 'Ināyat brought a message from *Bakhshī* (pay master) asking for the saint's permission to include the house of an old woman within the mosque for its expansion, after securing her willingness. The saint replied, "The claims of neighbour are very great, and the space already available for prayer is quite sufficient. If no good is done to a neighbour, at least no harm or evil should be done. Though she considers herself to be under the protection of this poor man, the truth is that I, the slave of God, am under her protection, and weak, helpless ones are nearer to God and worthy of response. If I cannot be a flower let me not be a thorn" (f. 197).

On 12 Sha'bān, 1074, somebody suggested that for the alleviation of pain in the ears of the saint a sort of oil should be prepared with a live oyster shell and poured in there. He added that his brother who was suffering from such a trouble, and had lost completely the sense of hearing, was cured by this effective medicine, prepared by an expert physician. H. Arshad said "God alone knows if relief actually comes or not when for driving out an ailment, they burn down a living thing" (202). On 17 Rabī'I 1076, the compiler was given by his saintly father few strings of blue coloured threads with instruction that he should recite the verses of *Sūrah-i-Yāsīn* 21 times, each time making a knot of the cord, and such a thread be placed round the neck of the child to ensure its safety from a premature death (2(2).

chintā—Tan man apnā tujh ke dantā—Ab dekhūn kain terī kanthā Howa" *etc*. (Listen to me my Lord ! all my sufferings and anxieties have been caused by you. But I am still looking forward towards you and you alone). (7) "*Nairan rowe, nadyā bahā'ūn—nit uth shah kī sudh na pā'ūn—Ishī agahar sonko bula'ūn, Howa*" *etc*. (I have been weeping and weeping like a river for you—neverthless I don't find you, my lord ! Whenever I rise I am shouting for and calling you from the very house). (8) "*Sun ay sakhī, jo wah Shah pa'ūn—Chhowā chandan ang lagā'ūn—Kūd karūn O mangal gā'ūn, Howa*" etc. (Hear Oh you my female friend ! I may besmear my body with the sweet scent and sandal—I may jump up in fury and sing the song of welcome. He exists etc.) The exordium ends with the Persian line :— "*Takhtah-i-Ḥāmid ḥamd rawishtah, raqsh-i-ghair az lauḥ bi-shustah; Ṭīnat-i-'ū az ghair bi-rustah, Howa Howa laisa siwāho*" (Let on the tablet of Ḥāmid be your praise inscribed—the painted carvings of all others than you have been washed off. His nature has been rescued and saved from all except you. He exists and none else.

Such outpouring of a saintly poet of nature in a crude versified language which is neither the regional *Awadhī* of the locality nor *Kharī Bolī* but something in between—people's tongue or even rustic speech—may not commend themselves to the purists; but they have got a significance of their own in the History of Hindi/Urdu literature. We should not ignore them as effusions of unlearned persons. We have considered some ejaculatory and conversational specimens, and there are others such as "*Aur kuchh darkār nāhīn* (232). "*Miyān jāgte ho to dahī laimūn liyāvah*" of a similar type which emanated from those who were amongst the intellectuals of the age. Further ahead on folio 486, we get a *Gīt* beginning with "*Silaunain jhurmat khele*" etc.; and in a letter addressed to H. Arshad Badr ul-Ḥaq and on the last folio, 522 there are some verses which end abruptly with the book itself "*Milen more Shyām sundar—Arshd pīr tumhen bin mokon lāge sabhi jagat andherwa.. Jāg re bhor bhayi re panchhi*". Apart from the linguistic importance do they not throw some light on the forces of integration and the impact of the culture-elements of the indigenous population on the Muslims of higher order ?

Among the bits and flashes splashed on the book some are well worth consideration. They might throw some light on life and conditions, views, attitudes, outlooks and ideologies of the saintly personages of Jaunpur School. Shaikh Niẓāmu'ddīn of Ambhetī would not allow an expert non-Muslim physician of Fatahpur to treat him,

concerning *Namāz* he said "*Hawās bāwar howe, to kāhe pāncho kare*".

The fifth lineal ancestor of Rāje Sayyid Aḥmad Ḥalīmu'llah, Raje S. Ḥāmid Shāh, was a *Murīd* of H. Ḥusāmu'ddīn of Manikpur (f. 835). He was an unlettered poet and often composed Persian verses in praises of his *Pīr*. "*Main kon Samārūn Ghauth Ḥusām, Aur ke dhan hai, dhan sain karhīn kām; Mere dhan hain Ḥaḍrat Ghauth Ḥusām* (I rely upon the strength of my spiritual guide, Makhdūm saint Ḥusām, whom I always keep in my memory. All other become rich by worldly possession, but my wealth lies in his holiness, the saint Ḥusām). Some one approached him and asked for a formula which might evoke a response from God. He was told to recite repeatdly, "*Yā Ajījo*", 'Azīz being a name of God. The man thought that it was an inelegant style, and repeated the formula in its correct form. It did not serve the purpose. Sometimes after, when he met the saint, he again enjoined upon him to utter "*Yā Ajījo*", and added "*Mas'alah Jārab farḍ hai mūl, konhio boli pare Qubūl*" (the primary object is to know the point of law; in whatever language you utter, it will be acceptable). In the same place there is a beautiful poetical piece in mixed Arabic, Persian and Hindi consisting of 14 couplets. The Hindi portions are as follows :—(1) "*Jab nainan men terā mukh dekhā—ghar bāhar jan sab bisekhā—Rāt dewas man mānh yah līkhā, Howa Howa, laisa siwāhu*" i.e. when I saw your face in my eyes, everything outside and inside appeared to be obliterated; day and night I had this enshrined in my heart; He exists, He exists, and there is none except Him. (2) *Jaun sar jāye to neh na chhorūn: Sarjan kāre prīt na paurūn—Rāt dewas as Sāyīn baurūn, Howa Howa*" (I shall not give up my love for you, even if I have to lose my head for it—Oh my Lord ! I have not been able to realise your love and have been roving like a madman night and day. He exists... (3) "*Tan merā yah birhan dehiyā—Tujh kāran yah main dukh sahiyā—Ab jo ās hi akhkhā rahiyā, Howa...*" (You have given pangs of separation in my body—I am suffering on your account. But I live in a perpetual hope of getting you . (4) "*Nit onh pāth nihārūn jāye—Bidh keer āmīn Sidh na pā'i—Ab jew keonkar rākhun mā'ī* (I am perpetually looking forward towards the path leading to you—I have not yet been able to realise you—How can I keep myself alive. He exists etc.). (5) "*Sāyeen kāran jieu na bārūn, Tan man joban opar sawārūn—Kabhū howe tohe pukārūn, Howa...*" (I am still living for my Lord, I am preparing my heart and body and my beautious self for Him; when will the time come when I shall be able to take Him as my own. He exists etc.) (6) "*Sun Surjan tain merī*

The books taught in higher stages included *Zubdah*, *Sharḥ-i-'Aqā'id*, *Irshād*, *Mukhtaṣar-ul-Ma'āni*, *Sharḥ-i-Tahdhīb*, *Kāfiyah*, *Mi'at Āmil*, *Hidāyat-un-Naḥv*, *Sharḥ-i-Mullā* of Miyān Allahdad, *Muṭawwal*, *Ḥusāmi*, *Talwiḥ*, *Tauḍiḥ*, etc. Even at the age of eleven the compiler appeared to be very fond of games and sports, and when somebody pointed this out to his father he smiled and said in Hindi, "*Darzī kā pūt, jīyegā to sīyegā*" (f. 509). One can have some idea from the *Malfūẓāt* of the sort of education imparted in the elementary and learned stages. Books specially used were *Baiḍāvī*, *Sirāji*, *Sharḥ-i-Ta'arruf*, *Bustān-i-Abu'l Laith*, *'Awārif*, *Rashidiyah*, *Fuṣūṣ-ul-Ḥikam*, *'Aḍudīyah*, *Muqaddamah* of *Naqd-un-Nuṣūṣ*, some chapters of the *Futūḥāt* of Ibn-i-'Arabi, *Mishkāt*, *Mashāriq-ul-Anwār* etc. There is a reference on f. 574 to subjects like *Hay'at* (astronomy), *Handasah* (geometry), *Ḥisāb* (arithmetic) *'Ilm-i-Farā'iḍ* (the knowledge of dividing inheritence agreeable to law) and even to *Usṭurlāb* (astrolabe). But the books read on such subjects have not been mentioned.

A special feature of *Ganj-i-Arshadī* lies in the numerous off hand utterances and ejaculatory expressions emerging from the lips of the saintly personages of the *Rashīdīyah* school. There is a plethora of such words here and there which are still in common use in eastern U. P. and Bihar. Only a few may be mentioned here :— *Sīso* (for Sheesham, a tree), *Badhnā-i-āb*, *Mīyān Bhā'ī*, *Dulhā* Bhā'ī, *Ganderī Paunda*, *Sāg*, *Chapātī*, *Bhāt*, *Dāl*, *Kelā Bhāt*, *Khhichrī*, *Qābulī*, *Pothī Patrā*, *Do-pattā*, *Gudrī*, *Lohband*, *Manglī*, *Buddhi* (names). More important are full sentences of which also we get numerous specimens. In a *Samā'* assembly, being overpowered by ecstatic emotion Shāh Fatḥu'llāh Rājgīrī rose on his legs and cried out "*Dayī Pāwey to ham bhī Dikhāwain*". Encouraging the lifter of stones and woods for building a new hall for Shāh Arshad, his father said, *Sāt sohāgan ke hāth lāge, de māre*." Shortly before his death Dīwān Rashid queried, "*Ko'ī hamārā yār hai*" ? Getting a response he said, "*Hamāre yār aur hain, ke jānein*". When he died, lifting the shroud *Bālāposh* (coverlet) Shāh Arshad said "*Are Dīwānjī Kuchh Kahwa*". Getting hysterical he cried only thrice "*Tum sachche ham jhūthe*". In a letter to a friend he wrote "*Shahar kāsi. tasmā phānsi*". The saintly Rāje Sayyid Ḥāmīd Shāh Rāje of Manikpur (d. 1040) has been quoted "*Ham nā mārab, māre ān, dekha'ī ānkh, Sunā'ī kān*". When asked about the saintly Shaikh, 'Isā Tāj of Jaunpur, he was told, "*Jas tad nagar tas tad thākur*'. He hesitated to go to Jaunpur when Shaikh 'Īsā was there and was told, "*Tohār Bisār, unhke niksār*" (i.e. death). Explaining a *Mas'alah* (problem)

on 28 Dhīqa'd, 1120. His dead body was brought to and buried in the family vault at Jaunpur. The fourth son, the poet, Ghulām Quṭbu'ddīn who chose to become a disciple of the saintly Shaikh Ṭaiyyib, son of pious Mu'īnu'ddīn of Benaras, and his long poem of slightly less than a hundred couplets, have been referred to above. As regards Shaikh Arshad Badr ul-Ḥaq, he like others, had received good education as was prevalent at the time in Ṣufī circles, and this probably included something in the way of physical and military training also. It is he whom his father chose to be his spiritual successor. When his father was asked by 101 years old Mullā Muḥammad Shafi' of Amathua (Gaya), one of the five or six Bihari members of the Syndicate which compiled *Fatāwā-i-'Ālamgīrī*, as to what he would take to God as a present, he said that he would catch hold of Arshad by his hands and would offer him as the best he had.

There is no connected and adequate account at any place in the book of the actual existing conditions of education imparted at different stages in the *Khānqāh*, the subjects of study, the books generally taught and read and the methods and discipline of teaching followed. But tid-bits picked up from different places yield rich fruits. The *Maktab* ceremony commenced there as elsewhere with *Bismi'llāh* (in the name of God) which was written and had to be repeated. It was followed by some of the letters of the Arabic alphabets written by the teacher, and these had to be recited by the child, usually 5 or 6 years of age. Sweets were distributed and prayers were offered for the well being of the novice. Even when Diwān Rashīd was lying bed-ridden and was on verge of death, when he was told that one Rashīd Khān had brought his daughter for the initiatory instructions in *Bismi'llah* and *Ḥarf-i-Tahajji* (alphabet), he did not put forward any legitimate excuse. The letters of the alphabets were written on a piece of paper or on a wooden table called *Takhti*. Children were taught to recite short pieces of the *Qur'ān*, the whole of which had to be memorised by some later on. Ḥ. Arshad himself initiated the *Maktab* stage of his son and successor, Ghulām Rashīd, the compiler of *Ganj-i-Arshadi*, and then entrusted him to Md. Anwar Bengalī and others to help him in the recital and *Takrār* (repetition) of different pieces of the Qur'ān. Many others were employed to impart lessons in *Pand Nāmah* of Sa'dī, *Nām-i-Ḥaq*, *Niṣāb-i-Ṣibyān*, *Dastūr-ul-Mubtadī*, and Arabic grammar (*Taṣrīf*) like *Mīzān Munsha'ib*, *Ṣarf*, *Naḥv*. Thereafter began the teaching of *Manṭiq* (logic), *Kalām* (scholastic knowledge), *Adab* (literature), *Fiqh* (law), *Tafsīr* (commentary), *Ḥadīth* (tradition).

sudden assemblage of a large concourse of *Ganwārān* (boorish rustics) on the 'Nawwāb camp' at Sulṭānpūr. Shaikh 'Abd-ul-Ḥamid, the eldest brother of Shāh Arshad gave a good account of his war-like qualities (*Dād-i-sipahgarī dād*) and being assisted by Rustam Khān and others killed about 200 of the rioters, and many of them were driven towards the river and drowned in Gomtī. A few men on the side of the Nawwāb were also wounded. Elsewhere we are told that everyone of the saintly Sayyid family of Manikpur bearing the title of the Rāje was not only garbed as a *Darvesh* but remained fully armed cap a pie, and when asked as to why they kept themselves fully armed, the grandfather of 'Raje' Sayyid Ḥamid Shāh, said, "In these regions the chiefs and *Rāyās*, are leaders of mischievous people and they always make raids upon Muslims, and this is the reason why we feel the need of remaining armed and alert". When Dīwān Rashīd rode out to his ancestral place, Barauna, he was garbed in *Pairāhan* (a shirt or shift) over which was a *Kamarband* (a long piece of cloth girt round the loin) by which a knife was fastened. Over that he wore another *Jāmah* (robe or garment) with a bag containing a dagger bag tied to it. On his horse he carried a *Dopattah* (a sheet of cloth loosely thrown over the shoulder), a *Gudrī* (mendicant's quilt), a staff, *Na'lain* (a pair of shoes with wooden soles), and a *Bārāni* (a cloak to keep off rains). On 24th Rabī'I, 1074 he rode out on his horse armed with a sword.

The eldest son, Shaikh Md. Ḥamīd, has been described as a good scholar, a trustworthy functionary, and a perfect *Darvesh* by his temperament and dispositions. In his earlier career he served as a gallant soldier under Shāh Nawāz Khān. He was present in the camp of the Nawwāb of Sulṭānpūr which was threatened by a large concourse of *Ganwārān* (boorish rustics). He and Rustam Khān faced them boldly and killed many of the raiders. Others beat their retreat and lost their lives in the Gomtī. (f. 16). Abandoning his employment, he took up the work of *'Ilm-o-Irshād* (knowledge and spiritual training). His *Ḥāshiyah* or commentary on the *Tafsīr-i-Baiḍāwī* was highly commended by Qāḍī Md. Āṣaf, a very learned scholar of Allahabad. He compiled the Dīwān (*Shamsīyah*) and *Maktūbāt* of his father, and in this his third brother, Ghulām Mu'īnu'ddīn, helped him. All the four sons of Dīwān Rashīd had taken up the work of *Dars* (learning and teaching) as *Tarkah-i-Pidarī* (father's legacy). Mu'īnu'ddin was a fine calligraphist and he was also an adept in swift penmanship. He had entered in the service of Shāh 'Ālam I and had accompanied him to Hyderabad where he died

of knowledge; and this refelcted the true situation. His scholarly father, the author of *Rashīdīyah*, a commentary on *Sharīfīyah*, *Zād-us-Sālikīn*, and several other Arabic works on theology and mysticism, was a fellow student with Mullā Maḥmūd, the celebrated author of *Shams-i-Bāzighah* under Afḍal-ul-'Ulama Miyān Afḍal of Jaunpur. Once when the latter was lecturing, his own teacher, Mullā Mohan (Muḥyīu'ddīn) Bihāri, an erudite scholar of the age, and the teacher of Aurangzeb, came to the *Madra ah* and bade his ex-pupil not to stop for he would like to see how his lessons were received. In the intellelectual discussion (*Mudhākarah*) that took place Shaikh Rashīd held his own and received approbation. He seems to have received some military training also for whenever he journeyed from Jaunpur to Barauna, the place of his ancestral residence, he had the sword and the dagger by his side. Once being accompanied with 'Abd-ush-Shakūr Maneri he happened to pass through a place where Shāh Nawāz Khān had laid siege to the stronghold of a rebel, and they were accomodated in a place which was exposed to the discharge of artillery. Musket balls fell like rains but the work of *Dars* (reading and lecturing) went on together with the usual exercises of repetition (*Takrār*) and the lesson was completed. The favourite pupil of Maner used to get lessons also under the leaking *Chhappar* of the *Khānqāh*.

The book also refers to tension, disturbances, and plundering raids and Hindu-Muslim clashes and conflicts. An entry dated 26th Shawwāl, 1074 refers to a previous incident on the instigation of somebody. The *Kisāns* of the *Jāgīrdārs* fell on a village of Muslims and making a detour from the royal passway they fell upon a body of Sayyids and, plundered their property. The mischievous *Lashkaris* (soldiers) made many captives, dragged them with disgrace upto the city, and wounded two female inmates. At the instance of Shāh Rashid, Sheikh Md. Māh made a search and found the clue to the three captive children; but even though the Nawwāb was approached they could not be rescued on 27th Shawwāl, 1075. The *Musta'li* or chief man of Mandwadih came and said that the ruler of the village had plundered his *Ra'iyati* (farmed out cultivated land) and considerable quantity of grain had been brought in the market and put up for sale by the soldiers. The saint said that it was good that he had been informed of the affair for he would abstain from making use of such grains and would give up taking bread made of wheat and remain content with barley bread (*Nān-i-Juwār*) for this had been lying in the market from previous times. There is also a reference to a

an object of Divine wrath is not free from infamy and confusion. The Qāḍī should forbid these Muslims to go with them, and they should not transgress the path of Islām (f. 203). On 12 Sha'bān, 1074 a *Māli* (gardener) had collected fuel wood for burning it on the occasion of *Holi Saturnalia*. Ḥājī Jalāl was directed to see that he desisted from doing it (f. 205). On 7 Jāmādī II, 1079, at evening prayer, Shāh Arshad enquired about the day of *Dithawan* (the *Chaudashi* or the eleventh day of the bright half of the month of *Kārtik* on which there is a festival dedicated to *Vishnu*) and he was told that it would fall on the 9th of the month, on Thursday. He directed the attendant, Miyān Bungā, to bring a *Ganderī* (Joint pieces of the sugar cane) which the Hindūs take on that day. It should be taken before that for it was better and pleasanter to act in opposition to them (f. 193). On 9th Sha'bān, 1079 Shāh Arshad observed, "I, the mendicant, do not say that a temple should be converted into a mosque : it is better to make it a *Mazba'a* (a dunghill—any place where filth is thrown)" (f. 104). There was a reference to the levy of *Jizyah* and he said, "Whatever is levied in lieu of the responsibility undertaken for the protection of the life and property of the Hindūs who were called *Dhimmīs* or the protected people was *Jizyah*, and that was an yearly amount at the rate of 48, 24 and 12 *Dirhams* levied from the rich, middle and lower classes. The Qur'ān says, 'Make war...until they pay *Jizyah* with their hands and be subdued'. This has been provokingly magnified as follows :— "They should demand this amount and the *Dhimmīs* would have to bring it before the collector in hands raised above, and the latter should shake off his shoulder and say, "Give the *Jizyah*, oh enemy of God !".

It is a relief to turn from such things to the question of learning and education which was an essential part of the religious pursuits and spiritual training in the Sufic hospices. Dīwān 'Abd ur Rashīd and his four sons were highly educated men possessed of many-sided accomplishments. The youngest, Ghulām Quṭbu'ddīn (b. 1067) was a good poet of Persian and Hindi and his beautifully versified lines of *Shajarah-i-Irādat* have been given in full in the book. He has also been described as one of peerless and fearless intrepidity. He, like his brothers and father, appears to have had military training under the compulsion of the exigencies of the times. Once when garbed in a coloured *Lungī* (Loin cloth), a *Gudrī* (*Darvesh's* garment), a *Dastār* (turban) and a *Band-i-Kamar* (girdle or belt) he was asked by Miyān Md. Naṣib of Bihar as to whether he was a *Darvesh* or a *Sipāhī* : he said that he was neither the one nor the other, but a seeker

Qāḍī Hidāyatu'llah of Banaras approached Md. Amīn Khān, the Faujdār of the place, to send some men for the protection of the Shāh. Though the official contingent could not be sent, a few men clad in armour (*Baktarposh*) and matchlock-men (*Barqandāz*) came to protect the Shāh. But before they could arrive the Shāh had already reached the door of the temple which was closed with heavy locks weighing 5 seers. Crying aloud *Allah-o-Akbar* they hurled themselves against the gate and it crashed. The door was thrown open, but there was another inner gate. It was also broken. Some of the accomplices of the Shāh were killed by the blows of the spears of the Rājpūts and Sanyaseen (Hindu ascetics). Eventually the "Infidels were sent to the hell". Then the assailants entered the temple, broke down the idol, and ruined the *Dehra*. While destroying the temple of Visheshar, the big stones could be displaced only with great difficulties by means of hatchets and pick-axes. The hyperbolical number 500 given, could not have been that of the temples but of the idols or the images of the temple. The enthusiasts wanted to attack another *Dehra*, known as '*Band Madho*'; but as the streets had been tightly closed they could make no further advance. Shāh Yāsīn was, however, complete master ot the situation. The civil officers were mightily afraid of consequences for the Rājā was known to be a favourite of the Emperor. But when the report was conveyed to the Emperor, 'Ālamgīr, "the protector of the faith", he offered thanks to God, felt relieved of a great anxiety, and said that what was wished for had come about (f. 242).

The date, A.H. 1079/A.D. 1669, is that when, according to Dr. Altekar, an specific order issued by Aurangzeb for the demolition of *Visvanath* temple and its conversion into a mosque was executed. The Marathi scholar does not quote his authority. The *Malfūẓ* does not refer to any such order, and places the responsibility primarily on those who chose to build a mosque in the environs of Hindu temples and Rājpūt houses and then on the fanatical Muslims headed by Shāh Yāsīn. References to the temples of *Visheshar* and *Band Madho* (*Bare Madho*) which was not demolished in 1079 are also significant. But what has been said about the Emperor shows that he had scant respect for the venerated institutions of his subject people. That it was an age of intolerance and of puritanical actions (and beliefs) like those of early iconoclast is evident from sundry other items recorded in the *Malfūẓ*. On 11 Muḥarram, 1081, the saint said, "Today the Hindūs and some of the Muslims are going to perform the *Si'ala* (small pox) worship. To follow the footsteps of those who are

a plethora of references in *Ganj-i-Arshadi* (=GA), for he was one of the most trusted and favourite followers of the Rashīdī family. His fanatical zeal, and not any general order of Aurangzeb, was mainly responsible for the sacreligious distruction of some old temples near Visishvar and their conversion into a mosque which may or may not have been identical with Gyanvapi mosque. The compiler of GA refers to a letter of Miyān Shaikh Yāsīn, dated 15 Jamādī I, 1079, which briefly referred to such an action. It said that a Sayyid had erected a mosque which had been demolished by the infidels who had also wounded the builder. Hearing this the writer came from Mandwadih, took his seat in a mosque, and was ably assisted by one, Ḥāfiẓ Dost Muhammad, who broke the images with a wooden staff, and felt no need for the use of hatchets, pick-axes (*Kudāl*) or instruments like that. Shaikh Mu'izzu'ddīn also had done much in collecting the weavers of the locality, but the destruction of the big temple (*Butkhānah-i-Kalān*) was postponed. Elaborating this the compiler gives us what he had heard about the whole affair in some details from some dear one (*'Azīz*). At a place, called Harcha, a Sayyid who was a mason and a seal engraver, named 'Abd ur-Rasūl, decided to establish a mosque near which there was an idol temple, and there were also the houses of the Rājpūts all around that. The Hindūs naturally objected; but finding them obdurate held a meeting, and then demolished the erected walls of the mosque at midnight. The Muslims re-erected the walls, and the Hindūs again demolished them, and this process went on three or four times. One midnight, sitting in a hidden cover, 'Abd ur-Rasūl saw the Hindūs, assembling with implements, and challanged them; but he fled away when they showed a fighting attitude. They wounded the Sayyid. When the Muslims of the neighbourhood heard of it, they assembled in large numbers, and the Hindūs fled away. The wounded Sayyid was taken to Shāh Yāsīn of the Mandwadih whose zeal for religion was roused to the boiling point, and he decided to attain the felicity of martyrdom. The civil officials were torn between a mixed feeling of sympathy and fear, and they sent a message to the "*Jihādī*" Shah not to take the law in his own hands and commit any sacreligious action to the *Dehra* (temple) without the permission of the Emperor with whom the Rājā of the locality had very good relations. But Shāh Yāsīn, the religious zealot, paid no heed to the message sent by the administrators (*Mutaṣaddis*). Sword in hand, he rose for *Jihād* or the 'holy war', and advanced upto Chaukhamba market, defying the constant fusillading of stones from the houses or balconies of the Hindūs.

after completing his education under Afḍal-ul-'Ulama, Maulana Nuru'ddin Madāri, went to the court, seeking service under prince Mu'azzam Shāh Alam I. He was appointed Qāḍī of Jaunpur and was very strict in the discharge of his duties. He felt disgusted on seeing the prevailing atmosphere of corruption, slackness, and even the rebellious attitude of the soldiers, and their Jamadārs (leaders). Having come to know that the then Ḥākim of Dhākā (Bengal) was a "Shi'ah-i- Shanī'ah", an abominable Shi'ite, who reviled (*Sabb*) the companions of the Prophet, he ran to the place, killed the man, and "sent him to hell". The corpse of the un-named "accused fellow" was allowed to remain on the public road for 3 days as a warning lesson to all. People advised him not to prolong his stay there; but he was adamant and fearless, and remained unscathed. He refused to put his seal on a paper which had been prepared on his behalf by certain dear ones. Strangely speaking, the nobles dared not take notice of the murder of a Ḥākim or Governor or express any disapproval of his act. He was a favourite disciple of the Quṭb-ul-Aqṭāb (Dīwān Rashīd), and every year celebrated the anniversary of his death with great eclat at Dhākā. He died in 1105 (f. 9).

But there is also another side of the picture. On 4th Shawwāl, 1073, one of the men of the saint's assembly said that such and such Ḥākim of the city was a tyrant and a *Rāfiḍī* (heretical Shi'ite), but he performed the 'Īd prayer in congregation. Shāh Arshad said that if he was seen performing his congregational prayer, why was he speaking ill of him, and it behoved him to look at the good rather than the bad side of any one (f. 195). Many men of high rank and position paid visits to Dīwān Ṣāhib and his successor, Shāh Arshad. These included Bahādur Khān, a brother 'Ali Quli Khān Shaibānī of the time of Akbar and Jahāngir. They were Shi'ites in creed and Uzbak in race. Ja'far Khān, sometimes a governor of Bihar, and a prime minister of Shāh Jahān, his son Kāmgār Khān, and many other Irānis, obviously Shi'ites, like Nawwāb Ghaḍanfar Khān, Shāh Nawāz Khān, Mukarram Khān etc. used to pay courtesy calls to the Jaunpur saints. Once Kāmgār Khān came to pay his respects, and was kept waiting. After sitting for sometimes he left the place in disgust, to the utter unconcern of the saint. Apparently, the saint had poor opinion about the "Mughal Irānī", as is apparent from his attitude and remarks regarding Nawwāb Ghaḍanfar and I'tiqād Khān.

A case of religious intolerance was furnished by Shāh Yāsīn of Mandwadih, the author of *Manāqib-ul 'Ārifīn*, about whom there is

Shaikh and stepped forward to welcome him. When he had returned, Shaikh Adham was approached by a needy person who insisted upon the saint seeing the king again and speaking personally about him. The holy man was prepared to write to him, and even to send one of his men to the Sulṭān for the purpose; but the man became more importunate than before. The saint had to yield, and started in a *Muḥāfah* (a covered chair). The *Munhiyān* (reporters) informed the king of it who, at that time, was preoccupied with some serious affair, and he directed his men to set up a white tent for the saint's reception. The Shaikh suddenly decided to return without seeing him, and told the man that the affair had to be left to God. After some time news arrived that Sher Shah had received a fatal burn during the course of the investment of the enemy's fort. As usual, an element of the marvellous has been introduced into the narrative.

Shaikh Adham's grandson, the pious Shaikh Qiyāmu'ddīn, was once summoned by prince Jahāngīr, then at Allahabad, and he was asked about the age of his father, grandfather and his own; and the reply given about himself was that it was not the ways of the men of his house to keep a record of their lives and times. The imperial prince wanted him to stay with him, and the Shaikh answered that he would prefer to remain content with the grass that had grown up around the shrines of his ancestors, and would continue to sweep the floor thereof. This was quite in keeping with the attitude of the *Chishti* Saints, for they were generally averse to close associations with kings and courtiers or officials for personal profits.

There is another reference to the Emperor Jahāngīr reflecting the time-old religious discords on the question of cows. On 22nd Rabī'II, 1080, the saint of Jaunpur said that in the beginning of the reign of Jahāngīr cow slaughter had been prohibited in the city of Mathurā. Someone had the hardhood of killing a cow which immediately recoiled upon him; for he, and his two sons, had their throats cut down by the irate Hindūs. Strangely enough, the *Pīr-i-Dastgīr* (Shah Arshad) accounted for, and approved of, the act of the fanatic (*Taujīh-o-Taḥsīn*), and said that the murdered ones would be interceders on behalf of the Emperor (Shāfi'), for it was in his reign and because of him, that they attained the position of martyrs (f. 190). Again we are unable to understand how the disclosure of an evil action by some one could be interpreted as detraction or slander (*Ghībat*) which needed some allowance and favourable judgement (*Tā'wīl* and *Ḥusn-i-Ẓan*). We get another case of bigotry. Qāḍī Ḥabību'llah 'Alawī, a relative of Dīwān 'Abd ur-Rashīd,

Jahāngīr, Mu'azzam Shāh 'Ālam I and others to ordinary artisans, *Naddāf* (Carder), *Hajjām* (barber), *Nūr-bāf* (weaver) and even *Domes* and *Halālkhors* (sweepers). The book is interspersed with anecdotes and references to fights and fanaticism, displayed in saintly circles; the Sayyids and Shaikh Darweshes of Manikpur remaining armed cap-a-pie. The original matters and many fresh *or* new matters can not but attract the attention of a student of life and culture of the age in which the saint flourished.

There is some information of historical interest. Referring to *Tārīkh-i-Jahān Ārā* (not known to us), the compiler of the Malfūz, says that Jaunpur was founded by Sultān Firozshah Tughlaq. Proceeding from Bahraich he came to the bank of Gomtī, and seeing a flat level ground, he decided to lay the foundation of a new city which he named after his cousin, Sultān Muhammad Tughlaq, who was called Malik Juna. *Tārīkh-i-Muhammadī* has also been quoted from to the effect that when Firoz Shah returned for the second time from Bengal expedition in the year 765 (sic : 762) and halted at the town of Zafarābād he laid waste the village of Karsa on the bank of river Gomtī and built an elevated fort in the newly established city of Jaunpur, and to this he invited many notable Mashā'ikh (holy men) 'Ulamā (scholars) and Fuḍalā (accomplished personages) from different places, and made them settle down there. We may also notice in passing what the Malfūz says, on the basis of a book, *Thamarāt ul-Quds*, about the killing of his brothers, Khiḍr Khān and Shadi Khān, Murīds or disciples of H. Niẓāmu'ddīn Auliyā, by Sulṭān Quṭubu'ddīn, after the death of their father, 'Alā'u'ddin Khilji; the strained relations of Quṭubu'ddīn with the renowned Chishti saint who maintained his composure, although Wajihu'ddin Aḥmad and 'Alī Shāh, brothers of Amir Khusrau, had warned Sulṭān ul-Mashā'ikh of the impending danger from the Sulṭān's wrath; and to Quṭubu'ddīn's unexpected murder at the hands of his favourite, Khusrau, and his men of *Brādau* tribe. We are also told about the hostility of Sulṭān Ghiyāthu'ddin Tughlaq shown towards the great saint, and its miraculous end in favour of the latter (ff. 55-59). Elsewhere, we get an interesting account of Makhdūm Shaikh Minnatu'llah known as Shaikh Adham the author of *Mūnis udh-Dhākirīn*, and a very learned and vernerable person who used to be reverently received and consulted by Sher Shāh Sūr concerning the grants, stipends and lands to the deserving men. A list of *Tūmār* was prepared at his instance. We are told, on the authority of *Thamārāt-ul-Quds* that when Sher Shah was about to embark on his last and fatal Kalinjar expedition, he first went to

undertaken, the means of conveyance used, routes and stages, (*Sarā'is*) which had to be passed through, and were halted at, during the course of travels of Shāh Arshad Badr ul-Ḥaq, via Benaras, Sarā-i-Mughal, Shahabad, Bhojpur, Sasaram, Arrah, Naubatpur, Mohibalipur to Maner, Biharsharif and Purneah, the last mentioned place containing the shrine of his grand father, Shāh Jamāl Mustafā Abu'l Hamid 'Uthmānī, the spiritual disciple of Shāh Niẓāmu'ddin 'Uthmānī of Ambheti (d. 981 A.H.). There is something interesting even in the long geneology of the saint, given in the book for the blood of the second and third caliphs of Islam ran in his veins, and besides the high pedigree, he could boast, there was an odour of sanctity and also of scholarship about his family. His recorded lineage went up, through the great Sufi saint, *Sari Saqti*, the spiritual master of the celebrated Junaid Baghdādi and a contemporary of Ḥārith Muḥāsibī, Bishr al-Ḥāfi etc. to Ában, the son of 'Uthmān, the third Caliph. The maternal grandfather of Shāh Arshad was Ḥājī Arzānī Fārūqi, a descendant of Khwājah Mubārak Arzāni, a noted Traditionist (*Muḥaddith*), who was the author of *Ma'ārij-ul-Akhbār* which he planned in 952 on a novel way, on the model of the well known *Mashāriq-ul-Anwār* of as-Saghānī Lāhori (d. 577-1181). The Khwājah is said to have served Sher Shāh Sūr and his son, Islam Shāh, as a minister, and died in 980 A.H.

The book contains abundant information about the various affiliations or *Silsilas*, (Sufic orders), besides exposition of the principles of Sufism, and mystic thought and tendencies like the concept of *Tauḥīd* (Unity of Being) *Ma'rifat* (insight in divine matters or mysteries), or knowledge of self, universe, love etc. *Ta'lim-o-Riḍā* (resignation and acquiscence for God's sake), *Ilqā wa Nuzūl-i-Rūḥānī* (inspiration, communication and spiritual descent), *Ghalbāh-i-Ḥāl* (ascendency of ecstatic conditions), mostly dealt with in epistles, addressed by Shāh Arshad's father, Diwān 'Abd ur-Rashid, entitled Quṭb ul-Aqṭāb, to special disciples, sent in reply to their queries. *Ganj-i-Arshadi* is largely based on *Ganj-i-Rashīdī* compiled by Qāḍī Maudūd, and has also been drawn upon both well known and little known sources. Of some special interest are the biographical particulars and notices of numerous saints and Sufis and scholarly personages of Bihar, Bengal and eastern U.P. who were disciples, devotees and associates of the learned father and his accomplished sons of Jaunpur School. We meet with a great many of contemporary persons of different walks of life from high provincial and local chiefs and noble Irānīs, Afghāns, and Mughals, also kings like

ing among Muslims). There are matters of some sociological interest.

Founded on the notes and notices, religious, mystical, hagiological, anecdotal, biographical, prepared about the life, actions, discourses and epistles of Shāh Muḥammad Arshad, entitled Badr ul-Ḥaq (b. 1041; d. 1113 A.H.), and of his scholarly father, Dīwān 'Abd ur-Rashīd (b. 1000; d. 1081 A.H.) by his friend and follower, Shāh Shukr Ullah, and compiled later in 1134-35 A.H. by his son and successor, Abu'l Fayyāḍ Ghulām Rashīd (b. 1096; d. 1167 A.H.), the present work has all that constitutes the characteristic contents, faults and virtues, as are usual with works of the class. The bulk of the book consists of matters which hardly add anything new to the existing knowledge. What is new and original is not much, and has to be picked out, and is therefore scarce. Of course, we have to take into consideration the instructive discussions and observations of the saintly personages of Jaunpur on a variety of subjects, usually connected with Sufism, on questions and points of law, mystic traditions, veneration of the *Pir* or *Murshid*, and miscellanies relating to ethical matters, austerities, religious duties, rituals and routine of life from Sufic standpoint. Much that is based on Jāmī's *Nafaḥāt*, 'Aṭṭār's *Tadhkirah*, works of 'Abd ul-Ḥaq Maḥaddith Dehlavī, 'Abd ur-Rahmān Chishtī, the authors of *Siyar-ul-'Ārifīn*, *Siyar-ul-Auliyā* and other writers which give no first hand information; as also, and specially, the long accounts and legendary stories of the prophets of the past, and of the great mystic saints who had flourished outside India, and in our own country, since the 12th century, form very tiresome reading. The big space devoted to *Shajarah-i-Bai'at* (spiritual tree of ascent and discent), *Khilāfat Nāmah* and *Ijāzatnāmah* (vicegerance and permission given to make *Murīd*) — all in Arabic—, the instructions about the performance of prayer, obligatory, auxiliary or *Nafl*, *Tarāwīḥ* (extra prayer in Ramaḍān), *Namāz-i-Ma'kūs* (prayer performed while suspended and turning upside down), and long geneologies since Ādam, and glorification of saints and Shaikhs, can commend themselves only to a few. Besides, there is much in the present work which is hardly credible and amenable to reason.

But the book is not without the virtues and values of its own, even from the point of view of a critical researcher. Most of the narration of events, of life and movements, deeds and associations of the saintly personages, with the contemporaries are in chronological order, with exactitutde of dates, days, months and years. There is some useful geographical information, arising from the journey

florid artificial style, and it reflects the ways and modes of thought of the Sufi Shaikhs of the age to which it belongs. It gives us an idea of interaction between alien and indegenous culture and communities, each contributing something to the other, without being influenced so much as to result in loss of individual entity or identity. There is a plethora of *Malfūẓāt*; but for the present we are concerned with one of the three, forming a series, produced by the 17th and 18th century Sufi Saints of *Chishtī* order of Jaunpur with affiliation to the other major *Silsilas*.

Of the comparatively little known *Malfūẓāt*, *Ganj-i-Rashīdī*, *Ganj-i-Arshadī* and *Ganj-i-Fayyāḍī*, the second is more imposing, voluminous, fuller and somewhat of historical and cultural interest. The Phulwārī Khānqāh manuscript is slightly worm-eaten and repaired, and the confusion arising from the ill-arranged contents and misplaced leaves may be rectified by a comparison with the other two manuscripts seen by the present writer, one of Mahal (Bihar sharif) and the other of Khānqāh-i-Rashīdiya mahalla Mast of Jaunpur town. The manuscript before me is bound in two volumes, covering altogether 522 folios and is written in fair *Ta'līq* script with 20 lines to a page, and ends abruptly. The detailed table of contents is divided into 10 *Bābs*, which are subdivided into a considerable number of *Faṣls* and *Waṣls*, and its headings like those of the various sections are in rubrication. That the arrangement is not well kept, is apparent from the fact that *Bāb* 3 comes on folio 481, and there is no correspondence of the text with them; those with headings of the last seven do not appear. Apparently chapter 4 about *Ma'mūlāt* (manners and habits), 5 on *Kalām* and *Maktūbāt* (speeches and letters), *Faṣl* 1 and 2 of Bāb 6 relating to *Ash'ār-i-Fārsī wa Hindī* (verse), *Faṣl* 1 and 2 of 7 regarding *Ru'yā* (dream and vision), 8 on *Malfūẓāt* (discourses), 9 dealing with death and burial of saint Arshad, 10 on *Irādat* (discipleship), and *Khātimah* (epilogue) on *A'rās* (anniversaries of saintly personages), do not find separate places in the body of the book, though particulars regarding all these, and many others, in between, are found scattered here and there throughout the book. There is no mention, however, anywhere, of *Man'-i-Jalwa* (the first meeting of the partners of marriage, or bridal bed in the presence of the relatives), *Dhikr-i-Tambākū*, (*Bhang and Sharāb*, *Karāhat-i-Ṭa'ām-i-Siyum wa dahum* and *Dhikr-i-Chihlum-o-Shashmāhī* (disagreeableness or disapproval of the ceremonial distribution of food on the third, tenth or the fortieth, and half yearly day, after the death of the deceased, generally applied to the period of mourn-

The religious literature and sacred writings of the medieval Indian Sufis which come frequently under three categories, *Maktūbāt*, *Malfūẓāt* and *Tadhkiras*, are to be studied not as literary works but primarily as a source of knowledge of our heritage of the past,—characteristic culture and traditions, monastic and ethical conceptions, lives and legends and things of a vague set and conventional pattern. The writers lacked scientific outlook, had little or no methodology, and believed in all that was marvellous and miraculous. There is a good deal in them of apocryphal *Ḥadīth* or traditions and legendry stories and anecdotes of apostolic and saintly patronages of the past. Comparatively speaking, the *Maktūbāt* provides us with authentic literature produced by eminent Sufis about the mystic creed, theories, principles, doctrines, practices and discipline of Sufism. The *Malfūẓāt* and *Tadhkiras* give a catalogue or list of Shaikhs and saints with a collection of their lives and legends, deeds, discourses and spiritual teachings concerning religious duties from Sufic stand-point, and also a set of impressions and views on a variety of subjects expounded impromptu to the audience or visiting devotees, disciples and admirers. But the *Malfūẓ* genre is not devoid of something of substantial value, and has had a place in pious literature, clarifying some outstanding spiritual and mystical issues concerning *Kasb-o-Riyāḍat* (acquisition by labour and austerity) like *Adhkār* (repeating the names and attributes and praising God). It conveys information of diverse type in simple language without any embellishment or any

The biographical sketches **(Tadhkiras)**, *Letters* **(Maktūbāt)** *and Utterances and Discourses* **(Malfūẓāt)** *of the Sufi saints form a genre which are of great significance for those who are interested in Sufic literature and which have not had the attention that was due to them. The Sufis were divided into several orders, and their centres of activities were different, spread throughout the whole of India. One of the important centres was Jaunpur. Among the works produced by the scholarly Sufi saints of Jaunpur School, the Malfūẓāt,* **Ganj-i-Rashidi**, **Ganj-i-Arshadi**, *and* **Ganj-i-Fayyāḍi** *are most important. Here is a short study of* **Ganj-i-Arshadi** *of which, to the writer, no complete and undamaged copy was readily available.*

Malfuzat : An untapped source of Social History
Ganj-i-Arshadi of the Jaunpur School —*A Case Study*

by
Prof. S. H. Askari
Patna

The present issue, besides containing a detailed analysis of *Ganj-i-Arshadi*, the *magunum opus* of the Jaunpur school of Sufism, includes a selection of the significant writings appearing in the distinguished Urdu monthly, ADEEB of Allahabad, which, though short-lived, brought out during the short span of 1910 to 1913 a number of items which are still worth preserving and, therefore, reproducing. Started in January, 1910 by the enterprising Indian Press, Allahabad, under the editorship of the famous editor and poet of that period Naubat Rai *Nazar*, its last issue appeared in July, 1913, the editorship changing hands from Naubat Rai to Pyarelal *Shakir* in June, 1911 and from Pyarelal to *Haseer* Azimabadi with effect from January, 1913 to last only for seven months.

The present selection is divided into two parts. Part I consists of 14 articles containing biographical accounts of eminent contemporary Urdu writers and poets written in most of the cases by their intimate friends. Supplementing the contemporary account of documentary value, the photographs of 35 eminent persons appearing in ADEEB and not easily found elsewhere have also been reproduced alongwith 3 historical groups, 3 groups of writers and journalists, 4 *waslis* and one specimen of Ghalib's autograph. Two articles regarding 2 leading institutions, the Nadwatul Ulama of Lucknow and the Imperial Library (now the National Library at Calcutta) and an informative article dealing with the immortal Firdausi's *Shahnamah* have also been included in the present selection. The last section contains a selection of 5 stories by **Premchand** prefaced by another of his articles on the art of writing novels in Urdu; as these writings after their first appearance in ADEEB have been forgotten by the Urdu readers, their reproduction may be appreciated as our humble share in the celebrations to mark the birth centenary of **Premchand**.

Part II of the present selection represents, with a variety of subjects, the nature and character of the contents of ADEEB on a wider plane. It consists of 79 items with the following break-up :

5 distinguished poems; 11 notes/articles on contemporary and near contemporary Urdu poets; 6 articles/notes on contemporary Urdu prose writers; 5 articles/notes on Deccani personalities; 4 on All India figures and 1 on the great Indian poet of all times. Eight articles/notes are regarding Journals, Journalism and Press. Nineteen articles deal with Urdu and the problem of Hindi versus Urdu. Three articles are on socio-political issues, two notes deal with the libraries and two items are regarding education and learning. Three articles are regarding rites and reform of Indian Muslims, two on medieval India archaeology and three on contemporary and near contemporary Indian paintings and painters. The last section consisting of 5 items dealing with Hindu/Budhist subjects.

The division of the present selection in two parts is simply incidental : Initially it was decided to present only that much portion which is now part I of the present selection. We, however, realised that the selection is not comprehensive and, therefore, decided to add another part to make it wholesome and more representative.

— EDITOR

CONTENTS

1. The Khuda Bakhsh Library Journal is a quarterly journal specialising in oriental studies in Arabic, Persian and Urdu languages, covering meaningful research based on the material preserved in the Khuda Bakhsh Oriental Public Library, or having any concern with it.

2. Articles will be accepted in English, Arabic, Persian and Urdu.

3. Notes and addenda, by way of correction/addition to any information published in this Journal or in any publication of the Library e.g. Catalogues, will be a regular feature of the Journal.

Rs. 30.00 per copy

Annual subscription : Rs. 60.00 (Inland)
Pakistan : $ 12.00
Europe : £ 8.00
U.S.A. & Other Countries : $ 24.00

Printers : Tara Press, Tripolia, Patna-7 & Patna Litho Press, Patna-4
Publisher : Mahboob Husain, for Khuda Bakhsh O.P. Library, Patna.

Khuda Bakhsh Library

Journal

7-8

1978-1979

Khuda Bakhsh Oriental Public Library,
PATNA-800 004
(INDIA)